دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

کراچی

سچی کہانیاں

ڈائجسٹ

January
2014

سالِ نو مبارک

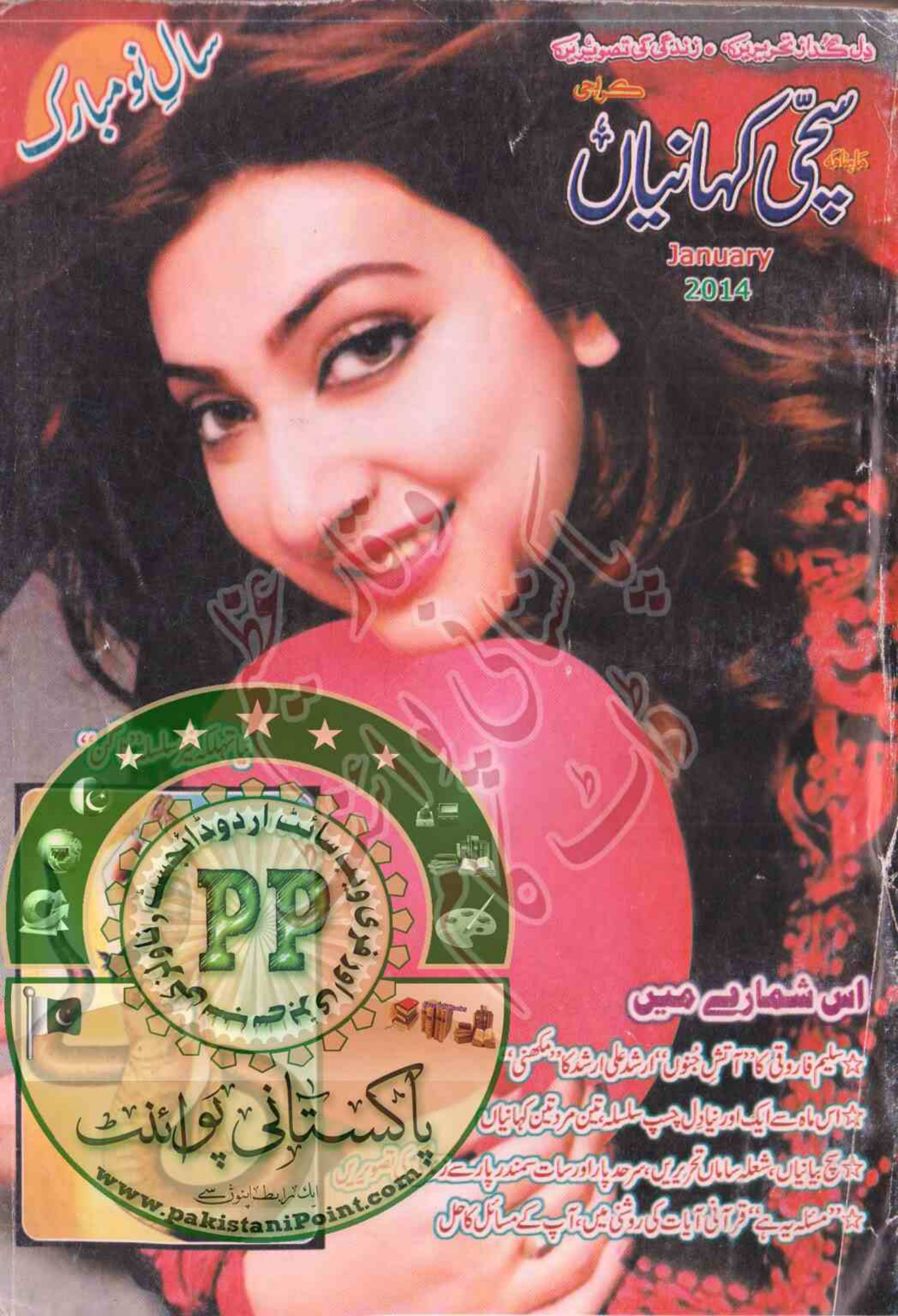

اس شمارے میں

☆ سلیم فاروقی کا "آتشِ جنوں"، ارشد علی ارشد کا "میکھنی"

☆ اس ماہ سے ایک اور نیا دل چسپ سلسلہ، تین مرد تین کہانیاں

☆ سچ بیانیاں، شعلہ ساماں تحریریں، سرحد پار اور سات سمندر پار سے

☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں، آپ کے مسائل کا حل

پاکستانی پوائنٹ
ایک مکمل رابطہ انٹرنیٹ سے
www.pakistaniPoint.com

بانی سہام مرزا

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

چیف ایگزیکٹو
رخسانہ سہام مرزا

منیجر مارکیٹنگ
زین العابدین

منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن
محمد اقبال زمان

کمپوزنگ / گرافکس
محمد کاشف

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام
نگراں مدیر : سلیم فاروقی
مدیر : کاشی چوہان

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا: 110، آدم آرکیڈ
شہید ملت روڈ / بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✲ جلد: 31 ۔ شمارہ: 01 ✲ جنوری: 2014ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

پرل پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

7 کاش — منزہ سہام
8 کچھ اپنی باتیں — کاشی چوہان
10 احوال — مدیر
24 بل گیٹس — احمد سجاد بابر
32 عذابِ رفتگاں — ڈاکٹر صغیر احمد
46 فرشتہ یا شیطان — آئی۔ امتیاز احمد
52 جھولا — آصفہ ضیاء احمد
65 یہ بے حسی... — بشیر احمد بھٹی
70 بیٹیاں پھول ہیں — فریدہ خانم
76 غرقاب — فرزانہ سحاب مرزا
81 عشق عشق — مہر پرویز دولو
84 ہاف سیٹ — گڈی آپا
90 گرگلو — مصطفیٰ کریم
97 پیاس — ایم اشفاق بٹ
100 آتشِ جنوں — سلیم فاروقی
122 دستِ ابلیس — ثالستائے
126 اعزاز — میبل ڈوموٹکا
130 گوشہ گیر — رشاد نوری
134 امریل — عصمت چغتائی
142 اونٹ کی کل — شرون کمار ورما
146 ناگن — اعجاز احمد نواب
168 کالک — ایٹیسن ڈیس مسیح
172 میں بے گناہ... — الماس روحی
178 آگہی کا عذاب — نصرت سرفراز
183 چوڑیاں بالی عمر — محمد علی ایبد بھٹی
190 المینی — فہیم اعظمی
194 نادیدہ مہربان — سیمین غزالہ نیحان
200 مرحوم محکلات — طاہر اقبال
204 ڈیرے والی — شاہ محمد تبریزی
212 مکھی — ارشد علی ارشد
234 مسئلہ یہ ہے — ادارہ
244 سخن آباد — قارئین
248 وصیت نامہ — سید قاسم محمود

فون: 34930470 - 021-34939823 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس 7-OB، لیاقت روڈ، کراچی

زرِ سالانہ مدیر جنوری پاکستان 720 روپے، فرانس 65 ڈالر، آسٹریلیا 65 ڈالر، کینیڈا 55 ڈالر، آسٹریا 55 ڈالر، فرانس 55 ڈالر، جرمنی 55 ڈالر، ہالینڈ 55 ڈالر، بیلجیم 55 ڈالر، سوئٹزرلینڈ 55 ڈالر، اٹلی 55 ڈالر، سپین 55 ڈالر، ڈنمارک 55 ڈالر، ناروے 55 ڈالر، سویڈن 55 ڈالر، فن لینڈ 55 ڈالر، یونان 55 ڈالر، پرتگال 55 ڈالر، آئرلینڈ 55 ڈالر، بیلجیم 55 ڈالر، سوئٹزرلینڈ 55 ڈالر، اٹلی 55 ڈالر، سپین 55 ڈالر، ڈنمارک 55 ڈالر، ناروے 55 ڈالر، سویڈن 55 ڈالر، فن لینڈ 55 ڈالر، یونان 55 ڈالر، پرتگال 55 ڈالر، آئرلینڈ 55 ڈالر

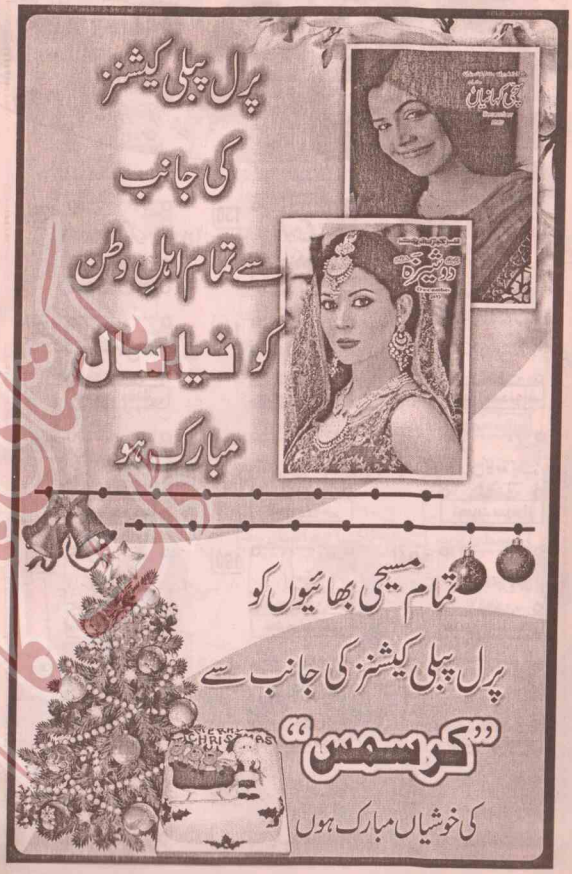

کاش

2014 کا سورج طلوع ہوا چاہتا ہے، جس کے طلوع ہوتے ہی 2013 کی تمام تر سیاہی اور تاریکی قصۂ پارینہ ہو جائے گی اور نیا سال اپنے ساتھ نئی امیدیں لے کر جلوہ افروز ہوگا۔

نیا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہوگا۔

نیلگوں آسمان پر پرندے تیرتے پھریں گے۔

میری پاک سرزمین پر خوش رنگ گل مہکیں گے، جن پر رنگ برنگی تتلیاں رقصاں ہوں گی۔ خنک ہوائیں بارش کی خوشبو، بھاپ اڑاتی گرم گرم چائے، مونگ پھلیاں اور خوب صورت باتیں کرتے چہروں کو اپنی موجودگی سے روشن کرنے والے پیار کا ساتھ نصیب ہوگا.....

کاش یہ سارے حسین مناظر اور یہ تمام خوشیاں اس بار ہم سب کا نصیب ہوں.....

یہ نیا سال تمام بچھڑے ہوئے لوگوں کو پھر سے ملانے والا سال ہو.....

کاش اس بار ایسا ہی ہو.....

اے ربِ کائنات میرے وطن اور ہم وطنوں کو سلامت رکھنا..... ہر بُری نظر اور دکھوں سے محفوظ رکھنا.....

رب العزت ہمیں اپنی غلطیوں اور خامیوں سے سبق سیکھنے والی قوم بنا دے.....

ہمیں زندہ قوم بنا دے..... کہ گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہوتی ہے۔

منزہ سہام

کچھ اپنی باتیں.....

کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ اس دنیا کو آگ لگادوں، راکھ کا ڈھیر بنادوں اور کبھی یہ بھی جی چاہتا ہے کہ اس کے ذرّے ذرّے کو سنوار دوں، ہر جا پھول کھلا دوں، ہر رُخ شوخیاں کر دوں، ہر تیرگی کو آفتاب ہو جاؤں، مگر جو کچھ جی چاہے، وہ ہوتا کب ہے؟ اور میرا من تو نہ جانے کیا کیا چاہتا ہے۔ صبح کی پہلی کرن ہی سے یہ طلب گار بن جاتا ہے۔ ہر روز ہر صبح ایک نئی بات سمجھاتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ صبح کا ٹھنڈا سورج ہر ساحل پر نمودار ہوتا دیکھوں اور تمام دن لہریں گنتا رہوں، ساحل کے پُرشور سناٹے میں خود سے باتیں کروں کہ شام ہو جائے اور آفتاب بھی غسل کو موجوں کے تلاطم میں اتر جائے۔ پھر تیرگی اک رُوپہلی روشنی سے رُوشناس ہو اور سرکتے سرکتے سفید گول چاند عین سر پر آجائے اور اس کی چاندنی ایک بیش قیمت دبیز قالین کی طرح سطحِ سمندر پر بچھ جائے۔ مگر یہ تو طلب ہے، طلب سے کیا ہوتا ہے، دل کی طلب کا زندگی میں ایک دن بھی نہیں۔ مگر نہیں، بہت کچھ ہے۔ بے پناہ مصروفیت ہے۔

بے پناہ کام ہے۔ اس دھوئیں سے اٹے ہوئے شہر میں ہر طرف دھواں ہی دھواں ہے۔ من کے اندر بھی دھواں، من کے باہر بھی دھواں، خواب بھی دھواں، تعبیر بھی دھواں، پھول بھی دھواں اور خوشبو بھی دھواں، بیہاں بادل بھی اور بارش بھی دھواں، زندگی دھوئیں کا استعارہ بن کر رہ گئی ہے کہ ذرا آگ بجھی اور ہم مُشتم، اس دھوئیں میں پھل پھولتے شہر میں اک مسموم دھواں بھی ہے، وہ ہے مصروفیت کا دھواں۔ اس دھوئیں نے چاروں طرف اندھیر کر دیا ہے۔ بس کام اور مصروفیت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

مگر کیا کیجیے اگر کام نہ کریں تو کیا کریں! اور کام بھی وہ جو من چاہا ہے۔ صبح کے سات بجے ہیں اور قدم اسکول کی دہلیز کو سجدہ کر رہے ہوتے ہیں اور میرے سامنے ایک دھواں تن کر کھڑا ہو جاتا ہے، تدریس کا دھواں، نظم و ضبط کا دھواں اور پھر میں اس دھوئیں میں گم ہو جاتا ہوں۔ سو بارہ بجتے ہی بچے میرے دھوئیں سے آزادی پاتے اور دروازے کی جانب ایسے دوڑتے ہیں جیسے کوئی دم گھٹا ہوا سانس لینے کو تالاب کی جانب دوڑے۔ میرے بوجھل قدم مجھے گھر لے آتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اچھی سی کتاب پڑھوں، کوئی

سوڈی دیکھوں کچھ دیر نیند کر دوں مگر نہیں، میرا جی اس وقت کہیں اور کے لیے دھواں دھواں ہونے لگتا ہے۔ میں جلدی جلدی کھانا کھاتا ہوں۔ کھانے کے دوران ہی یہ احساس بکھر لیتا ہے کہ دفتر سے دیر ہو گئی ہے۔ یہ خیال آتے ہی لقمے حلق میں دھواں ہونے لگتے ہیں۔ دوڑ پڑتا ہوں، بھاگم بھاگ گھڑی بھر کی بھاگم بھاگ کے بعد دفتر پہنچتا ہوں اور یہ بھاگم بھاگ بھی ترتیب کے دھوئیں میں مصروف رہتی ہے کہ دفتر پہنچ کر کیا کیا کرنا ہے، کہاں سے شروع کرنا ہے اور کام کہاں ختم کرنا ہے۔ سب ترتیب راستے میں طے پا جاتی ہے۔ جی ہاں سچی کہانیاں، دوشیزہ کا دفتر، کہانیوں کا دفتر، کہانیاں پڑھنے والوں کو کب معلوم ہوتا ہے کہ کہانیوں کا دفتر بھی تحریر ایک کہانی ہوتا ہے، ایک پُراسرار کہانی کی طرح۔ اور اس دفتر میں کام کرنے والا ہر شخص ایک کہانی، مدیرِ اعلیٰ ادام مزہ کو بھیجے! متین، پُروقار، باریک، بے پناہ نظم و ضبط کی مالک، دفتر کا نظام چلانے والی، ہر قسم کے غم سے آزاد لگتی ہیں، مگر جب ان کے دفتر میں حاضری ہوتی ہے تو ایسا لگتا ہے کسی قدیم کہانی گھر میں پیشی ہو گئی ہے۔ ان کے دفتر کے ہر ذرّے سے ایک کہانی چپٹی ہوئی ہے۔ سرکولیشن منیجر اقبال زمان کو بھیجے جدید ترین مشین کی طرح متحرک رہتے ہیں اور ان کی تیز رو، ہر وقت پھیلی ہوئی آنکھیں کہانی لکھتی اور کہانی بنتی نظر آتی ہیں۔

اور میں کاشی چوہان اور دیگر..... سب کہانیاں ہیں۔ دھوئیں دار، دھوئیں سے لبریز، دھواں دھواں، دھواں دھواں کتنی، دھواں دھواں پھوٹتی کہانیاں۔

یہ سب مسلم کہانیاں آپ کے لیے دوشیزہ اور سچی کہانیاں ترتیب دیتی ہیں۔ کوئی لکھتا ہے، کوئی کمپوز کرتا ہے، کوئی تزئین کرتا ہے۔ کوئی حساب کتاب کرتا ہے، کوئی چھاپتا ہے، کوئی ترسیل کرتا ہے، کوئی ادارت تو کوئی نگہداشت کرتا ہے۔ سب اپنے اپنے حصے کا وہ دھواں ان ڈائجسٹوں میں منتقل کرتے ہیں جو وہ دن بھر اس دھوئیں سے اٹے ہوئے شہر کے کثید کرتے ہیں۔ لیکن منتقل کرتے وقت یہ دھواں مسموم دھواں نہیں رہ جاتا بلکہ شہد بن جاتا ہے۔ اور کہانی کار شہد کی مکھی کی طرح ہی تو ہوتا ہے۔ پھولوں کے کڑوے کسیلے رس کی طرح زمانے بھر کا دھواں خود میں جمع کرتا ہے اور اسے ایک دلچسپ، نصیحت آموز، پیغام رساں کہانی کی صورت میں منتقل کر دیتا ہے۔

سو کاشی کہانی کو بھی کہانیوں کے پُراسرار دفتر میں رات ہو جاتی ہے۔

آپ کا اپنا

میں نہ ساحل پہ جا پاتا ہوں نہ ڈوبتے ابھرتے سورج کو دیکھ پاتا ہوں۔

بس دھواں دھواں سلگتے بوجھل قدموں سے گھر کو لوٹ جاتا ہوں۔

کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

لیجیے ساتھیو..... اٹھنے سال کی پہلی خبر! سلیم فاروقی بھی احوال سے گئے۔ انکل باریہ گیا..... آپ نے تو کہا تھا کہ آپ کچھ دنوں کی رخصت پر جارہے ہیں اور دوسرے دن آپ نے آفس فون کر کے کہا کہ میں کام نہیں کرسکتا!'' اب بھلا کیسے یہ بدیرانہ بوجھ آن پڑا ہے۔ دیکھ کر پہ چہ بھی تو دیا ہی تھا، مگر وہ جو اک شجر سایہ دار کا کام ہوتا ہے نا..... اہم معاملہ وہ ہے۔ خیر جی اب میں ہوں اور میرے پیارے پیارے قاری اور لکھاری دوست اور وہ سب جو مجھ سے اور ''سچی کہانیاں'' سے پیار کرتے ہیں۔ تو آپ سب تیار ہیں میرے ساتھ تعاون کے لیے، مجھے آپ سب کا انتظار رہے گا۔ ساتھیوں دیکھ کر دن یوں چٹکی بجاتے گزر جاتے ہیں، اور دیکھتے دیکھتے سورج ڈوبنے لگتا ہے اور میرے شہر کے ڈوبتے سورج کا منظر..... یہ شہر کراچی ہے پیارو!

سمندر کے کنارے، ساحلوں کی ریت پر کتنی ہی انمول یادوں اور خوابوں کے خزینے دفن ہوجاتے ہیں، کب پتا چلتا ہے، مگر یہاں معاملہ کچھ یوں ہے کہ ''تیرے عشق میں جو بھی ڈوب گیا، اُسے دنیا کی لہروں سے ڈرنا کیا'' میری ہر ممکن کوشش یہ

ہے کہ آپ کی محبت ''سچی کہانیاں'' کو سب سے معیاری پرچہ بنانے میں معاون ثابت ہو۔

اکتیس دسمبر کی رات اپنی کوکھ میں نیا سال لیے گھوم رہی تھی۔ جب گھڑی کی سوئیوں نے بارہ کا ہندسہ عبور کیا تو نئے سال کی پیدائش ممکن ہوگئی۔ یہ نیا سال 2014ء دنیا کے نقشے پر طلوع ہو چکا ہے۔ پتا نہیں کیا کیا نام دیا جانے والا ہے اسے۔ کون کون اسے کس کس کے حوالے ظہرانا ہے، مگر ساتھیو! ''سچی کہانیاں'' کا نیا سال ہمیں ایک سچی دنیا سے روشناس کرا رہا ہے۔ ابتدا ہو چکی ہے، اب سفر کا آغاز ہے اور بہتری کی جانب اٹھنے والا پہلا ہی قدم منزل کا پتا بتا دیتا ہے۔ بہت باتیں ہوگئیں اپنی..... اب ہم آتے ہیں احوال کی جانب۔

حال احوال سے آگاہ رکھا کر مجھ کو
میں ترے بام پہ آنے سے ہی جی اُٹھتا ہوں

یہ میرا ذاتی خیال ہے پیارو۔ مگر ہاں ایک چیز کا خیال رکھیے گا۔ ہمیں اپنے پرچے کے حوالے سے احوال میں بات کرنا ہے، بات مختصر ہوتی ہے تو اپنا اثر بھی دیرپا رکھتی ہے۔ امید ہے آپ میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں۔

✉ یہ خط ہے فیصل آباد سے محمد سرفراز ناز کا، لکھتے ہیں، بکری وخمتری مدیرہ ماہ نامہ سچی کہانیاں کراچی۔ السلام علیکم۔ خدا کے فضل وکرم سے خیریت موجود، خیریت مطلوب۔ دیگر احوال یہ کہ کم وبیش ڈیڑھ، دو دہائی قبل سچی کہانیاں میں مستقل لکھنے کا سلسلہ جاری رہا، جن کی اکثریت اشاعت پذیر بھی ہوئی پھر پتے، نوکری، مسائل جیسے غم دوراں نے رفتہ رفتہ سچی کہانیاں، اخبار جہاں، فاصلہ وغیرہ سے دور کردیا۔ اب کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا تو ہم خوابیدہ قلم انگڑائی لے کر چلنے پر آمادہ نظر آیا اور پہلی کاوش آپ کے لیے ہی ارسال کی ہے۔ جہاں تک آپ کے ڈائجسٹ کی بات ہے تو اس نے نہ صرف اپنا معیار قائم رکھا بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہی ہوا ہے۔ کون بنے گا کروڑ پتی؟ کا ایک کردار میں خود ہوں۔ یہ سرکاری کردار ابھی زندہ ہے۔ تاہم چند ایک نام و مقامات کی تبدیلیاں کرا دی ہیں۔ کہانی بھی ایک عرصے کے بعد تحریر کی ہے، لہٰذا اس میں نقائص و بیان کی ماہری کا بھی احساس ہے تاہم اب مشق شروع کردی ہے، آپ کی حوصلہ افزائی حسب سابق رہی تو باقاعدگی سے یہ سلسلہ شروع کروں گا ان شاء اللہ۔

ہمدرد سرفراز صاحب! خدا آپ کو اور آپ کے قلم کو رواں دواں رکھے، کہانی پڑھ کر آپ کو ان ہی سطور کے ذریعے مطلع کردیا جائے گا۔ باقی احوال میں آپ کی شرکت ہر ماہ ہونا چاہیے کہ اب اتنے عرصے بعد آئے ہیں تو رگیولر رہیے گا۔

✉ یہ خط آیا ہے ثمر سے مور شاہد حسین کا۔ لکھتے ہیں، السلام علیکم! امید ہے کہ آپ سچی کہانیاں کا پورا سٹاف، رائٹرز اور قارئین حضرات خدا کے فضل وکرم سے ٹھیک ٹھاک، صحت سلامتی، موج مستی میں ہوں گے۔ خدا ہم سب پر اپنی رحمتوں، نعمتوں اور عنایتوں کا نزول فرمائے۔ آمین۔ کاشی چوہان بھیا ماشاء اللہ آپ سچی کہانیاں کے وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوگئے ہیں Most Welcome۔ مبارک باد قبول ہو۔ انتظار کی گھڑیاں گزارتے گزارتے آخر پرچہ 30 اکتوبر کی شام کو مل گیا۔ فائنل کچھ خاص نہیں تھا۔ اس کے بعد ادارے میں پہنچے، عید قرباں، واقعی انکل ہم پاکستانی روز روز قربانی کرتے ہیں۔ مال کی نہیں اپنی جان کی، پھر ہم نے ایک دم اپنی محفل احوال میں چھلانگ لگائی۔ محفل احوال خوب سجی ہوئی تھی، بس کمی تھی تو ہماری۔ انکل فیصل صابرہ کو الماری میں رکھ کر پھر سے تالا لگالیں تاکہ تھوڑا آرام کرے، اس کا بھی حق ہے۔ اس سطر کے توسط ہم سب سے خاص کر تحسین جو نیجو سے مخاطب ہیں کہ پلیز جس کا بھی نام لکھیں پورا لکھا کریں۔ جیسے اس بار سدرہ انور علی نے پتا نہیں رانا شاہد یا مور شاہد کو یاد کیا۔ سسٹر وعلیکم السلام، ہم ٹھیک ہیں۔ بس دعاؤں میں یاد رکھا کرو، مجھ اسماعیل بروہی ان شاء اللہ اپنی دوستی ہمیشہ قائم رہے گی۔ جو نیجو سسٹرز پلیز کوئی تحریر لائیں۔ انکل محمد نعیم، آنٹی نصرت سرفراز آداب، سلام و دعائیں۔ مریم شاہ اور مون شاہ پلیز جب دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھائیں تو اس ناچیز کو بھی ضرور یاد کریں۔ احوال محفل جیسے

ہی احتظام ہوئی ہم کہانیوں کی دنیا میں جا پہنچے۔ خیام کی ریا می نے رُلا دیا۔ آج کل سچی محبت کا کسی کو احساس ہوتا ہے۔ آتشِ جنوں سمجھو رسالے کی جان ہے۔ آوارہ حسینہ، موبائل فائدے سے زیادہ نقصان کا رثابت ہوا ہے۔ ''جسے چاہا تھا'' عادت بد، شمع جلتی رہے گی''، اچھی تھیں۔ ''بہت برا ہوں میں، برائی کا انجام برا ہی ہوتا ہے، کاش کوئی سمجھ پائے'' مختصر کہانیاں ''ہوں نے دن یہ دکھائے، مجرم کون، جرم کی کوکھ، رکھیل'' بے حد پسند آئیں۔ سفر کہانی ابھی تک پڑھی نہیں ہے۔ ''عہید کا جوڑا موت کا عمل، اک لمحے کی بھول، تقدیر کے کھیل نیارے'' زبردست تھیں۔ رائٹرز نے خوب محنت کی۔ ''اک سربستہ راز'' بے حد پسند آئی کہانی کا پلاٹ اُٹھا۔ کافی دلچسپ تصویریں اُس پر وادی کی تصویر آنکھوں کے سامنے بسی لیے پھر رہی تھی۔ مرحوم سہام مرزا نے 1996 میں جو لکھا واقعی وہ موجودہ صورت حال کا عکاس ہے۔

☆ پیارے بھائی شاہد۔ سلامت رہو۔ پرچہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ بھی خوش ہو جائیں کہ ہمارے پرچہ سنبھالتے ہی آپ کی کہانی بھی شائع ہو گئی ہے۔ پلیز ایک گزارش آپ سے اور نئے لکھنے والوں سے کرنا ہے کہ مطالعہ وسیع کریں۔

✉ احوال میں خط ہے ایم اشفاق بٹ کا لالہ موسیٰ سے۔ تحریر کرتے ہیں۔ السلام علیکم! آپ سب کو اور میری دعا ہے کہ آپ اور آپ کی ساری ٹیم سدا شاد باغ ہنستی مسکراتی رہے۔ آمین، کہانیوں میں سب سے پہلے اپنے نیوٹ رائٹر محمد سلیم اختر کی کہانی ''شمع جلتی رہی'' جو کہ بہت ہی اچھی اسٹوری تھی۔ تسلیم منیر ملوی، کی کہانی خیام کی ریا می..... مشاہر نے تو تابندہ کو رباعیوں کے چکر میں ہی رکھا اور خود موج کرتا رہا۔ عظیم الدین انصاری کی کہانی ''آوارہ حسینہ'' کافی سبق آموز تحریر تھی ان کے لیے جو کسی کی بھلی ہی کال پر دل دے بیٹھتے ہیں۔ مجید احمد جائی کی کہانی ''جسے چاہا تھا'' اس کہانی میں وہی پیار محبت کا کھیل، وہی رونا دھونا، وہی ناکام محبت پہ ماتم، وہی پانچویں کلاس میں ہی کسی سے پیار ہو جانا، واہ جی واہ..... جائی صاحب کوئی اور تا پک نہیں ملا تھا آپ کو اس ناکام محبت کے سوا..... اس طرح کی کہانی سچی کہانیاں کے معیار کی نہیں ہے۔ سچی کہانیوں کا معیار بہت ہی اچھا ہے۔ باقی کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ ایک پیغام اپنے دوستوں کے نام دینا چاہتا ہوں، نثار احمد حسرت، ایم شفیق تنہا، محمود احمد بلوچ، صدا حسین صدا، اللہ دتہ مخلص آپ سب بھی ایک دفعہ سچی کہانیاں ضرور پڑھیں، مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اس کے دیوانے ہو جائیں گے۔ سچی کہانیاں میں اپنی حاضری یقینی بنا لیں۔ آخر میں سب کو سلام اور ڈھیروں دعائیں اور اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور سچی کہانیاں دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے اور ہماری دعا ہے کہ سچی کہانیاں اُفق پر چمکتا رہے۔ آخر میں سب کو میرا سلام۔ اللہ نگہبان

☆ پیارے بھائی اشفاق۔ لیجیے پہلا خط شائع بھی ہو گیا آپ کا۔ اب حاضری مسلسل بنائیں یقیناً سب کو اچھا لگے گا۔

✉ یہ خط ہے ہمارے پاس ضلع مظفر گڑھ کی تحصیل جتوئی سے ملک عاشق حسین ساجدکا..... لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! مزاج گرامی قدر۔ اس بار کا ''سچی کہانیاں'' پڑھا، جو ہر حوالے سے لاجواب اور معیاری تھا۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں..... اتنا معیاری اور خوب صورت رسالہ کے اجراء پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کریں۔ دعا کرتا ہوں ''سچی کہانیاں'' دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔ کافی عرصہ سے میرے نزدیک بہت سارے جرائد زیر مطالعہ رہے ہیں۔ جن میں میری کاوشیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں، مگر جو مزہ و افر ادیت معیار کے حوالے سے ''سچی کہانیاں'' میں ہے وہ کسی اور میں نہیں۔ بلاشبہ یہ ایک فیملی میگزین ہے۔ اس بار کے شمارے میں اداریہ بھی لاجواب تھا۔ جناب محمد سلیم اختر کی لاہور گ کہانی ''شمع جلتی رہے گی'' نے خاصا متاثر کیا جو ایک منفرد کہانی تھی۔ اگلی بار تفصیلی تبصرہ کے ساتھ پھر حاضر خدمت ہوں گا۔ ان شاء اللہ

☆ پیارے بھائی عاشق حسین۔ امید ہے ''سچی کہانیاں'' کا نیا رنگ بھی آپ کے ذوق کے عین مطابق ہوگا۔ آپ کے بھرپور تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ یہ خط احوال کی زینت بنا ہے اسلام آباد سے میجر (ر) امتیاز حسین ملک کا۔ لکھتے ہیں، السلام علیکم! مزاج گرامی، آپ سے نہ کبھی ملاقات ہوئی نہ فون پر بات، نہ ہی خط و کتابت اس لیے مناسب ہوگا کہ اپنا تعارف کروادوں۔ میرا نام امتیاز حسین ہے۔ فوج سے 1992 میں میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ چوں کہ بوسٹ ریٹائرمنٹ میں لکھنے وہیں رہائشی اختیار کر لی۔ زیادہ تر وقت میرا مختلف اخبارات اور رسائل میں لکھتا رہا۔ وہیں سے میری دو کتابیں ''حصار'' اور ''راہ طلب'' شائع ہوئیں، اب اسلام آباد شفٹ ہو گیا ہوں۔ ''سچی کہانیاں'' میں کافی عرصے سے لکھ رہا ہوں۔ ناصر رضا صاحب سے اچھی خاصی واقفیت تھی، میری بیٹی ''عروبہ عدنان'' بھی سچی کہانیاں میں لکھتی ہیں، امید ہے رابطہ رہے گا۔ ایک کہانی ''رنگِ ندامت'' بھیج رہا ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی اور مناسب جگہ بھی پا لے گی۔ ایک گلہ بھی کرنا ہے، تبصرے کے شمارے میں میری ایک کہانی ''دھول سا پیار'' چھپی ہے، لیکن نام تبدیل کر دیا گیا ہے۔ نام ''دھول سا ہی'' ہے، لکھنے والے کا نام بھی ایک جگہ میجر امتیاز حسین ملک ہے اور دوسری جگہ میجر ام امتیاز حسین ہے۔ پتا نہیں کیوں.....

☆ پیارے بھائی امتیاز اسلامت رہیے۔ جو ہو چکا اُس کے بارے میں تو ہم اب کیا کہیں کہ دونوں ہی ایڈیٹرز اب ''سچی کہانیاں'' کا حصہ نہیں ہے۔ ہاں آپ سے گزارش ہے کہ ''سچی کہانیاں'' سے رابطہ نہ توڑیے گا۔ اور جلد از جلد کہانیاں ارسال کریں، امید ہے ''سچی کہانیاں'' کا نیا روپ آپ کو پسند آئے گا۔

✉ یہ خط ہے رحیم یار خان سے وقاص حسین کا۔ لکھتے ہیں، السلام علیکم! امید ہے اللہ پاک کے فضل و کرم سے خیر سے ہوں گے۔ ''سچی کہانیاں'' کی ساری ٹیم بھی خیر و عافیت سے ہوگی اور تمام احوالیوں کو پیار بھرا سلام۔ اب اپنا محبوظ کیا لکھوں کوئی پوچھتا ہی نہیں ''میاں کوئی گل کر'' پھر بھی بتا دیتا ہوں۔ ابھی تک تو فٹ فاٹ ہوں آگے اللہ جانے۔ عید آئی اور خاموشی سے گزر گئی، ہر بار کی طرح اس دفعہ ''سچی کہانیاں'' زیادہ لیٹ نہیں ملا۔ اس لیے سوچا چلو اس بار احوال میں شامل ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ اب دیکھو کیا بنتا ہے۔ پچھلے تین چار ماہ سے میں اپنے دوست ظفر (دوست بھی ہے اور وہ اخبار فروش بھی ہے) کا دماغ چاٹ رہا تھا کہ یار رسالہ جلدی دے کر جایا کرو، وہ ہر بار ایک ہی جواب دیتا تھا کہ یار جلدی آئے تو میں بھی دے کر جاؤں۔ اب آرہی ہے سی ایل ٹو آتا ہے تو میں کیا کروں۔ تم ان کو کہو کہ وہ جلدی بھیجا کریں۔ میں ہر بار ان کر پہ کر جاتا تھا کیوں کہ ''اب اچھوں سے شکایت کیا کریں'' ایک شکایت ہمارے صاحب لوگ کافی کر رہے ہیں کہ رسالے کا سرورق جینوئن ہوتا ہے وہ نہ ہو اس کو ختم کر دیں۔ رسالہ خراب ہو جاتا ہے۔ اب پتا نہیں وہ صاحب لوگ رسالے سے کھیلتے ہیں کہ پڑھتے ہیں؟ اگر کھیلتے ہیں تو خراب ہو سکتا ہے ورنہ پڑھنے سے تو خراب نہیں ہوتا۔ مجید احمد جائی کے والد کے بارے میں پڑھ کر کافی افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور جائی صاحب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین) روبینہ شاہین کی تحریر ''عادت بد'' اور مریم شاہ بخاری کی ''مجرم کون'' مجھے عام انسان اور عقل مانے کو تیار نہیں ہوتی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ کیا ایک باپ ایسا بھی کر سکتا ہے؟ مگر افسوس..... ایسا ہوتا ہے۔ آج سے چوہتر سال پہلے ہماری کالونی میں بھی ہوا تھا ایسا ہی ایک واقعہ۔ وہ کرائے کے مکان میں آئے تھے۔ اس آدمی کی بیوی فوت ہو گئی تھی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں دو تین مہینے بعد جب بات اوپن ہوئی تو وہ چلے گئے تھے۔ افسوس ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو مقدس رشتوں کو پامال کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ دو تین کہانیاں اور بھی پڑھی تھیں، بھائی راجی میں۔ اب تک کے لیے اتنا ہی اگر اگلی بار رسالہ جلدی مل گیا تو پھر ملیں گے۔

28 تاریخ کو Library گیا تھا ناول لینے کے لیے..... ناول ڈھونڈ رہا تھا نیچے سے ''سچی کہانیاں'' مل گیا۔ میری خوشی قابل دید تھی۔ ہوتی کیوں نہیں! جس کو پہلے 10,8 تاریخ کو ملتا ہوا سے 28 کو مل جائے تو..... رسالہ کے لیے اپنی شاپ پر پہنچا، سب

کچھ گنور کرتے ہوئے سب سے پہلے احوال میں پہنچا تو جو خوشی تھی آدھی سلیم صاحب کا احوال پڑھ کر ہوا ہو گئی کہ اس ماہ کا شمارہ جلدی شائع ہو گیا ہے۔ بات تو خوشی کی تھی لیکن..... میں جو پہلے ہی لیٹ لطیف تھا یہ پڑھ کر یقین ہو گیا کہ میرا خط احوال کی نظری میں نہیں پہنچا۔ اب آتے ہیں رسالہ کی طرف تو سب سے پہلے کاشی صاحب کو مدیر بننے پر بہت بہت مبارک ہو۔ نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید کیوں کہ ہم تو زبردستی آئے تھے اور ابھی تک اگنور کیے جا رہے ہیں۔ چار ماہ سے خانہ خط کسی اللہ کے بندے نے پوچھا تک نہیں..... چلو کوئی گلی نہیں۔ پہلی کہانی جو پڑھی وہ تھی "رہبر پورس" ایک تاریخی کہانی تھی جو کہ احمد سجاد کے قلم سے نکلی۔ "رہبر پورس" کو اس کے اپنوں نے ہی مروا دیا۔ وہ کسی نے سچ ہی کہا ہے اپنے ہی گراتے ہیں نشیمن پہ بجلیاں..... محمد سلیم الحق کی تحریر "سکون" محبت ہو اور جنون نہ ہو..... محبت تو ادھی ہی ہوتی ہے۔ کوکب جمیل کی دو ٹن دوست، انسان اپنے مفاد کے لیے بہت کچھ برداشت کرتا ہے خود غرضی بھی بڑی چیز ہے..... محبت غفاری کی تحریر "میں ایک بیٹی ہوں" اکثر ضد میں آ کر کیے گئے فیصلے اولاد کی پوری زندگی برباد کر دیتے ہیں اور پھر پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ محمد الیاس کی تحریر "وارے کی عورت اچھی تحریر تھی۔ سات سمندر پار سے آنے والی اور سرحد پار سے آنے والی کہانیاں اچھی رہیں، تین مرد تین کہانیاں اچھا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ باقی کچھ کہانیاں ابھی پڑھی نہیں اور جو پڑھی ہیں وہ سب کی سب زبردست تھیں۔ اب تک کے لیے اتنا ہی اگر زندگی نے وفا کی تو پھر اگلے ماہ احوال میں ہوں گا تب تک کے لیے اجازت اللہ نگہبان۔

☆ پیارے وقاص۔ سلامت رہو۔ بھئیا گزری باتوں کو یاد کر دو گے تو پریشان ہو جاؤ گے۔ آپ سے گزارش ہے کہ جلد قارم میں آ کر پرچے کا تبادلہ دیکھ کر اس کے مطابق لکھیں، باقی ہم ہیں نا۔ بھائی وقاص دیکھو لوٹ آپ کا ماہ و سبر کا تبصرہ بھی شامل اشاعت ہے۔ اب تو خوش ہو آپ؟ اگلے ماہ نمبر ضرور کرنا۔ انتظار رہے گا۔

☒ یہ آمد ہے کراچی سے۔ نجیلی معتوک۔ تحریر کرتی ہیں السلام علیکم۔ اللہ سائیں سے اُمید ہے کہ آپ مع "سچی کہانیاں" کے اسٹاف سمیت سکھ اور شانتی سے ہوں گے (آمین) رخسانہ سہام، منزہ سہام ہی کو بھی سلام دعائیں۔ سرورق "سچی کہانیاں" پر معصوم سی دلہن بہت پیاری لگی۔ قربانی تو خدا کو خوش کرنے کے لیے ہوتی ہے نا کہ پاس پڑوس پور عزیز دار لے یا نمائش کرنے کے لیے، احوال کے سوال و جواب و خطوط بھی پڑھے اس سے کھلواری، بہن و بھائیوں سے بھی آدھی ملاقات ہو جاتی ہے رسالے پر خوب صورت تبصرے بھی پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ رضا بھائی اور ربیعہ محمود صاحبہ کے بارے میں اطلاع پر افسوس ہوا بہ خیر۔ ویسے نومبر کا "سچی کہانیاں" بہت بہت بہترین ہے۔ ہر چیز لاجواب لگی۔ کہانیوں کا معیار ایک سے ایک تھا۔ "خیام کی رباعی" بہترین ہے۔ لکھنے کا انداز بہت پیارا تھا۔ شمیم منیر ملوی کی خوب صورت کاوش، "آتش جنوں" بھی ٹھیک جا رہی ہے۔ "موج جلتی رہے گی" بہت پسند آئی۔ واقعی سچ کی شمع خلوص سے ہی جلتی ہے۔ ام عادل بھی اچھی کہانی لائیں۔ کاشی چوہان کی "سربستہ راز" بھی انوکھی کہانی تھی پسند آئی۔ محمد ابراہیم بروہی بھی اچھی تحریر لائے۔ "لمحے کی بھول، مجرم کون، عادت بد" یہ بہت بولنا کہ حقیقتیں ہیں۔ ان پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، زبان پر بوجھ ہو جاتا ہے۔ ایسی تحریر پڑھ کر، اُف..... موت کا عمل واقعی سبق آموز کہانی ہے۔ وہ میں نے کہا نا کہ اس مرتبہ ایک سے ایک کہانی ہے۔ نومبر کا شمارہ مزہ دے گیا۔ "مکھی" بھی کھمن کی طرح پھسلی جا رہی ہے، دیکھیں کہاں رکتی ہے۔ افتر شہاب صاحب کا سفرنامہ بھی خوب جا رہا ہے۔ تحریر میں ہی انڈونیشیا کا نظارہ ہو رہا ہے۔ سلسلے بھی سب خوب ہیں۔ کہانی بھیج رہی ہوں بذریعہ رجسٹری، کسی قریبی شمارے میں جگہ دیں مہربانی، رسید تو ضرور دیا کریں، اب پہلے والی کہانی "روشن راہوں کے مسافر" کے بارے میں کچھ پتا نہیں کہ آپ کو ملی تو کیا ہوا۔ آخر میں سب لکھاری بہنوں بھائیوں کو میرا سلام۔

☆ نجیلی جی ہمیں پتا ہے کہ کہانی لکھنے میں کس طرح خون، پانی ہوتا ہے۔ جو ہو چکا، اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہوں گا۔ ہاں اب جو ہوگا وہ آپ سب دیکھیں گے کہ کس طرح لکھواری اور پرچے کا معتبر ساتھ زندگی کی خوب

صورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ بابل کے بارے میں جلد مطلع کر دیا جائے گا۔

☒ یہ خط آیا ہے ہماری دوست لکھاری فرزانہ چغتہ کا راولپنڈی سے۔ لکھتی ہیں "سچی کہانیاں" کے تازہ شمارے میں اپنی سچی کہانی "ہوں کے....." دیکھی۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ کو نہ صرف پسند آئی بلکہ شرف اشاعت بھی بخشا۔ ولی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ ایسی کہانیاں ہمارے معاشرے میں بہت نظر ہی ہوئی ہیں۔ کوئی بھی قلم کی گرفت میں آ سکتی ہے۔ اور..... سچی سچی کہانی تو مجھے ایک عزیزہ نے سنائی حاضر خدمت ہے۔ ان کا کہنا ہے حرف حرف سچی ہے۔ نیا شمارہ بہت دیدہ زیب خاصا ضخیم اور اپنے اندر بھی آپ ہتیوں، جگ ہتیوں کی رنگا رنگ دلچسپیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ آپ کے حسن انتخاب اور محنت کا منہ بولتا شاہکار۔ اللہ تعالیٰ اسے روز افزوں ترقی دے۔ آپ کو خدمت علم و ادب، قرطاس و قلم کی توفیق ارزانی کرے، آمین ثم آمین۔ "سچی کہانیاں" میں ملنا میرے لیے ایک بڑے اعزاز سے کم نہیں، آپ کے تعاون کا دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ باقی امید ہے سب خیریت ہوگی۔

☆ محبت جی لکھتی رہیے کہ لکھنا ہی تو زندگی ہے۔ تعریف کا شکریہ۔

☒ یہ خط آیا ہے تلہ گنگ، چکوال سے فیصل اقبال لاوہ کا۔ تحریر کرتے ہیں، محترم سہام مرزا صاحب؟؟ اللہ کرے آپ خیریت سے ہوں "سچی کہانیاں" کے پورے اسٹاف کو مجھ ناچیز کا سلام ہو۔ سہام مرزا صاحب میں اپنی پہلی کہانی آپ کے رسالے میں بھیج رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ شائع کر کے فیصل اقبال کو شکریہ کا موقع فراہم کریں گے۔ اگر میری حوصلہ افزائی کی گئی تو اور بھی کہانیاں لکھوں گا۔ پلیز میری کہانی شائع کرنا میرا حوصلہ بڑھانا ہوگا اور یہ بھی بتانا کہ میری کہانی کیسی لگی اور اگر میں کہانی لکھنے میں کوئی غلطی کر گیا تو ضرور بتائیے گا تاکہ آئندہ ایسی غلطی نہ کروں۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ "سچی کہانیاں" دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین ثم آمین۔ "سچی کہانیاں" پڑھنے والے تمام بہن بھائیوں کو سلام۔

☆ بھائی فیصل اقبال۔ آپ کی غلطیاں کرنے کی عادت اس قدر پختہ لگتی ہے کہ تازہ شمارہ پڑھ کر بھی آپ نے سہام مرزا جی کے نام خط لکھا، جبکہ مرزا صاحب کو ہم سے بچھڑے بارہ برس گزر چکے ہیں۔ امید ہے آپ نوٹ فرمالیں گے۔

☒ یہ خط آیا ہے فوجی بستی، بہاولپور سے نثیر احمد سٹی صاحب کا۔ لکھتے ہیں، "سچی کہانیاں" کی خوب صورتی برقرار ہے لیکن ایک شکایت ہے کہ یہ ڈائجسٹ قارئین کو بازاری دوڑیں لگواتا ہے۔ جب بھی بک اسٹال پر جاتے ہو پوچھو، "سچی کہانیاں" آیا ہے، وہ نہیں ملے گا۔ ہر بار یہ جواب ہی ملتا ہے۔ مجھے افسوس ہوا ہے کہ ایک اچھے ڈائجسٹ کی جستی و پبلسٹی ہے، اس کے مطابق وہ مارکیٹ میں میسر نہیں۔ آپ سے التماس ہے، اس معاملے پر توجہ دیں تاکہ اس کی فروخت میں اضافہ ہو۔

☆ بھائی نثیر احمد بھٹی! آپ کے شکوے شکایات بہت زیادہ ہیں۔ ان پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، زبان پر بوجھ ہو جاتا ہے۔ ایسی تحریر پڑھ کر، اُف..... موت کا عمل واقعی سبق آموز کہانی ہے۔ وہ میں نے کہا نا کہ اس مرتبہ ایک سے ایک کہانی ہے۔ نومبر کا شمارہ مزہ دے گیا۔ "مکھی" بھی کھمن کی طرح پھسلی جا رہی ہے، دیکھیں کہاں رکتی ہے۔ افتر شہاب صاحب کا سفرنامہ بھی خوب جا رہا ہے۔ تحریر میں ہی انڈونیشیا کا نظارہ ہو رہا ہے۔ سلسلے بھی سب خوب ہیں۔ کہانی بھیج رہی ہوں بذریعہ رجسٹری، کسی قریبی شمارے میں جگہ دیں مہربانی، رسید تو ضرور دیا کریں، اب پہلے والی کہانی "روشن راہوں کے مسافر" کے بارے میں کچھ پتا نہیں کہ آپ کو ملی تو کیا ہوا۔ آخر میں سب لکھاری بہنوں بھائیوں کو میرا سلام۔

☆ نجیلی جی ہمیں پتا ہے کہ کہانی لکھنے میں کس طرح خون، پانی ہوتا ہے۔ جو ہو چکا، اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہوں گا۔ ہاں اب جو ہوگا وہ آپ سب دیکھیں گے کہ کس طرح لکھواری اور پرچے کا معتبر ساتھ زندگی کی خوب

☒ یہ خط آیا ہے ہماری دوست لکھاری فرزانہ چغتہ کا راولپنڈی سے۔ لکھتی ہیں "سچی کہانیاں" کے تازہ شمارے میں اپنی سچی کہانی "ہوں کے....." دیکھی۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ کو نہ صرف پسند آئی بلکہ شرف اشاعت بھی بخشا۔ ولی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ ایسی کہانیاں ہمارے معاشرے میں بہت نظر ہی ہوئی ہیں۔ کوئی بھی قلم کی گرفت میں آ سکتی ہے۔ اور..... سچی سچی کہانی تو مجھے ایک عزیزہ نے سنائی حاضر خدمت ہے۔ ان کا کہنا ہے حرف حرف سچی ہے۔ نیا شمارہ بہت دیدہ زیب خاصا ضخیم اور اپنے اندر بھی آپ ہتیوں، جگ ہتیوں کی رنگا رنگ دلچسپیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ آپ کے حسن انتخاب اور محنت کا منہ بولتا شاہکار۔ اللہ تعالیٰ اسے روز افزوں ترقی دے۔ آپ کو خدمت علم و ادب، قرطاس و قلم کی توفیق ارزانی کرے، آمین ثم آمین۔ "سچی کہانیاں" میں ملنا میرے لیے ایک بڑے اعزاز سے کم نہیں، آپ کے تعاون کا دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ باقی امید ہے سب خیریت ہوگی۔

☆ محبت جی لکھتی رہیے کہ لکھنا ہی تو زندگی ہے۔ تعریف کا شکریہ۔

☒ یہ خط آیا ہے تلہ گنگ، چکوال سے فیصل اقبال لاوہ کا۔ تحریر کرتے ہیں، محترم سہام مرزا صاحب؟؟ اللہ کرے آپ خیریت سے ہوں "سچی کہانیاں" کے پورے اسٹاف کو مجھ ناچیز کا سلام ہو۔ سہام مرزا صاحب میں اپنی پہلی کہانی آپ کے رسالے میں بھیج رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ شائع کر کے فیصل اقبال کو شکریہ کا موقع فراہم کریں گے۔ اگر میری حوصلہ افزائی کی گئی تو اور بھی کہانیاں لکھوں گا۔ پلیز میری کہانی شائع کرنا میرا حوصلہ بڑھانا ہوگا اور یہ بھی بتانا کہ میری کہانی کیسی لگی اور اگر میں کہانی لکھنے میں کوئی غلطی کر گیا تو ضرور بتائیے گا تاکہ آئندہ ایسی غلطی نہ کروں۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ "سچی کہانیاں" دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین ثم آمین۔ "سچی کہانیاں" پڑھنے والے تمام بہن بھائیوں کو سلام۔

☆ بھائی فیصل اقبال۔ آپ کی غلطیاں کرنے کی عادت اس قدر پختہ لگتی ہے کہ تازہ شمارہ پڑھ کر بھی آپ نے سہام مرزا جی کے نام خط لکھا، جبکہ مرزا صاحب کو ہم سے بچھڑے بارہ برس گزر چکے ہیں۔ امید ہے آپ نوٹ فرمالیں گے۔

☒ یہ خط آیا ہے فوجی بستی، بہاولپور سے نثیر احمد سٹی صاحب کا۔ لکھتے ہیں، "سچی کہانیاں" کی خوب صورتی برقرار ہے لیکن ایک شکایت ہے کہ یہ ڈائجسٹ قارئین کو بازاری دوڑیں لگواتا ہے۔ جب بھی بک اسٹال پر جاتے ہو پوچھو، "سچی کہانیاں" آیا ہے، وہ نہیں ملے گا۔ ہر بار یہ جواب ہی ملتا ہے۔ مجھے افسوس ہوا ہے کہ ایک اچھے ڈائجسٹ کی جستی و پبلسٹی ہے، اس کے مطابق وہ مارکیٹ میں میسر نہیں۔ آپ سے التماس ہے، اس معاملے پر توجہ دیں تاکہ اس کی فروخت میں اضافہ ہو۔

☆ بھائی نثیر احمد بھٹی! آپ کے شکوے شکایات بہت زیادہ ہیں۔ شاید دو سبز کا شمارہ آپ کے ہاتھ نہیں لگا۔ شمارہ پڑھیے امید ہے آپ کے شکوے کچھ تو دور ہو جائیں گے۔ باقی کوشش جاری ہے۔ امید ہے دیگر چیزیں بھی بہتری ہی کی جانب آ رہی ہیں۔ تعاون جاری رہے..... ہم آپ کے خط کے ساتھ بھی شائع کریں گے۔

☒ یہ خط ہے راولپنڈی سے ہمارے ساتھی محمد سلیم الحق کا، لکھتے ہیں۔ آپ کی سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ حاضری دے رہا ہوں، دسمبر کا "سچی کہانیاں" مل چکا۔ سب سے پہلے تو بھائی کاشی چوہان کو "مدیر" کا عہدہ مبارک ہو۔ میری تمام تر دعائیں اور تعاون آپ کے سنگ رہے گا۔ خوش آمدید۔ دسمبر کا شمارہ مجموعی طور پر تو بہتر ہے..... آگے جا کر مزید بہتر ہو جائے گا۔ باقی تحریروں کا انتخاب خوب ہے۔ میں ابھی تمام پرچہ پڑھ نہیں سکا۔ اس لیے تحریروں پر تبصرہ نہیں کر رہا۔ نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کو ترجیح دیں۔ یوں پرچے کی مقبولیت اور سیل میں بھی اضافہ ہوگا۔

☆ بھائی سلیم سلامت رہیے۔ امید ہے اگلے ماہ آپ پرچہ پڑھ کر ہمیں تبصرہ ارسال کریں گے، آپ کے تعاون کے منتظر ہیں۔

☒ یہ خط ہے کراچی سے عائشہ خورشید انور صاحبہ کا۔ تحریر کرتی ہیں۔

سخن ور تیری سخن وری بھا گئی
تیری محفل میں یہ ناچیز پھر آ گئی

نئے مدیر صاحب کا شی چوہان! سلیم فاروقی بھائی اور منزہ آپی کو اور رسالے کے سب ہی لوگوں کو عائشہ خورشید انور کا سلام قبول ہو۔ ہا کر کا بے صبری سے انتظار، رسالے کا گھر کی بالکونی سے آتا ہی کے گرنے کی دھم کی آواز پر میرے کان ہر دم کھڑے رہتے ہیں۔ رسالے کو پک کر اٹھانا، اپنا چشمہ ڈھونڈنا، رسالے کی سب کام چھوڑ چھاڑ کر صفحہ اول سے آخر تک ورق گردانی کرنا، آہا کیا مزا دیتا ہے، اس کا کوئی جواب نہیں، سونے پر سہاگہ اگر اس میں میرا نام آ جائے تو پھر کیا کہنے..... گھر کے ہر فرد کو بتانا، اُن کو دکھانا کہ میرا خط چھپا ہے، مجھے اک ایسی خوشی دیتا ہے کہ بیان نہیں۔ کاشی چوہان کو مدیر بننے پر بہت بہت مبارک باد۔ ان کی بکھری باتیں دل کو چھو گئیں اور تحریر اپنی اپنی لگی گی۔ بالکل ایسی ہی کیفیت ہماری بھی ہے جو بھی کاشی چوہان کی ہوا کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ محنت کا پھل ضرور دیتا ہے یہ اس کا وعدہ ہے۔ کاشی نے محنت کی اس کا پھل مل گیا۔ میری محنت بھی میرا اللہ دیکھ رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ مجھے بھی میرا پھل کہانی چھپنے کی صورت میں ضرور ملے گا۔ امید کرتی ہوں کہ نئے مدیر صاحب ضرور میری کہانیوں کو وقت دیں گے۔ میں کس سے گائیڈ لوں مجھے تو کوئی کچھ بتانے والا ہی نہیں۔ پلیز آپ ہی لوگ کچھ کرم کریں، باقی میرے رب کی مرضی۔ اگر میری محنت رنگ نہ لائے تو میرا اب پھل ضرور دے گا۔ مجھے اپنی کہانی چھپنے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ ایک بات اور کہ کیا میں فون پر آپ لوگوں سے بات کر سکتی ہوں۔ ایک بار پھر کاشی چوہان آپ سے درخواست ہے کہ میری کہانیوں پر نظر کرم ڈال دیں۔ اللہ آپ کو اور ترقی دے۔ بس میرا دل دنیا ٹوٹے۔ اس رسالے سے میرا رشتہ نہ ٹوٹے۔

☆ عائشہ خورشید صاحبہ۔ اس رسالے سے ہم آپ کا رشتہ کبھی بھی ٹوٹنے نہ دیں گے۔ کہانی کے بارے میں آپ کو کسی نے پھر غلط گائیڈ کر دیا ہے۔ فون پر بات کر کے ہم آپ کی غلط فہمی دور کر دیں گے۔ جلد آپ کی کہانی پر کام کرتے ہیں۔

☒ یہ مختصر خط آیا ہے، ریلے کالونی روڈ، کوئٹہ سے محمد قاسم خان کا۔ تحریر کرتے ہیں۔ السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے، میں کسی بھی ادارے سے پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ میں آپ کے رسالے کا پچھلے سات ماہ سے مسلسل مطالعہ کر رہا ہوں، آپ کا رسالہ بہت ہی اچھا ہے۔ ہم سب گھر والے اگلے ماہ کے رسالے کا بہت شدت سے انتظار کرتے ہیں۔ میں آپ کو اپنے ماموں کے بیٹے کا سچا قصہ لکھ کر بھیج رہا ہوں، میں پہلی بار کسی بھی ادارے میں کچھ لکھ رہا ہوں اگر کوئی بھی غلطی ہو جائے تو معاف فرما دیجئے گا۔

☆ پیارے وقاص۔ یہ پڑھ آپ کا ہے، اس پر آپ کا حق ہے، مگر بھائی آپ کو ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔ امید ہے آپ کی محنت کی بدولت بہت جلد آپ کا نام بھی ''سچی کہانیاں'' کے رائٹرز کی فہرست میں جگمگا رہا ہوگا۔

☒ یہ خط آیا ہے پوری شریف نسبوں سے حسین جو نیجو کا لکھتی ہیں محترم واجھے بھائی کاشی چوہان السلام علیکم۔ کچھ اپنی باتیں ''ساتھ لے'' بسم اللہ کی جو کہ ہم نے دل سے محسوس کیا۔ احوال کی محفل بہت خوب صورت رہی اور ہم اسے اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں، پلیز بھائی یہ آپ کا ہم پر احسان رہے گا، ہاں طویل خطوط کی تعداد زیادہ ہے تو بھلے کچھ مختصر ہی چلے گا، ہمرے کے ساتھ، سلام و عالیا سانگرہ وش لازمی شامل کریں، باقی جو آپ بہتر سمجھیں تازہ و شمارہ کہانیوں کے حوالے سے بہت بہتر پایا، نئے سلسلے ''تین مرد تین کہانیاں'' اور ''ماگن'' کا اضافہ انتہائی زبردست رہا..... سب سے زیادہ جو بات مجھے پسند آئی وہ ہیں پرانے سلسلے برخاست کر جیسے کہ آپ کی ڈائری، پسند یدہ اپنی اپنی اور کتاب تبصرہ'' یہ سب چیزیں ہر جگہ، ہر میگزین میں ایٹ اور نیس تک پہ کھری پڑی ہیں..... اب ذرا احوالیوں سے سلام وعا کرلوں، پھر کہانیوں پر تبصرہ۔ عزیز جی آ انکل، سلیم اختر انکل..... مجید عزیز صاحب اور محمد امجد صاحب، اتنی حوصلہ افزائی اور پسندیدگی کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ ثمینہ ناز بجا فرمایا، مگر سیٹوں پر

بیٹھنے سے قبل ہی سیٹ اُڑتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ دعا کرنا۔ عبدالرؤف عدم بھیا، بہت خوشی ہوئی کہ میرے کہنے پر آپ کی آمد ہوئی۔ اشتال صاحبہ، ایسی بات نہیں، بھلا میں کیوں اعتراض ہونے لگا۔ آتی رہو خوشی ہوگی۔ سدرہ انور، بڑی فوراً شکی اس لائق سمجھا مجھے، بس جی ٹوٹ جھوٹ کہ رہا اچھا لگتا ہے، مگر پسند نہیں۔ اب مجھ کہانیوں پر تبصرہ۔ ''عجب مقدر ہے میرا'' فرحانہ کوثر آپی کی فریحہ کے مقدر پر واقعی رونا آیا، جھوٹ نیزی سے نہیں تک تو سنا تھا مگر اب حل سے جھوٹ نیزی تک کس قدر اذیت ناک سفر ہوتا ہے، ہائے ری قسمت..... ''سہارا'' میں کاشی بھائی نے بے رنجیدہ کر دیا، مور شاہد حسین کی ''ایسا بھی ہوتا ہے'' بالکل ہوتا ہے، ہمارے اردگرد روزانہ جانے ایسے کتنے کردار جنم لیتے ہیں۔ ''تکون'' سلیم اختر کی انوکھی داستان حیرت میں مبتلا کر دینے والی۔ شہناں کھوسہ بھائی بہت عرصے بعد ''زندگی اک جوا'' لے کر آئے۔ روتے کھڑے کر دینے والی غم زدہ تحریر، واہ ری دنیا لعنت ہے ایسے مردوں پر..... ''گونڈاں'' واقعی انوکھی ہی رہی، باقی شاہ زیر مطالعہ ہے۔

☆ ڈیئر حسنین! آپ کا تبصرہ صرف وہیں سے حذف کیا گیا ہے جہاں ضرورت محسوس ہوئی، باقی ان شاء اللہ خدا سب کو ایک ساتھ جوڑے رکھے۔

☒ یہ خط ہے کراچی سے عزوبہ عدنان کا۔ لکھتی ہیں، امید ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گے، میں دعا گو ہوں کہ اللہ آپ کو کسی غم صحت کے ساتھ عطا فرمائے..... اسی طرح ''سچی کہانیوں'' کا سلسلہ قائم و دائم رکھیں۔ میں کافی عرصہ سے سچی کہانیوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہوں، ہر کہی، کبھی سچ میں کچھ عرصے کے لیے غائب بھی ہو جاتی ہوں وجہ وہی مصروفیات اور گھریلو معمولات ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کا اور ہمارا ساتھ مزید مضبوط ہوگا۔ ''ان شاء اللہ'' میں امید رکھتی ہوں آپ سے اپنے قیمتی مشوروں سے مجھے ہمیشہ نوازتے رہیں گے اور میرے آگے کے سفر کو سہل اور دلچسپ بنا دیں گے۔ (انشاء اللہ)

☆ عزوبہ صاحبہ! خدا کرے آپ کا اور ہمارا ساتھ مضبوط رہے، تبصرہ کہاں ہے؟ یہ تو اچھی بات نہیں۔ آئے، اپنی سنائی اور چلے گئے۔

☒ یہ خط آیا ہے محمد گوگل کا کوئٹہ سے، لکھتے ہیں میرے پیارے پرچہ ''سچی کہانیاں'' کے ایڈیٹر صاحب السلام علیکم کے بعد آداب عرض! حال یوں ہے کہ میں نے پہلے بھی خطوط لکھے ہیں لیکن میری کہانیاں یا خط کبھی سچی کہانیاں میں شامل نہیں ہوا ہے۔ برائے کرم ہماری طرف توجہ فرمائیے گا۔ ڈوگ کا مسئلہ بھی ہے۔ میں یہ کہانی بھیج رہا ہوں آپ یہ میری کہانی ڈائجسٹ میں شامل کریں گے ہمارے دوست شامل ابڑو ڈائجسٹ ہماری طرف توجہ بھیجتے ہیں اور ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہماری کہانی

اطلاعِ عام

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' اور ماہنامہ ''دوشیزہ'' کے قارئین، مصنفین اور تمام ایجنٹس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ناصر رضا (سابق مدیر خصوصی ''سچی کہانیاں'') اور راجا محمود (سابق مدیر ''سچی کہانیاں'') کو کوئی کام سے کوتاہی اور مجرمانہ غفلت کے باعث ادارے نے ملازمت سے برخاست کر دیا ہے۔

اب ان دونوں حضرات کا ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دونوں حضرات سے کسی بھی قسم کے لین دین یا کسی بھی معاملے کا ذمے دار ادارہ نہ ہوگا۔

(ادارہ)

میں جو بھی واقعات ہوتے ہیں بالکل سچے ہوتے ہیں لیکن ہم یہ مانتے ہیں کہ لکھنے میں تھوڑا طریقہ کار صحیح نہ ہو، میں آپ کے ادارے سے تعاون کی امید رکھتا ہوں۔

☆عمر بھائی! آپ کی کہانی ہمیں موصول ہوگئی ہے اور اُس کے ساتھ یہ تبصرہ بھی ہمارے قلم کے نیچے ہے۔ ہمارا تعاون آپ کو ہمیشہ حاصل رہے گا۔ مگر آپ کو محنت کی ضرورت ہے۔ امید ہے آپ ہماری تجویز پر عملی مظاہرہ کریں گے اور فوری طور پر کوئی بہتر تحریر ہماری طرف روانہ کریں گے۔

☒یہ خط ہے روبینہ شاہین کا کراچی سے، لکھتی ہیں۔ بہت ساری دعاؤں اور ممکنہ نیک خواہشات کے ساتھ حاضر ہوں، اس ماہ کا ''سچی کہانیاں'' بہت ہی مختلف و منفرد لگا۔ ٹائٹل سے آخری صفحے تک یہ دلچسپی اور انفرادیت کا سحر تھا جو حرف حرف سے بول رہا تھا۔ ''کچھ اپنی باتیں'' بہت ہی اپنے پن سے آراستہ تھیں ''احوال'' بھی خوب پُر رونق تھا۔ احمد سجاد صاحب نے ''راہا پور'' میں تاریخ کا آئینہ دکھایا اور ہم نے ماضی کی خوب سیر کی۔ ''سکون'' انسان کی شرانگیزی اور بے توقیری کی بے مثال داستان ہے۔ ''دشمن دوست'' نام کی طرح منفرد اور لطف کہانی تھی۔ ''عیب مقدر'' واقعی بے اعتباریوں کے موسم میں انسان کے انسان پر بھروسے اور اعتماد کی کہانی ہے۔ ''زندگی اک خواب'' یوں ہی سچی سچائی تھی کمال کیا شعبان صاحب نے! ''میں ایک بیٹی ہوں'' صبر اور کمالِ ضبط سے بُنی تھی داستان ''جیون کا کھیل'' آسائشوں کی تلاش میں نفس کی راہی لڑکی کی کہانی جو درس عبرت ہے۔ ''جیون کا کھیل'' ناکام محبت کی بربادی کی کہانی تھی جو گوشۂ چشم نم کرگئی۔ زن خانہ برباد و فرانس کی آزاد فضاؤں کی بہت ہی آزاد آزاد زادی کہانی تھی۔ گمنام ایک مختلف و منفرد کہانی تھی۔ ''خاکسار'' رشتوں کے لیے خاک ہونے والوں کی کہانی ہے۔ ''سکی'' جرم کی دنیا سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کی پُر درد کہانی تھی، جو اس شمارے کی چمک بڑھا گئی۔ ''آدمی صحت'' ایک سچی کہانی تھی جو کہ ایک لڑکی کی حوصلہ مندی پر محیط ہے۔ مرد کہانی کا سلسلہ بھی خوب صورت ہے۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوا کہانی بھی مذکر و مونث میں تقسیم ہے ان میں ''آج کی رات'' بہت ہی ستاتر کن تھی۔ تخن آباد بھی اچھا تھا۔ بازگشت بھی بہت مضبوط سلسلہ ہے۔ امید ہے ''سچی کہانیاں'' یوں ہی انفرادیت قائم رکھے گا۔ اب دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ

☆روبینہ جی! آپ کا تبصرہ بڑا جاندار رہا۔ امید ہے اسی طرح آپ ہماری ہمت افزائی کرتی رہیں گی۔

☒یہ نامہ ہے کراچی سے سبی غزالہ یہاں کا۔ لکھتی ہیں محترمہ منزہ صاحبہ اور ایڈیٹر بڑی کہانیاں۔ اُسکا شمارہ بہت دیر سے ملا۔ مگر اپنی کہانی ''رحمت کا اشارہ'' دیکھ کر خوشی ہوئی..... کوا کو تیر کا شمار ہو اور طوطا تختہ مہ سہل ہوا۔ اس میں بھی میری کہانی ''انجانا پسند'' شائع ہوئی تھی۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ دوسری آنکھ کا بھی موتیا کا آپریشن اسی مہینے میں ہوا ہے، اس لیے لکھنے پڑھنے پر کچھ دنوں تک پابندی ہے..... مگر ہم بغیر پڑھے اور بغیر لکھے کہاں رہ سکتے ہیں اس لیے پھر دو کہانیوں ''نادیدہ مہربان'' اور ''آ گہی کا عذاب'' لے کر حاضر ہو رہی ہوں اور جناب کرنل رفیق الیس ایم مرحوم صاحب کی طرح صرف اتنا کہوں گی..... ''اگر پسند آئے تو چھاپ دیں ورنہ چھپا دیں'' تاکہ میری بھی عزت رہ جائے۔ کہانیوں پر تبصرہ اس لیے نہیں کرتی کہ ''سچی کہانیاں'' کے سب لکھاری ماہر اور کہنہ مشق ہیں جبکہ میں ابھی طفلِ کتب۔

☆غزالہ صاحبہ! آپ کی کہانیاں موصول ہوگئی ہیں، باری آنے پر شائع کردی جائیں گی۔ دسمبر کا پرچہ پڑھیے، آپ کے بہت سارے گلے آپ ہی آپ ختم ہو جائیں گے۔

☒یہ خط آیا ہے عامر زمان عامر کا بورے والا سے۔ تحریر کرتے ہیں۔ مدیر اعلیٰ (منزہ آپی)، رخسانہ آنٹی، قابلِ قدر فاروقی انکل اور عزیز جان پیارے کاشی ''سچی کہانیاں'' قلم قبیلے کے تمام رائٹرز (مرد و خواتین) اور قارئین کی خدمتِ اقدس میں سلام خلوص۔ پیارے کاشی کی محبتوں کے طفیل طویل عرصے بعد دسمبر کا پرچہ موصول ہوا۔ اس نوازش کے لیے کاشی جی انتہائی مشکور ہوں۔ کاشی سمیت تمام اسٹاف کو میری جانب سے ڈھیروں سلام کہیے گا۔ بروقت پرچے کی مارکیٹ میں ترسیل یقیناً

ایک معیاری پرچے کی کامیابی و مقبولیت لازمی جز ہے۔ یہ بہت اچھی روایت ہے برلاکو کم اس روایت کو برقرار رکھے گا۔ کاشی جی نے ''کچھ اپنی باتیں'' تنا کے جہاں اپنے ادبی سفر، محنت و لگن کی داستان سے روشناس کیا وہاں ہمیں اپنے عہد گزشتہ کے ہر باب اور شب و روز مشفقانہ قلم کاری کی نذر ہوتے پل پل یاد کروا دیے۔ ویل ڈن کاشی جو ہان۔ احوال میں خورد بینی نظریں سب سے پہلے اس تاڑ میں تھیں کہ دیکھیے پرانے رائٹرز، کرم فرماؤں میں کون کون صاحب، صاحبہ ابھی تک اپنے قلم کا جادو بکھیر رہا ہے۔ روبینہ ناز کراچی، رانا محمد شاہد کے علاوہ میرے لیے تمام چہرے نئے نویلے تھے۔ اس لیے کہ طویل ترین عرصے بعد ''سچی کہانیاں'' کا دیدار ہوا۔ رانا محمد شاہد دل کے کومل جذبوں کے سمندر سنہرے ہم بھی پڑھ پاتے لیکن آپ کا خط تاخیر کے باعث شامل احوال نہ تھا۔ آپ کے نام پہ ہی اکتفا کیا۔ شاہد بھائی، بورے والے بطور قلم کار آپ کی نمائندگی میرے لیے باعثِ مسرت و افتخار ہے اور اب ان شاء اللہ بورے والا سے آپ کا چھوٹا بھائی آپ کے ہم قدم رہے گا۔ بہت ساری دعائیں آپ کے نام۔ تبصرہ تنقید یقیناً ادب حیات ہے اور اہل قلم کے لیے یہی وہ کسوٹی ہے جس میں وہ اپنے ادبی قد کی پرکھ کر کے آگے چلتا ہے۔ اس اصلاحی پہلو ایک شدت سوچ، تنقید برائے اصلاح (نہ کہ تنقید برائے طنز ہو) جس سے تخلیق کار اپنی فنی پختگی کو دور کر کے اپنی کوتاہیوں پہ قابو پا سکے۔ احمد سجاد بابر جیسا نام تو تعریف تو صیف کے تمہارے قصیدے سنے تھے سو دریچہ خوشی ہوئی۔ ''راہ پور میں'' پڑھ کے اس سے بھی بڑھ کے پایا۔ سلیم اختر کی ''سکون'' روایتی موضوعات، گاؤں کے فطرتی گرداور اور کبھی احساس سے مزین تھی۔ ''دشمن دوست'' عام سے معاشرتی کرداروں پہ مشتمل عام سی کہانی ہے۔ کاشی جو ہان بلاشبہ ایک شعلہ بیاں مقرر کی طرح بڑے تسلسل اور روانی سے بھرپور قصہ ''سہارا'' لائے۔ کاشی بہت خوب۔ آپ کے انداز تحریر میں جامعیت کے ساتھ جدت اور منفرد لب و لہجے کا بانکپن ہے، الفاظ کے تیر چلانا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی لیکن تیر نشانے پہ لگانا (الفاظ، محل الاستعمال، تشبیہات کا صحیح استعمال) بہت بڑا فن ہے اور خدائے آپ کو اس صلاحیت سے خوب نوازا ہے۔ رضوانہ کوثر کی اچھی کاوش ہے، ہمارے معاشرے میں لاتعداد ایسے کردار بکھرے پڑے ہیں۔ تمہیلہ زاہد کی کہانی نام، عنوان اور کردار سے مناسبت نہیں رکھتی۔ ہماری ناقص رائے کے مطابق تھوڑی محنت کیجیے اپنے قلم میں روانی اور موضوع محل سے ہم آہنگ تحریر لکھیے خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''ایسا بھی ہوتا ہے'' کچھ بھی پلے نہ پڑنے والی بات جیسے غیر معیاری پرچوں میں کہانی ہوتی ہے ویسی۔ شازیہ کا ایک خوبصورت خاکہ ہو گیا وہ بہت پریشان ہوئے آخر جنگل سے برآمد ہوا کہانی ختم۔ امید ہے میرا شمارہ نہ لگے ہوں گے۔ ''آتش جنوں'' جتنا پڑھا عمدہ۔ کیوں کہ سابقہ اقساط نہیں پڑھیں۔ اعجاز احمد نواب، ٹھیک ہی زبردست سلسلہ ہے۔ ''وارے کی عورت'' زبردست تحریر ہے۔ ''نقوش امارا'' کے ساتھ عباس حسنی چھائے رہے۔ ''بارشوں کے شہر میں'' اختر شہاب رنگین و سنگین سفرنامہ کا دلچسپ روداد سفر ہے۔ ''جرم کی صلیب'' موجودہ دور کی خوب عکاسی کرتی ہے۔ تین مرد تین کہانیاں کے حوالے سے ماہ بہ ماہ تین خوب صورت مہکتی تحریروں کے لیے کام کرنے کے لیے پاس گزاریں۔ ہر ادارے کی اپنی پالیسی اور تواعد و ضوابط ہوتے ہیں لیکن ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' دو ہر حاضر کاسب سے مقبول ترین پرچہ ہے تو اس میں شاعری اور نثر دری کے لیے اگر ممکن ہو تو صفحات بڑھائیے اس سے اور بھی نکھار پیدا ہوگا۔ اور اس سلسلے میں اس میں ''آج کی رات'' ٹاپ آف دی لسٹ رہی ویل ڈن۔ ارشد علی ارشد صاحب آپ کی ''مکھی'' شروع سے پڑھتے تو کچھ کہتے ہاں۔ خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ مسئلہ ہے یا ہمت خوب! دو..... عبوری وصال اور سلیم فاروقی کا کلام دل کو چھو کے روح میں اترنے والا تھا۔ تمام رائٹرز، قارئین، اسٹاف کو دہ بہ دہ پُرخلوص سلام، دُعیروں دعائیں، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆پیارے عامر! تم آ گئے تو خزاں میں بہار آ گئی۔ تمہاری تحریر ہمیں بہت پسند آئی اور تبصرہ بھی شاندار ہے۔ امید ہے

ہمیں تمہارا تبصرہ برہاہ موصول ہوگا۔ کیوں..... ہمارا مان برقرار ہے نا؟.....

☒ یہ خط آیا ہے ملتان سے مجید احمد جائی کا، لکھتے ہیں۔ بعد از سلام بیشمار کی طرح ڈھیروں دعاؤں، نیک خواہشات کے ساتھ اب رب تعالیٰ کے حضور بہ دست دعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو قارئین کو ''سچی کہانیاں'' کے تمام اسٹاف کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ آمین ثم آمین۔ دیگر احوال یوں کہ 29 نومبر کو اپنے کزن محمد یونس کے ہاتھوں ''سچی کہانیاں'' منگوائی، شام کو جب آفس سے گھر آیا تو میرے کمپیوٹر کے ساتھ ''سچی کہانیاں'' کا تازہ شمارہ میرے انتظار میں بے تاب تھا۔ میں نے جلدی سے لفافے سے آزاد کیا تو سرورق پر بیٹھی، کھلے بالوں کی نمائش کرتی حسینہ مسکراتی تھی۔ حسینہ سے ملتے، ہیلو ہائے کرتے آگے کو بڑھے، نزلے زکام کے لیے جوشاندہ پیتے، سچی کہانیوں کی جھلکیوں میں جھانکے، ارے واہ بھائی اب کی بار کاشی چوہان تشریف لائے ہیں۔ جن سے ہم ایک تقریب میں مصافحہ بھی کر چکے ہیں۔ بھیا! ذرا قدم چومک چومک کر رکھنا، سلیم فاروقی صاحب ''کوہ گراں'' میں حکومت کو بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ میں ایک کالم نگار کی حیثیت سے آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ کاشی چوہان کی ''سہارا'' زبردست تحریر تھی۔ سلیم اختر کی ''نکون'' محبت پر جان نثار تحریر تھی۔ ویلڈن سلیم صاحب، ''میں ایک بنی ہوں'' محبت غفار، تلخ حقیقت تھی، باقی اسٹوریاں زیر مطالعہ ہیں۔ اس دفعہ فیصل آباد کے علاوہ تمام سلسلے غائب تھے، وجہ جان سکتا ہوں۔ محترم تین کہانیاں آپ کو میل کر چکا ہوں (تیرے انتظار میں، خوابوں کی منزل، پیار کے اس پار) ایک کہانی بہت جلد میل کردوں گا۔ ضرور بتایئے گا کہ کتابی اشاعت میں، اور کب تک؟ اور کیا ''احوال'' ہم میل کر سکتے ہیں۔ ضرور جواب دیجیے گا۔ آخر میں ڈھیروں دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ اجازت طلب ہوں۔

☆ پیارے بھائی! گلے شکوے سر آنکھوں پر..... جود کا شکار معاشرہ، ہیشہ ترغزلی کی جانب جاتا ہے۔ دسمبر کا پرسکیمل طور پر پڑھنے تو شاید بھیا آپ کو آپ کے ہر سوال کا جواب مل جاتا۔ جگہ تو کوئی کمی کی نہیں کے سکتا، پیارے بھائی آپ کو حق ہے، جتنا چیخے مگر دل آزاری نہیں، کڑوے بادام بھیجنے کا شکریہ۔

☒ یہ خط میں آیا ہے ڈیرہ اللہ یار، بلوچستان سے سائل ابڑو کا، لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! بعد عرض ہے کہ میں یہاں خیریت سے ہوں امید ہے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم بھی خیریت سے ہوگی۔ ماہ دسمبر کا تازہ شمارہ ملا، بہت بہت شکریہ اور یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک کے نامور بازرشناء، افسانہ نگار نوجوان کاشی چوہان نے مدیر کی حیثیت سے اس پرچے کی ادارت سنبھال لی ہے۔ تو کاشی چوہان اس غریب کی طرف سے آپ کو بہت بہت مبارکباد اور امید کرتے ہیں کہ ''دوشیزہ'' کی طرح ''سچی کہانیاں'' کو بھی چار چاند لگ جائیں گے۔ خوب صورت ٹائٹل اور سرفہرست کی انداز دلاویزی..... کاشی چوہان کی ''پھلجھڑیاں باتیں'' پڑھ کر حیرانگی ہوئی کہ واقعی کل کا کاشی آج کا ایڈیٹر..... کاشی پیارے آپ کی محنت ہے جو صدیوں بعد بھی رائیگاں نہیں جائے گی..... بہر حال مجھے آپ کی باتیں بہت اچھی لگیں اور ہر ماہ اس صفحے کو اپنا ذاتی صفحہ بنائیں تاکہ ہم نوجوان نسل کو بھی اس سے سبق ملتا رہے..... احوال میں تم کم رکھا تو یہاں ہمارے پیارے انکل سلیم فاروقی کی طبیعت کا جان کر بہت دکھ ہوا۔ احوال سے فارغ ہو کر کہانیوں کی دنیا میں پہنچا تو سب سے پہلے احمد جاوید بابر، ''راہ پورس'' کہانی مجھے بہت اچھی لگی۔ سلیم اختر، ''نکون'' جو محبت کرنے والوں کے لیے جینے چاہتی محبت کی ایک مثال تھی۔ اور وہ محبت جنہیں کی ہم ہوگئی۔ سلیم اختر پلیز کبھی کبھار شکاری اور خانہ بدوشوں کے موضوع پر بھی لکھا کریں۔ کوکب جمیل، ''دشمن دوست'' بھی ایک پیغام تھا۔ کاشی چوہان ''سہارا'' زبردست معیار اور ''سچی کہانیاں'' کے مزاج پر پوری تھی۔ کاشی چوہان آپ کی ہر کہانی اس معاشرے کی عکاسی کرتی ہے، اس ملک قوم کے لیے ایک پیغام ہوتی ہے اور ہم نوجوان نسل کو تعمیراتی سوچ سے آگاہ کرتی ہے۔ رضوانہ کوثر، ''عجب مقدر ہے'' شمعان کھوسہ ''زندگی اک جوا'' واہ جی واہ کیا تخلیق کی ہے آپ نے۔ باقی تمام دوستوں کی بھی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ دلچسپ سلسلہ تین مرتبین کہانیاں زبردست سلسلہ ہے۔ ''سچی کہانیاں'' کے تمام سلسلے بھی بہت اچھے چل رہے ہیں۔ اگر زندگی نے ساتھ دیا تو ان شاء اللہ حاضری دیتے رہیں گے، واسلام۔

☆ پیارے ساحل! تم آئے بہت اچھا لگا۔ یقین کرو تمہارے ایڈریس کی وجہ سے پرچہ تم تک تاخیر سے پہنچا۔ اب ہر ماہ پرسچے پرتبصرہ ضرور کرنا۔

☒ یہ خط آیا ہے سرگودھا سے ممتاز احمد کا، تحریر کرتے ہیں۔ السلام علیکم، دعا ہے رب جلیل ہم سب پر اپنی رحمت اور لطف و کرم میں اضافہ فرمائے۔ پیارے دیس پاکستان میں بسنے والے ہر انسان کو گوشہ عافیت میں رکھے۔ آمین، سب سے پہلے محترم کاشی چوہان صاحب کو ''سچی کہانیاں'' کے مدیر کا قلمدان سنبھالنے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بہت بہت مبارک قبول ہو۔ گزشتہ دو ماہ سے تنگ ڈاک کی بری رفتار (UMS) کی سست رفتار سروس کی بدولت میرے خطوط احوال میں شامل ہونے سے رہ گئے۔ بھائی عبدالعزیز جی آصحاب السلام علیکم کیسے ہیں آپ.....؟ آپ کی نظم ''نون میاں'' حامد میر صاحب نے اپنے شو میں پڑھی تو بہت بہت مبارکباد قبول فرمائیں۔ اس دفعہ دسمبر کا شمارہ پورا نہیں پڑھ سکا کیوں کہ احوال کی محفل میں شامل ہونے کے لیے جلدی خط لکھ رہا ہوں، کاشی چوہان صاحب کی ''کچھ اپنی باتیں'' بہت اچھی لگیں۔ اداریہ میں سلیم فاروقی صاحب نے ''کوہ گراں'' کے عنوان سے دور حاضر کی بھیانک تصویر پیش کی۔ احوال میں تمام دوستوں کے خطوط شاندار تھے۔ محمد سلیم اختر کی ''نکون'' سچی محبت کی لازوال ایک زبردست انوکھی کہانی تھی۔ کاشی چوہان کی ''سہارا'' پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ خوب صورت شاعری کے اضافے نے چار چاند لگا کر کہانی کو خوب بنا دیا۔ رضوانہ کوثر کی ''عجب مقدر ہے میرا'' پڑھ کر دل دکھی اور مغموم ہو گیا۔ نعمت غفار کی ''میں ایک بنی ہوں'' پڑھ کر دل لرز گیا کہ اس معاشرے میں انسان نما درندے اور جانور دندناتے پھر رہے ہیں جو پھول جیسی معصوم بچیوں کو بیدردی کا نام دے کر ظلم و ستم کے پہاڑ گرا رہے ہیں۔ خدا کرے ثانیہ کے قتل کے کیس کا جلد از جلد فیصلہ ہو۔ جرم کیفر کردار کو پہنچے کڑی سزا ملے تاکہ کسی اور جیسے جانور جو انسانیت کے ماتھے پر بدنما داغ اور کلنک کا ٹیکہ ہے کی سزا سے اس جیسے لوگ عبرت حاصل کریں۔ تحشیہ زاہدی ''جیون کا کھیل'' شوبز کی چکا چوند کی شوقین اور دلدادہ لڑکیوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے ایک بہترین کہانی تھی۔ اب تک صرف اتنا ہی پڑھ سکا ہوں۔ اب اجازت چاہوں گا اس پیغام کے ساتھ کہ ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اب نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے، دراصل وہ لوگ اخلاص کی کمی کا شکار ہیں وہ اس لیے کہ نیکی کا بدلہ انسانوں سے چاہتے ہیں۔ نیکی کے لیے تو ہر زمانہ ہی موزوں ہے بس بدلے کی اُمید صرف اللہ سے رکھنی چاہیے۔'' ان شاء اللہ آگے ماہ جلد حاضری ہوگی اگر سانسوں کی ڈور ٹوٹی رہی تو.....

☆ بھائی ممتاز خدا سانسوں کی ڈور کو جوڑے رکھے، ہمیں تو آپ کے تبصرے کی..... بہت ضرورت ہے اور ہاں ایک بات اور اگلے ماہ ''میں آپ کا پرچہ'' پر مبصر پر تبصرہ چاہیے۔

☒ یہ خط آیا ہے مجھا سماعیل بروہی کا، دوآبہ سے۔ تحریر کرتے ہیں، سب سے پہلے آپ اور ''سچی کہانیاں'' کا شکریہ کہ آپ نے میری کہانی ''قسمت کے کھیل نرالے'' کو شامل کیا اور مجھے حوصلہ دیا۔ شکریہ شکریہ، میرے ابو میرے گھر والے بہت خوش ہوئے بلکہ پورے نواب شاہ کے خریداروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف سے مبارکباد ملی۔ دسمبر کا شمارہ ملا، سرورق پہ ماڈل نابیہ شیر کی مسکراہٹ اچھی تھی، اداریہ میں سلیم فاروقی نے بالکل سچ کہا۔ کاشی بھائی کی باتیں بھی اچھی لگیں۔ انکل سلیم اختر کی لکھی کہانی نکون بہ صد پسند آئی، کاشی چوہان کی سہارا بھی بہترین کہانی تھی۔ عجب مقدر میرا رضوانہ کوثر، زندگی اک جوا شعبان کھوسہ کی لکھی کہانیاں متاثر کن تھیں۔ واہ مور شاہد بھائی پیارے دوست آپ کی تحریر مجھے بے حد پسند آئی۔ محبت غفار اور تحشیلہ زاہدی کی لکھی کہانیاں بھی پسند آئیں، بس اتنا پڑھ سکا ہوں، باقی کہانیاں بھی اچھی ہی ہوں گی۔ اب اک خبر کے ساتھ اجازت کے میں ملتان کے ایک اخبار کو جو اگر کہا ہوں کامیابی کی دعائیں چاہتیں۔

☆ پیارے بھائی اسماعیل! ہم آپ کو اور آپ کے نوابشاہ کو ایسے ہی خوش کرتے رہیں گے، ہر آپ کو کہانی کے معیار کو مزید بہتر بنانے کی ضرورت ہے آپ کو تاکہ ہم فخریہ طور پر اسماعیل بروہی کی کہانی، بغیر کسی قطع برید کے شائع

کر سکیں۔ امید ہے آپ نے ہماری بات کا مائنڈ نہیں کیا ہوگا۔

☒ یہ خط آیا ہے راجہ خان سا گر کا ڈیرہ مراد جمالی سے، لکھتے ہیں۔ 11 سال بعد "سچی کہانیاں" کو بک اسٹال پہ دیکھ کے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ تو بہت پرانا رشتہ ہے۔ جلدی میں خرید کر گھر پہنچا سب کام تو جیسے بھول ہی گیا۔ احوال میں اکثر اجنبی ناموں سے سامنا ہوا۔ سلیم اختر، روبینہ شاہین، مریم شاہ بخاری کے نام جانے پہچانے لگے اور محمد عزیز نے بھی میرے خیال سے بہت عرصے بعد واپس آنے میں۔ حیدر کاشری، انکل کرنل رفیق البی ایم اور ہوا خاماں اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ یہ لفظ پڑھتے ہی سکتہ طاری ہو گیا۔ اللہ پاک انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ ان کے ساتھ کچھ ایسا رشتہ تو ضرور تھا جو یہ پڑھ کر بے یقین ہو گیا۔ اللہ پاک ہمیں ہر مصیبت سے بچائے۔ انکل سلیم فاروقی ہماری اللہ سے یہی دعا ہے آپ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ ہمیں کوئی پہچان بھی نہیں پائے گا۔ گیارہ سال کا عرصہ بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے گزشتہ کے ساتھ انسان کا رشتہ ہوتو سو سال کے بعد بھی اسے پہچان لیتا ہے ہم نے تو "سچی کہانیاں" کو پہچان لیا مگر کیا یہ بھی ہمیں پہچان پائے گا۔ احوال کے علاوہ آگے مطالعہ نہیں کر سکا، کیوں کہ آج 4 دسمبر ہے اور پوسٹ ڈیٹ چیک ہے اس لیے احوال میں شامل ہونے کے لیے اپنا یہ خط کوریئر کے ذریعے بھیج رہا ہوں، ان شاء اللہ کل آپ تک پہنچ جائے گا۔ امید ہے احوال میں جگہ بھی مل جائے گی۔ میری طرف سے تمام اسٹاف اور تمام نئے و پرانے قارئین کو نئے سال کی مبارکباد۔ دعا کریں کہ یہ سال ہمارے لیے اچھا ثابت ہو۔ اللہ حافظ

ماضی کی محفلوں کو سجا کر شعور میں
دیتے ہیں زندگی کو سہارا کبھی کبھی

☆ بہت پیارے بھائی راجھا۔ گیارہ سال بعد آپ کی آمد نے ہمیں بھی شاکڈ کر دیا۔ تو پیارے بھتیا یہاں تو دوسرے دن بھول جانے کی روایت ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ حال سے آگاہ رکھا کریں۔ اب آگے ہیں تو شامل محفل رہنا آپ۔ باقی ہمارے لیے آپ اور آپ کے لیے ہم نے ضرور ہیں مگر اس پرچے کے لیے ہم دونوں ہی ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔

☒ یہ خط آیا ہے ہمارے پاس راجہ منظور ربانی کا واہ کینٹ، خمیسل نیکسلا سے۔ لکھتی ہیں۔ "سچی کہانیاں" کو میں بچپن سے دیکھتی آئی ہوں، لیکن آج پہلی بار اپنی شاعری بھیج رہی ہوں، پلیز آپ اسے اپنے ترجمے میں شامل فرمائیں۔ آپ اگر توجہ فرمائیں گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی اور میری شاعری جو کہ آزاد شاعری اور غزلوں کی صورت میں ہے، ان شاء اللہ حرف عام پر آجائے گی۔ پلیز میں انٹرپاس ہوں اور تین بیٹیوں کی ماں ہوں۔ بس اس رسالے کے ذریعے ہی میں نے کوشش کی ہے۔

☆ بہن راجہ! آپ کی آزاد نظم ہمیں موصول ہوگئی ہے، امید ہے اگلے ماہ آپ کا تبصرہ بھی ہمارے پرچے کی زینت بنے گا۔

☒ یہ خط ہے سدرہ انور علی کا جھنگ صدر سے۔ لکھتی ہیں میری طرف سے تمام پڑھنے والوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نیا سال مبارک ہو اللہ کرے 2014 ہماری دھرتی اور اس کے باسیوں کے لیے امن اور خوشیاں لے کر آئے، ثم آمین۔ کاشی بھیا کو بھی کہانیاں کا مدیر بننے پر بہت مبارکباد۔ "کچھ اپنی باتیں" پڑھ کر جذبات اُمنڈ آئے۔ سلیم انکل کا اداریہ "کوہ گراں" ہر انسان اپنے مدار میں خود کو ٹھیک کر لے تو ملکی حالات بہت اچھے ہو سکتے ہیں، خدا بھی اُس کی حالت نہیں بدلتا جسے خود خیال نہ ہو۔ احوال میں تمام خطوط بہترین تھے۔ حسین بھی اللہ کے کرم سے میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ سب کے لیے دعا گو ہوں۔ آپ کی اپیا زاہدہ نے ہمارے میں کیس بات بھی ٹھیک طرح سے بتا دی۔ سب سے پہلے بات ہو جائے۔ "ناگن" کی بہت ہی اچھا اور دلچسپ سلسلے ہے۔ نمایاں شخصیات سچے واقعات میں احمد سجاد بابر کی "رعد پور" تاریخی داستانیں ہمارے آج کے لیے کسی سرمائے سے کم نہیں ہیں۔ انکل محمد سلیم اختر کی "سکون" بے شک محبت موت کی وادی اور زندگی کا خاتمہ ہے۔ ایک ساتھ تین اموات! محبت پر یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ کاشی بھیا کی تحریر "سہارا" عورت بے شک بے سہارا ہوتی ہے۔ اس کی کئی کمزوریاں ہوتی ہیں جن کا علاج مشکل ہے۔

رضوانہ کوثر کی "عجب مقدر ہے میرا" یہ دنیا بہت ظالم اور منافق ہے۔ انسانی شکلوں میں شرافت کا لبادہ اوڑھے بھیڑیے گھومتے ہیں یہاں۔ شہباز کھوسہ کی "زندگی ایک جوا" پڑھ کر بہت غصہ آیا جوا لوگ کھیل بھی بچیوں کا یہ حال کرتے ہیں۔ میرا بس چلے تو گولی ماروں ایسے لوگوں کو۔ عجب غفاری "میں ایک بنی ہوں" خواتین کسی بھی معاشرے کے لیے بڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قوموں کو سنوارنے میں جتنا عمل دخل اس صنف نازک کی کارکردگی کا ہے اور کسی کا نہیں لیکن اسی عورت کے ساتھ ظالم سماج یہ حال کرے تو ایسے لوگ انسان تو کیا مسلمان بھی کہلانے کے حق دار نہیں۔ تحمیلہ زاہدی "جنون کا کھیل" میں چھپا سسٹم سب کو سمجھ لینا چاہیے۔ مور شاہد حسین بھتیا کی "ایسا بھی ہوتا ہے" کسی کہنے والے نے خوب کہا ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ سلیم انکل "آتش جنوں" بہت اچھی جا رہی ہے۔ محمد الیاس کی "وارے کی عورت" پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی کی "جرم کی سزا" پڑھ کر ملک کے محافظوں پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ تین مرد تین کہانیاں بہت اچھا سلسلہ ہے۔ کہانیاں پسند آئیں۔ شاہ محمد شاہ کی "آج کی رات" جو لوگ اپنے رب کو چھوڑ کر مخلوق سے مانگیں ان کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سمیرا خان اسلان کی "می" کسی کسی کو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ہمدرد اور کوئی سہارا نہیں رہتا تو اللہ تعالیٰ وسیلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ "تخت آباد" میں تمام لوگوں کی شاعری پسند آئی۔ زرخسانہ آنٹی، منزہ آنٹی، شگفتہ آنٹی، ملک خمیسن، نزہ زینہ جونیجو، افشاں جی، صنیعہ جلیل شاہ، مجید احمد جائی، ممتاز بھیا، شاہ حسین بھیا، سلیم اختر انکل، عزیز انکل، نجیم انکل، عبدالرؤف بھیا، مدثر علی ارشد، اشعر جرار اور تمام پڑھنے والوں کو سلام اپنا خیال رکھے گا۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات تک بے حد کے لیے اللہ نگہبان۔

☆ سدرہ آپ کا تبصرہ اچھا لگا امید ہے آئندہ بھی ہمیں پرچے کے متعلق آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

میرے پیارو، جھنو، منزہ، بھانجو، بھتیجو..... اگلے ماہ ان ہی صفحات پر آپ اور میں ساتھ ہوں گے۔ جنوری کا شمارہ کیسا لگا؟؟؟ آپ کی رائے، تبصرے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ امید ہے آپ اپنے تبصرے ہمیں اس طرح ارسال کریں گے کہ پانچ تاریخ سے پہلے ہمیں موصول ہو جائیں۔

اور ہاں ساتھیو! اپنے تبصرے کے ساتھ اپنی ایک عدد پاسپورٹ سائز تصویر ضرور ارسال کریں۔ ماہ فروری سے آپ کے تبصرے، شاعری اور کہانی کے ساتھ تصویر بھی شائع کی جائے گی۔

آپ کی دُعاؤں کا طالب

کاشی چوہان

توجہ طلب

اپنی نگارشات کے حوالے سے بات کرنے کے لیے آپ 0307-2089080 پر رابطہ کر کے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ پیارے ساتھیو! آپ اپنی نگارشات ہمیں ای میل کے ذریعے بھی روانہ کر سکتے ہیں

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

ڈاک سے بھیجنے کے لیے: 110۔ آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

نوٹ: قارئین اور لکھاری دوستوں سے گزارش ہے کہ آپ اپنی تحریر کاغذ کے ایک طرف، ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور اپنا نام، پتا اور مقام واضح طور پر تحریر کیا کریں۔ (شکریہ)

ایڈیٹر

نمایاں شخصیات، سچے واقعات

بل گیٹس

احمد سجاد بابر

خاک سے اُٹھنے والے اُس ستارے کی کہانی جو کمپیوٹر کی دنیا کا بے تاج بادشاہ ہے، جو لاکھوں فاقہ زدہ بچوں کی زندگی بچا رہا ہے، لاکھوں غریب طالب علموں میں علم کی دولت بانٹ رہا ہے

کمپیوٹر کی دنیا کے بے تاج بادشاہ کی کہانی

"ڈاکٹر صاحب..... میرے بیٹے کا اچھی طرح چیک اپ کیجیے نا!!"

ماں کے لہجے میں پریشانی کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

"یہ عام بچوں جیسا کیوں نہیں ہے..... یہ گھنٹوں خاموش بیٹھا رہتا ہے، یہ جھولنے والی کرسی پر بیٹھ کر تیز تیز جھولنے لگتا ہے، اسکول میں یہ لڑتا جھگڑتا رہتا ہے..... یہ رات کو اسٹڈی ٹیبل پر ہی سو جاتا ہے اور.....اور....."

ماں کی بات جاری تھی کہ ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میڈم شکر کریں کہ آپ اسے وقت پر مجھ تک لے آئی ہیں، ایک نئی بیماری اس پر حملہ کر سکتی تھی..... خیر میں دوا لکھ دے رہا ہوں، امید ہے کہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کی بات سن کر ماں کے چہرے پر ہیلا ہٹ دوڑ گئی، وہ تھکے قدموں سے اپنے بچے کو لے کلینک سے باہر آ گئی۔

"مگر ماہر نفسیات تو کہتا تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھنے کو دیں، یہ بالکل ٹھیک ہے، جبکہ یہ ڈاکٹر تو....."

وہ سوچوں میں غلطاں چلی جا رہی تھی۔

اس کا بیٹا واقعی عجیب تھا، گھنٹوں چپ بیٹھا رہتا، ماں کے پوچھنے پر سنجیدگی سے جواب دیتا۔

"امی..... مجھے ڈسٹرب نا کریں..... دیکھ نہیں رہیں، میں سوچ رہا ہوں!"

اور ماں اسے دیکھتی رہ جاتی۔

"ہمارے گھر میں یہ ارسطو کیسے پیدا ہو گیا!"

ماں کڑھ کر سوچتی۔

☆.....☆

خاک جب آسماں کو چھونے لگے تو منہ کے بل زمین کی طرف گرتی ہے، لیکن خاک کو خاک ہونے کا احساس رہے تو مجبوراً بھلا کب ہو جایا کرتی ہے..... یہ غیر معمولی بچہ دنیا میں بل گیٹس کے نام سے جانا گیا، جو مسلسل چودہ سال دنیا کا امیر ترین شخص رہا، جو کمپیوٹر سافٹ ویئر کے عالمی ادارے مائکروسافٹ کا بانی ہے، جس کی دولت میں ہر سیکنڈ میں پندرہ ہزار روپے کا اضافہ ہوتا ہے، جس کے پاس اتنی دولت ہے کہ دنیا کے ہر شخص کو پندرہ ڈالرز دیں پھر بھی اس کے پاس پانچ بلین ڈالرز بچ جائیں گے، اگر بل گیٹس کو ملک تصور کر لیں تو وہ دنیا کے 37 واں امیر ترین ملک ہوگا، اگر اس کی جیب سے ہزار ڈالر کا نوٹ گر جائے تو اس کو اٹھانے تک وہ ہزار ڈالر کما چکا ہوتا ہے، دنیا کے 35 ممالک میں اسے سربراہ کا پروٹوکول دیا جاتا ہے، جو صرف 39 برس کی عمر میں دنیا کا سب سے امیر شخص بن گیا!

ولیم ہنری بل گیٹس سوم، امریکہ کی ریاست واشنگٹن میں 28 اکتوبر 1955 کو سیاٹل نامی شہر میں پیدا ہوا۔ اس کی دو بہنیں "کرسٹی" اور "لبی" تھیں۔ اس کے والد ولیم گیٹس ایک وکیل اور معلم تھے۔ اس کی والدہ "میری میکسویل" واشنگٹن یونیورسٹی میں ٹیچر تھی، اس کے نانا بینکر تھے۔ بل پڑھائی میں کمزور تھا، سوچوں میں یکسانیت نہیں تھی۔ اس کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ ہارورڈ یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کر لے، مگر اس نے خود ہی یونیورسٹی چھوڑ دی۔ بل گیٹس اس دن چھوٹ پھوٹ کر رو دیا جب اس کے یونیورسٹی ٹیچر نے اسے ڈیپ کر کہا۔

"بل تم زندگی میں زیادہ سے زیادہ ٹرک ڈرائیور بن سکتے ہو"

پوری کلاس کے قہقہے بل کو رُلا گئے، مگر اس میں اس کے ٹیچر کا بھی زیادہ قصور نہ تھا۔ بل متاثر کن طالب علم نہ تھا، اس کی مصروفیات کا محور و مرکز صرف کمپیوٹر تھا، اس کا یقین تھا کہ کمپیوٹر کی مدد سے بزنس شروع کیا جا سکتا ہے۔ اسی شام بل گیٹس نے یونیورسٹی چھوڑ دی، اس کا دوست پال ایلن اس کا شریک سفر تھا۔ بل گیٹس نے پال ایلن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور پُر یقین لہجے میں کہا۔

"آؤ پال..... اس دنیا کی بنیاد رکھیں جو آج تک ہمارے ذہن میں تھی، تم دیکھنا، ایک دن ہارورڈ یونیورسٹی مجھ پر فخر کرے گی۔"

یوں پال ایلن اور بل گیٹس نے ایک خوابناک سفر کا آغاز کر دیا۔

☆.....☆

یہ صرف ایک آئیڈیا تھا جس پر وہ دونوں کام کر رہے تھے۔ جدوجہد کے دن تھے، ہر طرف مایوسی اور مفلسی کے تیر تھے، کبھی کبھی حوصلے بکھرنے لگتے، ہر طرف اندھیرا نظر آتا، آنکھیں دھندلا جاتیں تو ایک چراغ راستہ دکھانے لگتا، ایک ہاتھ اسے تھام لیتا، ایک آواز اس کا حوصلہ بڑھاتی..... اس ابتلا کے دور میں ایک ہستی تھی جو ہمیشہ بل کو حوصلہ دیتی تھی، یہ ایک بس ڈرائیور تھا، تھکا ہارا بل جب بھی بس پر پاؤں رکھتا، وہ ڈرائیور اس کی طرف دیکھ کر ایک زوردار نعرہ لگاتا۔

"ہائے بل..... تم کر سکتے ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

یہ آواز اس کے لیے صبح میں بیٹھے چشمے کی مانند ثابت ہوتی، ایک دفعہ تو مایوسی کے وہ دن بھی آئے جب بل نے اپنا خواب ترک کرنے کا سوچا، اس نے سوچا میں بھی عام امریکیوں کی طرح تعلیم مکمل کر کے شاندار نوکری تلاش کر کے زندگی گزارتا ہوں، مگر اس بار بھی وہ ڈرائیور اس کا مددگار ثابت ہوا۔ اس نے بل گیٹس کی طرف دیکھا، زور سے ہاتھ ہلایا اور نعرہ مارا۔

"ہائے بل..... آئی ایم ونڈیو۔"

یہی آواز گرتے ہوئے بل گیٹس کو دوبارہ کھڑا کر گئی، اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ تھکنا اور ہارنا نہیں، یہی اندھیرے راستہ دیں گے، یہی طوفان بادبانِ حیات کا رُخ منزل کی طرف موڑیں گے۔

☆.....☆

بل گیٹس نے اس زمانے میں کمپیوٹر کا شوق پالا جب کمپیوٹر عام نہ تھا اور کمپیوٹر رکھنا ایک مہنگا مشغلہ تھا۔ بل کے والدین نے اسے 13 سال کی عمر میں لیک سائیڈ کے ایک پرائیویٹ اسکول میں داخل کروا دیا۔ بل گیٹس خیالات کی دنیا میں گم رہتا، اس نے خیالوں میں کئی کمپیوٹر کمپنیاں بنا رکھی تھیں جن کے ذریعے وہ لوگوں کو خیالوں میں ہی اپنی مصنوعات خریدنے کا اشتہار بھیجا کرتا تھا، حالانکہ ابھی تو نہ کمپنی کا وجود تھا اور نہ ہی مصنوعات کا.....

یہ کیسے ہوگا، اس سوال کا جواب بھی نہ تھا مگر ایک ارادہ تھا جو اس کے اندر آگ کے الاؤ کی طرح روشن تھا۔ اسکول دور میں ایک سائنس اسکول نے مدرز کلب کے چندے سے ایک کمپیوٹر خریدا جو جنرل الیکٹرک کمپنی کی ملکیت تھا، یہ اسکول کے طلبا کے لیے تھا اور اسکول اس کے عوض کمپنی کو بھاری معاوضہ ادا کرتا تھا، بل گیٹس اور اس کا دوست پال ایلن ہر وقت کمپیوٹر سے چمٹے رہتے، ان کا ہوم ورک بھی رہ جاتا، اساتذہ سے ڈانٹ بھی پڑتی، مگر ان کا جنون ماند نہ پڑتا۔ بل نے کمپیوٹر کے لیے اپنی ریاضی کی کلاس چھوڑنا شروع کر دی۔

اسکول میں جو بھی طالب علم کمپیوٹر استعمال کرتا، اس کا نام درج ہوتا۔ بل گیٹس اور اس کے چار دوستوں نے مل کر کمپیوٹر میں دائرس داخل کر دیا تاکہ ان کو زیادہ سے زیادہ کمپیوٹر استعمال کرنے کا موقع مل سکے۔ اسکول انتظامیہ نے ان چاروں پر موسم گرما کے دورانیے میں کمپیوٹر استعمال کرنے پر پابندی لگا دی۔ ہائی اسکول میں تعلیم کے دوران جب اس کی عمر صرف سولہ سال تھی، اس نے ایک سوفٹ ویئر بنا کر چار ہزار ڈالر میں فروخت کیا۔ بل اور اس کا دوست پال ایلن کمپیوٹر گیمز بنانے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے، انہوں نے ایک ایسی گیم بنائی جس میں دنیا کو فتح کرنے کا آئیڈیا تھا، جس میں بہت سے ہوائی جہاز، بحری جہاز، ٹینک اور بیلی کاپٹر تھے، بیک گراونڈ میں مسلسل ایک کمانڈر کی آواز آتی تھی جو احکامات صادر کرتا رہتا تھا۔ بل گیٹس اپنے پہلے کمپیوٹر پروگرام کے بارے میں کہتے ہیں۔

"میں نے کمپیوٹر کے لیے اپنا پہلا پروگرام محض 13 سال کی عمر میں تیار کیا، یہ ایک گیم تھی، یہ کمپیوٹر بہت

بڑا اور آہستہ تھا، اس کی اسکرین بھی نہ تھی، اس وقت کمپیوٹر استعمال کرنا بہت مہنگا تھا، ایک گھنٹے کا خرچ چالیس ڈالر تھا۔"

پال ایلن بل گیٹس سے تین سال بڑا تھا، وہ مشینوں کا ماہر تھا اور بل پروگرامنگ کا، وہ بل گیٹس کو مختلف میگزین اور کتابیں پڑھنے کو دیتا رہتا تھا جو بل کی معلومات میں اضافہ کرتیں مگر منزل ہنوز دور تھی۔

بل گیٹس نے چار ہزار ڈالر کی مدد سے ایک چھوٹی سی اپنی ٹریفک۔ او۔ ڈیٹا۔ کے نام سے قائم کی اور حکومتی اداروں کو ٹریفک کے بارے میں ڈیٹا سسٹم بنا کر فروخت کرنے لگا، اس وقت اس کی عمر صرف سترہ برس تھی۔ اس ڈیٹا سسٹم سے اسے بیس ہزار ڈالر کی آمدنی ہوئی۔ 18 برس کی عمر میں بل نے ایک اپنی کوایک ایسا سوفٹ ویئر بنا کر دیا جس کی وجہ سے وہ اپنے ملازمین کی تنخواہیں وقت پر اور سہولت سے ادا کرنے کے قابل ہوئی اور ملازمین کا ریکارڈ رکھنے میں بھی مدد ملی۔

بل گیٹس کہتا ہے کہ "ہم ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے تھے، ہم چاہتے تھے کہ کوئی ایسا سسٹم بنائیں کہ لوگوں کو معلومات ایک ہی جگہ پر مل جائیں، ایسا بھاری بھرکم کمپیوٹر بنائیں، جس میں بہت سارے مائیکرو پراسسر لگے ہوں۔"

بل گیٹس نے ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کی تو اس نے 1600 میں سے 1590 نمبر حاصل کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ ہائی اسکول کے بعد اس نے 1973 میں ہارورڈ یونیورسٹی میں بیچلر آف کمپیوٹر سائنس کی تعلیم شروع کی، یہاں پر اس کی ملاقات اسٹیو بالمر سے ہوئی، جس سے آگے چل کر اس کا کاروباری اشتراک بھی ہوا، اس نے الگورتھم کے حوالے سے ایک حل طلب مسئلے کو اپنے پروفیسر ہیری کے سامنے حل کر دیا، اگلے تین سال تک اسی کا تجویز کردہ حل پڑھایا جاتا رہا، اس بات سے بھی اسے شہرت ملی۔ بل گیٹس نے سوفٹ ویئرز بنانے کی خاطر تیسرے سال میں یونیورسٹی کو چھوڑ دیا، وہ کہتا تھا کہ آگے جو کتابیں پڑھائی جانے والی ہیں، وہ اسے پہلے سے آتی ہیں۔

☆.....☆

بل گیٹس کے خیال میں ماضی حیران کن واقعات کا

بل گیٹس اپنی شریک سفر کے ہمراہ

مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ ماضی تو سبق سکھاتا ہے۔ ہارڈ ویئر کی دنیا میں بہت کام ہو رہا تھا، مگر سافٹ ویئر کا میدان تا حال خالی تھا، آنے والا دور کمپیوٹر کا دور ہونے جا رہا تھا، کمپیوٹر کو جو احکامات دیے جاتے ہیں، وہ ان پر عمل کرتا ہے، ان احکامات کو سوفٹ ویئر کی مدد سے کمپیوٹر تک پہنچایا جاتا ہے۔ بل گیٹس کچھ ایسا کرنا چاہتا تھا جو پہلے کبھی نہ ہوا ہو، وہ کمپیوٹر کی ایک خاص زبان بنانا چاہ رہا تھا جس کی بنیاد پر کمپیوٹر کام کر سکے۔ ان کی محنت رنگ لائی اور انہوں نے کمپیوٹر کی بنیادی زبان ترتیب دے لی۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکی انجینئرنگ کمپنی MITS کام شروع کر چکی تھی اور ایک مائیکرو کمپیوٹر Altair 8800 متعارف کروا چکی تھی جس کی بنیاد Intel-8080 کے سی پی یو (CPU) پر تھی۔ جب بل گیٹس نے پاپولر الیکٹرونکس کے میگزین میں اس کمپیوٹر کا تعارف پڑھا تو اس نے اس کا آپریٹنگ سسٹم وضع کرنے کی پیشکش کی، اس وقت پال ایلن MITS میں کام کر رہا تھا۔ 1975 میں بل گیٹس کا اس کمپنی سے معاہدہ ہو گیا اور اس نے BASIC کے نام سے MITS کو آپریٹنگ لینگویج بنا کر دی، جس میں اسے محض پانچ ہفتے لگے، MITS نے بل کی تیار کردہ لینگویج کو بغیر کسی ادائیگی کے کاپی کرنا شروع کر دیا، جس پر بل نے اس ادارے کو خیر باد کہہ دیا۔ 26 نومبر 1976ء کو بل گیٹس نے مائیکرو سافٹ کے نام سے ایک الگ کمپنی رجسٹرڈ کروالی، یہ ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز تھا۔ بل گیٹس شہرت کی نئی بلندیوں پر قدم رکھنے جا رہا تھا۔

☆.....☆

آج مائیکرو سافٹ دنیا کی پانچ بڑی کمپنیوں میں شمار ہوتی ہے، اس کے ملازمین کی تعداد 70 ہزار کے قریب ہے اور دنیا کے 102 ممالک میں اس کی شاخیں ہیں۔ یہ کمپنی اب تک دنیا کے ایک لاکھ سے زائد لوگوں کو اربپتی بنا چکی ہے، مگر اوائل کے دن بہت کڑے تھے۔ بل گیٹس نے BASIC کو مائیکرو سافٹ کی پہلی پروڈکٹ کے طور پر متعارف کروایا۔ یہ ذمے داریوں کا دور تھا جب بل گیٹس ہر کام کی نگرانی میں پیش پیش تھا، وہ سوفٹ ویئر ڈیلیور بھی تھا، منصوبہ ساز بھی اور مائیکرو سافٹ کا دماغ بھی، وہ کام میں اتنا مگن رہتا کہ اپنے ساتھیوں تک کو میسر نہ تھا، ہر کسی کی ہر پروڈکٹ کے کوڈز خود لکھتا اور ان پر نظر ثانی کرتا۔ وہ معیار پر کوئی کمی سمجھوتا نہیں کرتا تھا، اکثر جب اس کے ساتھی اسے کوئی نئی چیز پیش کرتے اور وہ اس کے معیار سے مطمئن نہ ہوتا تو انتہائی بے رحمی سے یہ کہہ کر اسے مسترد کر دیتا۔

”میں نے اس سے زیادہ احمقانہ چیز آج تک نہیں دیکھی، تم کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے.....!“

1980 میں بل گیٹس نے اپنے پرانے دوست اسٹیو بالمر کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسی سال مشہور زمانہ کمپنی IBM نے مائیکرو سافٹ سے رابطہ کیا۔ اور اپنے نئے کمپیوٹر کے لیے ایک جدید اور جامع آپریٹنگ سسٹم بنانے کی درخواست کی، ایک ایسا پروگرام جو کمپیوٹر ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کے درمیان وقفے کو کم کر سکے اور رابطے کا کام بھی دے۔ IBM کا مشن کمپیوٹر کا سائز کم کرنا تھا۔ بل گیٹس نے انہیں ڈیجیٹل ریسرچ والوں سے رابطے کا کہا، IBM کے ڈیجیٹل ریسرچ سے مذاکرات کامیاب نہ ہو پائے اور انہوں نے دوبارہ بل گیٹس سے رابطہ کیا، بل نے ڈسک آپریٹنگ سسٹم یعنی DOS کے نام سے یہ پروگرام تیار کر کے IBM کے حوالے کیا اور ان سے 50 ہزار ڈالر معاوضہ وصول کیا، اب بل گیٹس کے ذہن میں DOS کا متبادل لانے کا خیال آیا، وہ اپنی سوچ کی عکاسی کچھ یوں کرتا ہے۔

”ہر شخص غلطیاں کرتا رہتا ہے، اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ ان غلطیوں کے بعد کیا کرتے ہیں، ہمارے کاروبار میں کامیابی کا تجزیہ ہی پوشیدہ ہے، مجھے اس پر ایمان ہے کہ درست وقت پر درست تبدیلی ہی ایک کمپنی کو تاپ پر رکھتی ہے۔“

اسی مقولے پر ایمان رکھتے ہوئے مائیکرو سافٹ نے 1985 میں ایک اور جدید تر آپریٹنگ سسٹم WINDOWS کے نام سے تیار کر کے آئی۔ بی۔ ایم کے حوالے کیا۔

کام سے اس کی لگن اور خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے کام کے دعویٰ کے ساتھ ٹارگٹ متعین کرتا اور پھر مقررہ وقت میں ان کو مکمل کر کے دکھاتا۔ بل گیٹس نے مائیکرو سافٹ کی مصنوعات کی تشہیر کے لیے میڈیا پر کرشلز میں بھی کام کیا۔ اس کا ایک ساتھی بیان کرتا ہے کہ اس نے ایک نئی گیم میں بل گیٹس کو 37 میں سے 35

بل گیٹس ملکہ برطانیہ کے ہمراہ

مرتبہ شکست دی، ایک ماہ تک بل گیٹس نے اس گیم پر غور کیا، اسے سمجھا اور جب دوبارہ اس کا بل گیٹس سے سامنا ہوا تو بل نے ہر مرتبہ اسے ہرایا یا برابری پر گیم کھیلی۔ یہ اس کے جنون اور کام سے لگن کی ہلکی سی ایک مثال ہے۔

بل گیٹس کو پیسے سے محبت نہیں تھی، اس نے آہستہ آہستہ خود کو مائیکرو سافٹ سے الگ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے 2006 میں اعلان کر دیا کہ وہ 2008 میں مائیکرو سافٹ چھوڑ دے گا اور خود کو فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دے گا۔ تاریخ میں بہت سی بڑی ہستیاں گزری ہیں، کسی نے محبوبہ کے لیے تاج و تخت چھوڑا تو کسی نے سکون کے لیے بادشاہی ٹھکرا دی، کوئی حاتم طائی بن کر سات سوالوں کے جواب ڈھونڈنے جنگلوں و ویرانوں میں چلا گیا تو کسی نے کسی شہزادی کا سوئمبر جیتنے کے لیے تخت چھوڑ دیا۔ بل گیٹس نے عام لوگوں کے لیے، پسماندہ اور پسے ہوئے لوگوں کے لیے 60 ارب ڈالر اور 200 ارب ڈالر کی کمپنی یعنی سونے کی کان چھوڑنے کا اعلان کر دیا اور وہ کان جو اس نے اپنے لہو سے پتھر کاٹ کر نقشِ ہستی پر ابھاری تھی، عظمت اور کیا ہوتی ہے۔

☆.....☆

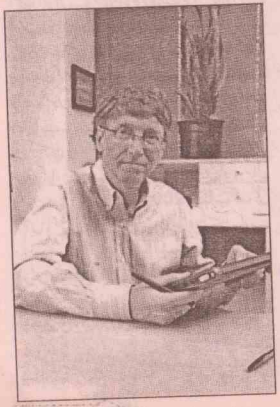

بل گیٹس سکتی انسانیت کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا، جو دولت اس نے جمع کی تھی، وہ معاشرے کو لوٹانا اس کا خواب تھا۔ یکم جنوری 1994 کو بل گیٹس کی میلنڈا فرنچ سے شادی ہوئی، جس سے دو بیٹیاں "جینیفر" اور "ایمی" اور ایک بیٹا "راری جون" ہیں۔ اپنی شادی کے بعد بل اور میلنڈا اپنی مون کے لیے کینیا گئے، وہاں بل گیٹس نے غربت کا حقیقی چہرہ دیکھا۔ افریقی مرد اور خواتین سارا دن کھیتوں میں کام کر کے مشکل سے گھر کا چولہا جلا پاتے، بچے بھوک اور فاقوں سے مرجاتے، ان مناظر نے بل گیٹس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، وہ واپس امریکہ پہنچے تو بل کی والدہ چل بسیں، اس نے اپنی وفات سے پہلے اپنی بہو سے سرگوشی کی۔

"جن انسانوں کو زیادہ ملے، انہی سے توقع بھی زیادہ ہوتی ہے۔"

ماں کی موت کا بل نے بہت زیادہ اثر لیا، اسے زندگی بے مقصد نظر آنے لگی۔ بل کے والد نے بھی بل پر فلاحی کاموں کے لیے زور دینا شروع کیا، آخر کار بل گیٹس نے 2000 میں "وہم ایچ گیٹس فاؤنڈیشن" قائم کی، بعد میں اس کو "بل اینڈ میلنڈا فاؤنڈیشن" میں تبدیل کر دیا۔ اس فاؤنڈیشن کے اکاؤنٹ میں 29 بلین ڈالر ہیں۔ پاکستان کا ٹوٹل بجٹ 12 بلین ڈالر کے قریب ہوتا ہے۔ یہ پوری دنیا میں صحت، تعلیم، لائبریز، کمپیوٹر ایجوکیشن اور غریب طلبا کے لیے وظائف کا بندوبست کرتی ہے۔ ہر سال غریب ممالک کے ایک سو طالب علموں کو اپنے خرچ پر کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ دلواتی ہے۔ غریب ممالک کو ویکسین فراہم کرتی ہے۔ ان ویکسین کی تیاری کے لیے بھی بل گیٹس نے سرمایہ فراہم کیا، جس کے تحت بچپن کروڑ بچوں کو ہر سال ویکسین مہیا کی جاتی ہے۔ 2001 سے اب تک بل گیٹس پاکستان کو بھی 27 ارب کی امداد و ویکسین کے لیے دے چکا ہے۔ اس پروگرام کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ دنیا بھر میں پولیو کی کیسز 45 فیصد کم ہوئیں۔ بل گیٹس کی فاؤنڈیشن ایڈز اور کینسر کی ریسرچ کے لیے مالی معاونت بھی فراہم کر رہی ہے۔

ہارورڈ یونیورسٹی میں اپنے ایک خطاب کے دوران ایک طالب علم نے ان سے سوال کیا کہ آپ اپنی کس ایجاد کو اہمیت دیتے ہیں، سافٹ ویئرز یا ویکسین پروگرامز..... بل نے جواب دیا کہ سافٹ ویئرز کی اہمیت اپنی جگہ مگر ویکسین پروگرام اہم ہے، کیونکہ یہ انسانی جان بچاتا ہے، بل گیٹس کا کہنا ہے کہ وہ انتقال سے قبل اپنے بچوں کو صرف ایک ملین ڈالر دے گا، باقی دولت وہ تقسیم کر کے جائے گا، کیونکہ یہ دنیا کی امانت ہے۔

بل گیٹس نے دنیا کی کم عمر ترین پاکستانی IT ماہر مرحومہ ارفع کریم کو خاص طور پر امریکہ مدعو کیا اور اس سے ملاقات کی۔ ارفع کی بیماری کے دنوں میں بھی ارفع کا امریکہ میں علاج کروانے کی کوشش کی، مگر ارفع کی حالت سفر کے قابل نہیں تھی، لہٰذا اس کے لیے امریکہ سے ماہر ڈاکٹرز کی ویڈیو کانفرنس کا بندوبست کیا، ارفع کریم جب بل گیٹس سے ملنے گئی تو نو سالہ ارفع نے بل گیٹس کے لیے ایک نظم لکھ کر اسے پیش کی، جس کا عنوان تھا "Mr. Bill Gates" جسے بل گیٹس نے بہت سراہا۔

بل گیٹس نے کتابیں بھی تحریر کیں۔ 1995 میں بل گیٹس کی کتاب "The Road Ahead" منظر عام پر آئی، اس کے بعد اس نے "Buisiness@The Speed Of Thought" نے شہرت حاصل کی، ان کے حالات اور جادوئی کامیابیوں پر فلمیں اور ڈاکیومنٹریز بھی بن چکی ہیں، امریکی صدر نے فخر سے کہا۔

"ہم بل گیٹس کی قوم ہیں"

ہارورڈ یونیورسٹی نے اپنے گیٹ پر اس کے نام کی تختی لگا دی۔ یہ اعزاز پا کر وہ بے اختیار رو پڑا۔ آج دنیا میں جانے کتنے ارب پتی ہیں، وہ مر جائیں گے اور وقت کی دھول ہو جائیں گے، لمحوں کی دیمک انہیں چاٹ لے گی..... مگر بل گیٹس زندہ رہے گا..... ان لاکھوں فاقہ زدہ بچوں کی صورت جن کی وہ زندگی بچا رہا ہے، ان غریب طالب علموں کی شکل میں جن کو وہ روٹی دے رہا ہے، علم بانٹ رہا ہے اور دولت کو بے وقعت سمجھنے کی وجہ سے وہ زندہ رہے گا، کیونکہ یہ صالحین، عابدین، زاہدین اور اللہ کے پسندیدہ بندوں کا وصف ہوا کرتا ہے۔

☆.....☆

اس ماہ کی سچ بیانیاں

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ، وہ سچ بیانیاں جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوشبو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

☆ عذاب رفتگاں	ڈاکٹر صغیر احمد	جہلم سے محبت کی روانی لیے ایک سچ بیانی
☆ فرشتہ یا شیطان	ایس امتیاز احمد	مذہب کی آڑ میں اپنی ہی دنیا میں جینے والوں کی دُکھ بھری کہانی شہر کراچی سے
☆ بھولا	آصفہ ضیاء احمد	حیدر آباد سے محبت کا رنگ لیے ایک انوکھی کتھا
☆ یہ بے حسی.....	بشیر احمد بھٹی	ایمان فروشی کی ایک تصویر، جسے بہاول پور سے ایک مجاہد مرد نے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا
☆ بیٹیاں پھول ہیں	فریدہ خانم	لاہور سے ایک دوشیزہ کے ماضی سے آباد ایک نوحہ
☆ غرقاب	فرزانہ سحاب مرزا	ایک پاکستانی نژاد دوشیزہ کی، امریکہ سے بھیجی گئی سچ بیانی
☆ عشق عشق	مہر پرویز احمد	میاں چنوں سے ایک سچے عاشقِ رسول ﷺ کی کہانی
☆ ہاف بٹ	گڈی آپا	لاہور سے ایک بدنصیب جوڑے کی لہو رُلاتی سچ بیانی
☆ گرگلو	مصطفیٰ کریم	لاس اینجلس سے ایک نوجوان کی زندہ دل سچ بیانی
☆ پیاس	اشفاق بٹ	لالہ موسیٰ سے..... ایک نوجوان کی انوکھی آپ بیتی

عذابِ رفتگاں

ڈاکٹر صغیر احمد

جہلم سے، محبت کی روانی لیے ایک سچ بیانی

اگر چہ میرا تبادلہ اپنے ہی ضلع کی دوسری تحصیل میں ہوا تھا، مگر وہ کہتے ہیں ناں کہ پیٹھ پیچھے پردیس ہوتا ہے۔ نئے لوگ، نئی جگہ، نیا اسٹاف، نئی ڈسپنسری، غرض یہ کہ کوئا گوں خدشات تھے جنہوں نے دماغ و دل کو جکڑ رکھا تھا، پھر گھر اور گھر والوں سے دور رہنے کا احساس بھی بڑا تکلیف دہ تھا۔ کھانے پکانے، کپڑے لتے دھونے کا مسئلہ..... دل تھا کہ یہی سوچ سوچ کر بیٹھا جا رہا تھا۔

ایک دو دفعہ تو ذہن کے کسی کونے سے اس خیال نے بھی سر اُبھارا کہ نہیں کرنی میں نے نوکری۔ ایسے میں ملازمت میں نہیں کرپاؤں گا، مگر پھر جلد ہی احساس مردانگی نے اپنا رنگ جمانے کی کوشش کی۔ یہ سارے خدشات و تحفظات عارضی ہیں۔ ملازمت میں ایسے مراحل آتے رہتے ہیں اور پھر میں نے کون سا عمر بھر وہیں کا ہو کر رہنا ہے۔ کچھ مہینوں، برسوں کی ہی تو بات ہے۔ میری ان سوچوں سے دل کی کچھ ڈھارس بندھ جاتی اور آنے والے اچھے وقت کی امید پھر بندھ جاتی۔

آج مریضوں کا بہت رش تھا، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے شہر بھر کے تمام مریضوں کو آج ہی آنا ہے، سابقہ تمام اسٹاف بشمول ڈاکٹر صاحب مقامی سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے۔

یہ قدرتی سی بات ہے جہاں بھی نیا ڈاکٹر تعینات ہوتا ہے، پہلے کچھ دنوں تک مریضوں کا تانتا بندھ جاتا ہے، لوگ شاید نئے ڈاکٹر کو پرانے ڈاکٹر پر فوقیت دیتے ہیں۔ شفایابی کے حوالے سے زیادہ واجبی کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے انچارج (ڈاکٹر صاحب) ضلع چکوال، جو کہ اس وقت تک ضلع جہلم کی تحصیل کا درجہ رکھتی تھی، کورٹ میں شہادت دینے (Court Evidence) کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ میڈیکل آفیسر کی غیر دستیابی میں ڈسپنسر کو اپنی ڈیوٹی کے ساتھ ڈاکٹر کی ڈیوٹی بھی کرنی ہوتی تھی، جو کہ ایک اضافی بوجھ ہوتا تھا، مگر نوکری نوکری ہوتی ہے، سرکاری احکامات کی بجا آوری بہ ہر حال کرنی ہوتی ہے اور اسی کا نام ملازمت ہے۔

میں اپنے تئیں بڑی مستعدی سے کام نپٹا رہا تھا۔ چوکیدار رحمت جس کو ہم سب پچار رحمو کہتے تھے اور مزے کی بات یہ تھی کہ اپنے بگڑے نام پر وہ کبھی نہ بگڑتا تھا، بلکہ خوش ہوتا اور موصوف کو اگر رحمت کہہ کر پکارتے تو دیر کے بعد سمجھ پاتا کہ کوئی اس سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔ بچا رحمو ہانپتا ہوا او پی ڈی کے کمرے میں داخل ہوا.....

"باؤ جی..... باؤ جی..... وہ پھر آ گیا..... پھر

اس کو دورہ پڑا ہے۔"

"چچا آرام سے بات کرو۔ کون پھر آ گیا۔ کس کو پھر دورہ پڑا ہے؟"

"جی وہ..... وہی کل والا۔" رحمو نے مجھے یاد دلایا۔

جو مریض کل عشا کے بعد آیا تھا۔ اچھا۔ اچھا..... میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم چلو میں پہنچتا ہوں۔" میں جلدی جلدی بلڈ پریشر ماپنے کا آلہ اور اسٹیتھو اسکوپ لے کر ایمرجنسی کی سمت دوڑا۔ مریض کی دونوں مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، چہرہ گرد و غبار سے اَٹا ہوا تھا۔ وہ زمین پر (خستہ حال فرش کو زمین ہی کہہ سکتے ہیں) بالکل سیدھا پڑا ہوا تھا۔ میں نے رحمو اور مریض کے اٹینڈنٹ سے کہا کہ اسکو وارڈ میں شفٹ کرو۔ میں ادویات وغیرہ لے کر آتا ہوں۔ آئی وی لن (I.V line) دینے کے چند منٹ بعد ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور ہونٹوں کی طرح اپنے اطراف دیکھنے لگا۔ پیش تر اس کے کہ میں اس سے کوئی بات کرتا، وہ خود ہی بول پڑا۔ "سوری باؤ جی (ڈسپنسر کو باؤ کہتے تھے) آج پھر میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا ہے۔"

"نہیں یار اسد ایسی کوئی بات نہیں" میں نے اس کا اعتماد بحال کرنے کے لیے اس کا نام لے کر کہا۔ اب وہ مکمل ہوش مند تھا اور اس کی آواز میں جو نقاہت تھی وہ بھی کافی حد تک دور ہو چکی تھی۔ "اچھا یار اسد میں جلدی آتا ہوں تمہارے پاس۔" میں نے اُٹھتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ اب اُٹھا کر مریض ہی آ رہا تھا اور میں نے چچا رحمو سے اسٹور اور ڈسپنسری کا ریکارڈ (رجسٹر جات) لانے کو کہا، تاکہ جتنا جلد ممکن ہوا، آج کام نپٹالوں۔ اگر ایک آدھ دن کا کام ملتوی ہو جاتا تو آئندہ دنوں میں نپٹانا بہت دشوار ہو جاتا۔

"اسد اب طبیعت کیسی ہے..... بہتری محسوس ہو رہی ہے؟"

"بہت افاقہ ہے..... بہت بہتر ہوں۔" میرے پوچھنے پر اس نے بھرپور آواز میں جواب دیا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید گویا ہوا۔ "جب میں سوچوں یا بھی پریشان ہوں تو بیمار ہو جاتا ہوں، کیا میں ٹھیک ہو جاؤں گا....."

"ہاں، ہاں کیوں نہیں، تم ان شاء اللہ بہت جلد مکمل ٹھیک ہو جاؤ گے" اور پھر میں کسی کام کا بہانہ کرتے ہوئے اُٹھ کر چلا آیا۔

دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ مزید سوال و جوابات کے چکر میں پڑے، مبادا کہیں اس کی حالت پھر سے بگڑنے لگے اور پھر میرے پیشے کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جو کام میرے سینئرز کا ہے، وہ میں نہ کروں۔

شام کو میں اپنے انچارج سے ملا اور تمام دن کی کارگزاری اُن کے نوٹس میں دی۔ "اب اس لڑکے کی طبیعت کیسی ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے استفسار کیا۔

"سر بہتر ہے..... جب سے یہاں آیا ہے..... دوبارہ انیک (دورہ) تو نہیں پڑا۔"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ شاید 16 منٹ کا وقفہ پڑا ہوگا کہ رحمو چچا دوڑتا ہوا آیا۔ "آپ کو ڈاکٹر صاحب وارڈ میں بلا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم چلو میں آتا ہوں۔" ڈاکٹر صاحب نے کچھ دیر تک مریض سے متعلق کچھ معلومات لیں۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ مریض سے براہِ راست سوال کم سے کم کریں، پھر کچھ ضروری ہدایات دینے اور ادویات لکھنے کے بعد گھر جانے کی اجازت دے دی اور اسد (مریض) کے بڑے بھائی کو تاکید کی کہ وہ صبح مریض کی سابقہ کیس ہسٹری سے متعلقہ دستاویزات و نسخہ جات لے کر ضرور آئے۔

اگلے دن معمولات سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے آفس میں بلوایا۔ سابقہ نسخہ جات اور رپورٹس وغیرہ دیکھنے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ مریض گزشتہ تین برسوں سے اس مرض میں مبتلا ہے۔ وہ علاج کے لیے اپنے مقدور بھر کوشش کرتے رہے ہیں، ان کے معاشی حالات بفضل خدا خاصے بہتر تھے۔ وہ علاج کے سلسلے میں کراچی، لاہور اور راول پنڈی تک جا چکے تھے۔ چوں کہ مریض کا والد ایک عرصے سے سعودی عرب میں ملازمت کر رہا تھا۔ روپے پیسے کی فراوانی کی ہی وجہ تھی کہ وہ اس کے علاج کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر حضرات کے علاوہ تعویذ گنڈے کرنے والے کئی ایک

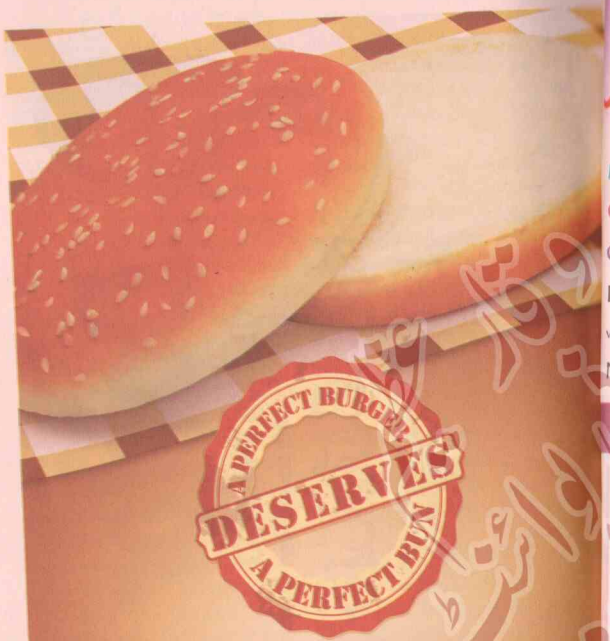

Bakery fresh taste, soft and silky texture and golden tone to enhance a burger like no other.
The New Dawn buns are a perfect compliment to whatever you want to place in between.

So enjoy the burger of your choice with

DAWN BREAD

Take the contest on our Facebook page to win fabulous prizes!

UAN: 111-111-999 | www.dawnbread.com

Medora

Matte,
Glossy and
Glitter
Lipsticks
with matching
Nail Polish

Get a look that compliments your overall style with Medora's extensive range of lip and nail colours.

MATTE
IN 90 COLOURS

GLOSSY
IN 35 COLOURS

GLITTER
IN 20 COLOURS

PLEASE ASK YOUR DEALER FOR SHADE CARD

MEDORA OF LONDON for a more beautiful you

عالموں کے ہاں بھی جا چکے تھے، مگر خاطر خواہ فرق ندارد تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب کافی تجربہ کار تھے، گرچہ وہ صرف ایم بی بی ایس تھے، مگر اپنے پیشے میں بہت اچھی شہرت پائی تھی۔ بہت سے پرانے اور پیچیدہ کیسز کا بھرپور علاج کر چکے تھے اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بیش تر مریض شفایاب ہو چکے تھے۔ اس مریض کو بھی ڈاکٹر صاحب نے ہینڈل کرلیا اور مجھے حکم دیا کہ مریض کے داخلہ فارم تیار کر کے اسے وارڈ میں منتقل کروادوں۔

آج میں حسب معمول بلڈ پریشر چیک کرنے گیا تو اسد کے چہرے سے بشاشت ٹپک رہی تھی۔ آج وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ ”کیا خاص بات ہے، بہت زبردست لگ رہے ہو آج۔“ میں نے جاتے ہی سوال داغا۔ اس نے خوش گوار لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”خالد بھائی کی شادی ہو رہی ہے اور رات کی فلائٹ سے ابو جان بھی آرہے ہیں.....“

”ہوں! اس لیے شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔“ میں نے مکا لگاتے ہوئے کہا۔

آج پندرہ دنوں کے بعد اسد کو ایک ہلکا سا دورہ پڑا جس کا دورانیہ کچھ سیکنڈ کا تھا۔ ڈاکٹر ساحب نے اس کے لواحقین کو تنبیہ کی ہوئی تھی کہ اس کو خوش رکھنے کی کوشش کریں۔ کوئی بھی ایسا کام نہ کریں جو اس کے اعصاب پر گراں گزرے اور ایسی ویسی بات کرنے سے بھی گریزاں رہیں، مگر میری کھوٹی طبیعت مجھے ٹکنے نہ دے رہی تھی۔ یوں لگتا جیسے وہ کسی حادثے سے دوچار ہو چکا ہے۔ کوئی خاص راز ہے جسے وہ لوگ سینے میں دبائے ہوئے ہیں، مگر اس سربستہ راز کو اگلوانے کے لیے موزوں وقت اور احتیاط ملحوظ خاطر تھا۔

ہمارا اسٹاف اسد کے بھائی خالد کی شادی پر مدعو تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ پیسا بولتا ہے۔ واقعی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا، صرف گھر ہی نہیں بلکہ سارا محلہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ رنگ برنگے قمقمے، آتش بازی، بینڈ باجے، ڈھول، بھنگڑا، لڈی شہری اور دیہاتی ثقافت کا زبردست امتزاج تھا۔

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے چکر کاٹتا جا رہا تھا۔ سورج قانون قدرت کے تحت طلوع و غروب کی منازل طے کر رہا تھا۔ اسد کو تیسرا ماہ ختم ہونے کو تھا زیر علاج ہوئے۔ وہ انتہائی کھلنڈرا اور شوخ واقع ہوا تھا۔ گفتگو میں بڑی حلاوت تھی۔ میرے ساتھ بہت بے تکلف ہو چکا تھا اور میں بھی اس سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ ہم عمر ہونے کے سبب ہم اکثر گپ شپ کرتے رہتے اور فارغ اوقات میں گھنٹوں بیٹھے رہتے، پھر ایک دن ڈاکٹر صاحب نے اعلان صادر فرمایا کہ ”اسد اب گھر جا سکتا ہے، اور یہ کہ اسے تین ماہ تک مزید ادویات استعمال کرنی ہیں۔ وہ اس بات کا قطعی خیال رکھے کہ ادویات لینے میں ناغہ نہ ہونے پائے۔“

ڈسپنسری سے فارغ ہوئے پانچویں دن اسد شام کو میرے پاس آیا۔ ”اب کے بعد کی کیا مصروفیات ہیں جناب کی۔“ وہ گویا ہوا۔ ”کوئی خاص نہیں، بس دل چاہ رہا ہے کہ دونوں بھائی اکٹھے کھانا کھائیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے، طے رہا کہ آج آپ کی شام میرے نام۔“

”اللہ خیر کرے، بڑے رومانٹک ہو رہے ہو، اس پر وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ رات کھانے کے بعد باہر لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہ مکمل صحت یاب اور پُر اعتماد نظر آرہا تھا۔ مختلف موضوعات زیر بحث آرہے تھے۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ موقع کی مناسبت کو بھانپتے ہوئے میں نے آج پھر اس کو گریدنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ”اور سناؤ اسد ادویات وغیرہ کھا رہے ہو.....گئے دنوں کی یاد اب تو نہیں ستاتی۔“ میں نے ٹیسٹ کرنے کے طور پر اس سے کہا۔ ”گزرتے دن یاد تو خیر آتے رہتے مگر اب ستاتے نہیں ہیں.....ماضی کب بھلا ہے بندے کو۔“ اُس نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ آج میں اپنے سینے میں دفن سربستہ آواز کی گرہ کھول رہا ہوں، شاید وہ میرا ارادہ بھانپ چکا تھا۔

میں نے میٹرک مقامی ہائی اسکول سے امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا تو مزید پڑھائی کا پلان بنانا تھا۔ بڑے بھائی اور ابو چاہتے تھے کہ میں کسی اچھے کالج میں داخلہ لوں۔ روپے پیسے کی ریل پیل تھی، کسی چیز کی کوئی کمی نہ تھی۔ یوں میں کسی بھی اچھے کالج میں اخراجات اٹھانے کا

Doctor
ANTI - LICE SHAMPOO
with conditioner
جوؤں اور اُن کے انڈوں کا
مکمل خاتمہ!
کہ انڈے بھی نہیں ہوں گے تو جوئیں کہاں سے آئیں گی.....؟
Doctor
ANTI - LICE SHAMPOO
with conditioner
Rs. 5

متمل ہوسکتا تھا..... بالآخر کافی سوچ بچار کے بعد عزیز و اقارب اور دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد گارڈن کالج راول پنڈی کا انتخاب ہوگیا۔ میٹرک میں شان دار کامیابی کی بناء پر مجھے مذکورہ کالج میں باآسانی داخلہ مل گیا۔ شروع میں کچھ اپ سیٹ رہا۔ کچھ تو گھر والوں سے دوری اور پھر نئی جگہ، نیا ماحول، مگر جلد ہی میں نے خود کو ایڈجسٹ کرلیا۔ امجد جو میرے قریبی گاؤں کا تھا، اس سے میرا تعارف ہوا۔ وہ مجھ سے ایک کلاس سینئر تھا۔ بہت ہی مخلص اور ہنس مکھ۔ ہم دونوں جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے اور پھر رشتۂ رفاقت میں بندھ گئے۔ اسٹڈی ٹائم کے بعد ہم اکثر اکٹھے رہتے، ہماری رہائش بھی ایک ہی جگہ تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری دوستی بھی مضبوط ہوتی گئی۔

میرے فرسٹ ایئر کے امتحان کچھ لیٹ تھے، امجد امتحان دے کر فارغ ہو چکا تھا۔ چوں کہ امجد نے گاؤں آنا تھا، سو میں بہت اُداس ہوگیا کہ تنہا یہ دن کیسے گزاروں گا۔ امجد نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یار کچھ دنوں کی ہی تو بات ہے۔ امتحانوں کے بعد تمہیں بھی تو گاؤں آنا ہے، تم اپنی تمام تر توجہ پڑھائی پر دو۔“ اس کی باتیں سن کر میرا حوصلہ بڑھ گیا، پھر اگلے ہی دن امجد گاؤں کی طرف عازم سفر ہوا۔ اب میری تمام تر توجہ پڑھائی پر مرکوز تھی۔ نیند کے لیے بھی میں نے صرف دو، ڈھائی گھنٹے مختص کیے ہوئے تھے، بقیہ وقت میں اپنے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ میں اپنی میٹرک میں معیاری کامیابی کو آگے لے کر چلنا چاہتا تھا۔ اور کوشش کررہا تھا کہ انٹر میں بھی میرا یہی معیار برقرار رہے، آج میرا آخری پیپر تھا اور میں خوشی خوشی گھر جانے کی تیاری کررہا تھا۔ جب میں مقامی بس اسٹاپ پر اُترا تو ملگجا سا اندھیرا چھا رہا تھا۔ ”احمد تم یہاں۔“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”ہاں میں! دراصل میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا..... میں نے تمہارے گھر سے پتا کیا تھا کہ تم آج آرہے ہو۔“

پھر وہ میرا بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔ جلدی کرو بائیک پر بیٹھو، گھر چلیں، مگر یار گھر والے پریشان ہوں گے۔ گھر والوں سے میں نے اجازت لے رکھی ہے۔“

”تم اس کا اندیشہ مت کرو۔“ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ امجد کا گاؤں گومیرے گھر سے قریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا، مگر اس کو دیکھنے کا مجھے اس سے قبل اتفاق نہیں ہوا تھا، کیوں کہ ہماری برادری، رشتے داری زیادہ تر اپنے گاؤں تک ہی محدود تھی، بس کچھ ہی گھرانے تھے، جو مختلف شہروں میں مقیم تھے۔

ہم جونہی امجد کے گھر پہنچے، امجد کے ابو، امّی ہمارا انتظار کررہے تھے۔

وہ دونوں مجھ سے بڑے پُرتپاک طریقے سے ملے۔ پُرسش احوال کے بعد امجد کے والد صاحب نے کہا۔ ”بیٹے! کچھ دیر ستانے کے بعد نہا دھو لو، پھر کچھ شپ ہوگی۔“ یہ خاندان کل چار افراد پر مشتمل تھا۔ امجد، اس کی بہن جو اس سے کچھ ہی چھوٹی ہوگی، والد اور والدہ۔ سارا خاندان محبت وخلوص کا پیکر، خالصتاً دیہاتی ماحول میں رہتے ہوئے بھی مہذب اور نہایت وضع دار لوگ تھے۔ امیر ان ٹھاٹھ باٹ نہ رکھتے ہوئے بھی وضع قطع سے کھاتے پیتے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ والد صاحب آرمی سے ریٹائرڈ ہوئے تھے اور اب وہ گاؤں میں ہی ایک چھوٹی سی کریانے کی دکان کرتے تھے، جب کہ نازیہ..... امجد کی چھوٹی بہن میٹرک سے فارغ ہوئی تھی۔ والد صاحب کی پنشن اور دکان کا ماحصل باعزت گزر اوقات کا سبب تھے اور تمام افراد سیر چشم واقع ہوئے تھے۔

رات کا کھانا میں نے امجد اور اس کے ابا جان کی معیت میں کھایا۔ پُرتکلف اور پُرلطف کھانا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ انکل جمیل اسد کے ابو بڑے زندہ دل شخص تھے۔ مختلف موضوعات زیر بحث آتے رہے اور ہم لوگ محظوظ ہوتے رہے، پھر نہ جانے کس پہر آنکھ لگ گئی۔ صبح اگلے دن کافی تاخیر سے جاگے۔ ناشتا کرنے کے بعد میں نے امجد سے درخواست کی کہ وہ مجھے گاؤں تک ڈراپ کردے۔ انکل اور آنٹی نے بہت کہا کہ شام کو چلے جانا، مگر میں مصر تھا کہ ابھی جاؤں گا اور پھر جلد ہی آنے کا وعدہ کرکے چلا آیا۔

پھر کافی دنوں تک امجد سے رابطہ نہ ہوا، کچھ سُستی اور کچھ طبیعت کا لاابالی پن آڑے رہا، پھر ایک دن دل ہی دل میں امجد سے ملاقات کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا کہ اچانک پتا چلا کہ امجد خود ملنے آگیا ہے۔ اس اچانک آمد پر میں بہت خوش ہوا، پھر شام کا کھانا کھانے کے بعد امجد نے گھر کی راہ لی۔ یوں ہمارے تعلقات بڑھتے بڑھتے بڑوں تک جا پہنچے اور پھر ایک روز امجد کے گھر والوں نے باقاعدہ کہلا بھیجا کہ ہم سب گھر والوں نے آج رات کا کھانا امجد لوگوں کے ہاں کھانا ہے، اس طرح ہمارے تعلقات میں وسعت اور پختگی آتی گئی۔ آج میں بہت خوش تھا۔ فرسٹ ایئر کا امتحان میں نے پاس کرلیا تھا۔ جس میری توقع سے بھی زیادہ تھے۔ میں مٹھائی کا ایک ڈبا لے کر امجد کے گھر گیا۔ دروازے پر میں نے دستک دی۔ دروازہ امجد کی بہن نے کھولا۔ میں نے جھجکتے انداز میں پوچھا۔

”امجد وغیرہ کہاں گئے۔“

”جی..... وہ لوگ ساتھ والے گاؤں گئے ہیں، برادری کی مرگ ہوگئی ہے۔“ اس نے بڑے شیریں لہجے میں کہا۔

”آپ باہر کیوں کھڑے ہیں! اندر آئیں، وہ لوگ بس آتے ہی ہوں گے۔“

لڑکیوں کے معاملے میں، میں کچھ ڈھیلا اور شرمیلا ہوں، اس کے کہنے کے باوجود میں باہر کھڑا ان کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ ہی دیر میں امجد والدین کے ہمراہ اپنے گھر واپس پہنچ گیا۔ میں ان کے ساتھ اندر چلا گیا۔ انکل اور آنٹی میری کامیابی پر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھے مبارک باد کے ساتھ ساتھ دُعیروں دعائیں بھی دیں۔ جس صوفے پر میں بیٹھا تھا اس کے بالمقابل کرسی نازیہ براجمان تھی۔ جب میں نے اس کو نظر بھر کے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔

وہ تو مجھے حسن کا مکمل شاہ کار لگی۔ شانوں پر بکھرے دراز گیسو، سرخ وسپید چہرہ، جیسے کالی بدلیوں کے جھرمٹ میں ماہتاب چھپا ہو..... میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی حسین دوشیزہ کو اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ گفتگو کے دوران میں اُس کو کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ لیکن ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی لگا رہا کہ کہیں کوئی میری چوری نہ پکڑ لے، پھر میں نے اس پر آخری نظر ڈالتے ہوئے واپسی کی اجازت چاہی۔ اس رات میں بہت بے قرار رہا، مجھے کسی کل آرام نہیں آرہا تھا۔ رہ رہ کر اس کی یاد آرہی تھی، جب بھی آنکھیں موندتا، وہ ہی پری جلوہ گر ہوتی۔ خدا خدا کرکے سحر ہوئی۔ رت جگے کی وجہ سے آنکھوں میں سُرخی اور دُکھن آگئی تھی۔ سر درد کا بہانہ لگا کر میں نے گھر والوں کو مطمئن کیا۔ رات کے جیسا دن بھی بڑا پھیکا گزرا، ہم وقت اُسی کا سراپا نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا۔ اسی اضطراری کیفیت میں دن گزرتے رہے۔ کالج کھل گئے تھے، لیکن پڑھائی سے دل رفتہ رفتہ اُچاٹ ہورہا تھا، پھر ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں امجد کے گاؤں پہنچ گیا۔ امجد ابھی تک گھر ہی پر تھا، وہ اس غیر متوقع ملاقات پر حیرت وخوشی کے ملے جلے تاثرات دے رہا تھا۔ جاتے ہوئے میں نے اپنی کیفیات وجذبات تحریری صورت میں نازیہ تک پہنچانے کا بندوبست کرلیا تھا..... بس اب موقع کی تلاش تھی کہ نامۂ احوال دل اس تک پہنچاؤں۔ میری دعائیں رنگ لائیں، امجد کسی کام کی غرض سے کمرے سے باہر چلا گیا، عین اسی وقت نازیہ کسی کام سے اندر آئی۔ میں نے ہمت کرکے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے رقعہ اس کو تھمادیا۔

”کیا ہے یہ؟“

”یہ..... آ..... آپ کے لیے ہے۔“ زبان انجانے خوف سے میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

دینے کو رقعہ میں نے دے دیا تھا، مگر دماغ ودل میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ عجیب وسوسے جنم لے رہے تھے۔

”اگر وہ بُرا مان گئی..... ابو یا بھائی کو بتلا دیا..... تو..... کیا وہ مجھے زندہ چھوڑ دیں گے؟“ ان کی نظروں میں میری عزت کیا رہ جائے گی.....“ بے رنگ اندیشے تھے۔ اس حالت کو گھومیں ایک گھنٹہ گزر گیا کہ وہ حسن پری نمودار ہوئی، جس کا رُخ کمرے کی طرف تھا۔ اب میں اپنے تمام حواس جمع کیے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے بھائی کو بلا کر گوئی سرگوشی کی، پھر امجد بھی باہر نکل گیا، چند ساعتوں کے بعد دونوں بھائی بہن کچھ کتابیں بغل میں دبائے میرے قریب آکر بیٹھ گئے۔ ”یار اسد! نازیہ کا پروگرام ہے

پرائیویٹ ایف اے کرنے کا۔ مضامین منتخب کرنے ہیں۔'' مختلف سبجیکٹ پر بات چیت ہوتی رہی۔ اسی اثناء میں نازیہ نے بہ کمال ہوشیاری ایک نرالا مزا کا غذ مجھے تھمادیا اور باہر کی جانب لپکی، میں نے دوبارہ آنے کا عدہ کرتے ہوئے رخصت لی۔ نازیہ کی تحریر آج کل کی لڑکیوں کی طرح روایتی یا جذباتی نہیں تھی اور نہ ہی عامیانہ انداز جیسی تھی۔ خط کا متن زیادہ تر نصیحت آمیز باتوں پر محیط تھا۔ اس میں مجھے زیادہ پڑھائی اور اچھے مستقبل کے لیے کوشاں رہنے پر زیادہ زور دیا تھا۔ اس دن سے میں نہ صرف اس کی پاکیزہ سوچوں اور نیک جذبات کا قائل ہوگیا، بلکہ میں نے صدق دل سے تہیہ کرلیا کہ اپنی پڑھائی کے معاملے میں بہتری کے لیے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھوں گا۔ وقت گزرتا رہا اور میں اپنے ارادوں کی تکمیل میں بتکار ہا، پھر اللہ نے مجھے میری شبانہ روزمحنت کا پھل عنایت کردیا۔ ایف ایس سی میں 80 فیصد کے لگ بھگ میری ایورج آگئی۔ مجھے کسی بھی اچھے انجینئرنگ کالج میں داخلہ مل سکتا تھا۔ ایک دن میں گھر میں بیٹھا انجانی سی سوچوں میں غرق تھا کہ اچانک بھائی کی ساعت کانوں سے ٹکرائی۔

''ایسویں صدی کے مفکر کیوں..... کیا ہوا.....؟ کیا سوچا جارہا ہے۔''

''کچھ نہیں بھائی جان، بس ویسے ہی مزید پڑھائی سے متعلق سوچ رہا تھا۔'' حالاں کہ میری تمام تر سوچوں کا محور نازیہ ہی ہوتی تھی۔ بھائی جان کا موڈ بہت اچھا لگ رہا، میں نے غنیمت جانتے ہوئے بھائی جان سے بات کرنے کی ٹھانی۔

''اسد تم جانتے ہو؟ کیا کہہ رہے ہو..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ خاندان سے باہر ہمارا رشتہ ہونا ہوگا۔''

''مگر بھائی جان کیا وہ لوگ مسلمان نہیں.....؟ پاکستانی نہیں؟'' میں نے جذباتی ہوکر کہا۔ ''میرے نزدیک ذات پات، برادری خاندان کی کچھ اہمیت نہیں..... ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ وہ مسلمان گھرانہ ہے۔ پڑھے لکھے اور شریف خاندان سے تعلق ہے۔''

بھائی جان نے مجھے مزید اپنے قریب کرکے کہا۔

''میں تمہاری سوچ اور موقف سے متفق ہوں..... مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ والد صاحب کسی طور نہیں مانیں گے۔'' میں نے ان کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''بہت اچھی طرح جانتا ہوں..... اسی لیے تو آپ سے بات کی ہے۔'' بھائی جان نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا.....

''ٹھیک ہے، مناسب موقع پر میں اسی جان سے بات کروں گا۔ اور تمہاری بھابھی سے بھی کہوں گا کہ وہ بھی امی سے بات کرے اور انہیں قائل بھی کرے۔''

بھائی جان کی باتیں سن کر مجھے کچھ امید بندھی۔

تیسرے دن امی جان نے مجھے طلبگی میں بلایا اور بغیر تمہید کے اپنا فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنے خاندان کی رسم و روایات کو جانتے ہوئے بھی تم آس لگائے بیٹھے ہو..... کیا تم اپنے ابو کے مزاج کو نہیں سمجھتے؟'' امی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''خواہ کچھ بھی ہوجائے..... وہ خاندان سے باہر تمہاری شادی نہیں کریں گے۔''

ماں کی تاسف بھری باتیں سن کر میرا ذہن بالکل ماؤف ہوکر رہ گیا۔ دل اُچاٹ سا ہوگیا۔ زندگی بے معنی اور بے مقصد لگنے لگی۔ دن خیالوں کے تانے بانے میں بیت جاتا، لیکن رات نازیہ کے خوابوں میں..... اسی اُدھیڑ بن میں ایک ماہ گزر گیا۔ اب میرا مزید پڑھائی کے لیے کسی کوئی پلان نہیں بن رہا تھا.....

طبیعت روز بروز مائل بہ خیال محبوب ہوتی گئی، پھر نہ جانے میرے دل میں یہ خیال کیوں کر سما گیا کہ اگر نازیہ ساتھ دے تو میں اس کو حاصل کرسکتا ہوں۔ کیوں کہ اب صرف کورٹ میرج کا آپشن موجود ہے۔ کیا ہم اتنا حق بھی نہیں رکھتے کہ مستقبل اپنی مرضی سے گزاریں۔ اب میرا ذہن باغیانہ سوچوں کی گرفت میں آچکا تھا۔ منفی خیالات میرے مثبت خیالات پر غالب آرہے تھے۔

میں نے دل ہی دل میں طے کرلیا کہ نازیہ سے کورٹ میرج کا کہوں، پھر میں نے اپنا حال دل ماں کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے متعلق اپنے فیصلے کے بارے میں نازیہ سے رابطہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ سہ پہر کے قریب میں امجد کے گاؤں پہنچا، اتفاق سے وہ گھر پر ہی تھا۔ میں نے اپنی ہی کوشش کی کہ میری دلی کیفیت عیاں نہ ہونے پائے، پھر انسان کا چہرہ اس کے اندر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انسانی چہرہ اور اس کی آنکھیں باطنی حالت کی غماز ہوتی ہیں۔

''کچھ اپ سیٹ سے لگ رہے ہو۔'' ملنے کے بعد پہلا سوال امجد کا یہی تھا۔ ''نہیں..... نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' میں نے مصنوعی طمانیت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ میری نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ مجھے نازیہ کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

''ٹھنڈا گرم؟'' امجد نے سوال کیا۔ ''کچھ نہیں.....'' میں نے بے دھیانی میں جواب دیا، پھر وہ خود ہی یہ کہہ کر اُٹھ کر چلا گیا کہ ''میں چائے لے کر آتا ہوں۔''

امجد کے باہر نکلتے ہی نازیہ دائیں جانب والے دروازے سے نمودار ہوئی۔ سلام کے بعد خیریت پوچھی، جواباً میں نے ہوں ہاں کرتے ہوئے رقعہ اس کی طرف اُچھال دیا۔ رقعہ اٹھاتے ہی وہ اُلٹے پیروں واپس چلی گئی۔

پھر میرے اور امجد کے درمیان پڑھائی کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہی۔ امجد نے میرے آئندہ کے لائحہ عمل سے متعلق بھی استفسار کیا، مگر میں اس کو کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکا۔

عصر کی اذان ہورہی تھی، مگر اب تک نازیہ کی طرف سے مجھے کوئی جواب نہیں ملا تھا، جس کے لیے میں بے تابی سے منتظر تھا۔ امجد کسی کام سے دوبارہ باہر چلا گیا، میں پھر اپنی سوچوں میں غرق ہوگیا، معاً دستک کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور وہ نازیہ تھی۔ دروازے ہی سے ایک کاغذ پھینک کر میری نظروں سے معدوم ہوگئی۔ اب میں شناسائی میں تھا کہ کب امجد سے اجازت چاہوں اور خیالات یار سے بہرہ مند ہوں۔ میں نے جلد ہی امجد سے رخصت چاہی۔ نازیہ کی تحریر پڑھ کر عجیب سی حالت ہوگئی۔ وہی روایتی شرقیت، حیاداری، خاندانی وقار، والدین کی عزت، آڑے آگئی۔ اس نے واضح اور دوٹوک لفظوں میں بتادیا تھا کہ وہ کورٹ میرج کرنے کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔ حالات کے سازگار ہونے اور انتظار پر زور دیا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ جیسے تیسے بھی ہو، میں اپنی امی کو راضی کروں اور ان کے گھر رشتے کے لیے بھیجوں، تاکہ نازیہ کے گھر والوں تک یہ بات پہنچ سکے۔

میں بہ خوبی جانتا تھا کہ آسانی سے یہ بیل منڈھے چڑھنا دُشوار ہے، پھر بھی اپنے تئیں کوشش میں بتا رہا، مبادا گھر والوں کے دل پہنچ جائیں، مگر یہ سعی لاحاصل کے سوا کچھ ثابت نہ ہوا۔ ایک رات میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ امی جان وارد ہوئیں اور بغیر دیا کہ والد صاحب نے حکم دیا ہے کہ جس قدر جلدی ہوسکے کسی اچھے سے کالج میں ٹھرڈ ایئر میں داخلہ لے لو اور یہ کہ شادی وادی کا خیال اپنے دل سے نکال پھینکوں اور شیطانی خیالات کو جھٹک دوں۔ قرین قیاس یہی تھا کہ امی جان نے ابو کو تمام حالات و واقعات سے آگاہ کردیا تھا۔ جب ہی اس طرح کا حکم نامہ آیا تھا۔

میں نے اب بجائے راول پنڈی میں رہنے کے گوجر آباد کا انتخاب کیا اور سرسید ڈگری کالج میں داخلہ لے لیا۔ اب میں ذہنی طور پر بہت پرُاگندہ ہوگیا تھا۔ پڑھائی کے لیے جب بھی بیٹھتا، نازیہ کا سراپا سامنے آجاتا۔ بہت کوشش کرتا کہ اس کے خیالوں کے حصار سے باہر نکلوں، مگر اس کی یادیں کسی آسیب کی طرح چمٹی ہوئی تھیں۔ سارا سارا دن بھوک پیاس کا احساس تک نہ ہوتا۔ نیند کو تو جیسے آنکھوں سے چرسی ہوگئی تھی، رت جگوں نے آنکھوں میں ڈیرے ڈال دیے تھے۔ خوابوں کی تعبیر کی جگہ مایوسیوں اور افسردگیوں نے لے لی تھی۔ ان ہی دنوں گھر سے اطلاع آئی کہ والد صاحب آئندہ اتوار پاکستان آرہے ہیں۔

میں دیگر گھر والوں کے ہمراہ والد صاحب کو لینے ایئر پورٹ پہنچا۔ وہ فرداً فرداً سب سے ملے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بار بار مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی پنی تنکی نظریں میرے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ رات کو کھانے کے بعد والد صاحب نے مجھے ایک طرف بلایا۔ امی جان بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

''تمہاری پڑھائی کیسی جارہی ہے۔''

انہوں نے پہلا سوال داغا۔ میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''جی ٹھیک ہے۔'' انہوں نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خاک ٹھیک ہوگی..... تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تم کوئی توجہ نہیں دے رہے

ہو اپنی پڑھائی پر۔" ابا جان نے میری ظاہری و باطنی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا، پھر تحکمانہ انداز میں فرمایا۔ "مجنوں کے جالفگیں بننے کی کوشش مت کرو۔ وقت آنے پر تمہاری شادی بھی ہو جائے گی۔" پھر وہ والدہ سے مخاطب ہوئے۔

بولے: "اس کو سمجھا دو، شادی بیاہ کے فیصلے پر بڑوں کی مرضی چلتی ہے۔"

اب یقین واثق ہو چلا تھا کہ میری کوئی تدبیر یا دلیل ان کے لیے بے معنی ہے۔ اس گومگو کی حالت میں دن بڑے پھیکے گزر رہے تھے، نہ دل جمعی سے پڑھائی ہو رہی تھی، نہ ہی یکسوئی سے نیند آتی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، امتحان کے دن قریب آ رہے تھے۔

پھر تھرڈ ڈویژن کا امتحان آیا اور گزر گیا، میں اس میں بری طرح فیل ہو گیا تھا۔

بس پھر کیا تھا، ڈانٹ ڈپٹ..... بات بات پر کوسنے، طعنے، بھنچوں، خبطی، بدبخت جیسے القاب سے نوازا جانے لگا..... اُدھر ابا جان کے دھمکی آمیز خطوط..... گھر سے نکال دینے کی دھمکی۔ کھانے اور کپڑوں سے محروم رکھنے کی دھمکی۔ میں نے اپنی پسند کا اظہار کیا، گویا کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا ہو۔

صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ گھر کے تمام افراد کھچے کھچے سے رہنے لگے، حتیٰ کہ امی جان کے رویے سے بھی لاتعلقی سی جھلکنے لگی۔ کالج کبھی چھوٹ چکا تھا۔ میں گھنٹوں اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا رہتا۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا نہ غمگسار۔ جب تنہائی کے آسیب نے زیادہ تنگ کیا تو اسموکنگ (سگریٹ نوشی) شروع کر دی، کچھ دنوں تک تو گھر والوں سے چوری چھپے پیتا رہا، پھر کھلے عام پینا شروع کر دی۔ اس بات پر بھی نے کبھی منع کیا نہ بُرا منایا، خصوصاً اس وقت بہت دُکھ ہوتا جب امی جان بھی میرے اس حال سے بے نیاز رہتیں۔ لاکھ بُرا سہی مگر تھا تو اُن کا لختِ جگر۔ کبھی اُبھار تو دیا اس احساس بھی ہونے لگتا جیسے میں سوتیلا ہوں، میرا اس گھر میں سگا کوئی نہیں۔

جب گھر والوں نے اس درجہ تک بے نیازی برتی شروع کر دی اور یکسر نظر انداز کر دیا تو میں نے ڈرنک کرنا بھی شروع کر دیا۔ ایک روز امی جان میرے کمرے کے قریب سے گزر رہی تھیں، میں فرطِ جذبات سے اُن کے قدموں سے لپٹ گیا اور زار و قطار رونا شروع کر دیا اور روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی۔ اب ماں کی ممتا بھی تڑپ اٹھی، انہوں نے مجھے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ میرے چہرے اور پیشانی پر بے اختیار بوسے دینے لگیں، شدتِ جذبات سے میرے اشک بہنے لگے، امی جان بھی زار و قطار رونے لگیں۔ جی تو یہ کہہ رہا تھا کہ بس یونہی ماں کی آغوش میں منہ چھپا کر ساری زندگی بتا دوں۔ جب کافی دیر کے بعد رو رو کر دلوں کا غبار چھٹ گیا تو امی جان گویا ہوئیں۔

"کچھ بھی ہو جائے..... میں اپنے بیٹے کی خوشی ضرور پوری کروں گی..... اس کے لیے چاہے مجھے کسی بھی حد تک جانا پڑے۔"

امی جان کی باتیں سن کر جیسے مردہ جسم میں زندگی سرایت کر گئی۔ آخر کار ماں کی تڑپ اور جس نے اپنا کام دکھا دیا۔ اب میں نے دوبارہ سے خود کو سنبھالا دینے کی کوشش شروع کر دی اور اپنے اطوار زندگی اور معمولات یکسر تبدیل کر دیے، اب میں نے پھر سے کالج جانا شروع کر دیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ کسی بھی بُری لت سے خود کو بچاؤں گا۔

آج اتوار کا دن تھا، میں صبح سے ہی بہت خوش تھا۔ امی جان..... بھائی جان کے ہمراہ نازیہ کے گھر بات پکی کرنے جا رہے تھے۔ میں بے حد خوش تھا۔ میرے خوابوں کی تعبیر کا ابتدائی مرحلہ طے ہونے والا تھا۔ میرے خاموش جذبوں کو زبان مل رہی تھی۔ حکایت حقیقت پارینہ تھی۔ سے گزرتے ہوئے نہ جانے کیا کیا سوچ چلا اور عشاء کا وقت ہو گیا، مگر ابھی تک امی اور بھائی جان واپس نہیں آئے تھے۔ انجانے سے اندیشے دل میں جنم لے رہے تھے۔ "کہیں نازیہ کے گھر والوں نے انکار تو نہیں کر دیا۔ شاید اس کی بات کہیں اور چل رہی ہو۔" جوں جوں تاخیر ہو رہی تھی، دل بیٹھا جا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے انتظار ختم ہوا۔ امی جان نے گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے گلے لگایا اور مبارک باد دی کہ نازیہ کے گھر والے رضامند ہیں اور دو سال کے بعد رخصتی ہونا طے پایا ہے۔ اب چند عرصہ قبل تک زندگی جو پھیکی پھیکی سی لگتی تھی، اچھی حسین لگنے لگی تھی..... بے قرار تمنائیں بامراد ہونے کو تھیں۔

اب میں نے پھر سے دل جمعی سے پڑھائی شروع کر دی۔ گو میرا پہلا سال ناسازگار حالات کی بنا پر ضائع ہوا تھا، مگر مجھے اس کا بڑا قلق تھا کہ ایک زندگی کا قیمتی سال بیکار گزر گیا۔

صبح میرا تھرڈ ڈویژن کا پہلا پیپر تھا۔ میں اپنی پڑھائی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھنا چاہتا تھا، شام کو نازیہ کا خط ملا۔ سلام دعا کے بعد وہی پند و نصائح پڑھائی اور صرف پڑھائی، دیگر تمام غیر نصابی سرگرمیاں معطل کر دینے پر زور دیا گیا تھا۔ میں نے نازیہ کی جو کسی بڑی پی ٹیسی پوزیشن تھیں مان کر فل پیراہو کر اپنے اور اس کے مستقبل کو سنوارنا تھا۔ میرے تھرڈ ڈویژن کے پیپرز بفضلِ خدا بہت اچھے ہو گئے۔ امتحان ختم ہونے کے بعد میں کچھ دنوں کے لیے گاؤں آ گیا۔

گاؤں آ کر پتا چلا کہ آنٹی (نازیہ کی امی) سخت بیمار ہیں۔ وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ بخار تھا کہ جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کھانا پینا متروک ہو چکا تھا۔ نازیہ اور امجد بھی بہت مغموم تھے۔ میں نے آنٹی کو راولپنڈی شفٹ کرنے کی درخواست کی۔ وہاں ایک بڑے ایک ڈاکٹر ہے، پھر اگلے روز ہم آنٹی کو ہولی فیملی اسپتال راولپنڈی لے آئے۔ میرے ایک کلاس فیلو کی وساطت سے آسانی سے بیڈ مل گیا اور دیگر معاملات میں بھی بہت پذیرائی ہوئی۔ آنٹی کو ٹائی فائیڈ جو کہ فرض ہو کر تکلیف دہ پیچیدگیاں پیدا کرنے کا سبب تھا، تشخیص ہوا۔ مکمل تشخیص اور مناسب علاج معالجے کی بدولت وہ ہفتہ بھر میں خاصی بہتر ہو گئیں اور ایک ہفتہ میں وہ مکمل ٹھیک ہو گئی۔ ہم ان کو گاؤں لے آئے، نازیہ اور اس کے گھر والے مجھ سے خاصے دبے دبے نظر آ رہے تھے۔

"اسد آپ نے ہم پر بہت احسانات کیے ہیں۔ آپ نہ ہوتے تو شاید آج امی جان ہم سے دور....."

"پگلی ایسے نہیں کہتے....." میں نے نازیہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تو میرا فرض تھا۔ وہ تمہاری ہی ماں نہیں ہیں بلکہ میرا بھی ان سے کوئی رشتہ بنتا ہے۔ میری خوشیاں اب اس گھر سے جُڑی ہوئی ہیں۔ تمہارے لیے تو میں کچھ بھی کر....."

اسی لمحے انکل کمرے میں داخل ہوئے اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ وہ بھی میرے احسان مند نظر آ رہے تھے۔ نازیہ نے الیف۔ اے مکمل کر لیا تھا اور گھر میں بیٹھ گئی۔ میں نے مزید پڑھنے کا مشورہ دیا تو جواباً کہا کہ "وہ اب والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہے....."

"بڑی سعادت مند بچی ہو..... ابھی سے جنت میں بکنگ کروا رہی ہو۔"

میری اس بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

وقت گزرتا گیا، مزید ایک سال گزر گیا۔ میری بی ایس سی بھی ہو گئی۔ والد صاحب بھی سعودی عرب سے ہمیشہ کے لیے آ گئے۔ وہ چاہ رہے تھے کہ قریبی شہر میں اپنا کوئی کاروبار کر لیں، مگر اس سے قبل میری شادی کرنا چاہتے تھے۔

نازیہ کے گھر والے شادی اسی انتظار میں تھے۔ امی اور ابا جان پروگرام کو حتمی شکل دینے کے لیے ان لوگوں کے ہاں گئے۔ رات یہ لوگ بہت دیر سے گھر لوٹے اور میں سویا ہوا تھا۔ صبح بیدار ہوا تو ماحول کچھ بدلا بدلا سا پایا۔ میں نے محسوس کیا کہ امی جان اور ابا جان ایک دوسرے سے نظریں چُرا رہے ہیں۔ گفتگو سے بھی واضح

اینٹی سیپٹک کی ایجاد

1860ء میں انگلستان کے ایک سرجن جوزف سٹر نے دنیائے طب کو واقع عفونت یا اینٹی سیپٹک طرز علاج سے متعارف کروایا۔ اس نے مشاہدہ کیا تھا کہ اس کے نصف مریض جن کی جراحی کامیابی سے ہی جاتی تھی، جراثیم کی وجہ سے مر جاتے تھے۔ اس نے تجویز کیا کہ اگر جراحی سے پہلے ہاتھوں، ڈریسنگ اور آلات کو کاربولک ایسڈ سے دھویا جائے تو پھر کسی جراثیم کے حملہ آور ہونے کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ جراحی میں اس دریافت سے ایک انقلاب برپا ہو گیا۔

تلخی محسوس ہو رہی تھی۔ میری چھٹی حس نے کسی انہونے خطرہ کا احساس دلایا، پھر میں نے ہمت کر کے امی جان سے پوچھ ہی لیا۔

"رات آنے میں بڑی دیر کر دی تھی۔ ان لوگوں نے کیا جواب دیا۔"

امی جان منہ سے تو کچھ نہ بولیں، مگر اشک بھری آنکھوں نے بہت کچھ سمجھا دیا۔

جہیز کہنے کو تو ہم سب اس کو لعنت کہتے ہیں، مگر کچھ والدین اس کو لڑکی والوں کی طرف سے نعمت سمجھتے ہیں۔ اگر ان کو حسب منشا مل جائے تو..... جانے یہ لالچی لوگ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کے منہ مانگے جہیز حاصل کرنے کی ضد کسی کی زندگی چھین سکتی ہے۔ کتنے ہی خاندان تباہ ہو سکتے ہیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون..... قانون خداوندی پر حاوی کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ دل، جس کو ہم خدا کا گھر گردانتے ہیں۔ ان مکروہ رسموں سے زنگ آلود کیوں ہو گئے؟

حوا کی بیٹی کی اس قدر تضحیک کب تک ہوتی رہے گی..... کیا ایک مہذب معاشرے میں اس کو روا سمجھا جائے۔ نادار کی بیٹی جہیز کی سکت نہ رکھنے پر پیادیس کی راہ تکتے تکتے منزل گور تک پہنچ جائے۔

امی جان نے ابا جان کو بہت سمجھایا۔ بیٹے کی خوشی ہی ہمارے لیے سب کچھ ہے، مگر ابا جان اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔

ان کی ڈیمانڈ ہر حال میں پوری ہو گی، وگرنہ ہماری طرف سے جواب سمجھے گا۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ تمام اشیاء مہیا کرنا ناممکن ہے، نازیہ کے گھر والوں نے دو ماہ کی مہلت مانگ لی۔

انکل پچھلے سال ایک ایکسیڈنٹ میں اپنی ایک ٹانگ گنوا بیٹھے..... وہ اب دکان کو بھی خیر باد کہہ چکے تھے۔ امجد بی۔ اے کر کے گھر بیٹھا ہوا تھا۔ قریبی شہر میں ایک فرم میں کلرک کی عارضی جگہ تھی۔ وہ بھی چھوٹ گئی تھی۔

لے دے کر اب صرف پنشن پر گزر اوقات ہو رہی تھی۔

انکل نے بیٹی کے سہاگ اور خاندانی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا جو لب سڑک تھا، فروخت کرنے کا پروگرام بنایا، مگر جس دن سودا ہونا تھا، ان کے قریبی رشتے دار بیچ میں آ ٹپکے اور اپنا قانونی حق جتاتے ہوئے عدالت سے حکم امتناعی (Stay Order) لے آئے۔ یوں یہ ترکیب بھی عمل میں نہ لائی جا سکی، نتیجتاً سارے افراد یاسیت کا شکار رہ گئے۔ امجد جو کہ بہت ہنس مکھ اور زندہ دل تھا، اب بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ انکل اور آنٹی نے اتنا اثر لیا تھا کہ وہ برسوں کے مریض لگنے لگے تھے اور نازیہ..... اس نے تو جیسے چپ سادھ لی تھی۔ اگر کوئی بات کرتا تو بول لیتی، ورنہ چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ اب میں نے والد صاحب سے خود بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

حسب توقع جب میں نے ابا جان سے بات کی تو جواب وہی ڈھاک کے تین پات کے مصداق مایوس ہوا۔ اب دل کی بات ہونٹوں پر لائے بنا چارہ نہ تھا۔

"ٹھیک ہے، اگر آپ اپنے فیصلے میں لچک نہیں رکھتے تو..... میں بھی یہ گھر چھوڑ رہا ہوں..... نہیں چاہیے مجھے آپ کی دولت، یہ گھر، یہ آسائشیں۔"

پھر میں نے گھر چھوڑ دیا۔ امجد لوگوں کو جب پتا چلا، تو انہوں نے مجھے سمجھایا کہ "میں نازونعم میں پروان چڑھا ہوا، مجھ سے نہ گزارہ کر سکوں گا۔ میرا مستقبل نہ بن پائے گا وغیرہ وغیرہ۔" مگر میں نے کہا۔

"میں آپ کے ہاں ہی رہوں گا۔ یہاں رہ کر روکھی سوکھی کھا لوں گا۔ فاقوں مر جاؤں گا، مگر خدارا واپس گھر جانے پر مجھے مجبور نہ کریں۔" یوں میں ان کے گھر کا فرد شمار ہونے لگا۔ ڈھنگ کی ملازمت نہ ملنے پر میں نے امجد اور نازیہ سے مینگ کی کہ کیوں نہ ہم ٹیوشن سینٹر کھول لیں۔ یوں ہم نے گاؤں کے نزدیک واقع ایک چھوٹے سے بازار میں ایک کمرہ کرائے پر لیا اور اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دلوں کی بات جانتا ہے، ہمارے کام میں برکت ڈالنے لگی اور دو ماہ کے مختصر سے وقت میں ہمارے طلباء کی تعداد بیس سے اوپر ہو گئی۔

واقعی وہ ہی رب ہے، کارساز ہے، انہی دنوں مجھے معلوم ہوا کہ ابا جان دوبارہ سعودیہ چلے گئے ہیں۔ ایک شام ہم شاگردوں کو پڑھانے میں مشغول تھے کہ امی جان بھائی کے ہمراہ ٹیوشن سینٹر آ گئیں۔ مجھے سینے سے لگا کر ڈھیر پیار کیا، پھر نازیہ اور امجد کی احوال پرسی کی۔

"ہم نہیں لینے آئے ہیں۔" امی جان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو انکار مت کرنا۔"

"مگر امی جان! میں کیسے چلا سکتا ہوں ٹیوشن سینٹر..... یہ بچے..... ان کا کیا بنے گا۔" میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کون کہہ رہا ہے تمہیں ٹیوشن سینٹر ختم کرنے کا، بائیک پر آ جایا کرو اور شام کو ٹیوشن سے فارغ ہو کر گھر آ جانا، ہر روز۔" بھائی جان نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں سوچوں گا، ابھی وعدہ نہیں کرتا۔ ایک آدھ دن تک میں آپ کو فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔"

جب انکل اور آنٹی کو اس بات کا پتا چلا تو وہ بہت خوش ہوئے اور زور دیتے ہوئے میرے روزانہ گھر جانے پر بخوشی راضی ہو گئے۔

اب میں کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ نازیہ کھنچی کھنچی اور کھچی کھچی سی لگ رہی تھی۔ ایک دن موقع پا کر میں نے استفسار کیا، تو اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔ "اگر تم میرے گھر جانے پر خوش نہیں ہو تو نہیں جاؤں گا۔" میں نے اپنے طور پر گرہ لگاتے ہوئے کہا۔

وہ بولی..... "نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں، تمہاری خوشی میں ہی تو میری خوشی ہے۔" نازیہ کے اس جواب سے میرا دل مطمئن نہ ہوا۔

میں آج کچھ جلدی آ گیا تھا۔ دو طالب علم چوپڑی میڈیکل کے طالب علم تھے، ان پر خصوصی توجہ دینا تھی اور ان کے لیے اضافی وقت نکالنا تھا۔ آج معمول سے بھی زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ تمام شاگرد آ چکے تھے، مگر نازیہ اور امجد نہیں پہنچے تھے۔ میں نے جیسے تیسے کر کے وہ وقت گزارا اور طلبا کو جلدی چھٹی دے دی، پھر بوجھل قدموں سے امجد کے گھر کی طرف چل دیا۔ نازیہ چارپائی پر بیٹھی کھانس رہی تھی۔ جب میں نے کچھ قریب جا کر دیکھا تو ہاتھ میں خون کی آمیزش محسوس ہوئی۔ میں نے دوبارہ اس کو کھنگھنے کو کہا تو تھوک میں جما ہوا خون کافی مقدار میں موجود تھا۔ آنٹی میرے نزدیک آئیں اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

"بیٹا! اس کو بچا لو خدا کے لیے اس کو بچا لو۔" وہ ڈبڈبائی نگاہوں سے میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔

"آنٹی..... آنٹی۔" فرط جذبات سے میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ میں کیا کروں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ عجیب عالم بے چارگی تھا۔ میں نے آنٹی کو حوصلہ دیا اور امجد کے ساتھ نازیہ کو قریبی اسپتال لے آئے۔ بنیادی تشخیص کے مطابق ٹیبر کلوسس (ٹی بی) تشخیص ہوئی۔ دیگر ٹیسٹ رپورٹس دو دن بعد ملنی تھیں۔ ضروری ادویات لے کر ہم واپس گھر آ گئے۔ میں نے آنٹی اور انکل کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ نازیہ ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائے گی، پھر میں نے آنٹی اور انکل سے علیحدگی میں کہا۔

"میں ابھی اور اسی وقت نکاح کرنا چاہتا ہوں۔"

میری بات سن کر انہوں نے کہا۔ "مگر بیٹا وہ اس وقت سخت بیمار ہے، اس کی طبیعت کچھ تو سنبھل جائے۔" میں نے ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں، میں اس طرح نازیہ کو کہیں لے جانے میں تذبذب میں مبتلا رہتا ہوں۔ لوگ بھی تو زبان اور آنکھیں رکھتے ہیں، کوئی کسی کی مجبور کو نہیں دیکھتا۔"

میری بات سن کر انہوں نے کہا۔ "ٹھیک ہے! تم خود نازیہ سے بات کر کے دیکھ لو، ہماری طرف سے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

ان کی طرف سے ہاں ہو جانے کے بعد میں نے نازیہ سے بات کی اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو..... جواباً وہ زار قطار رونے لگی۔

"نازیہ ہوش میں آؤ، یوں رونا، پریشان ہونا تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے اسے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "مگر وہ تھی کہ روئے جا رہی تھی۔ میں نے اس موقع پر مزید بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کی تشفی کے لیے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

نازیہ کی دیگر رپورٹس نہایت غیر تسلی بخش تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں دیکھ کر کہا جس قدر ممکن ہو، اس کو جلد از جلد ٹی بی سینی ٹوریم میں داخل کروا دیں۔ اگلے ہی دن ہم ٹی بی سینی ٹوریم پہنچ گئے۔

آج تیسرا دن ہمیں مری آئے ہوئے تھا۔ میں نے

نازیہ کو بتائے بغیر امجد سے کہا! ''مجھے ایک ضروری کام ہے۔ اس لیے میں گاؤں جارہا ہوں، کل شام تک ان شاءاللہ واپس پہنچ جاؤں گا۔''

میں سیدھا اپنے گاؤں گیا، امی جان اور بھائی کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور کچھ روپے دینے کی استدعا کی۔

''کیا کرو گے فی الی کی مریضہ ہے، جان چھڑاؤ اس سے۔''

ماں کے کچھ کہنے سے قبل بھائی جان بول اُٹھے۔ میں اب بھی ماں کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ تمہارا بھائی، کیوں اپنی جان کے دشمن بنتے ہو۔'' ماں نے بھی بھائی کی تائید کردی۔ اب مزید کچھ کہنا سننا بے سود تھا۔ میں شکستہ دل بھاری قدموں سے اٹھا اور امجد کے گاؤں کی راہ لی۔ راستے میں ہی میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے ایک جاننے والے کی وساطت سے اگلے دن اپنی موٹر سائیکل فروخت کردی اور رقم لے کر شام سے کچھ پہلے میں فی الی سینی ٹوریم واپس آ گیا۔

''نازیہ کیسی ہو۔ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔'' میں نے پیار بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''بہتر محسوس کررہی ہوں۔'' اس نے بڑے سنجیدہ، مگر گہرے لہجے میں جواب دیا۔ مجھے بھی وہ بہتر لگ رہی تھی۔ ''گاؤں گئے تھے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''خیریت تھی؟''

''ہاں بالکل خیریت ہے، میں ٹیوشن سینٹر گیا تھا..... اسٹوڈنٹس کو بتانا تھا کہ کچھ دن تک انہیں رخصت پر رہنا ہے۔'' میں نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔

''ہونہہ! وہ میرے اس جواب سے مطمئن نہ ہوئی، مگر خاموش رہی۔''

نازیہ روز بروز بہتر کی طرف جارہی تھی۔ چہرے پر کچھ رونق سی آ گئی تھی اور امجد اس کی بہتری کے لیے اپنی سی کوشش کرتے۔ اس کو خوش رکھنے کے لیے لطیفے اور کہانیاں قصے سنا سنا کر اس کو محظوظ کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔

آج نواں دن تھا اسے یہاں داخل ہوئے، انکل اور آنٹی بھی آئے ہوئے تھے، دونوں نازیہ کے لیے بہت فکر مند تھے۔ اس کی موجودہ حالت سے قدرے مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ میں ان کے لیے چائے پانی کا انتظام کرنے کے لیے باہر چلا گیا اور جب کچھ دیر بعد واپس آیا تو نازیہ پھر رو رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ میں نے اس کے رونے کی وجہ دریافت کی مگر اس نے ٹال دیا۔ کچھ دیر بعد جب انکل اور آنٹی جانے لگے تو میں بھی اُن کے ساتھ ہی باہر آ گیا۔ میں نے آنٹی سے نازیہ کے رونے سے متعلق سوال کیا۔ انہیں کسی حوالے سے معلوم ہوچکا تھا کہ میں نے بانیک فریوشت کردی ہے اور یہ بات انہوں نے نازیہ کو بھی بتادی تھی۔

''آنٹی یہ آپ نے بہت غلط کیا ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ نازیہ کتنی حساس ہے، اس طرح کی باتوں سے اس کی حالت بگڑ سکتی ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں اُن سے کہا، پھر وہ واپس جب میں نازیہ کے پاس پہنچا تو وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بہت تیز بخار تھا اُسے، اسی اثناء میں کھانسی کا ایک شدید دورہ پڑا، جیسے سانس سینے میں اٹک گئی ہے۔ وہ پسینے میں شرابور تھی، ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہ رہی ہے، مگر آواز اس کے حلق سے نہیں نکل رہی۔ میں دوڑتا ہوا ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب نے آکسیجن سلنڈر جو ساتھ ہی پڑا ہوا تھا، جلدی سے کھینچا اور اسے آکسیجن لگادی۔ کچھ ہی دیر میں نازیہ کی سانس نارمل ہونے لگی اور آدھ گھنٹہ میں بہت بہتر ہوگئی۔

آدھا گھنٹے بعد ڈاکٹر صاحب نے آکسیجن ماسک اُتار دیا اور مجھے چند ضروری ہدایات دے کر چلے گئے۔

مجھے پتا تھا کہ نازیہ مجھ سے موٹر سائیکل کے متعلق ضرور پوچھے گی۔ میں امجد کو نازیہ کے پاس بٹھا کر خود کمرے سے باہر نکل گیا، پھر کافی دیر کے بعد جب میں واپس آیا تو وہ سو چکی تھی۔

اگلے دن وہ صبح ہی بیدار ہوگئی۔ میں نماز پڑھ کر جونہی اس کے پاس پہنچا تو یوں گویا ہوئی۔

''آپ کی موٹر سائیکل کہاں ہے، میں جان بچی ہوں، آپ نے اسے بیچ دیا ہے میرے لیے، میرے علاج معالجے کے لیے۔'' میں نے نازیہ سے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''نازیہ! خدا کے لیے مت ایسا سوچو، سمجھنے کی کوشش کرو، میرے لیے اس وقت سب سے قیمتی شے تم ہو۔ مجھے اس وقت صرف تمہاری زندگی عزیز ہے۔''

یہ سننے کے بعد نازیہ نے لرزتے ہاتھوں سے ایک رقعہ تھماتے ہوئے بولی۔ ''اس کو پڑھ لینا مگر کچھ دنوں کے بعد، ابھی نہیں..... ٹھیک ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ نازیہ کی باتیں سُن کر نہ جانے میں کیوں اپ سیٹ ہوگیا۔ میرے دل و دماغ میں اندھیارے سے بھر گئے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دے گئی۔ میں کچھ دیر بیٹھ کر سستانا چاہتا تھا، میں اپنے دماغ کا جھٹکا کرنا چاہتا تھا۔ میں ابھی کچھ سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ معاً اس کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس نے ایک بڑی خون کی قے کی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے نازیہ کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

''نازیہ..... نازیہ آنکھیں کھولو۔ پلیز پلیز مت جاؤ مجھے چھوڑ کر مت..... '' پھر جیسے آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ جب ہوش میں آیا تو خود کو اسپتال میں پایا۔ بھائی جان اور امی جان ساتھ والی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ہوش میں آتے ہی میں نے بھائی جان سے نازیہ کے متعلق پوچھا، مگر کچھ کہنے سننے کے بجائے مجھے نیند کا انجکشن دے کر سلا دیا گیا۔ میں جب بھی نازیہ یا اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ پوچھنے کی جسارت کرتا تو مجھے سلیپنگ ڈرگ دے دی جاتی۔ ہفتہ بھر اسپتال میں رہنے کے بعد مجھے گھر بھیج دیا گیا۔

اگلے روز گھر والوں سے اجازت لے کر میں نازیہ کے گاؤں چلا گیا۔ میں نے جونہی ان کے گھر کے اندر قدم رکھا تو آنٹی دوڑتی ہوئی میری طرف آئیں اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ خوب جی بھر کے رونے کے بعد جب غبار دل کچھ ہلکا ہوا تو پھر ان لوگوں نے میری صحت کے متعلق پوچھا، پھر بڑے دھیمے لہجے میں بولے۔

''ہم بہت شرمندہ ہیں بیٹا کہ تمہاری تیمار داری نہیں کر سکے۔''

میں امجد کو ساتھ لے کر نازیہ کی قبر پر گیا۔ فاتحہ پڑھتے ہوئے آنسو ضبط کا بندھن توڑ کر بہنے لگے، پھر میں نے امجد کی موجودگی میں ہی وہ رقعہ کھولا، جو کچھ یوں تھا۔

☆.....☆

محترم اسد صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

جب تم میری تحریر پڑھو گے میں شاید تمہاری دنیا سے بہت دور جاچکی ہوں گی، مجھے جب سے معلوم ہوا تھا کہ میں ٹی بی جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوں۔ اسی دن سے میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں آپ سے شادی نہیں کروں گی۔ خدارا مجھے غلط مت جانیے گا، کیوں کہ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ اس بیماری میں مبتلا ہوں۔ ہاں مکمل صحت یابی کی اور بات ہے۔ آپ نے مختصر سے وقت میں ہم لوگوں پر اتنے احسانات کیے ہیں کہ آپ کو سجدہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ آپ نے اسپتال میں جس طرح میرا خیال رکھا اور علاج معالجے کے لیے جو کچھ کیا، اس کا بدلہ ہم جیسے تہی داماں لوگ عمر بھر نہیں چکا سکتے..... مجھے معاف کردینا۔ میں آپ کو آہوں کے سوا کچھ نہیں دے رہی اور ہاں عہد وفا میں کہیں اگر دنیا سے چلی گئی تو تم کسی اچھی سی لڑکی سے شادی ضرور کروگے۔

والسلام

تمہاری بدنصیب نازیہ

☆.....☆

نازیہ کی تحریر نے پھر سے ماضی کی سلگتی چنگاری کو شعلہ فشاں بنادیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر نازیہ کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ میں نے امجد سے کہا ''مجھے جلدی سے میرے گھر پہنچادے۔''

آج دو سال سے زائد عرصہ گزر گیا ہے۔ انکل نازیہ کے والد ہارٹ اٹیک سے نازیہ کی رخصتی کے چند ماہ بعد ہی چل بسے، آنٹی نیم پاگل سی ہیں۔ کبھی کبھار اس سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ نازیہ کی یادیں اور میری بیماری اکٹھے چل رہے ہیں۔ میں کئی دفعہ سوچتا ہوں کہ شاید میرے گھر..... یہ دنیا..... اس کی رسمیں، یہ سارے عوامل نازیہ کی موت کا سبب بنے ہیں، پھر اسد مجھ سے کہنے لگا۔

''آپ خصوصی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری نازیہ کو جنت الفردوس میں جگہ اور مجھے ہمت دے، تاکہ میں اس کی وصیت پر عمل کرسکوں (آمین)

☆.....☆

فرشتہ یا شیطان

ایس امتیاز احمد

مذہب کی آڑ میں اپنی ہی دنیا میں جینے والوں کی دُکھ بھری کہانی شہر کراچی سے.....

وہ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات سے

مولوی سمیع الدین کے وعظ میں جانے ایسی کون سی کشش تھی کہ بڑے سے بڑا گناہ گار بھی اگر دو چار بار ان کا وعظ سن لے تو ساری عمر گناہ کی طرح رُخ نہ کرے۔ محلے کے مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب مولوی صاحب کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور آخر لوگ ان کی عزت کیوں نہ کرتے؟ وہ لوگوں کے دین کو سنوارتے، ان میں اخلاقی قدروں کو اجاگر کرتے تھے۔ مولوی صاحب محلے کی واحد مسجد کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ تین وقت کا اچھے سے اچھا کھانا ان کو محلے کے لوگوں سے پابندی سے ملتا رہتا۔ مولوی سمیع الدین محلے والوں کو اپنے لیے خدا کے بعد دوسرا بڑا سہارا سمجھتے تھے۔ کوئی مذہبی مسئلہ ہو یا دنیاوی معاملہ، مولوی صاحب کرن کی طرح چمکتے اور آن واحد میں مایوسی کے اندھیرے چھٹ جاتے۔ مولوی سمیع الدین کا جہاں سارے محلے والے احترام کرتے، وہاں ایک بے ادب بھی تھا۔ مولوی صاحب کو کھانا دینا تو دور کی بات وہ انہیں گھاس بھی نہ ڈالتا اور وہ بے ادبی اس کی سرشت کا حصہ تھی۔

سلیم مولوی صاحب کا پڑوسی تھا۔ سرے پیر تک شیطان، اگر مولوی صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ نہ پڑھا ہوتا تو وہ یقیناً سلیم کو انسان کے بجائے سچ مچ کا شیطان سمجھتے، جو شاید ان کے امتحان کے لیے اترا تھا۔ مولوی صاحب کو جتنی خدا سے محبت تھی، اتنی ہی سلیم سے نفرت تھی۔ ان کا یہ معمول تھا کہ وہ دروازے پر جاتے مکینوں کی خیریت دریافت کرتے، ان کے مسائل دل چسپی سے سنتے اور جہاں تک ممکن ہوتا ان کی مدد کرتے۔ پیر کے روز بھی وہ حسب معمول ظہر کی نماز پڑھ کر محلے میں داخل ہوئے تو ان کی نظر گھریلو سامان سے بھری سوزوکی پر پڑی۔ وہ لپک جھپک کر محلے میں داخل ہوئے۔ سوزوکی پر رکھا ہوا سامان مالکان کی زبوں حالی کو پکار پکار کر عریاں کر رہا تھا۔ مولوی صاحب نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا تو پتا چلا کہ سامان کے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے، بلکہ دو خواتین ہیں۔ جن میں ایک پکی عمر کی عورت تھی اور ایک کم عمر لڑکی، جس کا اچھوتا حسن آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ سمیع صاحب فوراً آگے بڑھے۔

''خاتون! کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟'' دونوں خواتین نے ایک ساتھ مڑ کر فوراً ان کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں! بڑی مہربانی، آپ ذرا یہ الماری محلے کے لڑکوں سے پکڑوا کر اندر رکھوا دیں۔''

''بالکل۔'' مولوی نے فرماں برادرانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اور تیزی سے مڑ گئے۔ چند سیکنڈ بعد جب وہ وارد ہوئے تو ان کے ساتھ دو صحت مند لڑکے تھے۔ دونوں لڑکوں نے خواتین کو سلام کیا۔ سوزوکی والے کی مدد سے الماری اتروائی اور گھر کے اندر لے گئے۔ جس وقت لڑکے الماری اندر لے جا رہے تھے، مولوی صاحب کی نظر سلیم پر پڑی، وہ خدمت کے جذبے میں بھول بیٹھے کہ سلیم ان کا ازلی دشمن ہے۔

''ارے سلیم بیٹا ادھر آنا؟''

سلیم نے مڑ کر ان کو تیز نگاہوں سے دیکھا، لیکن بغیر کچھ کہے آگے آ گیا۔

''بیٹا ذرا گاڑی سے صندوق اتار کر اس گھر میں پہنچا دو۔'' انہوں نے انگلی سے سامنے والے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ دراصل گاڑی آگے نہیں جا سکتی راستہ بند ہے، پھر دیکھو تو صرف دو خواتین ہیں سارے سامان کے ساتھ۔ پتا نہیں کیا آفت آن پڑی کہ کوئی بھی مرد ساتھ نہیں ہے اور پتا نہیں کوئی مرد ہے بھی یا نہیں، پھر بھی بے چاریاں تن تنہا دنیا کے دُکھ اٹھا رہی ہیں آپ ہی آپ بڑبڑا کر مولوی صاحب نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا سلیم اپنی جگہ کھڑا ہے اور اس کی نگاہ سامان کے ساتھ آنے والی لڑکی پر ٹکی ہوئی ہے۔ یہ دیکھ کر مولوی صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لاحول ولاقوۃ، میاں لوگ واقعی سچ کہتے ہیں ''چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔'' ابے میں تجھ سے کہہ رہا ہوں صندوق اندر پہنچا دے اور تو کس شیطانی دھندے سے لگا ہے۔ سلیم نے گردن گھما کر دیکھا اور بازاری مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولا۔

''ارے مولوی صاحب میری نظریں تو خدا کی تعریف کر رہی تھیں۔ خدا کی قسم! کیا حسن اتارا ہے۔ ٹھنڈک پڑ گئی اور ہاں صندوق تو یہ مولوی صاحب ان حسن زادی کے طفیل ابھی گھر میں پہنچا، تم تو جانتے ہو مولوی صاحب، سلیم پھوکٹ میں کسی کا بھی کام نہیں کرتا، پر ایک

نظر نے ساری مزدوری دے دی..... اللہ تمہ۔" سلیم نے بازاری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر ایک آنکھ دبا کر مولوی صاحب کو عامیانہ سا اشارہ کیا اور صندوق اندر پہنچا کر یہ جادو جا۔" لاحول ولا قوۃ" کہتے ہوئے مولوی صاحب تیزی سے خواتین کے پاس گئے اور جلدی سے معذرت کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

"دیکھیے برا نہ مانیے گا، اس کم بخت لچے لفنگے کی باتوں کا، یہ سارا محلہ شریفوں کا ہے، یہاں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ سارا محلہ خاندان کی طرح رہتا ہے۔ آپ جس وقت....." ابھی مولوی صاحب کی بات ادھوری ہی تھی کہ محلے کی کئی خواتین اندر داخل ہوئیں۔ ملیک سلیک کے بعد پڑوس کی چنو کی اماں حسب عادت مردانہ آواز میں مخاطب ہوئی۔

"اے اللہ تیرا شکر ہے، میرا پڑوس تو آباد ہوا، کم سے کم اب رونق تو لگی رہے گی۔ کیا نام ہے، بہن تمہارا؟ کہاں سے آئی ہو، کچھ اپنے بارے میں بتاؤ؟" انہوں نے گہری نظروں سے کم عمر لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پختہ عمر کی خاتون سے سوال کیا۔

عورت بڑے دکھ سے مخاطب ہوئی۔

"جی امیر امام روزی ہے اور یہ میری بیٹی ریٹا ہے۔ میرے شوہر ٹائیگل کا پچھلے برس انتقال ہوگیا۔ جب تک وہ زندہ رہے ہم خوش و خرم تھے۔ دو ستوں رشتے داروں کی کوئی کمی نہ تھی۔ ان کی آنکھیں کیا بند ہوئیں، ایک ایک کر کے سارے سگے ساتھی تنہا کر گئے۔ جج پوچی ختم ہوئی تو مکان جج ڈالا، اگر خرچ تک وہ سرمایہ سہارا دیتا۔ آج کل کرایے کے مکان بھی ایک عذاب ہیں، سلامتی کرے اتنا کمالیتی ہوں کہ ہم ماں بیٹی کی گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

بات ختم کر کے جب انہوں نے تمام لوگوں پر نگاہ ڈالی تو آٹھ دس خواتین میں سے اب وہاں پر صرف دو چار خواتین ہی بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی بے زاری کے آثار نمایاں تھے۔ البتہ مولوی صاحب ہمہ تن گوش تھے، باقی خواتین دل ہی دل میں توبہ کرتے ہوئے صرف اس لیے اپنے گھر چلی گئیں کہ ایک غیر مذہب کی عورت کے ساتھ بیٹھ کر وہ کیوں جہنم خریدیں، جب کہ ان میں سے کچھ عورتوں کا خیال تھا کہ ایسے گھر پر خدا کی مار ہوتی ہے جہاں کوئی مرد نہ ہو، بھلا مرد کے بغیر بھی گھر میں رونق ہوتی ہے۔ جب رات گئے تک میاں بیوی کے جھگڑے کی آواز نہ آئے، دو چار برتن نہ ٹوٹیں اور بیوی کے جسم پر پڑوس کی عورتوں کو نیل نظر نہ آئے تو..... یہ بھی کوئی زندگی کی بس عورتیں ہی عورتیں گھر میں ہیں۔

جب تھوڑی دیر میں محلے کی باقی خواتین بھی اپنے اپنے گھر چلی گئیں تو ریٹا نے ماں کو آواز لگائی۔ "امی گھر کا حشر خانہ تو بالکل بدترین صورت حال پیش کر رہا ہے۔" بیٹی کی آواز پر جب روزی نے جا کر دیکھا تو واقعی جگہ جگہ کائی نے نہ صرف غسل خانے کو بلکہ اس سے متصل باورچی خانے کو بھی سیل زدہ کر دیا تھا۔ کوئی بات نہیں، ہم اپنی مل کر اس گھر کو چمکائیں گے، ماں نے ایک عزم کے ساتھ بیٹی کو مخاطب کیا۔ "ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" ریٹا نے ماں کے خیال سے متفق ہوتے ہوئے کہا۔

دو کمروں کے مکان کی صفائی ٹائم ہی کتنا لیتی ہے، چار گھنٹے میں سارا مکان صاف ہوگیا۔ دونوں نے ایک نظر سارے گھر پر ڈالی کہ کہیں کچھ باقی تو نہیں رہ گیا، مگر کونہ کونہ صاف ہو چکا تھا۔

اب رات کے آٹھ بج رہے تھے، گرمیوں میں یہ وقت کچھ اتنا اندھیرا نہیں لاتا مگر دونوں تھک کر اتنا چور ہو چکی تھیں کہ ان کی ہمت نہیں تھی کہ باہر جا کر کچھ کھانے کا انتظام کریں۔ دونوں نے ایسے ہی رات بسر کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد ریٹا نے ماں کو آواز لگائی۔ "امی مجھے بھوک لگ رہی ہے، اگر کہو تو جا کے بنا لوں؟" اس بات پر ماں نے خاموشی اختیار کر لی، شاید وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ خالی جائے سے کیا گزارہ ہوگا۔ اگر جائے ابھی بنا بھی لی تو صبح کہاں سے جائے بنائیں گے، ڈبے میں صرف ایک وقت کی جائے کی پتی پڑی تھی۔ جس وقت وہ پرانا مکان خالی کر رہی تھی، وہاں آس پاس کی عورتوں پر ان کی سلائی کے پیسے آتے تھے، مگر سب نے مختلف دنوں کا وعدہ کر کے ان کو ٹال دیا تھا، البتہ بے بی کی ماں نے بیگم روزی کے بڑے اصرار پر کہا تھا کہ وہ شام کو بے بی کے ابا سے اس کی سلائی کے پچاس روپے لے کر رکھیں گی اور کل

وہ آ کر لے جائے۔ محلے کی خواتین کے رویے سے ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کسی سے بھی مدد کی توقع رکھنا فضول ہے۔

آنے والی خواتین میں سے ایک خاتون بڑے روکھے انداز میں کہتے ہوئے اٹھی تھی۔ "چلو بھئی! شمشوں کے ابا کہتے ہیں، کافروں سے دوستی سے بہتر مسلمانوں کی دشمنی ہے۔" خدا بہتر کرے ان مولوی صاحب کا، جنہوں نے فورا کہا تھا۔ "اری کم عقل یہ اہل کتاب ہیں اور اہل کتاب کافر نہیں ہوتے" جس پر اس عورت نے ناک سکوڑ کر کہا۔

"معاف کرنا مولوی صاحب ہم نے بزرگوں سے سنا ہے اور خود بھی دیکھا ہے، عیسائی زیادہ تر بھنگی ہوتے ہیں اور اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ بھنگیوں سے دوستی کریں۔" جس پر مولوی صاحب نے ان کو عالمانہ لیکچر دیا۔

دس بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ بھوک کی وجہ سے دونوں کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ آواز سن کر روزی نے بستر پر اٹھنا چاہا۔ "ٹھہرو اماں نے اس کو روکتے ہوئے کہا۔ رات کا وقت ہے بیٹی اور پھر محلہ بھی نیا ہے، میں دیکھتی ہوں۔"

روزی نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک آٹھ نو سال کا لڑکا کھڑا تھا۔ بیگم روزی کو دیکھ کر جلدی سے بولا۔

"یہ کھانا ہے، مولوی صاحب نے بھیجا ہے اور کہا کہ اس کو پڑوسی ہونے کے ناتے اپنا حق سمجھیں۔" دونوں ماں بیٹی جس وقت کھانا کھاتے ہوئے مولوی صاحب کو دعائیں دے رہی تھیں، ادھر مولوی صاحب بھی ان کے خیالوں میں کم تھے۔

"امی مولوی صاحب بڑے نیک آدمی ہیں۔ دیکھیے تو ہمارا کتنا خیال ہے ان کو اور اسی سچ مچ مجھے تو نیند بھی نہیں آتی، کھانے کے بغیر۔" ریٹا نے جلدی جلدی کھانا کھاتے ہوئے مولوی صاحب کے بارے میں اظہار خیال کیا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" ماں نے صرف اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔

کھانا کھانے کے بعد نہ جانے کس وقت باتیں کرتے کرتے دونوں ماں بیٹی سو گئیں۔ ادھر مولوی صاحب کی آج برسوں بعد نیند اڑ گئی تھی۔ مولوی صاحب رات بھر خدا کی تعریف کرتے رہے کہ "اس خدا نے ریٹا کو کس قدر خوب صورت بنایا تھا۔" خیالات بہکنے لگے تو انہوں نے جلدی سے "لاحول" پڑھی اور پھر خود ہی بڑبڑائے۔ "کسی بندے کی کیا مجال کہ وہ خوب صورت بن جائے اور کسی دوسرے بندے کی کیا مجال کہ وہ اس کی رضا کے بغیر اس کی خوب صورتی کی تعریف کرے اور پھر ریٹا کی تعریف تو خدا کی تعریف ہے، کسی عورت کی تعریف ہرگز نہیں۔ وہ تو اس مصور کی تعریف تھی جس نے زمین پر بلا کی خوب صورتی بکھیر دی تھیں۔"

اس طرح وہ پیدا ہوتی ہوئی بھرمانہ سوچ کو جائز ٹھہرانے کی دل ہی دل میں اپنی سی کوشش کرتے رہے۔ گو کہ مولوی صاحب نے وہ چار بار ہی کن انکھیوں سے ریٹا کو دیکھا تھا، لیکن بلا کا حسن ان کی نگاہوں میں چھا گیا تھا۔

کشادہ پیشانی کے نیچے گہری سبز آنکھیں، ذرا نیچے خوب صورت ناک، ذرا اور نیچے خوب صورت ہونٹ ذرا اور نیچے خوب صورت گردن اور ذرا..... اور..... نیچے..... یہاں سے آگے مولوی صاحب سے سوچا نہ گیا اور ان کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح فجر کی نماز کے بعد وہ دعا میں ریٹا..... صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔ انہوں نے اپنے ناداں دل کو ڈانٹا اور چور نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی ان کے خیالات سے واقف تو نہیں ہو گیا، مگر کمرے میں چاروں طرف اندھیرا تھا، صرف ان کا دل ریٹا کے حسن سے روشن تھا۔

دوسری طرف سلیم بھی جاگ رہا تھا۔ ریٹا بار بار اس کے خیالوں میں گھم گھم کرتی جاتی اور وہ جھرجھرا کر اٹھ کر بیٹھ جاتا اور خدا سے دعا کرتا۔

"اے خدا تو جانتا ہے، میرا دل پاک ہے۔ سلیم دنیا میں بڑے سے بڑے بدمعاش اور بڑے سے بڑے شریف سے نہیں ڈرا۔ سلیم اگر ڈرا ہے تو صرف کسی کنواری کی عزت سے ڈرا ہے۔ اے پاک ذات اس حسن کی دیوی کو ہمیشہ پاک رکھنا اور اس کی عزت کی

حفاظت کرنا۔"

سلیم نے کبھی کسی لڑکی پر بری نگاہ نہیں ڈالی تھی، اس نے تو ریٹا پر بھی ایک عام نظر ڈالی تھی، مگر اس کا حسن اس کی نگاہوں میں بس گیا تھا۔ دل بار بار کہتا۔

"سلیم یہ تیرے لیے دنیا میں آئی ہے۔ یا اللہ تو جانتا ہے میں بہت بُرا آدمی ہوں۔ اے مالک! مجھے بُرا رہنے دے، اس اچھی لڑکی کی خواہش میرے دل میں مت ڈال۔" دعا مانگتے مانگتے سلیم کی آنکھوں سے زار زار موتیوں کی لڑیاں ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ اور پھر "اللہ بڑا ہے۔ اللہ بڑا ہے" کی آواز کے ساتھ ہی سلیم نے سکون سے آنکھیں بند کرلیں۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد روزی نے بیٹی کو آواز لگائی۔ ریٹا دروازہ اندر سے بند کرلو، میں ذرا سلائی کے پیسے لے آؤں اور خبردار کوئی بھی آئے تو دروازہ مت کھولنا۔ ابھی وہ دروازے سے باہر قدم نکال ہی رہی تھیں کہ ان کو مولوی صاحب نظر آئے جن کا رخ ان کے ہی گھر کی طرف تھا۔ روزی نے دروازے پر رُک کر مولوی صاحب کے قریب پہنچنے کا انتظار کیا۔ سلام دعا کے بعد روزی نے رات کے کھانے کے لیے مولوی کا شکریہ ادا کیا تو مولوی صاحب دل میں بڑے حیران ہوئے اور ان کی نظر جیسے ہی دروازے کے اندر کھڑی ریٹا پر پڑی، وہ حیرانگی کو بھول بھال کر اس کی خیریت دریافت کرنے لگے۔

وقت جتنی تیزی سے آتا ہے اتنی ہی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ روزی کو اس محلے میں آئے ہوئے چھ ماہ ہوگئے اور اس دوران وہی محلے والے جو کترا کر گزر گئے تھے، روزی اور ریٹا کے اس قدر گرویدہ ہوگئے کہ محلے کی کوئی خوشی اور غمی ان کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی اور اس اہمیت کے لیے دونوں ماں بیٹی مولوی صاحب کی شکر گزار تھیں، جن کی کوششوں سے محلے والوں نے نہ صرف یہ کہ ان کو قبول کرلیا تھا، بلکہ ان سے محبت بھی کرنے لگے تھے۔ ایک اعتماد ان کو اس محلے سے مل گیا، مگر اس اعتماد میں شک کا پالی سلیم کی ذات تھی۔ وہ اب سلیم سے خوف زدہ رہتی تھیں۔ ان کو صرف سلیم سے ہی نہ کسی خطرے کا خوف لگا ہی رہتا اور پھر کچھ دنوں سے وہ اپنی بیٹی ریٹا میں بھی بڑی تبدیلی محسوس کررہی تھیں۔

ریٹا اب گھوم پھر کر سلیم کے تذکرے کو اپنی باتوں میں ضرور لاتی اور سلیم بھی جہاں کہیں ریٹا کو دیکھتا پتھر کا بت بن جاتا۔ ابھی کل شام ہی کو جب وہ سامنے گھر سے نکلی تو سلیم اور ریٹا ایک دوسرے کو گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور ریٹا نے جیسے ہی ماں کی آہٹ محسوس کی، تیزی سے اندر چلی گئی اور سلیم نے بھی پیٹھ موڑلی۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات نے روزی کو بیٹی کی طرف سے کافی فکرمند کررکھا تھا۔

چھ ماہ میں روزی پر مولوی صاحب کی قربت نے بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ان کے تبلیغ کے انداز اور رویّے نے روزی کو سنجیدگی سے مسلمان ہونے پر مجبور کردیا۔ مولوی صاحب سے وہ پہلے ہی نئی دین کی کتابیں لے کر پڑھ چکی تھی۔ اسلام ان کو تمام مذاہب سے افضل لگا، جہاں زندگی کا ہر مسئلہ سلجھا ہوا تھا۔ آخر ایک دن حتمی فیصلہ کرکے انہوں نے اپنے گھر ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا اور اسی تقریب میں مولوی صاحب کے ہاتھوں دونوں ماں بیٹی مسلمان ہوگئیں۔ محلے والوں نے اس خوشی پر روزی کو جس کا نام زرینہ اور ریٹا کو جس کا نیا اسلامی نام رابعہ رکھا گیا، باہم پہنائے۔

اس واقعے کے بعد مولوی صاحب لوگوں کی نظر میں کچھ اور بڑی بزرگ ہستی بن گئے۔ تقریب کے اختتام پر مولوی صاحب اب رابعہ (ریٹا) سے مسلمان ہونے کے ناتے اور زیادہ قربت محسوس کررہے تھے۔

جس وقت دروازے پر دستک ہوئی رابعہ قرآن شریف یاد کررہی تھی، ایک ایک حرف اس کے دل میں اُتر رہا تھا۔ شیریں آواز دروازے سے کان لگائے سلیم کے دل میں ایک بے قراری پیدا کررہی تھی۔ سلیم کو چاروں طرف نور ہی نور نظر آرہا تھا۔ وہ گناہ گار زار زار معافی کے لیے آنسو بہا رہا تھا کہ اچانک نگاہ مولوی صاحب پر پڑی، جو رابعہ کی طرف آرہے تھے۔ سلیم ایک طرف کونے میں ہوگیا۔ دستک سن کر رابعہ نے دروازہ کھولا اور خوش ہوکر بولی۔ "مولوی صاحب میں

آواز دی۔ "سلیم اندر آؤ۔" سلیم ایک دم گھبرا گیا۔ اس طویل عرصے میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ رابعہ کی امی نے نہ صرف یہ کہ اس کو آواز دی، بلکہ گھر کے اندر بھی بلالیا۔ ڈرتے ڈرتے وہ اندر داخل ہوا۔ "بیٹھ جاؤ۔" کہہ کر رابعہ کی امی نے اچانک اپنے سر سے دوپٹا اتارا اور اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ "یہ کیا خالہ یہ کیا؟" سلیم نے گھبرا کر اپنے پاؤں سمیٹے۔

"دیکھو بیٹا!" رابعہ کی امی مخاطب ہوئیں۔ "ہمارے گھر کو تو جاتا ہے کوئی مرد نہیں ہے اور پھر بیٹا ہم کسی بڑے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، تو ہماری عزت رکھ لے۔ بیٹا دُکھاب تو ہی ہماری عزت رکھ سکتا ہے۔"

کیا مطلب خالہ میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ سلیم نے پریشان ہوکر کہا۔

"رابعہ ادھر آؤ۔" رابعہ کی امی نے رابعہ کو آواز لگائی۔ رابعہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس کی محبت، اس کا عشق، اس کی چاہت..... مگر سلیم نے جیسے ہی اس کے پورے سراپے پر نگاہ ڈالی تو اس کو اندازہ ہوا کہ وہ کچھ بے ڈول ہورہی ہے۔

"اوہ" سلیم ایک نگاہ میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ مولوی کا گھبرا کر رابعہ کے گھر سے نکلنا، سر سے ٹوپی کا غائب ہونا اور بار بار دستک پر بھی..... وہ تیزی سے اُٹھا۔ "ایک منٹ خالہ میں آیا۔" کہتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اب وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مولوی صاحب کے گھر جارہا تھا۔ وہ مولوی صاحب کے گھر تک بھی نہیں گیا تھا کہ اس کے دل نے سرگوشی کی۔

"کیا رابعہ اس بدنامی کے بعد زندہ رہ سکے گی۔ کیا لوگ اس کی عزت کریں گے۔ ایک بار مولوی صاحب نے اس کی محبت کی عزت کو پامال کیا تو کیا دوسری بار وہ خود اپنی محبت کو رسوا کردے۔" یہ فیصلہ کرکے وہ دوبارہ رابعہ کے پاس آیا۔ خالہ اندر ہی تھیں۔

"خالہ میں کل رابعہ سے نکاح کرلوں گا۔" سلیم نے رابعہ پر نگاہ ڈالی۔ وہ اسے آج بھی سرتاپا نور مجسم نظر آئی اور وہ مطمئن انداز میں رابعہ کے گھر سے چلا آیا۔

☆.....☆

نے سبق یاد کرلیا ہے۔"

"اچھا کیا اماں ہے گھر پر؟" مولوی صاحب نے اس کی بات کو سنی اَن سنی کرتے ہوئے پوچھا۔ "نہیں مولوی صاحب وہ سلائی کے کپڑے دینے گئی ہیں..... آپ اندر آجائیں۔" رابعہ نے دروازے کا پٹ پورا کھولتے ہوئے کہا۔ اس دوران سلیم وہاں سے سیدھا مسجد کی طرف چلا آیا اور زور زور کے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ساری عمر اسی طرح بیٹھا رہے اور روتا رہے، لیکن اس کو بہت سے کام کرنے تھے۔ اس نے سنا تھا کہ سکینہ کی شادی کے لیے اس کے باپ کو کسی سے بھی رقم نہیں مل رہی ہے، لہٰذا اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ "وہ چوری کرے گا اور رقم سکینہ کے گھر ضرور پہنچائے گا۔ اس کی شادی وقت پر ضرور ہوگی۔"

سلیم مسجد سے نکل کر دوبارہ گلی میں داخل ہوا تو اس کی نگاہ مولوی صاحب پر پڑی۔ وہ رابعہ کے گھر سے بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں نکلے۔ سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور ہمیشہ سر پر موجود رہنے والی ٹوپی بھی غائب تھی اور وہ تیز تیز قدم چلتا ہوا گھر کی طرف جارہا تھا۔

سلیم نے انجانے خدشے کے تحت تیزی سے رابعہ کے دروازے پر پہنچ کر تین بار ہولے ہولے سے دستک دی، مگر جواب ندارد۔ مایوس ہوکر وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ دو چار روز بعد ہی سلیم کی مصروفیات دوبارہ عود آئیں۔ جگہ جگہ چوریاں کرنا اور رقم کو سکینہ کے گھر میں پہنچانے میں وہ اتنا مصروف ہوا کہ اس کو پتا ہی نہیں چلا اور تین ماہ گزر گئے۔

رابعہ کی یاد کے ساتھ ساتھ اس کو بار بار مولوی صاحب کا رابعہ کے گھر سے گھبرا کر نکلنا سمجھ میں نہیں آتا تھا، مگر ایک روز یہ بھی سمجھ میں آگئی۔ وہ محلے سے گنگناتا گزر رہا تھا کہ آج صبح اس نے رابعہ کو دیکھا تھا۔ وہ بہت کمزور لگ رہی تھی، مگر وہ اتنی خوب صورت تھی کہ جب بھی رابعہ پر نظر پڑتی تو ایک نور کی ٹھنڈک اس کے دل میں اُتر جاتی۔

ابھی وہ رابعہ کے گھر کے نزدیک ہی پہنچا تھا کہ رابعہ کی امی زرینہ نے دروازہ کھولا اور اس پر نگاہ پڑتے ہی

تیسری سچ بیانی

جھولا

آصفہ ضیاء احمد

حیدرآباد سے محبت کا رنگ لیے ایک انوکھی کتھا

یہ بات نہ ساون سنہا کو یاد تھی اور نہ برکھا کو کہ وہ پہلی بار کب ملے تھے؟ کیوں ملے تھے اور کہاں ملے تھے؟ لیکن جب بھی دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے تو دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کا جذبہ موجود تھا۔ آہستہ آہستہ دونوں کے درمیان شرمگیں پردے ہٹتے چلے گئے۔ اجنبیت کی دیوار ریزہ ریزہ ہوتی گئی۔ قربتیں رنگ لائیں اور پھر ساری دوریاں ختم ہوگئیں۔ دوستی محبت میں بدلی تو عہد و پیماں باندھے گئے اور سنگ جینے مرنے کی قسمیں کھائی گئیں..... دونوں پیار کی برسات میں کچھ اس طرح بھیگے کہ شرابور ہوگئے، لیکن برکھا بھی بھی ساری جان سے کپکپا جاتی، کیوں کہ اُس کے اور ساون کے درمیان جو طبقاتی حد بندی تھی، اُسے عبور کرنا مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن تھا۔

ساون کے باپ کا شمار شہر کے مشہور وکلاء میں ہوتا تھا۔ راجن سنہا کا نام ہی کیس کی کامیابی کے لیے کافی تھا۔ مہنگی اور گراں فیس کی وجہ سے غریب تو اُن کے پاس جانے کی ہمت ہی نہیں کرتا تھا، لیکن امیروں کی بھی وہ ایسی کھال اُدھیڑتے کہ وہ بھی بلبلا اُٹھتے تھے۔ بذاتِ خود پیشتر رئیس تھے۔ سونے پر سہاگہ وکالت بھی خوب چل رہی تھی بلکہ دوڑ رہی تھی، اس لیے معاشرے میں اُن کا اپنا ایک مقام تھا۔ ہر جگہ نہایت عزت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

ساون سنہا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے باپ کی جائیداد کا تنہا وارث تھا۔ وہ خود بھی ایم ڈی کر چکا تھا اور اپنی ذاتی پریکٹس کر رہا تھا اور برکھا کے ساتھ مل کر مستقبل کے سین سپنے دیکھ رہا تھا۔ ہوش تو اُسے اُس وقت آیا جب اُس کے باپ راجن سنہا نے بڑھاکہ خیر خبر اُسے سنائی کہ انہوں نے اُس کا بیاہ اپنے عزیز اور ہم پلہ دوست گردھر پاٹل کی بیٹی شالنی پاٹل سے طے کر دیا ہے۔ ساون نے ممکن کوشش کی کہ راجن سنہا اس ضد سے باز آجائیں..... لیکن..... اس بات پر دونوں باپ بیٹے کے درمیان محاذ قائم ہوگیا۔ راجن سنہا کا کہنا تھا کہ وہ اپنے گھر میں نوکر بھی رکھتے ہیں تو بڑی نسل دیکھ کر رکھتے ہیں۔ اس لیے بہو تلاش کرنے کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے گھر کیسے چلے جائیں، جب کہ ساون نے برکھا اور اُس کے خاندان کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملائے، لیکن راجن سنہا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ سامنے والے کو کس طرح زیر کرنا اور کس طرح بات کا رُخ موڑنا ہے، یہ فن انہیں اچھی طرح آتا تھا۔ یوں کہ وہ اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے بیٹے کے سامنے یہ ترپ کا پتا پھینکا کہ ”تمہاری سور گباشی ماں (نیلا دیوی) نے شالنی کے پیدا ہوتے ہی مسٹر و مسز گردھر پاٹل سے شالنی کو تمہارے لیے مانگ لیا تھا اور اگر تم نے اپنی ماں کی یہ خواہش نہیں پوری کی تو اُن کی آتما ہمیشہ بھٹکتی رہے گی۔“ یہاں پر آکر ساون نے گھٹنے ٹیک دیے اور دل پر پتھر رکھ کر باپ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا۔

راجن سنہا کی دولت اور اسٹیٹس جیت گیا اور ساون و برکھا کا پیار کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ شکستہ دل کے ساتھ جب ساون نے سارا قصہ برکھا کے گوش گزار کیا اور تھرتھراتے ہاتھوں سے اپنی شادی کا کارڈ اُس کی طرف بڑھایا تو برکھا کی خوب صورت آنکھیں آنسوؤں کی برکھا برسانے لگیں اور ویڈنگ کارڈ دیکھتے ہی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی زہریلا ناگ اپنی زبان لپلپاتے ہوئے اُس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ زار زار روتی ہوئی وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ساون دُکھی اور اُداس نظروں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ایک سرد آہ اُس کے ٹوٹے ہوئے دل سے نکلی اور وہ تھکے تھکے مضمحل قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ آج دو محبت کرنے والے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوگئے تھے۔

☆.....☆

شالنی پاٹل جب راجن سنہا کی بہو اور ساون سنہا کی پتنی بن کر سنہا ہاؤس میں داخل ہوئی تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے سارے جہاں کی خوشیاں اور دھنک کے سارے رنگ اُس کے قدموں کو چوم رہے ہیں۔ ساون جیسا دولت مند، اسمارٹ اور ہینڈسم شوہر پا کر وہ جتنا بھی اپنی قسمت پر ناز کرتی کم تھا، لیکن آہستہ آہستہ اُس کی یہ خوشی کافور ہوتی چلی گئی، کیوں کہ چند دنوں میں ہی اُسے اپنی طرح اندازہ ہوگیا کہ ساون کے دل کے سنگھاسن پر کوئی

اور برا جان ہے۔ وہ تو صرف ایک بھی سجائی نمائشی گڑیا ہے جو صرف دنیا دکھاوے کے لیے لائی گئی ہے، لیکن تعلیم یافتہ، بردبار اور معاملہ فہم بیوی کی تھی، اس لیے بجائے کسی قسم کا واویلا کرنے کے صبر و تحمل سے کام لیا۔

ساون کا دل جیتنے کے لیے اُس نے ہر ممکن کوشش کی اور بہت حد تک وہ اس میں کامیاب بھی رہی۔ شوہر اور سسر کا ہر کام وہ اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی۔ سسرالی عزیزوں اور گھر کے ملازمین کے ساتھ بھی اُس کا رویہ انتہائی نرم اور میٹھا تھا۔ اسی لیے جلد ہی وہ سارے گھر کی چہیتی بن گئی۔ سب کی آنکھوں میں اُس کے لیے عزت و احترام تھا، کیوں کہ وہ خود بھی سب سے عزت و محبت سے پیش آتی تھی۔

ساون بھی اپنے کلینک سے آ کر بیوی کو پورا پورا وقت دیتا اور ہر طرح سے اُس کا خیال رکھتا، کیوں کہ اب شالنی اُس کی ایسی ضرورت بن گئی تھی، جس کے بنا اُسے یہ جیون ادھورا ادھورا سا لگتا تھا۔ ایڈووکیٹ راجن سنہا کو بھی ایسا محسوس ہوتا جیسے بہو کے روپ میں انہیں بیٹی مل گئی ہو۔

ساون کی داستانِ محبت کا تھوڑا بہت علم شالنی کو بھی تھا، لیکن وہ سب کچھ ساون کی زبانی سننا چاہتی تھی، اس لیے ایک دن موقع محل دیکھ کر اُس نے ہنستے ہوئے شوہر سے کہا۔

"آپ کی پریمیکا کو دیکھنے کا مجھے بہت ارمان ہے۔ کیا کبھی اُس سے نہیں ملواؤ گے۔" ساون نے گہری اور معنی خیز نظروں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اُس کے دل و دماغ پر تو میرا امیج ایک ہرجائی اور بے وفائی کا ہے۔ وہ مجھ سے ہی ملنا نہیں پسند کرے گی تو بھلا میں تمہیں کس طرح اُس سے ملواؤں گا۔"

شالنی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "یہ بات تو آپ بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ وہ سمجھے گی ہی ہم اُس کے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں، بہرحال آپ اپنی پریم کہانی شروع سے سنائیے۔" ساون نے شرارت سے گلدان میں سجے ہوئے تازہ گلاب اُس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا، تاکہ ساری کہانی سننے کے بعد ہر لڑائی میں مجھے طعنے تشنے دے سکو، کیوں سہ ٹھیک بات۔" شالنی نے جھینپے گلابوں کا پانی اپنے چہرے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے ڈاکٹر صاحب! لگتا ہے اُس لڑکی کو آپ ابھی تک بھول نہیں پائے۔ اُس کا ذکر میری زبان پر آتے ہی مجھ پر گلابوں کی بارش کر دی۔"

ساون بھی خوش گوار موڈ میں تھا، اُس نے شوخ لہجے میں کہا۔ "بات تو تمہاری بالکل سچ ہے۔ میں واقعی آج تک اُسے بھول نہیں پایا" بات مذاق کی تھی لیکن شالنی کے دل میں برچھی بن کر اُتر گئی، پھر بھی اُس نے ساون پر اپنا درد ظاہر نہیں ہونے دیا۔

☆.....☆

سنہا خاندان میں اُس وقت خوشی کی لہر دوڑ گئی، جب شالنی کا بیر بھاری ہوا۔ سب منتظر تھے کہ کوکھ میں بچے کی قلقاریاں گونجے اور در و دیوار کی رونق دوبالا ہو جائے۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور شالنی نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا، لیکن خلیتی کے اس مرحلے میں اُس کی جان پر بن گئی۔ ڈاکٹرز کی لاکھ کوششوں کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکی۔ شالنی کی موت کے بعد سنہا ہاؤس ایک بار پھر اُداسیوں اور ویرانیوں کی آماج گاہ بن گیا۔ سبھی کی جان، جس کا نام بھی سنہا رکھا گیا تھا، اب لوگوں کے رحم و کرم پر تھی، کیوں کہ راجن سنہا اور ساون پر ابھی تک غم ناک اور سوگواری کی کیفیت طاری تھی۔ بچی کے لیے گورس رکھ لی گئی تھی، لیکن پھر بھی وہ بلبلا کر روتی تو دادا اور باپ تڑپ اُٹھتے۔ ساون کو بے ساختہ شالنی یاد آ جاتی اور روتی بلکتی بیٹی کو سینے سے لگا کر کہتا۔ "شالو اتنی بڑی ذمے داری مجھ پر ڈال کر تم کہاں چلی گئیں، تمہیں ذرا بھی میرا خیال نہیں آیا۔"

بچی کے لیے دنیا جہاں کے عیش و آرام میسر تھے، اگر نہیں تھا تو صرف ماں کا پیار اور اُس کی ممتا۔ وقت کا دھارا بہتا رہا اور بچی دادا اور باپ کی چہیتی بنی رہی۔ وہ اسکول جانے کے قابل ہو چکی تھی۔ ساون نے اُس کا داخلہ شہر کے اعلیٰ ترین معیاری اسکول میں کروا دیا تھا۔ ساون اپنی نگرانی میں بچی کو اسکول کے لیے تیار کروا کے روانہ کرتا اور واپسی میں خود اُسے اسکول سے لے کر آتا۔ بچی کی ہر ذمے داری وہ بہ خوبی نباہ رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ گھوڑا بنا ہوا بچی کو پشت پر بٹھا کر سارے کمرے کی سیر کروا رہا تھا اور بچی زور زور سے گا رہی تھی۔

"لکڑی کی کاٹھی، کاٹھی کا گھوڑا، گھوڑے کی دُم پہ جو مارا ہتھوڑا۔"

گھوڑا اور سواری دونوں بھرپور انجوائے کر رہے تھے کہ معاً ملازم نے آ کر کہا۔ "ڈاکٹر بابو آپ کو بڑے صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

بچی نے ملازم کی بات سن کر منہ بسورا اور اپنی توتلی زبان سے کہا۔

"پاپا جب بھی آپ اور میں کھیلتے ہیں، دادا ہمیں ڈسٹرب کر دیتے ہیں۔ کل میں آپ کو نہیں بلکہ دادا کو گھوڑا بناؤں گی۔" اُس کی بات پر ساون بے اختیار ہنس پڑا اور پیار سے اُس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "کل سنڈے ہے نا، ہم اپنی رانی بٹیا کے ساتھ دل بھر کر کھیلیں گے۔" یہ کہہ کر اُس نے ملازم سے کہا۔ "رامو چاچا اسے اپنے کمرے میں لے کر آرام سے سلا دیجیے۔" ڈوگر جب بچی کو اٹھا کر وہاں سے چلا گیا تو ساون تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باپ کے کمرے میں داخل ہوا۔

راجن سنہا بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار نمایاں تھے۔ بیٹے کو دیکھتے ہی انہوں نے منہ میں دبا ہوا سگار نکالا اور کہا۔

"آؤ بہ خوردار آؤ۔ آج تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" ساون باپ کو بغور دیکھتے ہوئے نرم و گداز صوفے میں دھنس گیا۔ راجن سنہا بھی اپنے جہازی سائز پلنگ پر آرام سے پیر پھیلا کر مخملی کشن کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد کنکھار کے انہوں نے اپنا گلا صاف کیا۔

"ساون میرے بچے بغیر جیون ساتھی کے جیون بتانا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ کوئی میرے دل سے پوچھے اور بغیر ماں کے ایک ننھے سے بچے کی پرورش کس قدر صبر آزما کام ہے، میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ میں اپنے تجربات کی روشنی میں تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ تمہیں اگر لائف پارٹنر کی ضرورت ہو تو کبھی کو بھی ماں کی اشد ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں میری نظر میں ایک لڑکی ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ، سوشل اور سمجھدار ہے۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو لڑکی اور اُس کے پریوار کو کل ہم اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔ تمہاری بھی ملاقات ہو جائے گی اور کبھی بھی اپنی ہونے والی ممی کو دیکھ لگی۔"

اُن کی بات سُن کر ساون بھڑک اُٹھا۔ اُس نے ادب و لحاظ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تیز و تند لہجے میں کہا۔ "نہیں ڈیڈی ہرگز نہیں، فی الحال شادی کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔" دونوں باپ بیٹے میں کافی دیر بحث و مباحثہ جاری رہا۔ راجن سنہا اُسے سمجھاتے رہے کہ یہ پہاڑ جیسی زندگی تن تنہا نہیں گزر سکتی اور بچی کی پرورش بھی وہ اکیلا نہیں کر سکتا، لیکن ساون نے باپ کا فیصلہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ بیٹے نے اُن کی بات رَد کر دی تھی۔

بیٹے کے انکار اور اُکھڑے لب و لہجے کی وجہ سے انہیں غصے کے ساتھ ساتھ سخت ملال بھی تھا، لیکن انہوں نے بیٹے کی محبت میں برداشت سے کام لیا اور بیٹے کو کمرے سے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کھڑے ہوئے، پھر اپنی الماری سے نکال کر قیمتی وہسکی وائن کا ایک لارج پیگ تیار کیا اور خلاٹ چڑھا گئے۔ ساون کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ اب بہکیں گے اور وہی تباہی بکنا شروع کر دیں گے، اس لیے وہ اُن کی نظر بچا کر دبے پاؤں وہاں سے کھسک گیا اور اپنے کمرے میں آ کر لمبی تان کر سو گیا۔

☆.....☆

دوسری صبح ساون کے لیے انتہائی قیامت خیز تھی۔ راجن سنہا زیست و موت کی جنگ لڑ رہے تھے۔ بلڈ پریشر حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا اور دل بھی صرف پچیس فیصد کام کر رہا تھا۔ سانس رُک رُک کر آ رہی تھی، چوں کہ ساون خود بھی بہت اچھا ڈاکٹر تھا اور وہ اپنے طور پر باپ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش اور دوڑ بھاگ کر رہا تھا، لیکن راجن سنہا لحظہ بہ لحظہ موت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ساون نے شہر کے ماہر ترین کارڈیولوجسٹ سے رجوع کیا اور انہیں گھر سے اسپتال منتقل کیا گیا۔ وہاں جا کر انہوں نے ہلکی سی آنکھیں کھولیں اور اشارے سے ساون کو اپنے پاس بلایا اور سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

"تم میری فکر نہ کرو، کیوں کہ اُس نے انتقام لے لیا ہے۔ میں اُس کے سامنے بہت گڑگڑایا، رحم کی بھیک مانگی لیکن اُس نے کہا، جان کا بدلہ جان اور..... اور.....

اور..... اُن کی سانس بری طرح اُکھڑنے لگی تھی۔ قریب کھڑے ڈاکٹر نے ساون کو اشارہ کیا کہ وہ فوراً وہاں سے ہٹ جائے، لیکن راجن سنہا نے مضبوطی سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہمت و حوصلہ مجتمع کر کے پھر کہنا شروع کیا۔

"ساون میرے بچے اپنا اور اپنی کی بابت خیال رکھنا، کیوں کہ میرے بعد اب تمہاری اور بچی کی باری ہے۔

ہائے بھگوان وہ میری ساری فسل کو کھا جائے گا۔ یہ..... یہ..... میں نے کیا..... کیا، اُف..... اُف..... ف، اُن کی تکلیف اور اذیت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ساون کے ہاتھ پر اُن کی گرفت کمزور ہوتی چلی گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ بھاگ دوڑ، روپیہ پیسا سب دھرا کا دھرا رہ گیا اور راجن سنہا پرلوک سدھار گئے۔

ساون باپ کے پیر پکڑ کر بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ساتھی ڈاکٹرز نے بڑی مشکل سے اُسے سنبھالا۔ یہ سانحہ اُس کے لیے قیامت سے کم نہیں تھا۔ ابھی چاہنے والی بیوی کا غم کم نہیں ہوا تھا کہ باپ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ سنہا ہاؤس میں ماہا کار پٹی ہوئی تھی، ننھی بٹی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی باپ کو روتا دیکھ کر خود بھی زار قطار رو رہی تھی وہ سمجھ رہی تھی اُسے روتا دیکھ کر دادا فوراً اُٹھ کر اُسے گلے لگالیں گے۔ اُسے پتا ہی نہیں تھا کہ جانے والے کبھی نہیں آتے۔

☆.....☆

گزرتے وقت نے مرہم کا کام کیا۔ ساون اپنے روزمرہ کے معمولات کی طرف لوٹ آیا۔ بٹی بھی اب اسکول جانے لگی تھی۔ گھر کی سوگوار فضا کافی حد تک کم ہوگئی تھی، لیکن ساون کے باپ کے آخری جملے جو انہوں نے موت سے پہلے کہے تھے، وہ انہیں بھلا نہیں پا رہا تھا۔ اُن مبہم اور ادھورے جملوں پر وہ غور کرتا تو اُسے بے اختیار شالنی یاد آ جاتی۔ اُس کی بھی موت اچانک ہوئی تھی، جب کہ نہایت قابل اور ماہر فزن گانا کولوجسٹ نے کہا تھا کہ کیس نارمل اور اطمینان بخش ہے اور پھر اچانک اُس کی حالت بگڑی اور بگڑتی چلی گئی۔ گانا کولوجسٹ کے بھی ہاتھ پیر پھول گئے کہ یہ اچانک کیا ہو گیا، پھر اُسے باپ کا خیال آیا جو ہر طرح سے اپنی صحت کا خیال رکھتے تھے۔ ایکسر سائز بھی کرتے رہتے تھے۔ غذا میں بھی احتیاط برتتے تھے۔ ہاں البتہ بہت زیادہ خوشی کے مواقع پر یا حد سے زیادہ ڈیپریشن میں شراب نوشی کرکے بدپرہیزی کر لیتے تھے۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنی جلدی وہ اُس کا ساتھ چھوڑ جائیں گے، آخر وہ کون شخص تھا جو اُن سے انتقام لے رہا تھا۔ اُن کی نسل کشی کر رہا تھا۔ وہ کیوں اُس سے معافی مانگ رہے تھے۔ کون تھا وہ نادیدہ شخص جس سے اَب اُسے اور بٹی کو بھی خطرہ تھا۔ بہت زیادہ غور و فکر کے بعد بھی یہ گتھی سلجھائے نہیں سلجھ رہی تھی۔ وہ سوچوں کے دریا میں غوطے کھاتا رہا، لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

☆.....☆

ساون کی تمام دل چسپی اور توجہ کا مرکز اب بٹی تھی۔ دادا کی موت کے بعد بٹی کچھ دن تو بجھی بجھی اور غمگین رہی، پھر آہستہ آہستہ بہلنے لگی، لیکن ساون نے بٹی کے رویے میں ایک عجیب و غریب تبدیلی محسوس کی۔ اُس میں نہ پہلی والی چہچہاہٹ تھی اور نہ ہی وہ شوخی و شرارت تھی جو بھی اُس کی طبیعت کا خاصہ تھی، بلکہ وہ اچانک چپ چپ سی اور خاموش رہنے لگی تھی۔ ساون پہلے پہل تو یہ سمجھا کہ دادا کی موت سے اُسے اچانک جو شاک پہنچا ہے یہ اُسی کا ردِعمل ہے۔ اب وہ بٹی کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے لگا تھا اور پھر پورا وقت بھی دینا۔ کبھی اُسے آؤٹنگ پر لے جاتا، کبھی شالنی کے ہاں باپ یعنی بٹی کے نانا نانی کے گھر چھوڑ آتا۔ اُس کی چھوٹی بڑی ہر خواہش کو پوری کرنے کی کوشش کرتا، لیکن اس کے باوجود بھی میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں آئی۔ ایک شام موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ ساون نے بڑے پیار سے بٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آج ہم اپنی گزشتہ یادگار کو بھی ڈرائیو پر لے چلیں گے۔“

بٹی نے فوراً کہا۔ ”تو پاپا نو! میں آج آپ کے ساتھ نہیں چلوں گی، میں ہوم ورک کرکے نورا سوجاؤں گی، ورنہ اگر دیر ہوگئی تو کل اسکول نہیں اٹینڈ کرسکوں گی۔“ جہاں ساون کو اس بات کی خوشی تھی کہ اُس کی بٹی پڑھائی سے دل چُرانے والی طالبہ نہیں ہے، وہیں دل میں ایک کانٹا بھی چبھ گیا کہ اُس نے اتنی محبت سے کی ہوئی آفر پر بے دردی سے ٹھکرا دی، لیکن اُس نے بٹی پر کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا، بلکہ ہوم ورک کرنے میں اُس کی مدد کی اور پھر آرام سے اُسے سلا کر خود بھی لیٹ گیا، لیکن چہرے سے فکر و پریشانی عیاں تھی۔ اُس رات اُسے نیند بھی بڑی مشکل سے آئی۔

ساون جب بھی اُسے کسی تفریح یا کسی گیم کے لیے تیار کرنے کی کوشش کرتا تو وہ اسکول کا بہانہ کرکے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرتی، بلکہ وہ اب دوسرے بچوں سے بھی کترانے لگی تھی۔ اُس کی سائلنس پر ساون نے اُس کے ہم جماعت دوستوں کو بھی مدعو کیا، لیکن اُس نے کسی سے ہنس کر بات کی اور نہ ہی اپنے مہمانوں کو وہیل کم کیا۔ سارے گفٹ پیک بھی یونہی پڑے رہے، اُس نے کھولنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ ساون کے لیے یہ لمحۂ فکریہ تھا۔ وہ کون سی چیز ہے جو بٹی کو زندگی سے، زندہ دلی سے اور اُس سے دور کر رہی ہے۔ گھر میں یکے بعد دیگرے دو اموات نے اُس کے بعد بٹی کا رویہ، یہ عجیب سوچ بچار کے بعد اُس نے اُس کی اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے ٹائم پر وگرام بنایا اور اُن کی اسسٹنٹ سے فون پر بات کرکے دوسرے ہی دن کا وقت لے لیا۔

جیسے ہی اسکول کی بلند و بالا عمارت کے سامنے اُس نے گاڑی روکی۔ اسکول کے دو دی چوپن بیون نے اُس کی رہنمائی کی اور ایچ ایم کے آفس تک اُسے پہنچا دیا۔ سب سے پہلے تو ساون نے ایچ ایم سے معذرت طلب کی وہ بجائے ویزیٹرز ٹائم (ملاقاتوں کے وقت میں) ملاقات کرنے کے اُن سے اُن کا قیمتی وقت ضائع کروا رہا ہے، لیکن ایچ ایم جو کہ ایک کرسچین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لیڈی تھیں اور مسز ڈیسوزا کے نام سے پکاری جاتی تھیں، انہوں نے نہایت خوش دلی سے ایک استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ آہستہ سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں مسٹر ساون سنہا، آپ مجھ سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہ رہے تھے، اس لیے یہی وقت مناسب تھا۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟“

ساون نے نپے تلے انداز اور مناسب الفاظ میں سارا مسئلہ مسز ڈیسوزا کے سامنے رکھ دیا۔ وہ پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ ہر بات سنتی رہیں۔ اُن کی آنکھوں میں بھی تشویش کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ سارا قصہ سننے کے بعد انہوں نے ایک گہری اور سمبیر سانس خارج کی اور پُرخیال نظروں سے ساون کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم اپنی اس میٹنگ میں بٹی کی کلاس ٹیچر کو شریک کرسکتے ہیں، کیوں کہ میرے خیال میں بچے اپنی کلاس ٹیچر سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اُن سے ڈسکس کرنے کے بعد ہمیں اس اُلجھن کا حل مل جائے۔“

ساون نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ مسز ڈیسوزا نے فوٹی بجا کر پیون کو بلایا اور مخملہ لیجیے میں کہا۔ ”مس فلورا کو میری کال دو۔“

”اوکے میڈم“ کہتا ہوا پیون وہاں سے تیزی سے چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بیس ایس سالہ اسمارٹ اور قبول صورت دوشیزہ آفس میں داخل ہوئی۔ مسز ڈیسوزا نے اُن دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا اور پھر نہایت معقول اور مختصر اساون کا پرابلم بھی اُس کے سامنے رکھ دیا۔ فلورا نے ساری بات سننے کے بعد نہایت متانت اور سنجیدگی سے کہا۔

”مسٹر ساون آر آج آپ ہم لوگوں سے ملنے نہیں آتے تو یقین کیجیے میں خود میڈم سے کہہ کر آپ کو بلواتی اور اس مسئلے پر آپ سے گفتگو کرتی۔ آپ کی بیٹی بٹی سنہا ہماری اسکول کی ذہین ترین طالبہ تھی، لیکن یقین کیجیے ایسا لگتا ہے اچانک اُس کی ذہانت کو زنگ لگ گیا ہو، اسکول کی دیگر سرگرمیوں میں بھی وہ پہلے پیش پیش رہتی تھی، لیکن اب تو ہر وقت گم صم، ست اور مضمحل سی رہتی ہے۔ پہلے نہایت خوش مزاجی اور زندہ دلی کے ساتھ ہنستی بولتی اور ملتی جلتی تھی اب تو بالکل آدھ بیزار سی ہے۔ ہاں البتہ میں نے ایک اہم بات اُس میں یہ نوٹ کی ہے کہ ویسے تو وہ پژمردہ اور کھوئی کھوئی رہتی ہے، لیکن اٹرول ہوتے ہی اُس کے جسم میں ایک بجلی سی دوڑ جاتی ہے اور چہرے پر بھی ایک عجیب سی چمک آجاتی ہے۔ ہمارے پلے لینڈ میں کئی طرح کے گیم ہیں، لیکن بٹی ہمیشہ ایک ووڈن میڈ جھولے کو پسند کرتی ہے۔ یہ لکڑی کا جھولا پچھلے دنوں ہی میڈم نے لگوایا ہے۔ پہلے تو بہت سے بچے اُس پر باری باری جھولتے تھے، لیکن اب بٹی اپنے علاوہ اُس جھولے پر کسی کو بیٹھنے ہی نہیں دیتی، بلکہ دوسرے بچوں کو لڑ جھگڑ کر وہاں سے بھگا دیتی ہے۔ بچوں نے مجھ سے شکایت بھی کی اور میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ڈھٹائی سے کہنے لگتی ”وہ جھولا تو صرف میرا ہے“ ویسے میری کوشش جاری ہے اور میں مسلسل اُسے سمجھاتی رہتی ہوں

کہ اُس میں کوئی مثبت تبدیلی آجائے۔"

فلورا کریگ سے بات کرنے کے بعد ایک نیا پہلو سامنے آیا تھا۔ ساون فکرمندانہ انداز میں سوچے جارہا تھا اِس نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "کیا آپ کے یہاں انٹرویل ہوچکا ہے۔" مسز ڈیسوزا نے جواباً کہا۔ "جی نہیں بس تقریباً سات منٹ بعد انٹرویل کی بیل لگ جائے گی۔" ساون نے التجا آمیز لہجے میں ایچ ایم سے گزارش کی۔ "میڈم اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کیا میں انٹرویل تک رک کر پلے لینڈ کا وزٹ کرسکتا ہوں۔" مسز ڈیسوزا نے فوراً جواب دیا۔ "وائے ناٹ مسٹر سنہا، بلکہ آپ کو باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ آفس کی بالکونی میں کھڑے رہ کر پلے لینڈ کا نظارہ کرسکتے ہیں۔" ساون نے تہہ دل سے اُن کا شکریہ ادا کیا اور بیل لگتے ہی وہ بالکونی میں جا کر کھڑا ہوگیا، جنگل جنگل کرتے صاف ستھرے پوشاکیں میں ملبوس وہ ننھے ننھے بچے جو تمام فکر و پریشانیوں سے آزاد دنیا کی پذیرائی اور گناہ سے پاک وہ ننھے فرشتے اُسے بہت اچھے لگے۔ اُنہیں دیکھ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے سارے غم بھول گیا، پھر اچانک اُس کی نظر اپنی بیٹی پنکی پر پڑی جو سارے بچوں سے الگ تھلگ ایک لکڑی کے جھولے پر، جس کی زنجیریں لوہے کی تھیں، زور زور سے پینگیں لے رہی تھی اور بہت زیادہ خوش تھی۔ اتنا خوش ساون نے اُسے پچھلے کئی دنوں سے نہیں دیکھا تھا۔ اچانک ساون کے دل و دماغ میں ایک بجلی سی کوندی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت، کوئی باوراِئی قوت جھولا جھلا رہی ہے، ورنہ اتنی کمسن اور ننھی سی بچی اتنی لمبی پینگیں نہیں لے سکتی۔ اس خیال کے آتے ہی ایک خوف و دہشت کی لہر اُس کے جسم میں سرایت کرگئی۔ وہ ساکت و صامت کھڑا بنی کو جھولتا ہوا دیکھتا رہا، پھر جیسے ہی انٹرویل ختم ہوا اور بچے اپنی اپنی کلاسز میں واپس جانے لگے تو بنی بھی جھولے سے اُتری اور پھر جو کچھ ساون نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ اُس کے لیے ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین تھا۔ اُس نے دیکھا کہ جھولا آٹو میٹک طور پر رُک گیا۔ جھولے پر سے اُتر کر بنی نے بائے کہتے ہوئے اپنے ننھے سے ہاتھ کو حرکت دی اور پھر اپنی کلاس کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ ساون یہ سب دیکھ کر پسینے میں نہا گیا۔ اُس کی دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں، کنپٹیاں دھکنے لگیں، یہ وقت تمام اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور میڈم ڈیسوزا سے اجازت لے کر آفس سے نکل آیا۔ میڈم ڈیسوزا اور مس فلورا کریگ نے اُسے ہر طرح سے اپنے تعاون کا یقین دلایا، لیکن ساون کافی حد تک معاملہ بھانپ گیا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ مسز ڈیسوزا اور فلورا کریگ اُس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ ذہنی طور پر وہ سخت انتشار کا شکار تھا۔ یہ وقت اُس کے کلینک جانے کا تھا، لیکن اُس نے گھر کی جانب گاڑی کا رُخ کردیا۔ وہ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔

☆.....☆

اسکول میٹنگ کے بعد بجائے مسئلہ سلجھنے کے اور اُلجھ گیا تھا اور ساون کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ اُس رات جب وہ کھانے کی میز پر ڈنر کے لیے بیٹھا تو ایک لقمہ بھی اُس کے حلق سے نہ اُتارا۔ اُس نے رامو چاچا کو آواز دے کر کہا۔ "چاچا مجھے بھوک نہیں ہے، کھانا بڑھا دیجیے۔" رامو چاچا نے اُٹھ کر ایک طائرانہ نظر میز پر ڈالی اور کہا۔ "ڈاکٹر بابو کھانا تو جیسی کا تویں ہے، آپ کچھ تو کھالیتے۔" ساون نے آہستہ سے کہا۔ "کھانا چاہتا ہے مجھے بھوک نہیں ہے۔" جہاں دیدہ اور تجربہ کار ملازم کو رسے ساون کو دیکھنے لگا۔ اپنے مالک کے دُکھ اور پریشانیوں سے وہ بھی کافی حد تک واقف تھا۔ جب سے گھر میں دو اموات ہوئی تھیں، اُس نے ساون کو مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی اُس کا اُداس اور غم زدہ چہرہ دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ اُس نے زبردستی اصرار کرکے ساون کو کھانا کھانے کے لیے مجبور کیا۔ ساون نے تھوڑا بہت زہر مار کیا اور جب اُٹھنے لگا تو رامو چاچا نے قریب آکر آہستہ سے کہا۔ "ڈاکٹر بابو بھلے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" ساون نے واش بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں چاچا کہو کیا کہنا ہے۔" رامو چاچا نے گرد و پیش ایک پُرتجسس طائرانہ نظر ڈالی اور کہا۔ "یہاں نہیں ایکانت (تنہائی) میں۔" اس بار ساون چونکا، کیوں کہ رامو چاچا کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ معاملہ کافی سنجیدہ اور اہم ہے۔ اُس نے اپنے کمرے کی

طرف بڑھتے ہوئے اُنہیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر ساون اپنے بستر پر نیم دراز ہوگیا اور رامو چاچا دروازے کے پاس رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ ساون نے تجسس لہجے میں استفسار کیا۔ "اب بتائیے چاچا کیا بات ہے؟ چاچا نے رازدارانہ لہجے میں مدھم آواز میں کہا۔ "ڈاکٹر بابو یقین کیجیے میں کبھی کسی کی ٹوہ میں نہیں رہتا، لیکن جس رات آپ بڑے صاحب کے کمرے سے نکلے، اُس کے فوراً بعد بڑے صاحب نے مجھے آواز دی۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے، ہاں البتہ بے تحاشا ہانپ رہے تھے۔ اُن کی حالت دیکھ کر میں فکرمند ہوگیا کہ اگر وہ اسی رفتار سے ہانپتے رہے تو بالکل ہی مدہوش نہ ہوجائیں، اس لیے میں جیسا جاتا رہا کہ وہ مجھے جب بھی پکاریں میں فوراً اُن کی مدد کے لیے دوڑوں۔ جہاں تک میرا خیال ہے رات کا آخری پہر ہوگا، اچانک میں نے دیکھا ایک ننھی بچی میں داخل ہوا۔ وہ کوٹھی میں دیوانہ وار بلا کسی خوف اور جھجک کے اس طرح داخل ہوا جیسے ساری کوٹھی اُس کی دیکھی بھالی ہے۔ ڈاکٹر بابو یقین کیجیے میں نے بہت چاہا کہ میں اُس سے سوال کروں کہ تم کون ہو؟ کس کی اجازت سے اندر آئے ہو؟ اور گیٹ پر بیٹھا واچ مین کیا کر رہا ہے، لیکن یقین کیجیے ڈاکٹر بابو! مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میری ساری شکتی جکڑ (سلب) کردی ہو۔ میری بولنے کی سختی ختم ہوگئی، میں صرف میں ٹکر ٹکر دیکھے جارہا تھا۔ وہ آدھی بڑے صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ بڑے صاحب کی ایک (لرزہ خیز) چیخ سنائی دی، میں اندر اُن کی مدد کے لیے جانا چاہتا تھا، لیکن پاؤں سو سو من کے ہوچکے تھے۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیے، وہ آدھی بڑے صاحب سے کہہ رہا تھا۔

"تیری بہو کے بعد اب تیری باری ہے، پھر بہت جلد تیری پوتی اور بیٹا میرا شکار بنیں گے۔ اُس آدمی کی آواز اتنی ڈراؤنی اور بھیانک تھی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ بڑے صاحب اُس کے سامنے رو رہے تھے، گڑگڑا رہے تھے اور اُس سے چھما (معافی) مانگ رہے تھے۔ میں نے بڑے صاحب کو کبھی اس طرح (آنسو) بہاتے نہیں دیکھا تھا، لیکن اس وقت اُن کی اکڑ اور گھمنڈ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ وہ اُس آدمی کے چرنوں میں بیٹھ کر اُس سے پرانچھت (تلافی) کی بنتی کررہے تھے، لیکن وہ آدمی بار بار کہہ رہا تھا۔"

"تو نے میرا جیون برباد کیا ہے، میں ہر حال میں بدلہ لے کر رہوں گا۔ تیرا سارا خاندان، ساری کسل کو ملیا میٹ کردوں گا، جب مجھے شانتی ملے گی۔"

ساون پورے انہماک اور توجہ سے رامو چاچا کی باتیں سن رہا تھا۔ اُن کے خاموش ہوتے ہی ساون نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔

"چاچا مجھے بھی لگتا ہے کہیں نہ کہیں بہت بڑی گڑبڑ ضرور ہے۔ کیا اسرار ہے؟ کیا بھید ہے؟ کیوں میرے خاندان پر یہ تباہی آئی ہوئی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

ساون کا ذہنی ہیجان شدت اختیار کرگیا تھا۔ رامو چاچا نے قریب آکر چمچ سے پانی نکال کر ساون کو پیش کیا اور ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر بابو چنتا نہ کریں اوپر والا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالے گا، بس اُسی سے مدد مانگیے۔ اُس نے دیا (رحم) کردیا تو سارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔" اس وقت رامو چاچا نے اُسے جو حوصلہ دیا تھا، اُس سے حقیقتاً ساون کو بہت سکون اور سنتوش (اطمینان) ملا تھا۔ وہ ممنون نظروں سے اُنہیں دیکھنے لگا۔ رامو چاچا اُس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ساون اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ بہت زیادہ بے چین اور فکرمند تھا۔

☆.....☆

دوسری شب وہ بنی کو سلاتے ہوئے آہستہ آہستہ اُس کا سر بھی تھپک رہا تھا اور ہونٹوں کو سکوڑ کر سیٹی بجاتے ہوئے ہلکے ہلکے دُھن گنگنا رہا تھا، تاکہ بنی جلدی سے سو جائے، لیکن بنی کھلی آنکھوں سے جاگ رہی تھی، بالآخر ساون نے کہا۔ "بنی میری جان رات کے دس بج چکے ہیں لیکن تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔" بنی کے چہرے پر ایک عجیب سی پراسراریت چھائی ہوئی تھی۔ باپ کے کان کے پاس منہ لاکر اُس نے سرگوشی کی۔

"آپ کو پتا ہے آج رات اسکول والے انکل مجھے لینے آئیں گے، پھر وہ مجھے خوب جھولا جھلائیں گے، بس انکل ہوں گے اور میں، ہم دونوں خوب انجوائے کریں گے۔"

بنی کی بات سن کر خوف کے مارے اُس کی چیخ نکلتے

نکلتے رہ گئی۔ وہ ساکت و جامد نظروں سے بنّی کو دیکھے جارہا تھا۔ اُس نے بذبانی انداز میں یہ وقت تمام بنّی سے استفسار کیا۔ ”بنّی وہ اسکول والے انکل تم سے کب سے مل رہے ہیں؟ بنّی نے معصومیت سے اپنی آنکھیں جھپکا کر کہا۔ ”جب سے اسکول میں لکڑی کے تختے کا جھولا لگا ہے، بس اُسی جھولے پر میری اور انکل کی ملاقات ہوتی ہے اور پاپا میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔“ اُس نے رازدانہ لہجے میں کہا۔ سامان نے تھوک نگلتے ہوئے اپنا حلق تر کیا اور تشکل کہا۔

”کون سی بات؟“ بنّی نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”انکل صرف مجھے نظر آتے ہیں اور کسی کو نہیں۔“

”کیا..... کیا..... کیا کہہ رہی ہو۔“ سامان نے ہڑ بڑا کر کہا۔ دہشت سے اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور جسم کا خون منجمد ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ بنّی کو سمجھانے میں کامیاب ہوا، لیکن خود جاگتا رہا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ رات اُس کے لیے خوف اور دہشت کی ایک نئی لہر لے کر آئی ہو، جیسے ہی دیوار گیر گھڑیال نے ڈھائی بجنے کا اعلان کیا، بنّی ایک طویل انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھی۔ سامان نے فوراً اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور سونا بن گیا، لیکن چور نظروں سے وہ بنّی کی حرکات وسکنات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ بنّی نے ہاتھ بلا تکرکسی کو وہ بنّی کیا اور پھر وہ باہر جانے کے لیے پر تولنے لگی۔ موزے، شوز پہنے اور اپنے بال سیٹ کرنے لگی۔ اس وقت وہ کوئی ننھی منّی بچی نہیں، بلکہ ایک باشعور اور پختہ عمر دوشیزہ لگ رہی تھی۔ اُس کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا، جیسے ہی وہ کمرے سے باہر نکلی، سامان بھی خاموش قدموں سے چلتا ہوا اُس کے پیچھے ہولیا۔ اُسے جھٹکا اُس وقت لگا جب اُس نے دیکھا کہ کوٹھی کا آہنی گیٹ کھلا پڑا ہے اور چوکیدار اپنی کرسی پر بے ہوش پڑا ہے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ سامان اُسے ہلا تا جگاتا، کیوں کہ بنّی تیز رفتاری سے قدم اُٹھاتی ہوئی اسکول کے راستے پر رواں دواں تھی، وہ بھی سائے کی طرح بنّی کے تعاقب میں تیز تیز قدم اُٹھاتا رہا۔ اُس کی کوٹھی سے بنّی کے اسکول کا فاصلہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہ اور بنّی ہمیشہ سے کار سے آتے جاتے رہے تھے، لیکن اس وقت تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بنّی ہوا کے دوش پر سوار اُڑی چلی جارہی ہو۔ کبھی کبھی تو سامان کو دوڑ لگانی پڑتی کہ بنّی اُس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ تعاقب کے دوران سامان نے ایک عجیب بات یہ محسوس کی کہ یہ شہر کی انتہائی مصروف اور بارونق شاہراہ تھی، جو دن رات بہتی رہتی تھی، لیکن اس وقت اس پر ایسی ویرانی اور سناٹا طاری تھا کہ دور دور تک کوئی گاڑی تو کیا کوئی بائیک یا سائیکل بھی نظر نہیں آرہی تھی، صرف دور چلتی ہوئی بنّی تھی اور ڈری سہمی اُس کی اپنی ذات تھی۔

بنّی جیسے ہی اسکول کے گیٹ پر پہنچی، سامان کو یوں لگا جیسے کسی نے اُس کا استقبال کیا اور بڑھ کر گیٹ کا تالا کھول کر اُسے خوش آمدید کہا۔ اب بنّی کے چہرے پر سحر زدہ سی مسکراہٹ طاری تھی۔ کوٹھی کے چوکیدار کی طرح یہاں بھی گارڈ اپنی نشست پر ہوش وحواس سے بے خبر ساکت و جامد پڑا تھا۔ سامان اُس کو بھی نظر انداز کرتا ہوا بنّی کے پیچھے اسکول میں داخل ہو گیا۔ بنّی کا رُخ اب جھولے کی طرف تھا، جیسے ہی وہ جھولے میں بیٹھی، جھولا آٹو میٹک ہی بنّی پینگیں لینے لگا۔ سامان کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اپنی پوری قوت سے جھولے کو حرکت دے رہا ہو، لیکن اُسے نظر کچھ نہیں آرہا تھا، فضا تاریک اور ہیبت ناک تھی، لیکن بنّی کی ہیجان خیز اور دہشت ناک ہنسی اور قہقہے وہ صاف سن رہا تھا۔ سامان کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی نبض ڈوب رہی ہیں، وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنی محرز دہ بنّی کو دیکھے جارہا تھا، بالآخر اُس سے صبر نہ ہو سکا، اُس نے ہمت و حوصلہ مجتمع کر کے زور سے چلّا کر کہا۔

”کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟ کیوں مجھے اور میرے خاندان کو پریشان کر رہے ہو؟ میرے سامنے آؤ اور میرے سوال کا جواب دو؟ کیا چاہیے تمہیں، ہیرے سامنے آکر مجھ سے دوبدو بات تو کرو، جو بھی تمہارا مقصد ہے میرے سامنے آکر بیان کرو۔“

سامان اس وقت بری طرح حواس باختہ اور اضطرابی کیفیت کا شکار تھا۔ چہرے پر خوف اور آنکھوں میں دہشت سمائی ہوئی تھی، لیکن اُس کی یہ بذبانی پکار رائیگاں نہیں گئی۔ جواب میں جھولا ایک چرچراہٹ کے ساتھ رک گیا اور ایک آدمی کی واضح شبیہ جھولے کے قریب

نمودار ہونا شروع ہو گئی۔ اب وہ ایک مکمل انسان نظر آرہا تھا۔ سامان آنکھیں پھاڑے اُسے تک رہا تھا، وہ بھی سرد مہر اور خونخوار نظروں سے سامان کو تک رہا تھا۔ دونوں کے درمیان بنّی نہ ختم ہونے والی خاموشی طاری تھی۔ اسکول کا پیلے گراؤنڈ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سامان کی قوتِ گویائی اُس آدمی کو دیکھ کر سلب ہو گئی تھی، لیکن اپنی تمام طاقت بروئے کار لا کر مغموم لہجے میں مستفسر ہوا۔

”تم میرے لیے ایک انجان ہستی ہو، میں تمہیں بالکل نہیں جانتا، تم مجھ سے کون سا ناسدھا انتقام لے رہے ہو، مجھے کیوں نہیں بتاتے؟ اس جھولے سے، میری بچی سے اور میرے باپ اور بچی کی اموات سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ سامان کے اُن گنت سوالوں کے جواب میں ہولناک الفاظ مجسم نہ صرف ہنستا رہا بلکہ تادیر اُس کے تعجب فغاں کو چیخ رہے۔ جب اُس کی ہنسی رُکی تو اُس نے بھاری اور جبر آواز میں کہا۔

”مسٹر سامان سنہا آپ مجھے نہیں جانتے، لیکن میں آپ کو اور آپ کے سارے پر یوار کو اچھی طرح جانتا ہوں، میرے اس انتقام کے پیچھے ایک کرب ناک کہانی چھپی ہے، سن سکو گے؟“ سامان نے دھڑکتے دل کے ساتھ فوراً جواب دیا۔ ”بالکل یہ کہانی مجھے اسی وقت اور ابھی سننی ہے۔ کیا راز ہے؟ کیا بھید ہے؟ پلیز مجھے جلدی سے بتاؤ۔“ اُس شخص نے رعشی ہوئی مغموم آواز میں کہنا شروع کیا۔

”مسٹر سامان میں آشش شرما اپنی سندر پتنی اور ننھی منّی بچی کے ساتھ ایک سکھ بھرا جیون گزار رہا تھا۔ کوئن ٹیکسٹائل مل میں کیشیئر کے عہدے پر فائز تھا۔ میری ماہانہ آمدنی میرے چھوٹے سے کنبے کی کفالت کے لیے کافی تھی۔ میرے لیے ہر دن ہولی اور ہر رات دیوالی تھی کہ اچانک ایک بھیانک آندھی چلی اور میرا سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔ اُس آندھی نے سارا شیرازہ ہی بکھیر دیا۔ جل کے اندر بھی میرے نامعلوم دشمنوں نے ایک سازش کے تحت مجھ پر بہت بڑے غبن اور قتل کا الزام لگایا۔ میں چلاتا رہا، چیختا رہا کہ میں نردوش ہوں، بے گناہ ہوں، مگر کسی نے میری نہیں سنی، میرے دشمن میرے مقابلے میں نہ صرف دولت مند تھے، بلکہ بارسوخ بھی تھے۔

میری پتنی نے اپنا سارا گہنا بیچ کر میرے لیے ایک ماہر اور قابل وکیل کی خدمات حاصل کیں، لیکن میرے دشمنوں نے تمہارے باپ کو عدالت میں کھڑا کر دیا۔ تمہارا باپ راجن سنہا ایک گھاگ، عیار اور بے ایمان قانون داں، جو دولت کی خاطر کسی بھی بے گناہ کو پھانسی کے تختے تک بہت آسانی سے پہنچا سکتا تھا اور دولت کی خاطر وہ بڑے سے بڑے مجرم اور دوشی کو پھانسی کے تختے سے واپس بھی لا سکتا تھا۔ میری پتنی کا معتبر کردہ کیا ہوا وکیل نہ صرف ایمان دار تھا، بلکہ با اصول بھی تھا، وہ آخر تک پوری دیانت داری سے میرا کیس لڑتا رہا، لیکن جیت تو تمہارے باپ کی ہی ہوئی تھی، کیوں کہ میرے مخالفین کے پاس دولت کے انبار تھے۔ نتیجہ سب کے سامنے تھا۔ میرے پھانسی پانے کے بعد تمہارا امیر باپ امیر تر ہو گیا۔ میرے دُکھ کیپ میں خوشیوں کی چھلکیاں چھوٹنے لگیں اور میری پتنی دوھوا اور بنّی اناتھ ہو گئیں۔ اُن کے آنسو کسی نے نہیں دیکھے، لیکن مسٹر سامان سب سے بڑا نیائے کرنے والا ان آسمانوں سے سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اُس کی عدالت میں کسی مجرم کے لیے کوئی چھوٹ نہیں ہے، کوئی پاپی وہاں نہیں بچ سکتا اور کسی مظلوم اور بے گناہ پر وہاں کوئی آنچ نہیں آتی۔ مجھے اسی نے اتنی شکتی دی ہے کہ میں اپنا انتقام خود لے سکوں۔ میں نے باری باری اپنے تمام دشمنوں اور اُن کے کنبوں اور خاندانوں کو ٹھکانے لگایا۔ میں نے تمہارے باپ کو بھی بتا دیا تھا کہ اب تمہارے پر یوار کی باری ہے۔ تمہاری پتنی اور باپ کے بعد آج تمہاری اس بنّی کی باری ہے۔ تمہارا بھی نمبر عنقریب آنے والا ہے۔“

سامان ساکت و جامد بت بنا ہوا پورے انہماک سے آشش شرما کی ایک ایک بات سن رہا تھا۔ دل کی رفتار اتنی تیز ہو چکی تھی کہ اُس کی دھمک وہ اپنی کنپٹیوں تک محسوس کر رہا تھا۔ اب بات ناک اُٹھ کے بعد اُس کا سارا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اُس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

”میری بچی کو جھولے پر ہی کیوں مارنا چاہتے ہو؟ آشش شرما نے پھر ایک خوف ناک ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ”سامان سنہا یہی تو وہ پھانسی کا تختہ ہے جس پر میں نے دم

توڑا اور موت کی آخری ہچکی لی۔ میری اُبلی ہوئی آنکھیں اور لٹکی ہوئی زبان ابھی بھی اس تختے پر مجھے نظر آ رہی ہے۔ یہ پھانسی کا تختہ جیل سے نکل کر ایک نیلامی کے بعد ایک نمبر مینوفیکچرنگ کمپنی میں جھولے کے تختے کی شکل اختیار کرنے کے بعد اس اسکول تک پہنچا ہے۔ جب تک جھولے پر دوسرے بچے بیٹھتے رہے، ہنستے مسکراتے جھولتے رہے وہ مجھے بہت اچھے لگے، کیوں کہ میں بچوں سے بہت پیار کرتا تھا، بلکہ اُن بچوں کو دیکھ کر مجھے اپنی بھی منّی گڑیا یاد آ گئی، لیکن ساون سنہا جیسے ہی تمہاری بیٹی اس جھولے پر بیٹھی، مجھے اُس کے خون میں اپنے دشمن راجن سنہا کے خون کی بُو محسوس ہوئی اور بس میں نے سوچ لیا کہ اُس کی ماں اور دادا کا کام تو میں تمام کر چکا ہوں، اُس کے بعد اس بچّی کو میں نے اس جھولے سے اور اپنے آپ سے اتنا تھکا دیا کہ وہ اپنی سُدھ بُدھ ہی کھو بیٹھی۔ ابھی بھی تم دیکھ رہے ہو، یہ وہی کرے گی جو میں کہوں گا اور تمہیں، تمہیں تو پہچانے گی بھی نہیں، کیوں کہ یہ اپنے ہوش وحواس میں ہی نہیں ہے۔"

یہ سنسنی خیز کہانی سننے کے بعد ساون کے جسم میں خوف ودہشت کی ایک لہر سرایت کر گئی۔ اُس نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

"آشش شرما! میرے باپ راجن سنہا نے جو کچھ بھی کیا ہے، اُس کے لیے دل کی گہرائیوں سے میں تم سے معافی مانگتا ہوں، میں ہر پرائشچت کے لیے تیار ہوں۔ میرے ڈیڈی نے جو کچھ ساری عمر کیا وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے علاوہ بھی انہوں نے کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ یقین کرو اُن کی پاپ سے کمائی ہوئی دولت سے میں نے ہمیشہ نفرت کی ہے۔ اُن کے دیہانت کے بعد میں بھی ساری اسٹیٹ کا مالک ہوں اور میں نے یہ نیچت کر لیا ہے کہ اُن کی ساری دولت بھوکے ننگے، دلت اور دکھیارے لوگوں میں بانٹ دوں گا۔ اگر میں بے درپے ان دو صدموں کا شکار نہ ہوتا اور میری بیٹی کے ساتھ یہ عجیب و غریب حالات نہ پیش آتے تو شاید میں بھی کایہ کام کر چکا ہوتا، لیکن چوں کہ تم مجھ سے میرے باپ کا انتقام لے رہے تھے، اس لیے میں ذہنی خلفشار اور ہیجان کا شکار ہو چکا تھا۔ اگر تم مجھے مہلت دو تو میں اپنا وچن ضرور نبھاؤں گا۔ میری تم سے بنتی (گزارش) ہے۔ تم میرے باپ کے کیے دھرے کا انتقام مجھ سے ضرور لو، لیکن میری اس معصوم بیٹی کو بخش دو۔"

آشش شرما نے ایک کریہہ اور استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"راجن شرما کے پریوار کو معاف کر دوں۔ انہیں میری بیٹی اور معصوم بچی کا خیال نہیں آیا۔ میری ہنستی بستی پھلواری کو چند لمحوں کی خاطر اُس نے ہمیشہ کے لیے نشٹ کر دیا۔ مجھے وقت سے پہلے موت کے منہ میں پہنچا دیا اور تم کہہ رہے ہو میں معاف کر دوں۔"

ساون نے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔

"آشش شرما میں بہت شرمندہ ہوں، میرے باپ کے کرم ایسے نہیں ہیں کہ تم معاف کر سکو۔ میں بس تم سے مہلت مانگ رہا ہوں اور اپنی بچی کا جیون مانگ رہا ہوں، مجھے اتنا سے دو کہ میں تمہاری بیٹی اور بیٹی کے لیے بھی کچھ کر سکوں اور اپنے باپ کی کمائی کو ان نرودھن اور دکھی خاندانوں تک پہنچا سکوں جو اس کے حق دار ہیں۔"

آشش شرما نے ایک لمبی ہنکاری بھری۔ ساون کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نیم رضامند ہو۔ ساون التجائیہ انداز میں اُس سے مسلسل پرارتھنا کرتا رہا۔ بالآخر آشش شرما نے محاذ کے بعد کہا۔

"ساون سنہا تیرا چشمہ ایسا ہے جو نرودھن اور دکھی مانو جاتی (انسانیت) کے لیے سیوا کا کام کرے گا۔ میں تجھے اور تیری بچی کو صرف اس شرط پر چھوڑ رہا ہوں کہ تو اپنے آپ کو سکّے ڈھالنے کی مشین نہیں بنائے گا، بلکہ انسانوں کا مسیحا بن کر دنیا سے دُکھ دور کرے گا۔ ساری دھن دولت کو غریبوں کے لیے وقف کر دے گا۔ دان پنیہ کے کاموں میں اس دولت کو خرچ کرے گا۔ جا میں نے اوپر والے سے اجازت لے کر تیری اور تیری بیٹی کو معاف کر دیا۔ آج کے بعد میں تیری بیٹی کے پاس بھی نہیں آؤں گا۔ وہ مجھے حرفِ غلط کی طرح بھول جائے گی، یہ میرا وچن ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد آشش شرما کا ہیولا دھواں بن ہوا میں تحلیل ہونا شروع ہو گیا۔ ساون تشکر آمیز نگاہوں

سے اُسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اُس کے بعد اُس نے جھولے پر سے سوتی ہوئی بچی کو اپنی آغوش میں لیا، اُسے دل بھر کر پیار کیا اور برق رفتاری سے چلتا ہوا باہر آ گیا۔ گارڈ ابھی بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر بے ہوشی کی نیند سو رہا تھا۔ ساون جب اپنی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا تو وہاں بھی وہی منظر تھا، لیکن اُسے اچھی طرح علم تھا کہ تھوڑی دیر میں دونوں ہوش میں آ کر اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنی ڈیوٹی انجام دے سکیں۔

منّی کو اپنی گود سے اُتار کر اُس نے اُس کے بستر پر لٹایا اور جب بچی مکمل اور بھرپور نیند لے کر اٹھی تو وہ پہلے ہی کی طرح ہشاش بشاش اور خوش وخرم تھی۔ اتنے عرصے بعد بیٹی کو اس طرح ہنستا مسکراتا دیکھ کر ساون کی خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ دونوں باپ بیٹی کو لیا کیا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی طوفان سے نڈر کنارے آن لگے ہوں۔

☆.....☆

ساون نے آشش شرما کی روح سے جو وعدہ کیا تھا وہ بہت جلد اور مکمل دیانت داری سے پورا کیا۔ اپنا ایک کلینک بچی آبادی اور غریبوں کی جھونپڑیوں کے درمیان قائم کیا، جہاں وہ غریب، نادار، مفلس اور مفلوک الحال مریضوں کو مفت طبی امداد بہم پہنچاتا، ادویات بھی مفت فراہم کی جاتیں۔ ساون سنہا نے اپنے اخراجات سے دوسرے قابل اور کوالیفائیڈ ڈاکٹرز اور نرسیں بھی ملازم رکھیں اور انہیں اپنے کلینک میں ان دُکھی انسانوں کی خدمات پر مامور کیا۔ اپنے اس کلینک کا نام بھی اُس نے آشش کے نام پر "آشش رکھا لیہ" رکھا۔

اب وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ایک پرسکون اور خوشیوں سے بھرپور زندگی گزار رہا تھا۔ اُس کی زندگی میں اگر کوئی کمی تھی تو وہ بھی ایک اچھے جیون ساتھی کی، اس دوران اس کے قریب کئی لڑکیاں آئیں، بلکہ کچھ کا تعلق تو اُس کے پیشے سے ہی تھا اور تقریباً ہر لڑکی کی یہی خواہش تھی کہ وہ ساون کی خشک اور بنجر زندگی میں امرت دھارا بن کر برسے، لیکن ساون بڑی خوب صورتی کے ساتھ ہر لڑکی کی کاٹ جانتا اور پھر وہ لڑکیاں بھی ٹھہیں اور یہی اور سہی اور کوئی اور سہی پر عمل کرتے ہوئے پتری بدل لیتیں اور ساون سکون کا سانس لیتا۔

☆.....☆

آج دیوالی کی رات تھی۔ پوری فضا آتش بازی کے شور اور رنگ ونور سے مہک رہی تھی۔ بازاروں کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ ساون بچی کو ساتھ لے کر اُسے دل بھر کر دیوالی کی شاپنگ کروا رہا تھا۔ قیمتی اور دیدہ زیب ملبوسات، جیولری اور مختلف النوع کی چاکلیٹس اور مٹھائیاں خرید کر وہ بیٹی کا دامن خوشیوں اور مسرتوں سے بھرے جا رہا تھا، لیکن بچی نے محسوس کیا کہ اس کے والد جو چیز بھی اُسے خرید کر دے رہے ہیں وہ سنگل نہیں، بلکہ ڈبل خریدتے ہیں۔ آخر اُس سے نہیں رہا گیا اور اُس نے کار میں بیٹھتے ہوئے باپ سے استفسار کیا۔

"پاپا! آج آپ نے مجھے زبردست شاپنگ کروائی ہے، لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" ساون نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "کون سی بات" بچی نے فوراً کہا۔ "میں تو آپ کی اکلوتی بیٹی ہوں، پھر آپ نے ہر چیز ڈبل کیوں خریدی ہے۔" ساون نے معنی خیز نظروں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوں..... ہوں، تم ہماری بیٹی ضرور ہو، لیکن اکلوتی نہیں، بلکہ تمہاری ایک بہن اور بھی ہے۔ آج ہم تمہاری ملاقات اُس سے کروائیں گے۔" بچی خوشی سے اُچھل پڑی۔ اُس نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ "سچ..... آپ سچ کہہ رہے ہیں پاپا۔ میری کوئی بہن بھی ہے۔" ساون نے اُس کی خوشی سے محظوظ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں..... ہاں..... بھئی تمہاری ایک بہن بھی ہے۔ ابھی ہم اُسی کے پاس چل رہے ہیں، تمہیں یقیناً اُس سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔" بچی اپنی چشمِ تصور سے اپنی اَن دیکھی، بہن کو دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔

☆.....☆

آخر کار تلاشِ بسیار کے بعد ساون کو اپنا مطلوہ فلیٹ مل گیا۔ اُس نے پہلے دروازے پر دستک دی، لیکن جواب ندارد، پھر اُسے خود ہی ہنسی آ گئی، وہ اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبانا بھول گیا تھا۔ آتش بازی اور پٹاخوں کے شور میں بھلا دستک کی آواز کون سنتا ہے۔ اُس نے بچی کو کود

میں لے کر بیل بٹن دبانے کا اشارہ کیا۔ بچی نے اپنی نازک سی انگلی بٹن پر رکھی تو پھر رکھ کر اُٹھانا بھول گئی، لیکن اُس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ دروازہ فوراً کھل گیا۔ حیرت و استعجاب سے ساون کی زبان گنگ ہوگئی۔ ساون سراپا حیرت بنا اُس چہرے کو تک رہا تھا جسے اُس نے کبھی ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اُس کا ملکوتی حسن آج بھی ویسا ہی تھا، لیکن اُس کی سفید ساڑی اور اُجڑی مانگ چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ وہ آشش کی ودھوا ہے۔ وہ بھی اپنی آنکھیں پھاڑے ساون کو تک رہی تھی۔ دونوں کہنا سننا بھول کر ایک دوسرے کو ایک ٹک نہارے (دیکھے) جا رہے تھے۔

بچی بھی باپ کو دیکھ رہی تھی اور کبھی برکھا کو، اسی اثناء میں اندر سے بچی کی ہم عمر ایک بچی بھاگتی ہوئی آئی اور برکھا سے مستفسر ہوئی۔ ”ممّا کون آیا ہے۔“ پھر ساون اور بچی کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی، بالآخر ساون نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ”کیا اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی۔“

اُس کے لہجے میں ایسی حسرت اور تڑپ تھی کہ برکھا کی دل کی دھڑکنیں زیر و زبر ہوگئیں۔ دل کو کوئی کہانیاں یاد سی آکر رہ گئیں، اُس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ برکھا نے اپنی حسین آنکھوں کے حلقوں کو اُٹھا کر رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”آجایئے“ اور پھر اُس نے ساون اور بچی کو نشست گاہ میں لاکر بٹھا دیا۔

برکھا کی بیٹی متوحش نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ ساون نے بچی کو اپنی گود میں لے کر پیار کیا اور پھر بچی سے کہا۔ ”بچی یہ ہے تمہاری بہن.....“ برکھا کی بچی نے فوراً جملہ اُچک لیا اور جلدی سے کہا۔ ”میرا نام انجی ہے۔ انجی شرما۔“ ساون ہنس پڑا، بچی بھی مسکرانے لگی۔ ساون نے تحائف کے پیکٹ بچی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”بچی یہ تمام گفٹ جو تم انجی کے لیے لائی ہو، انہیں دکھاؤ جب تک ہم بات کرتے ہیں۔ بچی نے فوراً گفٹ پیپرز ہٹا کر ایک ایک چیز انجی کو دکھانا شروع کیا۔ انجی کی خوشی دیدنی تھی۔ دونوں فوراً شیر و شکر ہوگئیں۔

برکھا فلور کشن پر خاموش بُت بنی ہوئی سراسمہ نظروں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ساون نے آہستہ سے استفسار کیا۔ ”کیسی ہو؟“ برکھا نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ کو نظر نہیں آرہا ہے کہ میں کیسی ہوں۔“ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اُس نے سوال کیا۔ ”لیکن میرا پتا آپ کو کس نے دیا۔“

ساون نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ”مہ جبیں نے۔“ برکھا نے بے ساختہ کہا۔ ”کیا۔ کیا آشش آپ کو جانتا تھا۔“ ساون نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں جانتا تھا، لیکن ہماری ملاقات، کن حالات میں ہوئی، یہ ایک لمبی کہانی ہے، کبھی فرصت سے سن لینا۔“ پھر اُس نے برکھا کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”برکھا زندگی کا سفر اکیلے طے کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ تمہارا مجرم ہوتے ہوئے آج پھر تمہارے در پر صدا لگا رہا ہوں۔ کیا میں یہ امید رکھ سکتا ہوں کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔“

برکھا کی آنکھیں چمک پڑیں۔ اُس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”سوچ لیجیے۔ یہ صدا آپ پہلے بھی لگا چکے ہیں اور جب میں آپ کے قریب آئی تو آپ خود دور چلے گئے۔“

ساون نے شرمسار نگاہوں سے دیکھا اور خفت آمیز لہجے میں کہا۔ ”برکھا مجھے ایک موقع تو دو، بھگوان نے چاہا تو تمہاری ساری شکایتیں دور کر دوں گا۔“ برکھا نے انجی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب میرے ساتھ میری بیٹی بھی ہے، کیا آپ اسے برداشت کریں گے۔“ ساون نے شاکی لہجے میں کہا۔ ”کیسی باتیں کرتی ہو برکھا، بچی اور انجی، انجی اور بچی ہمارے بگیا کی دو کلیاں ہیں۔ کیا ہم دونوں ان سے جدا رہ سکتے ہیں۔“

”بس! اب زیادہ بحث تکرار میں نہیں سنوں گا۔ دیوالی کی اس شُبھ گھڑی میں مجھے تمہارا بیٹھا جواب چاہیے۔“ چند لمحے توقف کے بعد برکھا نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا۔ اُس کا فیصلہ سنتے ہی ساون کی دیوالی کی خوشیاں دوبالا ہوگئیں۔ وہ برکھا کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور آہستہ سے برکھا کا نرم گلابی ہاتھ چوم کر کہا۔ ”تھینکس دیری مچ“ بچی اور انجی اپنے کھیل میں مگن تھیں، دونوں کو خبر ہی نہیں تھی کہ وہ حقیقت میں بہنیں بن گئی ہیں۔

☆.....☆

چوتھی سچ بیانی

یہ بے حسی.....

بشیر احمد بھٹی

ایمان فروشی کی ایک تصویر، جسے بہاول پور سے ایک مجاہد مرد نے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا

دنیا کے حالات دیکھ کر شاید انسانوں کا ضمیر کہیں سونے چلا گیا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ ہر انسان جرم کرنے سے پہلے اپنے ضمیر کو ابدی نیند سلاتا تھا، پھر جرم کرتا تھا۔ اب یوں لگتا ہے کہ ضمیر بغیر درخواست کے دائمی رخصت پر چلا گیا ہے۔ انسان بغیر ضمیر کے گھوم رہے ہیں۔ انہیں کسی بات کی پروا نہیں ہے۔

دن میں ہزار بار جھوٹ بولنا، جھوٹی قسمیں کھانا، گالم گلوچ کرنا۔ یہ سب روزمرہ کی زندگی میں عام دیکھنے کو ملتا ہے۔ روز آخرت کا حساب، قبر کا حساب، ہم سب کچھ فراموش کر چکے ہیں۔ معاشی حالات کی خرابی اور پیسے کی ہوس میں ہم گردن تک مبتلا ہو چکے ہیں۔ اک ریس جاری ہے۔ پیسے کی دوڑ میں سب آگے نکلنے کی کوشش میں ہیں۔ پیسا ملے، بس پیسا..... خواہ کسی بھی حالت میں ہو۔ ضمیر، مذہب کسی چیز کی ہمیں فکر نہیں ہے۔ یہ 3 ستمبر بروز منگل کی بات ہے۔ بجلی اور سوئی گیس کے بل جمع کرانے کی آخری تاریخ پانچ ستمبر تھی۔ میں نے سوچا۔ بل جلد جا کر جمع کرا دینا چاہیے! میں 3 ستمبر کو گھر سے نکلا اور قریبی ڈاک خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ مینی ڈاک خانہ ہے اور آر ی کے زیر انتظام ہے۔ اس ڈاک خانے کے ملازم بڑے کاہل اور مرضی کے مالک ہیں۔ یہاں اپنی جگہ سب بادشاہ ہیں۔ یہ نہ تو کسی کے دباؤ کو قبول کرتے اور نہ ہی کسی کی مجبوری کو سمجھتے ہیں، یہ صرف اپنی من مانی کرتے ہیں۔ کوئی ان سے باز پرس کرنے والا نہیں ہے۔ یہ صبح اپنی مرضی سے آتے ہیں۔ ڈیوٹی کا وقت اگر صبح 8 بجے سے شروع ہو رہا ہو تو یہ سب نو بجے کے بعد ایک ایک کر کے آنا شروع ہوتے ہیں۔ اس دوران بل بھرنے اور منی آرڈر کے ذریعے رقوم بھیجنے والوں کا ڈاک خانے کے چھوٹے سے پلاٹ میں ہجوم جمع ہو جاتا ہے۔ پلاٹ بھی کیا ہے، بڑی بڑی بے ترتیب گھاس، درختوں کے سوکھے پتے اور گندخرابے سے اٹا ہوا ہے یہاں کوئی صفائی نہیں ہوتی۔ نو بجے کے بعد ایک ملازم آتا ہے۔ اندر سے دروازہ بند کر کے کام شروع کرتا ہے۔ اندر سے کھٹک پٹک کی آواز سے پتا چلتا ہے کہ اندر جیالا سختی کام کر رہا ہے۔ یہ عمل بیس منٹ تک جاری رہتا ہے۔ اس دوران دوسرے آنے والے ملازمین باہر پلاٹ میں کرسیاں نکلوا کر بیٹھ جاتے ہیں اور خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ صفائی کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے یعنی الماریوں سے کاغذات اور مہریں نکالنے والا کام۔ اس کام پر مزید آدھا گھنٹہ صرف ہوتا ہے، پھر جب کام شروع ہونے لگتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ بال پین سیاہی سے خالی ہیں، کام نہیں کر رہے۔ چنانچہ ایک چپڑاسی کو بال پین کی خریداری والا کام سونپا جاتا ہے۔ وہ جب منہ بنا کر بال پین لینے کے لیے جانے لگتا ہے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کچن میں چائے کا سامان موجود ہے؟ اگر چینی، پتی، دودھ نہیں ہے یا کم ہے تو وہ بھی لیتے آؤ۔ بال پینوں کے چکر میں ملازم کو مزید پانچ کام اور بتا دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ بازار جانے اور آنے پر آدھا پون گھنٹہ لگا آتا ہے۔ اس دوران ڈاک خانے میں ایک لمبی قطار لگ جاتی ہے۔ سب خجل خوار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ہیں سرکاری ملازموں کے چونچلے۔ اس کے علاوہ بھی پبلک کو مزید ذلیل کرنے کے اور بھی کئی حربے ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً استعمال کرتے رہتے ہیں۔ جب بارہ یا ایک بجتا ہے تو کام بند ہو جاتا ہے۔ کوئی آدمی ایک بج کر دو منٹ پر ڈاک خانے میں داخل ہو تو اسے ڈانٹا جاتا ہے کہ کم سویا کرو، یہ ڈاک خانے میں آنے کا ٹائم ہے۔ اب کل آنا، یعنی آنا اپنی مرضی کا اور جاتے وقت ڈسکپلن کا خیال کرنا کہ کہیں دو چار منٹ اوپر ڈیوٹی نہ کرنی پڑ جائے۔ کس قدر ہوشیار ہیں یہ ملازم۔ آتے ہیں بہت لیٹ اور جاتے وقت گھڑی پر ان کی نگاہ ہوتی ہے۔ یہ ہے لاقانونیت جو ہمارے سرکاری ڈاک خانوں میں دیکھنے کو عام ملتی ہے۔

میں جب بھی اس ڈاک خانے میں جاتا ہوں تو ذرا لیٹ جاتا ہوں، تاکہ جب وہاں پہنچوں تو کام شروع ہو چکا ہو۔ اس روز میں ذرا جلدی گھر سے نکلا تھا۔ اس لیے راستے میں کہیں بیٹھ کر سستانے کا پروگرام بنا لیا، تاکہ ڈاک خانے میں ملازموں کے آنے کے انتظار کے جھنجٹ سے بچ جاؤں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ راستے میں نہر کا پل آیا تو میں اس کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور ہوا کے مزے لینے لگا۔ نہر کے دائیں کنارے پر تارکول کی ایک چھوٹی سی سڑک تھی، جس کے ساتھ پختہ مکانوں کی ایک لمبی قطار موجود ہے۔ یہ چھوٹی سڑک جہاں بڑی سڑک سے مل رہی ہے، وہاں ایک سفید مکان موجود ہے،

جس کے دو طرف دروازے ہیں۔ ایک طرف کے دروازے نہر کی طرف کھلتے ہیں اور دوسری طرف کے دروازے ایک بڑی گلی میں کھلتے ہیں۔ جن دروازوں پر ویرانی اور سناٹا ہو، ٹھگ قسم کے نوسر باز لوگ پکڑ دھکڑ کے خوف سے ایسے دروازوں کا انتخاب کرتے ہیں، تاکہ چال بازی کا مظاہرہ کر کے صاف طور پر نو دو گیارہ ہو جائیں۔

میں پُل کے حفاظتی چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اوپر سایہ دار شجر تھا۔ میں اس کی چھاؤں میں بیٹھا تو بڑا مزہ آیا، کیوں کہ ٹھنڈی ہوا کے ہلکوروں میں نشہ سا محسوس ہوا۔ ڈاک خانے کے پلاٹ میں بیٹھنے سے بہتر تھا، یہاں بیٹھنا۔ میرے یہاں بیٹھنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ایک عبرت اثر کہانی کا مجھے مواد مل گیا۔ المصوّر و جلا شانہ۔ یہ تمام دنیا اللہ پاک کی بہت پیاری مصوّری ہے۔ مصوّر کو یہ اختیار ہوتا ہے، وہ جب چاہے تصویر کو بگاڑ دے اور جب چاہے اسے حسین بنا دے۔ اس دنیا میں خوب صورت اور بدصورت لوگ موجود ہیں۔ اللہ پاک دلوں کے بھید جانتا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے، نیت کے مطابق چہرے بنا دیتا ہے۔ یہ چہرے دِلوں کی عکاسی ہوتے ہیں۔

روزمرہ کی زندگی میں آپ دیکھتے ہیں، کئی چہرے نورانی ہوتے ہیں اور کئی چہروں پر پھٹکار نظر آتی ہے۔ کئی چہرے دیکھ کر آپ خوش ہو جاتے ہیں۔ کئی چہرے آپ کو بالکل اچھے نہیں لگتے۔ یہ سب اللہ پاک کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ نورانی اور شیطانی چہروں میں بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ گناہوں سے دل سیاہ ہو جاتے ہیں۔ چہروں پر بھی لعنت برسنے لگتی ہے۔ میں اپنی جگہ بیٹھا ٹھنڈی ہوا کے مزے لے رہا تھا اور اللہ پاک کی تعریف میں میری نس نس سرشار ہو رہی تھی۔ وہ پاک ذات ہے۔ جس نے ہم پر نعمتوں کی بوچھاڑ کر دی ہے۔ اتنے میں تارکول کی چھوٹی سڑک پر ایک موٹر سائیکل آ کر رکی۔ اس پر دو دُبلے پتلے، سانولے رنگ کے لڑکے سے جوان نظر آئے۔ اُن کے چہروں پر عجیب سی نحوست اور پھٹکار نظر آئی۔ میری نظروں کو وہ چہرے اچھے معلوم نہیں ہوئے۔ چہروں پر عجیب سی بے رونقی

کیا
خدا نے آپ کو
حسن کی
دولت
سے نوازا ہے؟
کیا آپ کو
لباس
پہننے کا سلیقہ آتا ہے؟
تو پھر آپ
دوشیزہ
کے سرورق کی زینت کیوں نہ بنیں؟؟
آج ہی ہمارے فوٹو گرافر سے رابطہ قائم کیجیے۔
دوشیزہ: 110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ کراچی۔

تھی۔ پیچھے بیٹھا ہوا پتلا سا جوان جمپ مار کر اترا۔ اگلے جوان کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ دونوں کے رنگ کالے تھے۔ موٹر سائیکل کے اگلے حصے میں ایک پلاسٹک کا تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ آگے بیٹھے ہوئے جوان نے تھیلے سے قرآن پاک کے دو سپارے نکالے، جو بڑے سائز میں تھے۔ وہ سپارے اس نے اپنے ساتھی کو دے دیے، اس کے ساتھی نے سپارے لیے اور مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دوبارا آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ذرا دیر بعد دروازہ تھوڑا سا کھلا اندر سے نسوانی آواز آئی ''کون؟'' دروازے میں تھوڑی سی جھری پیدا ہوئی تو اس خباثت سے بھرپور چہرے والے جوان نے سپارہ ہاتھ میں پکڑا اور دروازے کی جھری سے اسے اندر داخل کرنے کی کوشش کی اندھیرا عمر خاتون نے دروازہ بند کیا تو سپارہ جھری میں پھنس گیا۔ اس خبیث نے سپارہ پیچھے کی طرف کھینچا۔ آہستہ آواز میں کسی مدرسے کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے عورت سے چندے کی اپیل کی اور مزید چند لجاجت بھرے الفاظ کہے۔ عورت اس کی بات سنتی رہی، پھر وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ اس کالے بھبھوکا شخص نے مسکرا کر موٹر سائیکل سوار کو ایک اشارہ دیا کہ کام ہو گیا ہے! ذرا دیر بعد اس عورت نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور پچاس روپے کا نوٹ دروازے کی جھری سے نکلا۔ اس کالے شیطان نے وہ نوٹ جھپٹ لیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ اس کالے کلوٹے نے نوٹ اپنے ساتھی کے حوالے کیا جو اس نے اپنی قمیص کی سائیڈ والی جیب میں ڈال لیا۔ نوٹ وصول کرنے والا موٹر سائیکل پر سوار ہوا۔ دونوں نئے شکار کی تلاش میں روانہ ہونے لگے تو آگے بیٹھے ہوئے کلوٹے نے سپارہ لے کر تھیلے میں ڈالے اور دونوں وہاں سے کھسک گئے۔

قرآن کریم۔ اللہ پاک کا پاک کلام ہے، بغیر وضو ہم پڑھ سکتے ہیں۔ اُسے چھو نہیں سکتے۔ بغیر وضو کلام پاک کو ہاتھ لگانا سخت گناہ ہے! یہ کاروباری لوگ جو دن بھر دروازوں پر جا کر فراڈ کرتے ہیں۔ ان کے میلے پیر اور اُجڑے چہروں سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ بے وضو ہوتے ہیں۔ اس طرح کے گورکھ دھندے میں ملوث ہو کر یہ دن بھر کلام پاک کی بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بغیر وضو کلام پاک ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔ چند اسلامی کتابیں اور سپارے لے کر یہ لوگوں کو ٹھگتے ہیں۔ ہوٹلوں میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں، چائے پیتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں، نماز روزے سے یہ ناآشنا ہوتے ہیں۔ مذہبی امور کا ان کو پتا نہیں ہوتا، خصوصاً عورتیں ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آ جاتی ہیں۔ یہ لوگ ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں، خدارا عوام سے خصوصاً عورتوں سے پُرزور اپیل ہے کہ وہ اِن کی باتوں میں نہ آئیں، تاکہ ان کی حوصلہ شکنی ہو۔

☆.....☆

ہم کیسے مسلمان ہیں۔ قرآن پاک اللہ کا معتبر کلام ہے۔ اقراء! پڑھیے، اللہ پاک کا یہ بابرکت کلام تیس برس میں وحی کے ذریعے نازل فرمایا گیا۔ جس کی طاقت کے سامنے پہاڑ سر نگوں ہوئے اور انکاری ہوئے کہ ہم یہ وزن نہیں اٹھا سکتے۔ آج اس کلام پاک کی ہم قدر نہیں کر رہے۔ یہ کلام اللہ کی رحمت سے ہم خوش نصیبوں کو ملا۔ آج اس کی یہ قدر ہے کہ اسے بے وضو اٹھایا جا رہا ہے۔ دروازے کی جھریوں میں پھنسایا جا رہا ہے۔ پرانے ضعیف نسخے ہمارے مسلمان بھائی قبرستان کے کُوڑھوں میں پھینک دیتے ہیں۔ اخبارات میں اشاعت ہوتی ہے تو اخبار کندی نالیوں میں پڑے نظر آتے ہیں۔ سڑکوں، گلیوں میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ لوگ ان پر پاؤں رکھ کر گزر جاتے ہیں۔ ریلوے لائنوں میں یہ اخبار گندگی میں تھرتھرے نظر آتے ہیں۔ اِن پر لوگ پکوڑے رکھ کر کھاتے ہیں اور نیچے پھینک دیتے ہیں۔ ''کیا ہم بے ادب لوگ نہیں ہیں۔'' یہ سب خدا کے عذاب میں مبتلا ہونے والی نشانیاں ہیں۔

سوچنے کی بات ہے! کیا ہم نے کبھی انجیل اور تورات کے نسخے زمین پر پڑے دیکھے ہیں؟ آپ کا جواب ہوگا، بالکل نہیں۔ اگر انگریزوں اور یہودیوں نے انجیل شریف اور تورات کو محفوظ کر لیا ہے تو ہم مسلمان اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہیں کہ قرآن پاک کی حفاظت نہیں کر سکتے۔

☆.....☆

سردی آتے ہی شروع ہو جاتے ہیں بدلتے موسم کے اثرات۔
نزلہ زکام، کھانسی بخار، سر درد، غلوہ گلے کی خراش۔
12 جڑی بوٹیوں سے تیار، 12 مہینے اثر دار ہاشمی جوشاندہ
جس کا ہر ساشے ہے موسمی اثرات سے محفوظ رہنے کا وعدہ۔
Mohammad Hashim Tajir Surma
E-mail: a.hashmi@cyber.net.pk Web: www.hashmisurma.com
All logos and typography of Hashmi are internationally registered trademarks & ©Copyright protected.
SINCE 1794

بیٹیاں پھول ہیں

فریدہ خانم

لاہور سے، ایک دوشیزہ کے ماضی سے آباد ایک نوحہ

آج پھر ماہ نور کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ اُس کی ماں کی تیز ڈانٹ اور نور کی سسکیاں مجھے بے چین کررہی تھیں۔ اِن کے گھر سے اکثر ایسی ہی آوازیں آتی تھیں۔ جب سے یہ لوگ اِس محلّے میں آئے تھے، یہی کچھ ہورہا تھا۔

نور ایک بارہ تیرہ سالہ بچی ہے، متوسط گھرانے سے تعلق ہے، والدین اَن پڑھ ہیں، وہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے، اس کے باوجود اس کے لاڈ نہیں اُٹھائے جاتے۔ آئے روز نور کو مار پڑنے کی آوازیں آتی ہیں، مجھے سُن کر بڑی تکلیف ہوتی ہے، لیکن آج مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ میں نے پیروں میں چپل اَڑسی، چادر اوڑھی اور اُن کے گھر کے دروازے پر جا کر بے ساختہ ہی دستک دے ڈالی۔ نور کی ماں نے اندر سے پوچھا۔

''کون ہے؟''

میں نے کہا کہ ''باجی! میں ہوں بانو، دروازہ کھولیں۔''

اُنہوں نے نور کو دروازہ کھولنے کو کہا۔ دروازہ کھلتے ہی میں اندر داخل ہوئی، سلام کر کے میں نے دیکھا کہ نور کے چہرے پر پژمردگی چھائی تھی اور گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر ازحد دُکھ ہُوا۔

نور کی ماں خالدہ نے مجھے کُرسی آگے کر کے بیٹھنے کو کہا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ میرے منہ سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

میں نے خالدہ سے کہا۔

''باجی خالدہ! مجھے نور کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ مجھ سے رہا نہیں گیا، میں بے اختیار اِدھر آ گئی کہ پتا کروں خیر تو ہے؟ آپ نے بُرا تو نہیں منایا؟''

''ارے نہیں، بانو بہن! اِس میں بُرا منانے والی کون سی بات ہے۔ تم بھی تو ہماری اپنی ہی ہو۔ یہ بدنصیب بہت نافرمان ہے، روز مار کھاتی ہے، لیکن میری بات نہیں مانتی، اپنی ہی مرضی کرتی ہے۔ میں اس کی ماں ہوں، اسے مار کر مجھے کون سی خوشی ملتی ہے، آخر اِس کا بھلا ہی تو چاہتی ہوں لیکن یہ سمجھتی ہی نہیں ہے۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا ''باجی خالدہ آخر اس کا قصور کیا ہے، یہ تو اتنی معصوم سی ہے، بیٹیاں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہیں۔''

''ارے بانو بہن! اسے ہر وقت سجنے سنورنے کا شوق سوار رہتا ہے۔ اتنا منع کرتی ہوں، لیکن باز ہی نہیں آتی۔ بس ہر وقت منہ ہاتھ دھو کر، سرخی پاؤڈر ملتی رہتی ہے، جتنی بھی نگرانی کرلو، سمجھتی ہی نہیں۔ نئے نئے

ڈرائنوں کے کپڑوں کی فرمائشیں کرتی ہے، جیسے باوا کی کوئی فیکٹری ہے۔ میں تو اِس کے ہاتھوں بہت تنگ ہوں، ہزار بار منع کیا ہے، کہ سارے شوق شادی کے بعد سُسرال جا کر پورے کرنا، لڑکیاں اِس عمر میں سادہ ہی

اچھی لگتی ہیں۔ پر ہاں جی، یہاں تو ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے نکال دیا جاتا ہے۔ جب دیکھو منہ دُھل رہا ہے، آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر کبھی بال بنائے جا رہے ہیں، کبھی پاؤڈر لگایا جا رہا ہے۔ کپڑے استری کیے جاتے ہیں اور نئے نئے جوڑے لینے کی فرمائش، یہاں تک ہی بس نہیں ہے، بہن، بلکہ یہ ندیدی نظر رکھتی ہے۔ بھائیوں کو بوٹیاں زیادہ کیوں دیتی ہوں اور انہیں دودھ کیوں روز پلائی ہوں؟ بڑا شوق ہے اسے بوٹیوں اور دودھ پینے کا۔ ارے! وہ تو لڑکے ہیں، کل کو کما کر لائیں گے۔ اِس نے تو پرائے گھر جانا ہے، میں تو اس کی فرمائشوں سے بہت ہی تنگ ہوں۔ روز ہڈیاں تڑوانی ہے، لیکن باز پھر بھی نہیں آتی۔ تم ہی بتاؤ کہ آخر میں کیا کروں؟ تم ہی کچھ اسے سمجھاؤ، آخر تم سے سارہ پڑھنے آتی ہے، شاید تمہاری باتوں کا کوئی اثر لے لے۔'' نور کی ماں نے شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔

میں نے نور کی طرف دیکھا، اُس نے بے بس اور بے چارگی سے سر جھکا لیا۔

اس کے چہرے کی طرف دیکھتے دیکھتے میں کہیں دُور نکل گئی، اچانک اُس کا چہرہ کسی اور چہرے میں تبدیل ہو گیا۔ یہ چہرہ گڑیا کا چہرہ تھا، گڑیا کے بچپن کا۔ وہی بے بسی اور بے چارگی سے پُر، رچ پُور، مجھے بہت کچھ یاد دلا گیا۔

میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے باجی خالدہ کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ میرے گلے میں پھندے سے پڑ گئے ہوں۔ میں نے ڈبڈبائی نظروں اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اِسے مت ڈانٹا کریں، کسی چیز سے منع نہ کیا کریں، آپ تو اس کی ماں ہیں۔ آپ اس کا خیال نہ کریں گی تو کون کرے گا؟''

''ارے! بانو بہن میں کون سا اسے مارنا چاہتی ہوں، لیکن یہ اپنی حرکتوں سے باز ہی نہیں آتی، تو میں پھر کیا کروں، آخر اس کی بھلائی کے لیے ہی تو فیشن کرنے سے منع کرتی ہوں۔''

''خالدہ باجی! آپ میری بات نہیں سمجھیں، بیٹیاں تو بڑی نازک ہوتی ہیں، کانچ کی طرح، بالکل نگینوں کی طرح۔ انہیں تو سینت سینت کر رکھنا چاہیے۔ ماں باپ کے گھر میں تو مہمان ہوتی ہیں اور مہمان کا تو بہت خیال رکھنا چاہیے۔ آپ کو ایسے میری بات سمجھ نہیں آئے گی۔ میں آپ کو گڑیا کی کہانی سُناتی ہوں۔''

میری نظریں دُور کسی نقطے پہ مرکوز ہو گئی، میں ماضی کے سمندر میں ڈوب گئی۔

☆.....☆

''گڑیا ری او گڑیا! کدھر گئی، آواز کیوں نہیں دیتی؟''

گڑیا جو کہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بالوں کا کبھی جُوڑا بنا رہی تھی اور کبھی ماتھے پر گر کر پوز بنا رہی آئینے میں دیکھ رہی تھی، یکدم گھبرا گئی اور بال اکٹھے کر کے پونی بنا ڈالی اور دوپٹا سے رگڑ رگڑ کر جلدی سے ہونٹوں کی لالی صاف کرنے لگی۔ اتنے میں اُس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی اور ایک زوردار دھپ اُس کی کمر پر رسید کر کے بولی۔

''میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ تُو آئینے کے سامنے کھڑی ہو گی اور سنگھار کر رہی ہو گی۔ ماں کہتی ہوں کہ آخر تو باز کیوں نہیں آتی؟ کتنی بار منع کروں، تو پر موقع ملتے ہی سجنے لگتی ہے، آخر تو کس مٹی کی بنی ہے، اتنی بار کر کھا کر بھی باز نہیں آتی۔ میری سمجھ میں کوئی بات ہی نہیں آتی۔'' انہوں نے ایک اور دھپ گڑیا کی کمر پر رسید کی۔

وہ بلبلا اُٹھی اور اب کہ اپنی اونچی رونا شروع کر دیا۔ سسکتے ہوئے شکوہ کناں نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی، جیسے کہہ رہی ہو کہ امّاں! آپ مجھے اتنا کیوں مارتی ہیں، میں آخر آپ کی بیٹی ہوں۔ میں نے ایسا کون سا گناہ کر دیا، میری باقی سہیلیاں بھی تو سج سنور اپ کرتی ہیں، اُن کی مائیں تو خوش ہوتی ہیں، فرمائشیں پوری کرتی ہیں، کیا میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں؟''

اُس کی ماں نے دایاں ہاتھ آگے سے آنکھیں نکالتی ہے، ہزاروں بار سمجھایا ہے کہ لڑکیوں کا یوں بنا سنورنا اچھا نہیں ہوتا۔ سادگی سے رہا کرو، شرٹ شلیک اپ سے چہرے کا نور ختم ہو جاتا ہے۔ تیرے جتنے بھی ارمان ہیں سسرال جا کر پورے کر لینا، یہاں یہ سب نہیں چل سکتا۔''

غرض گڑیا کی ماں نے اُس پر حد درجے سختی کی اور نگرانی اتنی زیادہ کی، کہ گڑیا دل مسوس کر رہ گئی۔ اُس کا معصوم دل آہیں بھر کر رہ گیا۔ ذرا کسی بات پر قہقہہ نکل جاتا یا کوئی شرارت کرتی تو اُس کی ماں نے ٹھور کر دیکھنا اور صلواتیں سنانا کہ لڑکیوں اس طرح کہ کڑے بھرتی اچھی نہیں لگتیں، ''دوپٹا پھیلا کر لیا کرو۔''

اگلی باتوں نے گڑیا پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ گم سُم سی رہنے لگی۔ شرارتوں شوخیوں والی عمر میں سنجیدہ ہونے لگی۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں کو ہنستے سنورتے دیکھ کر آہ بھر کر رہ جاتی۔ اُسے سمجھ نہ آتی کہ آخر اُس کی ماں اُس کے ساتھ اتنی سختی کیوں کرتی ہے، اُس کے حالات سب سہیلیوں کی طرح کیوں نہیں ہیں؟

انہی سوالوں میں ہر روز ذہن چکرا تا رہتا، لیکن کہیں سے کوئی جواب نہ بن پاتا کہ آخر اُس کا قصور کیا ہے؟

ہر وقت کی روک ٹوک اور مار نے آہستہ آہستہ اُسے ڈھیٹ سردگی اور ہٹ دھرمی کے چال میں جکڑنا شروع کر دیا۔ اُس نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا، منہ دھونے سے کترانے لگی۔ کئی کئی دن کپڑے تبدیل نہ کرتی۔ دل میں ہر وقت خوف رہتا کہ اگر بال بناتے ماں نے دیکھ لیا، تو بہت مار پڑے گی۔ اُس کا معصوم دل ڈر اور خوف کی آماجگاہ بن گیا۔

ذرا ذرا سی بات پر چونکنا اُس کی عادت بنتی گئی۔ اُس کی آنکھیں اُجڑا ہوا دیار لگتیں۔ رفتہ رفتہ وہ چلتی پھرتی حسرت دیاس کی تصویر بن گئی۔ اُسے دیکھ کر کسی قبر کا گمان ہوتا۔ اب اُس کی ماں مطمئن ہو گئی، کہ بنی راہِ راست پر آ گئی۔ ہوتے ہوتے اُس کی سہیلیاں اُس سے اور ہو گئیں، وہ انہیں اپنے جیسی لگتی ہی نہ تھی۔

وہ گڑیا کو بدھی روح کہتیں، لیکن گڑیا جیسے برف کی سل بن گئی تھی، اُس کے جذبات ایسے ٹھنڈے پڑے کہ ان باتوں کا اُس پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ اُس نے اپنا جیا تو باذرین اور فیشن ایبل بیوی چاہتے ہیں، یہ تو کوئی جوگن ہی لگتی ہے۔''

ماں اُسے دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتی، اُسے سلیقے سے رہنے کو کہتی، وہ بڑی مجروح نظروں سے ماں کو جب دیکھتی تو وہ بے اختیار نظریں جھکا لیتی۔

جوں جوں گڑیا کی عمر بڑھتی گئی، اُس کی کالی گھٹاؤں

ولیم شیکسپیئر کی وفات

23 اپریل 1564ء انگریزی زبان کے سب سے بڑے شاعر اور ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر کی تاریخ وفات ہے۔ شیکسپیئر کے مشہور ڈراموں میں مرچنٹ آف وینس، کنگ جون، رومیو اینڈ جولیٹ، کنگ لیئر، میکبتھ اور ہیملٹ کے نام سرفہرست ہیں جو دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ شیکسپیئر نے 23 اپریل 1616ء کو وفات پائی۔

نے چاندی کے تار اوڑھ لیے۔ اُسے دیکھ کر کسی آسیب زدہ کھنڈر کا خیال آتا۔ بھائیوں نے کبھی بہن کی پروانہ کی اور اپنا اپنا گھر بسا کر علیحدہ ہو گئے، باپ تو بہت پہلے ہی وفات پا گیا تھا۔ اب گھر میں بوڑھی ماں اور اُس سے بھی بوڑھی بیٹی رہ گئے۔

ماں کو بیٹی کا غم دیمک کی طرح چاٹ گیا اور وہ چارپائی کی ہو کر رہ گئی۔ بالآخر ماں کو موت کے شکنجے نے جکڑا اور بیٹی سے دُور لے گئی۔ وہ بے بس و لاچار یہ وار بھی سہنے پر مجبور ہو گئی۔ اب وہ دنیا میں مکمل طور پہ تنہا رہ گئی۔ خالی گھر اُسے کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ اگر دُکان کے کرائے کا بھی چھوٹا سا آسرا نہ ہوتا تو کیا کرتی؟

گڑیا جو کہ اب بڑھیا ہو چکی تھی، اُس نے محلّے کے بچوں کو قرآنِ پاک کی تعلیم دینی شروع کر دی اور اللہ سے لو لگا لی۔

''اور وہ ہی گڑیا اب بانو آپا کے روپ میں آپ کے کھڑی ہے خالدہ باجی! آپ کے سامنے کھڑی ہے۔''

خالدہ باجی جو کہ اُس کی کہانی دم بخود ہو کر سن رہی تھیں، حیران رہ گئیں اور بولیں۔

''کیا..... کیا کہہ رہی ہو؟ یہ سب تم پر بیتا ہے، بانو بہن! بہت ہی زیادہ افسوس ہوا۔ تمہاری ماں کو یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آئے ہائے کیسے بیٹی کی زندگی تباہ کر دی۔''

''یہی تو خالدہ باجی! یہی تو میں آپ کو سمجھانا چاہ رہی ہوں۔ آپ کے سامنے جو آج دل کھول کر رکھا ہے، تو آپ کو یہی تو احساس دِلانا چاہتی ہوں۔ ذرا غور کیجیے کہ وہی سلوک جو میری ماں نے میرے ساتھ کیا۔ کیا آپ اپنی بیٹی کے ساتھ نہیں کر رہیں، کیا آپ ایک اور بانو آپا تیار نہیں کر رہیں؟''

''ارے! اللہ نہ کرے کہ میری بیٹی کا یہ حشر ہو۔''

نور کی ماں تھرّا اُٹھی۔

ہمارے پیارے نبی ﷺ اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ سے کس قدر پیار کرتے تھے، اُن کی آمد پر اپنی جگہ سے کھڑے ہو جاتے، اُنہیں زمین پر کپڑا بچھا کر بٹھاتے، کس قدر محبت اور احترام کرتے۔ ہم بھی تو آپ ﷺ کی اُمت میں سے ہیں، انہوں نے بیٹیوں کو رحمت قرار دیا ہے، تو ہم کون ہوتے ہیں، انہیں زحمت سمجھنے والے؟''

''بیٹیاں تو بہت نازک اور پیاری ہوتی ہیں، اِن کا تو بہت خیال رکھنا چاہیے، جانے اِن کے نصیبوں میں کیا لکھا ہوتا ہے، اگلے گھر جا کر کوئی صحیح طرح پہننے اوڑھنے بھی دیتا ہے یا نہیں، یہ کسی کو پتا نہیں ہوتا۔ ماں باپ کا پیار ہی تو اِن کا سرمایہ، اِن کا فخر ہوتا ہے، ساری عمر وہ اس پر مان کرتی ہیں، میں یہ نہیں کہتی کہ انہیں بے لگام چھوڑ دیا جائے، لیکن اِن کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اِس عمر میں تو ویسے بھی سجنا سنورنا سب کو ہی اچھا لگتا ہے اور آج کے دَور کا تو تقاضا بھی یہی ہے۔ اَب وہ دور گیا کہ جب صرف خاندانی شرافت سے رشتے ہو جاتے تھے۔ اب لوگوں کے مطالبات، اُن کے نظریات اور طرح کے ہو چکے ہیں۔ ہمیں اب اِسی دور میں اور انہیں کے مطابق چلنا ہے، لیکن میانہ روی کے ساتھ۔ میں صرف آپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر یہ کہتی ہوں کہ اللہ کے لیے اپنی بیٹی کو بانو آپا بننے سے بچا لیجیے۔ اِس کو اِس کی خوشیوں سے دُور مت کیجیے۔ ایک ماں کا سچا پیار اور مان دیجیے، اعتماد دیجیے، اپنی بیٹی کی دوست بنیے، باجی! اپنی بیٹی کی دوست بنیے، اس کے احساسات کو سمجھیے۔''

بانو آپا بات کرتے کرتے پلک پلک کر رونے لگیں۔ نور کی ماں جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھی اور اُس کو گلے سے لگا کر بولی۔

''بانو بہن! آج تم نے میری آنکھیں کھول دیں، مجھے بانو کی ماں بننے سے بچا لیا۔ میری نور، میری لاڈلی، بانو آپا نہیں بنے گی۔ میں اِسے اس کی ساری خوشیاں دوں گی، ایک اچھی تربیت دے کر اپنے ماں ہونے کا فرض ادا کروں گی۔ ہاں، ایسا ہی ہوگا۔''

میں نے آنسو صاف کرتے ہوئے نور کی طرف دیکھا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں تشکّر کے ستارے جگ مگ کر رہے تھے اور مجھے لگا کہ جیسے آج میری ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا ہو اور سکھ کا سانس لیا ہو۔

☆.....☆

غرقاب

فرزانہ سحاب مرزا

ایک پاکستانی نژاد دوشیزہ کی، امریکہ سے بھیجی گئی سچ بیانی

زندگی کتنی عجیب ہے اور وقت! اس سے کہیں زیادہ عجیب تر۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آنے والا پل ہمیں کس موڑ پر لے جائے اور کس سے ملا دے ایسا ہی ایک حسین موڑ میرے سامنے بھی آیا اور اس کو میں اک حسین اتفاق کا نام دوں گی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں امریکہ سے اپنے رشتے داروں سے ملنے پاکستان آئی ہوئی تھی۔ چوں کہ میں کافی عرصے بعد آئی تھی۔ اس لیے بہت سی جگہوں پر مجھے جانا تھا بہت سے رشتے داروں سے ملاقات کرنی تھی۔ اس دن میں اپنی رشتے کی پھوپی کے گھر ناظم آباد آئی ہوئی تھی، مجھے ان کے اصرار پر رُکنا پڑا۔ ان کے گھر سے پہاڑی صاف نظر آتی تھی۔ پہلے جب میں آئی تھی تو اتنی آبادی نہیں تھی، مگر اس دفعہ آبادی پہاڑی تک آگئی اور پہاڑی کا دامن اور پہاڑی کی چوٹی تک مکانوں سے آباد ہوگئی۔

میں دوربین لے کر چھت پر آگئی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی، ساتھ ہی خوشگوار ہوا کے جھونکوں نے ماحول کو مخمور بنا دیا تھا۔ میرے شانے تک کٹے ہوئے بال اُڑ اُڑ کر منہ پر آرہے تھے۔ ابھی میں جائزہ لے ہی رہی تھی کہ گھر کی بیل بجنی شروع ہوگئی۔ بیل متواتر بج رہی تھی، اندر پھوپھی کسی کام میں مشغول تھیں۔ میں جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر دروازے تک پہنچی اور دروازہ کھولا ہی تھا کہ اُودر کوٹ میں ملبوس ایک مناسب سا، ٹک ٹک والا بندہ میرے سامنے سے گزر کر باتھ روم میں گھس گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ باہر آیا تو اس کی خوب صورت شخصیت میرے سامنے تھی اور وہ مجھے سوالیہ نظروں سے ابھی دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ پھوپھو کمرے میں داخل ہوئیں۔

''ارے شان بیٹا! یہ اچانک اس طرف کیسے یاد آگئی میری؟'' پھوپھو اسے گلے لگاتے ہوئے شکوہ کر رہی تھیں۔

''بس دل نے کہا کہ آج اپنی پیاری سی خالہ سے ملنا ہے، اس لیے چلا آیا۔'' وہ کن انکھیوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا!

''ویسے کون ہیں یہ؟ پہلے تو کبھی نہیں دیکھا!'' اب کی بار وہ براہِ راست مجھے دیکھ رہا تھا!

''یہ میری بھتیجی نائلہ ہے، امریکہ سے آئی ہے، یہاں گھومنے پھرنے! یہ تو آج ہی جا رہی تھی مگر میں نے اسے کل تک کے لیے روک لیا ہے۔ کہاں بار بار آنا ہوگا۔'' پھوپھو میرا تقریباً تعارف کروا چکی تھیں۔

اور پھر اس کے بعد کیا ہوا مجھے پتا ہی نہ چلا۔ شاید اسی طرح دوستی اور پھر محبت کی ابتدا ہوئی ہے۔ شاید مجھے بھی شان سے محبت ہوگئی تھی بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہے کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔

اور پھر وقت پَر لگا کر اُڑنے لگا۔ میں تقریباً پھولوں کے گھر ہی منتقل ہوگئی تھی، کیوں کہ وہیں اِس ساری کہانی کی ابتدا ہوئی تھی اور وہی معاملات سنبھال سکتی تھیں، کیوں کہ میرے نخرے اٹھانے والے ذرا اور مزاج کے تھے۔

اور پھر شان کی فرمائش پر پھولو نے میرے گھر والوں کو ایمرجنسی فون کیے، تصویریں بھیجی گئیں۔ شان نے Net پر Online میرے سب گھر والوں سے Webcame پر بات چیت کی۔ اس کی خوب صورت شخصیت کے سحر اور گھر والوں کے رکھ رکھاؤ نے سب مسائل حل کردیے۔ فوری طور پر امریکہ سے امی ہی آسکیں اور یوں ایک ماہ میں میری آناً فاناً شان سے شادی ہوگئی اور میں اپنی پیاری پھولو کی گھر سے شان کے خوب صورت گھر بیاہ کر آگئی۔

ابھی میرے پاس شان کی ہمراہی میں تقریباً 4 ساڑھے 4 ماہ اور تھے میں ان سارے لمحات کو اپنے محبوب شوہر کی رفاقت میں گزارنا چاہتی تھی۔ شان مجھے لے کر روزانہ سیر کو نکل جاتے۔ ان دنوں میں خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کررہی تھی۔ آسمان میرے قدموں میں تھا۔ ستارے میری راہوں میں بچھے ہوئے تھے۔ ہمیں نہ وقت گزرنے کا احساس تھا اور نہ جدا ہونے کا خوف! ہم ایک ہوچکے تھے۔ اب کوئی طاقت ہمیں الگ نہیں کرسکتی تھی۔ مجھے اپنی محبت اور شان کی وفا پر پورا یقین تھا کہ ہم پھر ملیں گے۔ میری ساس..... جنہیں میں امی جان کہتی تھی، میرے لیے بہت سے میتھی ڈریسز اور جویلری خرید کر دی تھی۔ میرے پاس سسرال کی طرف سے آئے ہوئے بے تحاشا گفٹس تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری زندگی ہی سنور گئی۔ مجھے خود سے کچھ خریدنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ تحفے میں آئی ہوئی بے تحاشا چیزیں بھری ہوئی تھیں، جنہیں میں روزانہ ہی استعمال میں لارہی تھی۔

شادی کے بعد میں اتنی اہم ہوجاؤں گی، مجھے پتا ہی نہ تھی۔ کوئی بھابھی کہہ رہا تھا، کوئی بیٹی، کوئی بہو، تو کوئی چچی جان۔ میں اتنے سارے رشتوں میں گھری خود پر فخر کررہی تھی۔ دعوتوں کا لامتناہی سلسلہ تھا جو وقتاً فوقتاً جاری تھا۔

شان مجھے دیکھ دیکھ کر قربان ہوتے تھے۔

تھی تو میں سانولی سی، مگر شادی کے بعد تو ایسی بدل گئی کہ حیران ہو ہو کے آئینہ دیکھتی نہ تھکتی۔ اس پر ان کے مخمور آنکھیں..... جو ہر لمحہ میرا پیچھا کرتی تھیں اور میں کبھی گھبرا کے اور کبھی شرما کے نظریں جھکا لیتی تھی۔ میری روانگی کے دن نزدیک سے نزدیک تر آرہے تھے۔ ہر چند کہ مجھے خود پر یقین تھا کہ میں جلد سے جلد ان کو بلانے کا بندوبست کروں گی! مگر شاید عورت ہونے کے ناتے جذباتیت کا شکار ہورہی تھی۔ خوامخواہ کے وسوسے ذہن میں پل رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی عارضی جدائی کے خیال سے بھی ہراساں تھی، شاید جدا ہونے کا ڈر اور خوف، موت کے خوف کے برابر ہی ہوتا ہے۔

ایئرپورٹ پر انہوں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میں رخصت کیا اور مجھے ہلکی ہوئی روانہ ہوئی۔

☆.....☆

گھر پہنچی بھی نہ تھی کہ انہوں نے مجھے کال کی۔ ان کی آواز نے جیسے مجھے ایک توانائی عطا کی، وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتے ہیں۔ میں نے پہلی فرصت میں ان کے ویزا کے پیپرز داخل کرادیے اور اب جواب کا انتظار تھا۔ یہ انتظار کی کیفیت لحہ لحہ موت ہی تو ہوتی ہے۔

اور پھر 11 ستمبر امریکہ پر ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا واقعہ پیش آگیا۔ اس نے امریکہ سمیت ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مسلمان اور خصوصاً پاکستانی ہونے کے ناتے ہماری زندگی کا اسٹرکچر ہی بدل گیا۔ اتنی پراہلمز اور اتنی سختیاں شروع ہوگئیں کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ ہم یہاں کے شہری ہیں۔ ہر جگہ مسلمان ہونا ہمارے لیے مصیبت بن گیا۔

اور پھر دو سرا ہم جو میری زندگی پر گراوہ تھا شان کا ویزا ریجیکٹ ہوجانے کا۔ ہر چند کہ کاغذات میں کسی طرح کی کوئی کمی بھی نہ تھی۔ یہاں تو یہ عام تھا کہ امریکہ سے لڑکیاں پاکستان اور انڈیا وغیرہ جاکر اپنے کزنز سے

جنگِ پلاسی

جنگ پلاسی، جنوبی ایشیا کی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ یہ جنگ جو اس خطے میں برطانوی حکومت کا سنگِ بنیاد سمجھی جاتی ہے، 23 جون 1757ء کو لڑی گئی تھی۔ جنگِ پلاسی کا ایک فریق بنگال کا حکمران نواب سراج الدولہ تھا جب کہ اس کے مدِ مقابل انگریزوں کی کمان لارڈ کلائیو کے ہاتھ میں تھی۔ اس جنگ میں نواب سراج الدولہ کے وزیر میر جعفر کی قیادت میں حصہ لینے والا دستہ لاتعلق کھڑا رہا اور یوں لارڈ کلائیو نے بڑی آسانی کے ساتھ فتح حاصل کرلی۔ نواب سراج الدولہ شہید کردیے گئے اور انگریزوں نے غدار میر جعفر کو کٹھ پتلی نواب بنایا مگر تھوڑے ہی دنوں بعد انہوں نے اس سے بھی چھٹکارا حاصل کرلیا اور پورے بنگال کے حکمران بن گئے۔

شادی کے بعد بلاشبہ میں مگر میرے ساتھ یہ کیسی انہونی ہوئی..... میری تو ساری خوشیاں پل کے پل میں غم میں بدل گئیں۔ میرے ابو یہاں کے پرانے رہائشی تھے۔ انہوں نے ہر وہ ترکیب استعمال کرلی جو شان کو بلانے کے لیے کارگر ثابت ہوسکتی تھی۔ مگر ملک کے حالات کے دباؤ نے وقتی طور پر سب کچھ مفلوج کرکے رکھ دیا۔

امید کے سب دروازے مقفل پڑے تھے۔

میری پڑھائی ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی سوچا تھا کہ شان سے شادی تو ہو ہی چکی ہے لہٰذا اک نارمل ہاؤس وائف کی زندگی بسر کروں گی مگر حالات کا تقاضہ کچھ اور تھا۔ مسائل کی خندق منہ کھولے سامنے تھی۔ تب ہی امی ایجوکیشن کا ارادہ کیا۔ مگر خیال کا ناگ ہر وقت ڈستا رہتا تھا کہ ”اگر شان یہاں نہ آسکے تب؟ تب کیا ہوگا؟“

میں نے اپنی اسٹڈی شروع کی ہائر اسٹڈی کے لیے، ابھی 2 سال کا وقفہ تھا۔ شاید قدرت مجھے خود کو سنوارنے کا موقع دے رہی تھی میں نے تو ہاؤس وائف بننے کا سوچا تھا مگر میں تو شادی شدہ ہوکر بھی محرومِ زندگی تھی۔ محرومِ محبت تھی وہی نرم گرم بستر اب کانٹوں بھرا ہوگیا تھا۔ کنواری لڑکی بہت سال تک ماں باپ کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ مگر شادی شدہ لڑکی کا تو ایک ایک دن گھر والوں پر بھاری ہوتا ہے۔ ہر چند کہ میرے باپ دنیا کے بہترین ماں باپ تھے مگر میں نے آنے والے دنوں کے خیال سے خوف زدہ ہوکر اپنی پوری توجہ اسٹڈی کی طرف لگادی۔ میں حالات سنورنے کی کوشش اور دعا ہی کرسکتی تھی۔

پہلے کے مقابلے میں میری صحت الگ خراب ہوگئی تھی۔ رات دیر تک جاگنا، مستقل سوچنا میری عادت بن چکی تھی۔ نہ جانے قدرت کونسا انتقام مجھ سے لے رہی تھی، اس کشمکش میں پورا سال گزر گیا، میرا فائنل ایئر آگیا۔ شان سے فون پہ روز ہی بات ہوتی تھی۔ مگر جس طرح ہمنے کے شروع دنوں میں جیب میں پیسے نظر آتے ہیں اور مہینہ ختم ہونے تک جیب خالی ہوجاتی ہے۔ یہی حال شان کے لہجے اور گفتگو کا تھا۔ وہ شروع شروع لگاوٹ بھری باتیں وہ رومانس! ان کی باتوں سے تو اب مجھے کڑوے پن کا احساس ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا کہ جیسے وہ مجھ پر شک کررہے ہیں کہ میں کسی اور کے چکر میں پڑ کر ان سے آنا کانی کررہی ہوں۔ میں پورے طور سے اپنے ایگزام کی تیاریوں میں لگی تھی، ہر چند کے شان کا خیال دل سے نہیں نکلتا تھا مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ صبر جیسا زہر بھی گھونٹ گھونٹ پی لیا۔ شاید مجبوری کا دوسرا نام ہی صبر ہے۔

☆.....☆

دو دن سے میں انہیں ٹرائی کررہی تھی، مگر وہ فون پر مل ہی نہیں رہے تھے۔ سوچ آف جارہا تھا۔ میرے دل کو جیسے کچھ لگ گئے۔ کھر پر فون کیا تو ساس کی چہکتی آواز بھی چہکی محسوس ہوئی، مگر میں مسلسل فون پر

ٹرائی کرتی رہی۔

اس الجھن نے مجھے بے حال کر دیا، شان کی یاد شدت سے آ رہی تھی۔ یہ دل کمبخت بھی کتنا ظالم ہوتا ہے۔ ساری دنیا اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ میں نے آناً فاناً پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا اور شام تک ساری تیاری مکمل کر لی۔

☆.....☆

"اگر وہ نہیں آ سکتے یہاں نگر میں تو جا سکتی ہوں وہاں۔"

ابو کو فون پر یہ خبر سنائی تو انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ میں سیٹ ریزرو کروا کے ٹکٹ ساتھ لے کر آؤں گا۔

میرے ماں باپ جب میرے ساتھ تھے تو پھر مجھے کس چیز کا خوف! شام کو ابو آئے تو ٹکٹ کے بجائے ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا، جو انہوں نے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے لرزتے ہاتھوں سے ایمبیسی کے لفافے کو چاک کیا اور اپنے پیارے ماں باپ سے لپٹ کر رو پڑی۔ اس میں میری خوشیوں کا خزانہ پوشیدہ تھا۔ سب کاغذات مکمل تھے پچھلی بار ویزا اپلائی کیا تھا تو کچھ کمی بیشی اور کچھ سیاسی حالات کی وجہ سے ریجیکٹ ہو گیا تھا، مگر اس بار ابو نے مکمل تیاریوں کے ساتھ ویزا اپلائی کیا اور منظور ہو گیا تھا۔ میرے ابو دنیا کے بہترین باپ تھے۔ انہوں نے مجھے خبر بھی نہ لگنے دی اور اپنی بیٹی کی خوشیوں کے لیے دوڑ دھوپ کرتے رہے۔

میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل رہے تھے۔ مجھے آخری مراحل کے لیے ایمبیسی بلایا گیا تھا۔ ہفتہ اور اتوار کی چھٹی کی وجہ سے دو دن درمیان میں تھے۔ یہ میرے لیے قیامت کے دن تھے۔ یہ دن میرے اور شان کے درمیان تھے۔ یہ میں نے کیسے گزارے، یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ اس رات جیسے وہ خواب میں تھے، اچانک انہوں نے کہا۔ "آنکھیں بند کرو میں تمہاری بند آنکھیں کھلتے دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے آنکھیں بند کر کے کھولیں تو میں پوری طرح جاگ رہی تھی۔ میں نے آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو میرے ذہن میں ان کی باتیں گونج رہی تھیں۔

"تمہاری آنکھیں چغتائی آرٹ سے مشابہ ہیں۔"

ان کے خوابیدہ لہجے والی سرگوشی میرے کان میں گونجی۔ احساس کے پردے پر ان کا سراپا لہرایا اور پھر میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ گھر کے میں کوئی نہ تھا میں، میری بے بسی اور تنہائی تھی۔ نہ جانے کتنے آنسوان کی یاد میں بے بسی اور تکیے میں جذب ہوتے گئے۔ میں بستر سے اتری اور کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ شروع تاریکیوں کا ہلالی چاند جگمگا رہا تھا۔ میرے دل سے آہ نکل گئی۔

جاگتے اور سونے کے ان لمحات میں نہ جانے کب تک میں جاگتی رہی۔ صبح ایمبیسی جانا تھا، مگر نیند کا پتا نہ تھا۔ میں نے الارم پھر چیک کیا اور آنکھیں موند لیں۔ ہمیں صبح آٹھ بجے تک نکل جانا تھا۔ ابو مجھ سے پہلے تیار بیٹھے تھے۔ ابھی ہم نکلنے ہی والے تھے کہ ڈور بیل بجی۔ دروازے پر پوسٹ مین تھا۔ "نا معلوم کون ہیں؟ یہ ان کی رجسٹری ہے۔" میں لپک کر دروازے تک پہنچی۔

"جی، یہاں سائن کر دیں" پوسٹ مین نے ایک بھاری لفافہ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے سائن کیے اور دھڑکتے دل سے لفافہ کھولا۔ راحیل کا خط تھا۔

میری بیتابانہ نظریں ان کی تحریر سے الجھی ہوئی تھیں اور پھر میری بیتابی سکتے میں بدلنے لگی۔ آنسوؤں سے خط کی تحریر ہی دھندلا گئی۔

خط کیا تھا الزامات کی بھرمار تھی..... لکھا تھا۔

☆.....☆

"تم امریکہ میں رہنے والی آزاد تتلی جسے دنیا کو دکھانے کو اور دنیا کو بتانے کو ایک شوہر کی ضرورت تھی! میں نے سوچا تھا شادی کے بعد تم مجھے امریکہ بلا لو گی..... بس یہی سوچ کر تم جیسی معمولی صورت کی لڑکی کو اپنی بیوی بنا لیا۔ میں تمہارے قریب آ گیا، یہ جانے بغیر کہ تمہیں میری نہیں ایک رشتے کی ضرورت تھی۔ تم کیا سمجھتی ہو، میرے لیے یہاں لڑکیوں کی کمی ہے۔ میں تمہیں اور خود کو اس نام نہاد بندھن سے آزاد کرتا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں..... طلاق، طلاق، طلاق۔"

اس لفظ کے بعد کچھ اور سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میرا وجود آتش فشاں کی نذر ہو چکا تھا۔

☆.....☆

ساتویں سچ بیانی

عشق عشق

مہر پرویز احمد

میاں جنوں سے ایک سچے عاشقِ رسول ﷺ کی کہانی

جب سے یہ دنیا عدم سے وجود میں آئی ہے اور حضرت انسان نے زمین پر اپنا پہلا قدم رکھا ہے، تو اس وقت سے آج تک اس کی پہلی ضرورت وحاجت پانی رہا ہے۔ اس نے اپنی خوراک کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بھیڑ بکریاں پالنا شروع کردیں اور پانی کی ضرورت پوری کرنے اور اسے استعمال میں لانے کے لیے دریاؤں کے کنارے آباد ہوئے۔ وقت کے تغیر و تبدّل نے دنیا کو تہ و بالا کردیا۔ چند سو لوگ بڑھ کر کروڑوں میں تبدیل ہوگئے، گویا وسائل میں اضافے کے ساتھ ساتھ انسان کی آبادی میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور ان کی ضرورتیں بھی اسی رفتار سے بڑھتی گئیں۔ دریا کنارے آباد لوگ اب بھیڑ بکریوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی بھی کرنے لگے تھے۔ بنجر زمین سر سبز و شاداب ہونا شروع ہوگئی۔ صرف بھیڑ بکریاں چرانے والے چرواہے اب زمیندار کہلانے لگے۔ جن لوگوں کے پاس زیرِ کاشت رقبہ بہت زیادہ تھا وہ اب بہت بڑے زمیندار کہلانے لگے تھے۔ ان کے مرہونِ منت وہ لوگ تھے، جن کے پاس کوئی زمین نہ تھی۔ وہ لوگ جو مزارع کہلاتے تھے اور شکم پُری کے لیے ان وڈیروں کی زمینوں پر کام کرتے اور بدلے میں ضروریات زندگی حاصل کرتے۔

ہر دور میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بڑوں کے آگے ہاتھ باندھنا، پیشانی خم کرنا اور کورنش بجالانا باعثِ اعزاز سمجھتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے خوشامد اور چاپلوسی سے اپنا کام چلایا ہوا تھا۔ بڑے لوگوں کی اولادوں اور ان کے وڈیروں پر جا کر ان کی جھوٹی تعریف کرتے اور اس کے بدلے میں منہ بھر انعام واکرام حاصل کرتے۔

ہمارا علاقہ راوی بھی ایسے ہی زمینداروں پر مشتمل ہے، جو خوشامد کو پسند اور انسانوں کو غلام بنانا جانتا ہے۔ وڈیروں کے پاس نہ ختم ہونے والی بڑی بڑی جائیدادیں ہیں۔ بڑے بڑے وسیع و عریض قطعات اراضی ان کی ملک میں ہے جو انہوں نے غریبوں کا خون چوس کر حاصل کی ہے یا پھر غریب ہاری کی زمین پر قبضہ کرکے مالک بن بیٹھے ہیں یا انہیں انگریز سرکار نے اپنی نمک خواری کے باعث نوازا ہے۔ ان کی زمینوں پر کام کرنے والے غریب مزدور ہیں، اس کے ساتھ ہی ایک ایسا طبقہ بھی ہے، جو ان کام کرنے والے مزدوروں اور ہاریوں سے بھی زیادہ کمالیتا ہے۔ خوشامدی اور چاپلوس لوگ ان کی جی حضوری کرکے وڈیروں سے بہت کچھ حاصل کرلیتے ہیں۔

ہر فصل کی تیاری کے موقع پر وہ چاپلوس ان کی جھوٹی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے ہیں اور اپنی جھوٹی سچی دعاؤں کے ذریعے ان کا دل موہ لیتے ہیں۔ ان چاپلوسوں کے دل موہ لینے والے مشہور فقرے کچھ اس طرح سے ہوتے ہیں۔

''میرے سردار! آپ کا ڈیرہ آباد رہے اور آپ کی سرداری جنم جنم قائم دائم رہے۔ آپ اس طرح سدا غریبوں پر اپنی مہربانی کرتے رہیں۔ خدا اسی طرح آپ کا اقبال بلند رکھے اور آپ کی سخاوت اسی طرح قائم رہے۔''

حالاں کہ آج یہ تلخ حقیقت ہے کسی کا نہ تو کوئی ڈیرہ آباد رہا نہ ہی اس کی سرداری قائم رہی۔

اب ہر شخص اپنا کماتا اور اپنا کھاتا ہے، بے روزگاری اور مہنگائی نے بڑے بڑے لوگوں کی چیخیں نکال دی ہیں۔ اب نہ تو وہ سردار رہے اور نہ ہی مفت روٹیاں توڑنے والے۔ اب خوابوں کی دنیا میں رہنے کے دن ہوا ہوئے اور حقیقت کی دنیا میں رہنے کے دن آگئے ہیں۔ اب لوگ وڈیرہ شاہی اور سرداری نظام سے تنگ آچکے ہیں۔

ہوا کچھ یوں کہ پچھلے دنوں ہمارے علاقے کی ایک معزز شخصیت، اللہ والے، خدا ترس اور اللہ تعالیٰ کے حکم اور نبی کریم ﷺ کی سنت پر عمل پیرا، نہایت نیت سیرت ونیت صورت خالص رب کی رضا کے لیے ہر وقت برسرِ پیکار رہنے والے عمرہ ادا کرنے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

وہاں ان کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اور جس نے ان کے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور معرفت کو اور راسخ کردیا اور جوان کی زندگی کی کایا پلٹنے کا سبب بنا۔ اس حوالے سے وہ کچھ یوں فرماتے ہیں کہ عمرہ کی ادائیگی کے بعد میں مدینہ منورہ گیا۔ ایک صبح میں آقائے نامدار ﷺ کے روضۂ اقدس کے سامنے گیا اور استحیائی، عاجزی، انکساری، عشق ووجد، محبت وخلوص وپیار اور لگن کے ساتھ دونوں ہاتھ باندھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کیں اور تخیل میں آقائے نامدار ﷺ کے حضور نذرانۂ عرض کیا۔

یارسول اللہ ﷺ! ہمارے علاقے میں میراثی لوگ وڈیرے لوگوں کے ڈیروں پر جا کر ان کی جھوٹی تعریف کرتے ہیں۔ ان کی جھوٹی شان بیان کرتے ہیں، وہ ان کو اونچا اڑا دیتے ہیں۔ وہ ان کے حضور کہتے ہیں کہ:

''آپ کے ڈیرے سلامت اور سرداریاں قائم رہیں۔''

وڈیرے ان کے منہ سے اپنی جھوٹی تعریف سُن کر بہت خوش ہوتے ہیں اور انہیں انعام واکرام سے نوازتے ہیں۔

''میں بھی آج آپ ﷺ کا میراثی بن کر آپ ﷺ کے غلاموں کی صف میں کھڑا ہوں اور میں آپ ﷺ کا شجرۂ نسب پڑھتا ہوں۔ یارسول اللہ ﷺ میں بڑی آس وامید لے کر آپ ﷺ کے در پر آیا ہوں۔ آپ ﷺ کرم فرمایئے اور اپنی سخاوت وکریمی کے چند قطرے میرے دامن میں ڈال دیجیے۔ اپنے کرم سے میری خالی جھولی بھی اپنی رحمت سے بھر دیجیے۔ مجھ پر بھی آپ ﷺ کی چشم کرم ہو۔ مجھ عاصی کو بھی اپنا غلام اور گدا بنا لیجیے تاکہ سدا میں آپ ﷺ کے در کا منگتا بنا رہوں۔''

یارسول اللہ ﷺ آپ کا ڈیرہ سدا آباد رہے اور آپ ﷺ کی سرداری تاحشر قائم رہے ودائم رہے۔

برستا نہیں دیکھ کر ابرِ رحمت
بدوں پر بھی برسا دے برسانے والے

پھر میں نے محمد ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرّہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہد بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس سے حضرت آدمؑ تک آپ ﷺ کا شجرۂ نسب پڑھا۔

میں شجرہ پڑھتا رہا، میری آنکھوں سے آنسو جھڑی کی صورت رواں رہے، پھر جب میں آپ ﷺ کا شجرۂ شریف پڑھ کر فارغ ہوا تو میں نے آپ ﷺ کی ذات بابرکات پر درود شریف کے نذرانوں کا سلسلہ شروع کردیا اور میں تادیر پورے خشوع وخضوع کے درود پاک کا تحفہ خاتم المرسلین کی بارگاہ میں پیش کرتا رہا۔ پھر جب درود پڑھ کر فارغ ہوا تو میں نے شہر مدینہ کے مقامات مقدسہ کی زیارات کیں اور پھر میں جب عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلا تو ایک شخص بڑی تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور وہ میرا نام لے کر بولا۔

''آپ اوہو ہیں۔''

میں نے ہاں میں جواب دیا۔

وہ شخص سانولے رنگ کا افریقہ کا تھا۔ اس نے کہا کہ ''وہ آدمی جس کے ساتھ بہت سے لوگ ہیں کون ہے؟'' انہوں نے آپ کا نام لیا۔

وہ بولا۔ ''میں عصر کی نماز سے قبل حرم پاک میں آیا اور درود شریف پڑھنے لگا، اسی دوران مجھے اونگھ آگئی تو مجھے خواب میں آقائے نامدار ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔''

آپ ﷺ نے فرمایا!

''فلاں شخص کو میرا سلام دینا۔ میں آپ کو یہ پیغام دینے آیا ہوں۔''

یہ سننا تھا کہ میرے جسم کا رواں رواں خوشی سے نہال ہوگیا۔ میں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا اور محبوب نبی ﷺ پر صلاۃ وسلام کے گلدستے بڑی عقیدت ومحبت سے پیش کیے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میرا پیسا خرچ کرنا، گھر بار چھوڑنا، خود کو مشقت میں ڈالنا، وقت لگانا، سب کا حاصل مجھے مل گیا تھا۔ مجھے اس وقت وہ خوشی نصیب ہوئی تھی جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

ہمہ وقت اب تو میری یہی دعا ہے کہ ''کاش کہ ہر مسلمان ایسا ہی عاشقِ رسول ﷺ بن جائے کہ اس پر میرے آقا کا کرم جاری وساری رہے۔''

آمین

☆.....☆

ہاف رسٹ

گڈی آپا

لاہور سے ایک بدنصیب جوڑے کی لہوریلاتی سچ بیانی

کاشف و عمرانہ تایا چچا زاد تھے۔ دونوں والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ آباؤ اجداد کی حویلی نے سارے بہن بھائیوں کی رہائش کا مسئلہ حل کردیا تھا۔ وہ تو شکر کہ دادا خدا بخش نے اپنے آباؤ اجداد کی جائیداد کو نہ صرف سنبھالا، بلکہ اپنی کمائی بھی شامل کرکے ایک بڑی حویلی، جس کے تین کمرے اور ایک بڑا صحن، ہرسٹ کے ساتھ ایک باورچی خانہ اور ایک غسل خانہ بنادیا گیا تھا، ورنہ اگر وہ بھی اپنے بھائی کی طرح نشہ میں اُڑا دیتے تو بچوں کی زندگیاں اتنی آسان نہ ہوتیں۔

چاروں پھپھیاں بھی حویلی ہی میں رہتی تھیں۔ چوں کہ دادا نے ان کی شادیاں کرتے وقت یہ شرط لگادی کہ میں گھر جمائی رکھوں گا۔ کسی کو یہ شرط قبول ہو تو وہ میری بیٹیوں سے شادی کرے۔ ہرسٹ کے ساتھ ہی ایک ایک بوگن بلیا کی بیل لگادی گئی تھی، تاکہ ان کے مختلف رنگوں سے گھر جنت کا نمونہ لگے اور رسیوں سے چھت بنا کر بیلوں کو اُن پر چڑھادیا گیا تھا۔

کمروں کی چھت پر ہرسٹ کے اوپر کمرے اور برآمدے بنائے گئے تھے، جن کو خوب صورت فرنیچر سے آراستہ بھی کیا گیا تھا۔ دیواروں سے ذرا ہٹ کر موٹے پائپ سوراخوں والے لگادیے گئے تھے۔ صحن کے درمیان میں کنواں تھا۔

پائپوں کا تعلق ٹنکیوں سے جوڑ دیا گیا تھا۔ صبح شام اونٹ گھوم پھر کے سے ہودیاں بھر دیتا تھا، جس میں بچے نہاتے تھے اور اوپر پائپوں سے پانی گرتا ہوا۔ واہیں ہودی میں آجاتا تھا۔ یہ دادا جان کی ذہنی اختراع تھی۔ یہ گرمیوں میں حویلی کو ٹھنڈا اور بچوں کو خوش رکھنے کا ایک بہانہ تھا۔

شام ہوتے ہی دادا جان اپنی آبائی بڑی کرسی کی خوب صورت کرسی پہ بیٹھ جاتے اور سب کا جائزہ لیتے، وہ بچوں کو بٹھا کر یہی درس دیتے کہ انسان تنہا کچھ بھی نہیں۔ اتحاد و اتفاق ہی میں برکت ہے۔" اکثر کہتے کہ "اللہ کی رحمت سے میں نے اپنی پانچ نسلوں کے رہنے کا بندوبست کردیا ہے۔ اب اس کو قائم رکھنا تمہارا کام ہے۔" بہو بیٹیوں سے شفقت سے پیش آتے۔ ان کی ہر ضرورت کا خود خیال رکھتے، ہر موسم میں سب کے لیے ایک جیسا لباس لاتے لیکن رنگ مختلف ہوتے۔ ہر کوئی اپنی اپنی پسند کا رنگ انتخاب کرلیتا۔ ان میں خدمت گزار بھی شامل ہوتے، جن کو ویسا ہی کھلاتے اور پہناتے جیسا ہم لوگ کھاتے پہنتے۔

شام کو گھر میں ایسے رونق ہوتی جیسے کوئی میلہ لگا ہے، پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں، جن کو دیکھ دیکھ وہ جیتے،

ہر وقت ہر لمحہ عبادت میں گزارنے کی کوشش کرتے۔ فجر کی نماز کے بعد اشراق کی نماز پڑھتے، سید العالمین ﷺ کی ذات اقدس پر درود وسلام کے تحفے بھیجتے، جیسے ہی عبادت سے فارغ ہوتے، جامۂ نماز سے ہی ناشتا آجاتا اور ڈھیروں پکانے والی کو دعائیں دیتے۔ دوپہر کو اوپر والے برآمدے میں خوب صورت لکڑی کے فرنیچر سے آراستہ تھا، جا بیٹھے اور اوپر سے سب کی حرکات وسکنات پر نظر رکھتے، یوں انہوں نے بچوں کو پالنا آسان کرلیا تھا، ورنہ سوتیلی ماں کے تھپیڑے انہیں کسی بھی قابل نہ ہونے دیتے۔ انہوں نے تنہائی قبول کرلی تھی جو ان کا بہترین فیصلہ تھا، جسے سارے خاندان والے سراہتے تھے۔

کوئی بھی بڑے نصیب والی ہوتی ہے جو شوہر کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنتی ہے، ورنہ اکثر ماں کی خدمت کا صلہ اس کی اولاد کو اس سے دور رکھ کر الزامات لگا کر اپنا کام خود کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ بھائی کو بھائی سے لڑوانے والی، خاندان کو بے چین کرنے والی کسی دوسرے کو برداشت نہ کرنے والی ہوتی ہے، جو مرد کی دین ودنیا برباد کردیتی ہے۔

دادا جان کو اپنے خوابوں کو حقیقت بنانا ان کا مقصد عین تھا..... دادی سکینہ جی بے انتہا خوبیوں کی مالک تھیں، جن کی گواہی سارے خاندان والے دیتے تھے۔

دادی سکینہ حسین ہونے کے علاوہ عبادت گزار، خدمت گزار اور مہمان نواز بھی تھیں، محن کی دوسری جانب انگور کی بیلیں لگائی تھیں، جن کی چھت بھی بنائی گئی تھی۔ انگور آنے پر ان کے اوپر کپڑے کی تھیلیاں چڑھانا اور اُن کو پرندوں سے محفوظ کرنا ان کا من پسند کام تھا۔

دادی جان نے اپنے ہاتھوں سے ایک کونے میں ٹیڈی بکریوں کا ڈربہ بنایا اور اوپر مرغیوں کا، اس سے اوپر کبوتروں کا، بائیں جانب بڑی بڑی پانچ سیڑھیاں بنائی تھیں، جن پر بھی بھی بکریوں کے بچے مرغیاں اور کبوتر بیٹھے ہوئے بہت بھلے لگتے تھے۔ کبوتر کے گھر کے اوپر چھجہ بھی بنایا گیا تھا۔ صبح سویرے دانہ چُن کر اس پر بیٹھے پرندے بڑے بھلے لگتے، لیفٹ سائڈ میں ہر طرح کی سبزیاں اُگائی گئی تھیں، جن میں کالی توری، بھنڈی، بینگن کی بھی خوب بہار لگتی۔ صبح سویرے دادی جان عبادت سے فارغ ہو کر ٹوکری لے کر اپنے باغیچے میں آجاتیں، سبزی و انگور کے علاوہ گلاب اور موتیے کے پھول چُن لاتیں اور دادا جان کے آبائی پلنگ پر بیٹھے کر ہار بنانے لگتیں اور پھر دادا جان کو پیش کرتیں یا پھر ان کی کرسی کے ساتھ لٹکا دیتیں۔

اللہ تعالیٰ نے اُن کو کثیر اولاد بخش کر بہت بڑا احسان کیا تھا، جس کا وہ شکر یہ ادا کرتے نہ تھکتے تھے۔

اور بہ وقت مرگ انہوں نے کہا تھا کہ ''میرے بچوں کے ساتھ ساتھ میری پھول پھلواڑی کا بھی خیال رکھنا.....''

یہی وجہ تھی اور یہ ان کا پیار ہی تھا کہ بیچ ایک لمحے کو بھی باپ سے جدا نہ ہوتے۔ جہاں وہ ہوتے وہیں پر آجاتے۔ وہ روتے ہوئے بچوں کو میٹھی میٹھی ٹافیاں گولیاں دے کر چپ کرواتے، جو بھی بچہ تنگ کرتا اُسے کچھ نہ دیا جاتا۔ بچے پیار بھرے ماحول میں پل بڑھ رہے تھے۔ جو بچہ صبح کی نماز نہ پڑھتا اس کا انعام روک دیا جاتا۔

صبح صبح تانگا بچوں کو اسکول کے وقت لینے کے لیے آجاتا اور واپس بھی لے آتا۔ وقت پر لگا کر گزرتا رہا۔

اب کاشف اور عمرانہ نے جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ لیا تھا۔ عمرانہ دسویں میں اور کاشف ایم اے کی تیاری کرنے لگا۔ ایک شام دادا جان نے سب کو اکٹھا کیا اور بولے۔ ''میں عمر کے اُس حصے میں ہوں جہاں پر اپنے سارے کام جلد از جلد ختم کرلینے چاہئیں۔ میں چاہتا ہوں میں کاشف اور عمرانہ کی شادی کی خوشی دیکھ لوں۔ قدرت کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ جو مجھے اپنے بول پورے کرنے کی توفیق دے رہا ہے۔''

دادا جان کہہ رہے تھے کہ ''یہ تو سب جانتے ہیں کہ جیسے ہی عمرانہ نے دنیا میں قدم رکھا تھا، میں نے کاشف کے لیے اُسے مانگ لیا تھا، گو میں جانتا ہوں

کاشف ابھی پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا ہے لیکن جیسے ہی وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگا تو رخصتی کردی جائے گی۔ فی الحال منگنی مکمل طور پر کردیتے ہیں، کہیں یہ خوشی میری حسرت نہ بن کر رہ جائے۔''

دادا جی کی بات کو بھلا کون ٹال سکتا تھا اور ان کی بات پر کسی کو اعتراض نہ تھا۔ چناں چہ بڑی دھوم دھام سے نانی کو گھر بلوا کر آدھے آدھے کلو کے لڈو دیسی گھی میں بنوائے گئے۔

ساری حویلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ بوگن بلیا بھی پورے جوبن پر تھی۔ سات رنگوں کی توس قزح دادا جی کے گھر میں اُتر آئی تھی۔ ادھٹ رکھا نہ گیا تھا مبادہ کہیں پانی کی کمی نہ ہوجائے۔ گرتا ہوا پانی میوسٹی پیدا کررہا تھا۔ بے ہودی سے نکلنے کو تیار نہ تھے۔ مہمان آنا شروع ہوگئے تھے۔ دروازے پر ڈھول بج رہا تھا۔

سنہرے رنگ سے دروازے بنائے گئے تھے۔ پھولوں سے رونقیں مہکا دی گئی تھیں۔ پورا خاندان مدعو تھا۔ لوگ دادا جان کی حویلی پر رشک کررہے تھے۔ ان کا انتظام تو قابل دید تھا۔ غرض کہ عمرانہ اور کاشف کو ایک پکے وعدے کی انگوٹھی میں پرو دیا گیا۔ خاندانی زیور جو ان کی دادی جان کا تھا۔ عمرانہ کا حصہ بنا کر اس کو پہنا دیا گیا۔ دونوں طرف سے اکلوتے ہونے کی وجہ سے کافی زیور انہیں پڑا تھا، جس پر آنکھ نہ ٹکتی تھی۔

قورمہ، نان، پلاؤ کی دیگوں پر دادا جان خود بیٹھے ہوئے تھے، تاکہ کوئی خرد برد نہ ہوجائے، پھر آخر میں زردہ جو بادا موں اور دیگر میوہ جات سے بھرا ہوا تھا، مہمانوں کو پیش کیا گیا، آخر میں نمک والی گلابی چائے، جس سے ہر ایک نے خوب لطف اٹھایا، پیش کی گئی۔

عمرانہ اور کاشف بہت خوش تھے۔ دادا جان نے حکم دیا کہ عمرانہ کو مزید تعلیم نہ دلوائی جائے۔ کاشف لائق فائق ہے، خوب کمائے گا اور اپنی بیوی کی ہر جائز ضرورت پوری کرے گا۔ ہم نے کون سا عمرانہ سے نوکری کروانا ہے.....

دادا جان کی حکم عدولی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، کیوں کہ وہ بڑے عاقل تھے، جیسے ہی مہمانوں سے فارغ ہوئے تو دادا جان کی طبیعت خراب ہونے لگی، رات بھر پیٹ کے درد سے تڑپتے رہے۔

اشارے سے بہو سے وضو کا پانی مانگا۔ نماز بستر پر ہی ادا کی۔ بعد نماز تسبیح کرنے لگے، سب کو حکم دیا کہ ''تم لوگ جاؤ آرام کرو۔ ساری رات کے جاگے ہو۔ جاؤ..... سو جاؤ۔'' حکم بجالایا گیا۔ کاشف اور عمرانہ اُن کے پاؤں کی طرف بیٹھے رہے۔ اُن کو جانے کے لیے نہ کہا گیا تھا.....

پھر دادا جی نے دونوں کو قریب بلایا۔ ''یہ میری طرف سے تم دونوں کا تحفہ انگوٹھیاں ہیں۔'' دادا جان نے انگوٹھیاں پہناتے ہوئے کہا۔ ''خدا تم دونوں کی جوڑی سلامت اور خوش رکھے۔'' دادا جان نے کراہتے ہوئے کہا۔

''دادا جان! یہ سب آپ کا ہی تو ہے..... آپ ہی نے تو کیا ہے، انگوٹھیوں کی کوئی کمر رہ گئی تھی کیا۔''

دادا جان خاموش رہے اور انہوں نے منہ پر کپڑا لے لیا اور تسبیح کرنے لگے۔ عمرانہ اور کاشف آہستہ سے اُٹھے، تاکہ دادا جان کے آرام میں خلل نہ آئے..... اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد بڑی بہو ناشتا لے کر آئی اور ایک طرف رکھ کر ناشتے کے لیے اُن کو جگایا..... تو وہ خالق حقیقی سے جاملے تھے..... ہاتھ سے تسبیح گر چکی تھی۔

جہاں ابھی چند گھنٹے پہلے خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے، وہی گھر اب ماتم کدہ بن گیا۔ حویلی میں ہُو کا سا عالم ہوگیا..... تمام رُمتیں اور رونقیں رخصت ہوگئیں۔

وقت پر لگا کر اُڑتا رہا۔ آج کاشف بہت خوش تھا، اس کی منزل قریب آگئی تھی۔ بچپن سے دیکھا ہوا سپنا پورا ہونے کو تھا۔ اُسے یونیورسٹی میں اوّل قرار دیا گیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اُس کے پَر لگ جائیں اور وہ گھر پہنچ جائے، تاکہ وہ اپنے والدین کو یہ خوشی کی خبر سنائے.....

لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا.....

شام ہونے کو تھی، سارے گھر والے پریشان ہونے لگے..... اچانک گھر پر ایک لڑکا آیا..... جس

نے بتایا کہ کاشف کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ اسپتال میں ہے، گھر میں رونا پیٹنا شروع ہوگیا..... بھاگ دوڑ کر اسپتال پہنچے، کاشف کو آپریشن تھیٹر لے جایا گیا تھا۔ چار گھنٹوں کے آپریشن کے بعد اُسے انتہائی حساس کمرے میں رکھا گیا، جہاں کوئی داخل نہ ہوسکتا تھا اور باہر ہی سے اُسے دیکھا جاسکتا تھا۔ والدین اور سارا خاندان برے حال میں تھا۔ جتنا جتنا خون تھا، اپنی اپنی جگہ تڑپ رہا تھا۔ آج دادا جان کی کمی ہر ایک کو شدت سے محسوس ہو رہی تھی، شاید اگر آج وہ زندہ ہوتے تو حوصلے اس قدر کمزور نہ ہوتے..... تڑپتے..... روتے دھوتے وقت گزرتا رہا۔ کاشف کو کسی کی نظر لگ گئی تھی..... کڑیل جوان کاشف چند ہی دنوں میں کمزور اور ناتواں ہو چکا تھا۔

آج اُسے اسپتال سے خارج کر دیا گیا تھا۔ کمزور و لاغر، خجیف و نزار کاشف کو اس کے چچا اور پھپھی زاد اسٹریچر پر اندر لے کر آئے۔ عمرانہ میں ہمت نہ تھی کہ اپنے محبوب کو اس حال میں دیکھے۔ کاشف کو والدین کے بعد اسی کا انتظار تھا۔

کیا اب بھی وہ میری ہے؟ کیا اب بھی وہ اس کے قابل ہے؟ کیا اب اُسے اپنی محبت کی بربادی کا تماشا خود دیکھنا ہوگا؟ لیکن مقدر کے ساتھ کون لڑسکتا ہے۔

عمرانہ بچپن ہی سے کمزور دل کی مالک تھی۔ کسی بھی غم کو برداشت نہ کرسکتی تھی۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود نہ تو اپنا دل مضبوط کرسکی۔ اور نہ ہی کاشف کو دیکھ سکی کاشف مسلسل انتظار سے تنگ آچکا تھا..... اب وہ روح اور جسم کے ساتھ اکٹھا لڑائی لڑنا چاہتا تھا۔ آخر کار اس نے اپنے کزن کو بلایا اور بولا ''جو میں لکھوا تا ہوں لکھو.....''

''تم میری زندگی ہو کر بھی میرے قریب نہیں آئیں۔ شاید تمہیں مجھ کو اِس حال میں دیکھنے کا حوصلہ نہیں..... جہاں میں زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہا ہوں وہاں ایک لڑائی اور سہی..... حالاں کہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ حق، حق ہے، سچ، سچ ہے۔ مجھے تمہاری محبت پر شک نہیں۔ ساری زندگی تمہاری نظریں مجھے ہی پکارتی رہی ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے زندگی کی کمی جدائی ہم دونوں نے بڑی ہی مشکل سے گزاری ہے..... اب تو ہمارے ملن کی گھڑیاں آنے ہی والی تھیں، مگر..... میں تمہیں خود کو اپنانے کے لیے مجبور نہیں کروں گا..... اور نہ ہی محبت کی بھیک مانگوں گا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں.....''

''میرے ہاتھوں میں میرے ہاتھ ہیں
زنجیر نہیں''

''یہ شعر ساری زندگی مجھ پر اثر انداز ہوتا رہا۔ اب سمجھ آئی اس کا تعلق میری زندگی سے ہونا تھا اور ہاں میں یہ بات بھی باور کروادوں کہ قدرت کی طرف سے خواتین کو عطا کیے گئے خاص حقوق ہیں۔''

1۔ شادی و نکاح سے پہلے عورت کی رضامندی ضروری قرار دی گئی۔

2۔ ناکارہ، ظالم اور ناپسندیدہ شوہر سے چھٹکارا پانے کے لیے عورت کو خلع کا حق دیا گیا۔

3۔ عورت کو علم حاصل کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح مردوں کے لیے۔''

تمہارا اور صرف تمہارا
کاشف

عمرانہ اپنے کمرے میں قرآن پاک پڑھ رہی تھی کہ عابد نے چپکے سے خط اس کے ہاتھ میں تھمایا، پھر کیا تھا آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی۔ اس نے اسی کاغذ کے پیچھے لکھا۔

''آپ نے یہ سوچ کیسے لیا کہ میں دادا جان کے ہاتھوں سے پہنائی گئی انگوٹھی اتار دوں گی؟ چاہے ساری دنیا زور لگالے، آزمالے، مگر.....! میرے خیال میں کم عقل عورت خود اپنے اوپر ظلم کرتی ہے، مصیبتوں کو گلے لگاتی ہے..... مرنا اور تکلیفیں سہنا پھر اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ وہ اپنی خود کشی ہے اور خدا کے نوازے ہوئے نعمتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتی۔''

اب کاشف کافی تندرست لگ رہا تھا..... سب نے اپنے اپنے طور پر عمران کو سمجھایا تھا، مگر اس کا یہی جواب تھا میرے یہی مقدر میں تھا..... جو بھی ہے، جیسا بھی ہے..... مجھے قبول ہے۔ اپنی زندگی کا میں نے خود فیصلہ کیا ہے۔ شادی والے دن بھی اُسے بیٹھے ہوئے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کا بایاں بازو کہنی تک اور سیدھی ٹانگ گھٹنے تک غائب تھی، جس کا اُسے بڑا قلق بھی نہ تھا..... مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔

ہمت کر کے عمرانہ بولی۔ ''کاشف یہ کیا؟''

وہ ہنس کر بولا ''ہاف سیٹ'' لیکن میں اب بھی خدا کو حاضر و ناظر جان کر صدق دل سے کہتا ہوں!

تو مجھے چھوڑ کے ٹھکرا کے بھی جاسکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں میرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

مگر وقت اور خدمت نے یہ ثابت کر دیا کہ بچپن کی محبت رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے، جو ہر قربانی ہنس کر دے سکتی ہے۔ عمرانہ نے یہ کبھی احساس نہ ہونے دیا کہ کاشف میں کوئی کمی ہے۔

اب آہستہ آہستہ کاشف نے باہر نکلنا شروع کر دیا تھا۔ دبے دبے لفظوں میں لوگ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے۔

یار..... وہ تو ہاف سٹ بن گیا ہے۔ اُن پڑھ لوگ کیا جانیں کہ کسی کو برے لفظوں میں پکارنا منع ہے، لیکن خاندان کے کسی بھی فرد کے سامنے یہ کہنے کی جرأت نہ کی۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اگلے ہی سال قدرت نے انہیں خوب صورت بیٹے کی صورت میں تحفہ عطا فرمایا، جس کا نام انہوں نے واصف رکھا۔

جب اُس نے اسکول جانا شروع کیا تو اکثر لڑکے اُسے ہاف سٹ کہہ کر پکارتے اور تنگ کرتے تھے، جو اس کے دل پر لکھے جارہے تھے..... وہ کر تو کچھ نہ سکتا تھا، بس جل بھن کر رہ جاتا۔ وقت گزرتا گیا دونوں والدین بڑی ہی محبت اور پیار سے اُسے پالتے رہے اور آخر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسے امریکا بھیج دیا۔

ماں باپ اکلوتے بیٹے کی جدائی میں دُکھی رہتے، لیکن کبھی بچے کی زندگی بنانے میں حائل نہ ہوئے۔

پڑھائی کے دوران بھی اکثر واصف کے کانوں میں ''ہاف سٹ'' کی آوازیں گونجتی رہتیں.....

''یہاں تو کوئی کسی کو دکھ نہیں پہنچاتا اور نہ ہی فلرٹ کرتا ہے، بلکہ معذور افراد کی سارے لوگ مدد کرتے ہیں۔ یہ مسلمان ایسی غیر مذہبی حرکتیں کیوں کرتے ہیں، یہ پورے کے پورے ایمان میں داخل کیوں نہیں ہوتے۔''

واصف کے ذہن میں وہاں رہ کر بھی یہی باتیں گونجا کرتیں۔

ایک روز اس نے اپنی ماں کو خط لکھا۔

میری پیاری ماں اور پیارے ابا جان
آداب!

مجھے یہاں امریکا کی شہریت مل گئی ہے، میں نے یہاں ایک اچھی سی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ یہ کام آپ لوگوں کے بغیر ہوا..... میں بابا کو سیاقت کی تکلیف دینا نہ چاہتا تھا اور آپ بابا کو چھوڑ کر نہیں آسکتی تھیں، مگر اس کے علاوہ بھی اس میں ہمارے ملک کے لوگوں کا بڑا ہاتھ ہے، جنہوں نے ماں کی ممتا کو کچل ڈالا۔ یہ کبھی تہذیب یافتہ نہیں ہوسکتے۔ انہوں نے ہی اپنے کردار سے مذہب کو بدنام کیا ہے، حالاں کہ ہمارا مذہب امن کا مذہب ہے، یہ کبھی تہذیب یافتہ نہیں ہوسکتے۔ وہاں کے مسلم سے یہاں کے عیسائی اچھے ہیں، جو کسی کی دل آزاری نہیں کرتے، کسی کو ہرٹ نہیں کرتے، جیتے ہیں اور جینے دیتے ہیں۔ اپنی اپنی زندگیاں آرام سے گزارتے ہیں۔ جانوروں کے حقوق بھی دیتے ہیں۔ آپ لوگ مجھے ہردم یاد میں رہے گے اور میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، آپ کی بہو کی تصویر بھیج رہا ہوں، مجھے یقین ہے کہ میری پسند پر آپ کو فخر ہوگا۔''

خط پڑھتے ہی دونوں والدین چارپائی سے جاگے، چند ماہ کے بعد دونوں ایک ہی وقت میں مالک حقیقی سے جاملے۔

مرتے وقت دونوں کے منہ پر تھا.....
بیٹا..... آ..... جا

☆.....☆

گگلو

مصطفیٰ کریم

لاس اینجلس سے ایک نوجوان کی زندہ دل سچ بیانی

رائل ہوٹل کی ریسپشنسٹ پائن جا چکی تھی اور نجی کے بستر پر پائن کے جسم کی گرمی اب آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ نجی وہ ''شہر'' تھا جہاں ہر سیاح سیاحت کے لیے چلا آتا تھا۔ اس شہر کی بنیاد آج سے 38 سال پہلے پڑی تھی۔ نجی کی تمنا تھی کہ اس ''شہر'' میں کبھی ایسا سیاح نجی آتا جس کے وقار سے شہر کی رونق میں اضافہ ہوتا۔ وہ تمنا اب تک تشنہ رہی تھی۔

جس مسہری پر نجی لیٹا تھا اس کے ساتھ رکھی میز پر ایک تصویر ایک ایئر لیٹر پر اٹلی پڑی تھی۔ ایئر لیٹر پر بھیجنے والے کا نام فاطمہ نجی لکھا تھا۔ نجی نے تصویر کو سیدھا کر دیا۔ وہ ایک دس سالہ لڑکا اور اس سے کچھ چھوٹی لڑکی کی تصویر تھی۔ دونوں بڑی معصومیت سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ گیارہ سال پہلے ''فاطمہ'' اس ''شہر'' میں اپنی رضا سے قانوناً داخل ہوئی تھی، پھر بعد میں انہا دو معصوم بچوں کے ساتھ، شہر کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی تھی۔

بیڈ سائڈ ٹیبل پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو۔'' نجی خوابیدہ لہجے میں بولا۔

دوسری جانب سے جونسوانی آواز آئی اسے سن کر وہ مارے اشتیاق کے اٹھ بیٹھا۔

''بہت بہت شکریہ جوئس۔ میں تمہاری کاک ٹیل پارٹی میں آؤں گا..... 105 نمبر، گالوے روڈ۔ تمہارے گھر کا نمبر ہے۔ میں نے لکھ لیا ہے۔'' تیس بتیس سال کی عمر اور معمولی خدوخال کی مالک جوئس، رائل ہوٹل کی مستقل اہلی تھی۔

بغداد، قاہرہ، بیروت اور عمان میں نجی کے شاندار ہوٹل اور نائٹ کلب تھے۔ جس سرزمین سے نجی کا تعلق تھا وہاں تیل کا ذخیرہ تھا۔ اُبلتے ہوئے فوارے کے کر شمے سے اس کے عزیزوں کی بادشاہت قائم تھی اور اس کے ذاتی ہوٹل اور نائٹ کلب کا کاروبار چلتا تھا۔ نجی دبئی اور ابوظہبی میں جلد ہی ہوٹل تعمیر کرنے والا تھا۔ اسی بہانے ہوٹل کی تجارت کے نئے مسائل اور ان کا حل سمجھنے کے لیے وہ برائٹن آیا ہوا تھا۔ جن بین الاقوامی تجارتی اداروں کے اشتراک سے اس کے نئے ہوٹل بننے والے تھے۔ انہوں نے نجی کے لیے تجارتی امور کے سمجھنے کا انتظام رائل ہوٹل میں کرا دیا تھا۔

نجی جوئس کا ممنون تھا۔ جس دن وہ برائٹن آیا، جوئس اس کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ وہ نجی کو اپنی کار میں بٹھا کر ریگل گیسٹ ہاؤس لے آئی۔ یہاں نجی کے لیے ایک کمرہ ریزرو تھا۔

جب نجی پابندی سے رائل ہوٹل جانے لگا تو جوئس سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اکثر وہ جوئس کو ہوٹل کے بار میں لے جاتا اور اس کے ساتھ بیئر یا شیری پیتا۔ کبھی کبھی جوئس نجی کے ساتھ شہر کے نفیس ریستوراں میں کھانا بھی کھا لیتی تھی۔ نجی کی دلی خواہش کے باوجود رسم و راہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ جوئس اس سے مخصوص دوری رکھتی تھی۔

''شہر'' میں باوقار سیاح نہیں آیا۔ نجی نے ہوا رہوٹل کی میڈز اور بعد میں پائن پر اکتفا کی۔

جوئس کی دوست نے نجی کو سرور کر دیا تھا۔ مارے خوشی کے اُس کے لب اُس کے مضبوط جبڑوں پر پھیل گئے تھے اور اُس کے سفید دانت جھلملا رہے تھے۔

نجی بستر سے اُٹھ کر نہانے..... چلا گیا۔ واپس کمرے میں آ کر جب وہ نیلی پھول دار قمیص پر اپنی رنگ کی ٹائی باندھ رہا تھا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کون سا کولون استعمال کرے آئینے کے سامنے بروٹ (Brut) ای ڈیوڈورانٹ اور بھی کئی قسم کی کولون، آفٹر شیو لوشن اور ڈیوڈورانٹ فار مین (Deodrant For Men) کی بوتلیں پڑی تھیں۔ نجی نے بُرش کا کولون اپنی بغلوں کی گلائی، بڑے بڑے ہاتھ، تندرست گردن اور چہرے پر ملا، پھر وہ اپنے گھنگھریالے بالوں کو بڑی دیر تک اسی طرح ترتیب دیتا رہا کہ کسی طرح اس کے سر کا گنجا حصہ چھپ جائے۔

میک اپ سے فارغ ہونے کے بعد نجی نے کمرے کی واحد کھڑکی پر سے پردہ ہٹا دیا۔ جولائی کی طویل شام تھی۔ نہ دھوپ تھی اور نہ ہی رات کا اندھیرا۔ ہائیسنتھ (Hycinth) کے سرخ اور سفید پھول قطار در قطار گیسٹ ہاؤس کے چمن میں کھلے ہوئے تھے۔ نجی خوش تھا اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ اُسے ایسی دعوت میں مدعو کیا گیا تھا جہاں اعلیٰ طبقے کے افراد سے بے تکلف ملاقات کا امکان تھا۔ ماضی میں جب بھی وہ تجارتی مقصد سے یورپ آیا تو اہم لوگوں سے ملاقات صرف کاروبار کے اوقات ہی میں ہوئی تھی۔ اگر اُسے کسی ساتھی کی تلاش ہوتی تو اسے ہوٹل کی میڈز، طوائفیں، اسکورٹ گرلز یا مختلف عمر کی سیاح عورتیں ملتیں جن کے لیے نجی کو کولون اور ڈیوڈورانٹ کی مدد سے ''شہر'' میں چراغاں کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

گالوے روڈ ساحلِ سمندر سے کچھ فاصلے دور تک

سیدھی چلی گئی تھی۔ سڑک کی ایک جانب ٹیوڈر اور وکٹورین وضع کے بنے ہوئے مکانات تھے، ان میں اونچے متوسط طبقے کے افراد رہتے تھے۔105 نمبر مکان کے سامنے نجی کی ٹیکسی رُکی۔ جوئس کا گھر سرو کے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ نجی ٹیکسی سے اُتر اور گیٹ میں داخل ہوگیا۔ لاؤنج کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں پردے ہلتے ہوئے تھے۔ مرد اور عورتوں کے بولنے اور ہنسنے کی آواز کے علاوہ موسیقی بھی سنائی دے رہی تھی۔ نجی لاؤنج میں داخل ہوا۔ کمرے میں نفیس تمباکو اور سینٹ کی دھیمی خوشبو اُڑ رہی تھی۔ ایک طرف بڑی سی میز پر شراب کی رنگ برنگی بوتلیں چمل چراغ کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ لاؤنج سے صوفے کو ہٹادیا گیا تھا۔ صرف ایک دو کرسیاں پڑی تھیں۔ مختلف عمر کے مرد عورتوں کا اجتماع تھا، چند ایک نے نجی کی جانب دیکھا اور رسماً مسکرادیے۔

''خوش آمدید نجی۔'' جوئس بولی۔ وہ چمکتے ہوئے نیلے گاؤن میں ملبوس تھی۔ چہرے پر بظاہر بشاشت تھی، مگر آنکھیں کھوئی ہوئی سی تھیں۔

''نجی، تم کیا پیو گے؟'' جوئس نے پوچھا۔

''بیئر'' سرکہ مودبانہ خم دے کر نجی شیریں لہجے میں بولا۔

''مسٹر راجر ہیلی ابھی آئے ہیں، آؤ تمہیں ان سے ملادوں۔'' جوئس بڑے سے جام میں کالسبرگ بیئر کے ایک ٹن کو خالی کرتی ہوئی بولی اور ساتھ ہی اسنیکس کا ٹرے اُس کی جانب بڑھادیا۔ نجی نے تشکرانہ سر خم کیا اور بڑی نفاست سے ایک ننھے ساج (Sausage) کو طشت میں پڑے ایک نوکیلے تنکے کی مدد سے اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ پھر ٹھنڈی بیئر کا ایک گھونٹ اس نے پیا۔ بیئر کے لطیف ذائقے سے نجی کا دِل خوش ہوگیا۔

جوئس نجی کو چند افراد کے پاس لے آئی۔ درمیان میں راجر ہیلی کھڑا تھا۔ پچاس سے کچھ اُوپر اس کی عمر تھی۔ ماتھے پر سجے ہوئے سفید بال، آواز بھاری اور بیٹھی ہوئی۔ اُس کی آنکھوں کے گرد جھرّیاں رینگ رہی تھیں اور نجی کی طرح طویل قامت تھا۔

راجر ہیلی ہوٹل کا مالک ہونے کے علاوہ شہر کے ہوٹلوں کے مالکان کی انجمن کا صدر بھی تھا۔ نجی جن بین الاقوامی سرمایہ داروں کے اشتراک سے دوبئی اور ابوظہبی میں ہوٹل کھولنے والا تھا، انہوں نے راجر ہیلی کا غائبانہ تعارف کرادیا تھا۔ جوئس نے راجر اور اس کے گرد کھڑے ہوئے مردوں، عورتوں کے ساتھ باری باری نجی کی ملاقات کرائی۔

راجر نے نجی سے اب تک نہ ملنے پر بڑے اخلاق کے ساتھ معذرت کا اظہار کیا۔

''کیا آپ کو رائل ہوٹل میں ہر قسم کی معلومات حاصل ہورہی ہیں؟'' راجر نے نجی سے پوچھا۔

''جی ہاں، میں جوئس کا شکر گزار ہوں۔ ان کی وجہ سے مجھے بڑی سہولت ہے۔'' نجی نے مسکرا کر جواب دیا اور تنکیوں سے جوئس کی جانب دیکھا۔ جوئس کی آنکھوں میں درد کے بادل اب تک منڈلا رہے تھے۔ اس نے بیئر کا بڑا سا گھونٹ پیا۔

چند اور نجی کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ راجر زیادہ مردوں سے تفتگو کرتے وقت نجی کے لہجے میں اگرچہ کبھی تھوتری بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لہجے کی شیرینی وزمی صرف اس وقت نمایاں ہوتی تھی، جب وہ کسی جوان عورت یا لڑکی سے مخاطب ہوتا۔ راجر کے قریب ایک جوان لڑکی بڑے وقار سے کھڑی تھی۔ اس کے بال زرد گیہوں سے بنے تھے۔ چمکتے ہوئے زرد گاؤن میں اس کا جسم دمک رہا تھا۔ کمر کے گرد لپٹی طلائی زنجیر جسم کے پُرکشش تناسب کو واضح کررہی تھی۔ اس لڑکی کا نام لیزا تھا۔ وہ جنوبی افریقہ کی رہنے والی تھی اور راجر کے کسی دوست کی بیٹی تھی۔ وہ راجر کے ساتھ پارٹی میں آئی تھی۔ لیزا کو اپنی اہمیت کا احساس تھا۔ اُس نے پاس کھڑے مردوں کی گرم نگاہوں کو اپنے اردگرد آنکھ مچولیاں کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے بیئر کی چسکیاں لے رہی تھی۔ راجر نے لیزا کو سگریٹ پیش کی۔ نجی نے فوراً پانسو نے کا لائٹر نکالا اور لیزا کے لبوں میں دبے سگریٹ کو سلگادیا۔

''شکریہ۔'' جنوبی افریقہ کی رہنے والی لیزا، جس کا پورا نام الیزبتھ تھا خشک لہجے میں بولی۔

ایک غیر سفید قوم کے فرد کے اخلاق کا ردِعمل روکھا ہی ہوسکتا تھا۔ نجی کو ذرا ہتک کا احساس ہوا۔

''میجورکا (Majoeica) اور ابیزا (Ibiza) میں نئے ہوٹل کھولنے کا خیال ترک کردینا چاہیے۔ کیا خیال ہے راجر؟'' گھنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے

ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص بولا۔ سرخ بھرا ہوا چہرہ، پھولا ہوا پیٹ اور سینہ، اس کے کوٹ سے جیسے باہر نکلا آرہا تھا۔

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' راجر نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اُس کے ذہن میں تجارت کے زریں اصول ہمیشہ چمکتے رہتے تھے۔ راجر کو اچھی طرح علم تھا کہ دنوں جزیروں پر اتنے ہوٹل ہیں کہ مزید کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر سیاح نئی جگہ جانا زیادہ پسند کرتے ہیں، لیکن راجر کی برف جیسی سرد آنکھوں اور جذبات سے عاری چہرے کو دیکھ کر اُس کے خیالات کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔

راجر نے کارنس پر شراب کا گلاس رکھا اور دیوار پر لٹکی آئل پینٹنگ کو دیکھنے لگا۔ مصوری کے اس نمونے میں سمندر کی جھاگ اُڑاتی نیلی موجوں کے درمیان رواں تھا۔

جوئس مشتاقانہ راجر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُسے توقع تھی کہ راجر اُس کی پسند کی داد دے گا، لیکن وہ خاموش رہا۔ راجر اور جوئس کی بابت رائل ہوٹل میں بہت ساری افواہیں مشہور تھیں۔ اچانک راجر، جوئس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''ہم لوگ نئے ہوٹل کو مناسب بنا کر کھولیں۔ ساٹھ دہی ہوگی جسے ہم نے گذشتہ سال دیکھا تھا۔'' لفظ ''ہم'' نے اُس رشتے کی تجدید کردی جسے نجی نے افواہاً سنا تھا۔

''ایسین کی جھولی سرزمین پر واقع یہ جگہ بہت اچھی ہے۔ وہاں بھی خوب دھوپ نکلتی ہے اور سمندر قریب ہے۔'' جوئس بڑے وثوق سے بولی۔

''ان ہوٹلوں کا منتظم اعلیٰ کسے بناؤ گے۔ ان کے فوئر (Foyre) میں تمہاری پینٹنگس لگنی ہوں گی۔''

''سارے ہوٹلوں کی میں منتظم اعلیٰ؟ اور میری پینٹنگز؟'' جوئس نے بڑی ادا سے حیرت کا اظہار کیا۔

''کیوں نہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ کیمبرج کی گریجویٹ تجارت میں میرا ہاتھ بٹاتی ہے ورنہ میں بھی کاروبار چوپٹ ہوچکا ہوتا۔'' راجر نے یہ کہتے ہوئے جوئس کے شانے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کرلیا۔

اس وقت جوئس کا انداز مختلف تھا۔ راجر ہیلی کا اس کی ذات میں اظہارِ اعتماد اور ارغوانی شراب کے نشے کے جھونکے، جوئس کی آنکھوں میں منڈلاتے درد کے بادل اُڑا کر کہیں دور لے گئے تھے۔ جوئس کے گالوں پہ سرخی دہک رہی تھی۔ ہاتھ کی انگلیوں میں آدھ جلی ہوئی سگریٹ تھی۔ دوسرے ہاتھ میں بڑی نزاکت سے اُس نے شراب کا جام اٹھایا ہوا تھا۔ اسے یہ احساس نہیں تھا کہ راجر کی آنکھوں میں اب تک برف جمی ہے اور لیزا شرابور ہانگوں سے اسے دیکھ رہی ہے۔ جوئس آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔ اُسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ نجی اتنی پسندیدگی سے اُسے تک رہا تھا۔

کیمبرج کی گریجویٹ؟ مصوّر؟ رائل ہوٹل کی منتظم اعلیٰ؟ نجی دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

صرف حسین چہرے اور پُرکشش جسم ہی سے حسن کامل نہیں ہوتا۔ انسان کے ظاہری اور باطنی اجزاء کے حسنِ ترتیب سے اصل روپ نکھرتا ہے۔ نجی کے سامنے جوئس ایک نئے روپ میں گھر ہورہی تھی۔

اسٹیریو ٹیپ ریکارڈر کے لاؤڈ اسپیکر سے ہلکی پھلکی موسیقی کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ اچانک ایک دھن شعلے کی طرح لپکی۔ پوری محفل اس کی تپش سے جیسے لرزی گئی۔ ایک عورت خوشی سے تقریباً چیخ اُٹھی، سوائے چند کے سب رقص کرنے لگے۔ ناچ میں اعضا کی تیز حرکت کی ضرورت تھی، راجر ہیلی اور ایک دو بزرگ مرد و عورت الگ کھڑے رہے۔ نجی کو رقص کرنا نہیں آتا تھا، اس لیے وہ علیحدہ کھڑا ناچ سے لطف اندوز ہونے لگا۔

تھرکتی ہوئی ناہنجس ہوا میں بلند ہوتیں تو مردوں کے کف لنک، عورتوں کی کلائیوں میں بندھی ہوئی گھڑی کی طلائی زنجیر اور حسین انگلیوں میں پہنی ہوئی انگوٹھیوں کی جگمگاہٹ سے رنگ برنگی چنگاریاں سلگ اٹھتیں، رقص کرتی ہوئی جوان لڑکیاں اور عورتیں فرطِ انشاط سے جب اپنے سر کو جنبش دیتیں تو لہراتی ہوئی سنہری زلفیں اور سجے ہوئے بالوں کے جوڑے ہوا میں آگ سی روشن کردیتے۔ گلنار چہرے کھلے جارہے تھے، لبوں پر خاموش ناتمام تبسم تھی۔ رقصاں عورتوں کی چلتی ہوئی کرشمہ سازی سے مردوں کے قریب آتی پھر دور ہوجاتی۔

موسیقی کی اس دھن کا نام افریکن بیٹ تھا۔ اس میں بلا کی وارفتگی تھی، قیامت کا کیف تھا۔ ذہین موسیقار نے اسے روہڈیشیا جنوبی افریقہ کی بستیوں میں سُنا تھا، شاید اس کے سحر سے ان ملکوں کے سیاہ افریقن عوام اپنی غربت، بے

بسی، اور ذلت کو بھول جانے کی ناکام کوشش کرتے تھے۔
اس دھن میں Trumpets کی مدد سے فن کار نے ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ تہذیب کا چراغ دنیا کے ہر گوشے میں جلتا ہے، اس کی لَو سے کچھ روشنی مستعار لے کر انسان تہذیب کے نئے رنگ روپ کا مسلسل قائم رکھتا ہے۔

جوئس نے بڑی ادا سے راجرز کو آنکھوں ہی آنکھوں میں رقص میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ راجرز نے بڑے وقار سے انکار کر دیا، لیکن ناچتی ہوئی لیزا جب بھی راجرز کی جانب دیکھتی، راجرز کی آنکھوں میں جمی برف جیسے پگھلنے لگتی۔

لاؤڈ اسپیکر پر دھن ختم ہوگئی، ناچ بھی رُک گیا۔ لیزا نے اس دھن کا نام پوچھا۔ ''افریکن بیٹ'' کسی نے اسے بتایا، پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ لیزا نے راجرز کے کان میں نہ جانے کیا کہا اور راجرز نے بڑی سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''جوئس، اب رات کے ساڑھے گیارہ بجنے والے ہیں۔ مجھے لیزا کو ہوٹل پہنچانا ہے، پھر صبح رہوڈس (Rhodes) پرواز کرنا ہے، تمہاری دعوت لاجواب تھی۔ میں بے حد محظوظ ہوا۔ بہت بہت شکریہ!'' راجرز ہیلی نے کہا۔ پھر محفل میں کھڑے دوسرے مہمانوں کی جانب ہاتھ اُٹھا کر ''چیرز'' بولا۔

''چیرز!'' سب نے جواباً کہا۔

لیزا نے بھی بناوٹی تبسم کے ساتھ جوئس کا شکریہ ادا کیا اور راجرز کے ساتھ چل دی۔

افریکن بیٹ کی بنیاد ایک ایسی دھن پر تھی جسے کسی سیاہ افریکن نے تخلیق کیا تھا، اس پر جنوبی افریقن کی سفید فام لیزا ناچتی رہی تھی۔ اس سے بڑھ کر افسوسناک حادثہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

پھر ایک ایک کر کے سارے مہمان رخصت ہوگئے۔ موسیقی کی آواز تھمی جیسے کہیں بہت دور چلی گئی۔ نجی نے جب اجازت مانگی تو اس وقت جوئس اپنے گلاس میں کوئینسا ک ڈال رہی تھی۔ اس نے نجی کو رُکنے کے لیے کہا۔

کچھ دیر بعد نجی اور جوئس لاؤنج میں تنہا تھے۔ ایک طرف میز پر شراب کی سبز سفید، ارغوانی بوتلیں اور گلاس بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ کھڑکی سے باہر بہار کی خوشبو تھی، سمندر پر اڑنے والی ہوا نمی کی تازگی سے بوجھل، کمرے کے باہر منڈلا رہی تھی۔

نجی بے حد خوش تھا، اُسے روک کر جوئس نے قریب کا خاموش اظہار کر دیا تھا۔ جوئس کوئینسا ک اور لیمنیڈ سے بھرے گلاس کو اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑکی کے پاس کھڑی باہر اندھیرے میں نہ جانے کیا تک رہی تھی۔

''کمینہ..... جیسے مجھے نہیں معلوم کہ وہ لیزا کو لے کر اس وقت کہاں گیا ہے۔'' جوئس پر گوشیوں میں اپنے آپ سے بولی اور گلاس میں سے بڑا سا گھونٹ چڑھا گئی۔ نہ لیمنیڈ کی مٹھاس اُس نے محسوس کی نہ کوئینسا ک کی تلخی۔

''ڈیئل۔ جیسے مجھے پتا نہیں کہ راجرز ہیلی تنہا نہیں، بلکہ کتیا لیزا کے ساتھ کل رہوڈس (Rhodes) پرواز کر رہا ہے۔'' غصّے سے پھٹکارتی ہوئی زیرِ لب جوئس بولی۔ کوئینسا ک کے چند گھونٹ اور اس نے پیے۔ گلاس خالی ہوگیا۔

جو حادثات ہوگئے تھے نجی اُن سے بے خبر تھا۔ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اُس کی مرعوب کن شخصیت نے جوئس کو آخر کار بے بس کر دیا ہے۔ نجی جوئس کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بدستور کھڑکی کے باہر تک رہی تھی۔

آسمان پر سیاہ بادل گھر آئے تھے اور ہوا میں بھی تندی آگئی تھی۔ سمندر کے درخت بدروحوں کی طرح تاریکی میں ہل رہے تھے۔ دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ دور سے سمندر کی موجوں کی آواز آ رہی تھی، جیسے سسک سسک کر پتھریلے ساحل کو تاریکی کا راز بتانا چاہ رہی ہو۔

''جوئس، میں نے راجرز ہیلی کی بیوی کو دعوت میں نہیں دیکھا۔'' نجی نے بڑی شیرینی سے پوچھا اور جوئس کی جانب سگریٹ بڑھایا۔ جوئس نے سگریٹ لے لیا۔ جب نجی اس کے لبوں میں دبے سگریٹ کو سلگانے لگا تو لائٹر کی روشنی میں جھکی جھکی آنکھیں اور بظاہر پرسکون چہرہ اسے بہت بھلا لگا۔

''راجرز ہیلی کنوارہ ہے..... اُسے شادی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میڈز اُس کے گھر کا خیال رکھتی ہیں۔ کھانا وہ ہوٹلوں میں کھاتا ہے اور اس کی روکس رائس کو شوفر چلاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی لڑکی یا عورت اس کے گرد ہمیشہ منڈلاتی رہتی ہے۔'' جوئس پھیکے لہجے میں بولی۔ چند لمحوں کے لیے وہ خاموش، دھوئیں کے بادل اُڑاتی رہی، پھر عنوان گفتگو بدلنے کے لیے اس نے نجی سے پوچھا۔

''تمہاری سے لطف اندوز ہوئے؟''

''بہت، میری تنہائی تمہاری محفل میں گم ہوگئی۔'' یہ کہتے ہوئے نجی نے جوئس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے قریب کر لیا۔ جوئس شوخی سے ہنس دی۔ نجی نے اس کے لبوں کو چوم لیا۔ بوسے کی لذت میں ایک طویل وقفہ گم ہوگیا۔ جوئس نے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا۔ کیمبرج کی گریجویٹ..... تیس بتیس سال کی عمر..... مصوّر..... برائٹن کے مشہور ترین ہوٹل کی منتظم اعلیٰ کے ''شہر'' کی سیاحت کا خاموش اعلان کر دیا تھا۔

''تمہارا گھر بہت اچھا ہے۔''

''شکریہ آپ کیسی گھر دکھاؤں۔'' نجی کے بازوؤں کو نرمی کے ساتھ الگ کرتے ہوئے جوئس نے کہا۔

ڈائنگ روم اور لائبریری میں بار بار نجی سیاحت کی تعریف اپنے مخصوص شیریں لہجہ میں کرتا رہا۔ ایک کمرے کے کھلے دروازے کے سامنے آ کر جوئس رک گئی۔ اندھیرے کمرے میں مسہری کے دھندلے نقوش نظر آ رہے تھے۔ ''یہ بیڈ روم ہے۔'' جوئس بولی۔

''چند تو سب کمروں سے زیادہ خوب صورت ہے۔'' کہتا ہوا نجی جوئس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں داخل ہوگیا۔

جس رشتے کی وجہ سے جوئس نجی سے ایک خاص دوری رکھتی تھی، اس رشتے کی عمری جلس میں راجرز ہیلی نے بے حرمتی کر دی تھی۔ راجرز ہیلی اور جوئس کے درمیان دل کا رشتہ شاید یک طرفہ تھا۔

رات کے ڈیڑھ بجے جب نجی واپس ہوا تو اس کی انا کا آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہی تھی۔

اس رات کے بعد نجی اور جوئس اکثر شام ساتھ گزارتے۔ خدا ہونے سے پہلے بھی نجی جوئس کو اس کے فلیٹ میں پہنچا کر واپس آتا یا بھی جوئس اس کے کمرے میں آجاتی یا دفعتاً سارے دل کھول کر ''شہر'' کی سیاحت کر رہا تھا۔

ایک رات جب نجی اور جوئس فرینچنگی کا مظاہرہ کر چکے تو جوئس بستر سے اٹھی۔ وارڈ روب سے اُس نے ایوننگ گاؤن نکال کر پہنا اور سنگار میز کے اوپر دیوار میں لگے بلب کو روشن کر دیا، پھر وہ عجیب اضطراب کے عالم میں ساتھ رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ آج صبح سے وہ کچھ بے چین سی تھی۔ بستر کا نشہ اور جسمانی رشتے کی لذت بھی اس بے کلی میں کمی نہیں کر سکی تھی۔

سبز شیڈ میں چھپے بلب کی روشنی میں جوئس نے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ آنکھوں کے گوشوں میں نامعلوم سی تھرّیاں نمایاں تھیں۔ بلب کے اُجالے میں وہ گریٹنگ کارڈ بھی میز پر پڑا تھا جسے راجرز نے رہوڈس سے بھیجا تھا۔ کارڈ پر رسمی اور عامیانہ تحریر تھی۔ اسی دن لیزا کا ایک گریٹنگ کارڈ رائل ہوٹل میں مقیم ایک جنوبی افریقن عورت کے نام آیا تھا۔ اس کارڈ پر بھی رہوڈس کی مہر تھی۔

روشنی کے دائرے کے باہر نیم تاریکی تھی۔ اُس کی مسہری پر لیٹا ہوا نجی کھڑکی پر کھنچے ہوئے بھاری پردے، دبیز قالین پر اسی رنگ کے پھولوں اور دیوار پر ٹنگے جوئس کی مصوری کے نمونے، جو بھی کسی آرٹ گیلری میں مقام حاصل نہیں کر سکے تھے، یہ سب اندھیرے میں گھرے ہوئے تھے۔ ان سب کی اور نجی کے ساتھ جوئس کی رشتے کی اصلیت اُس دھوئیں کی طرح تھی جو نجی کے سگریٹ سے نکل کر اندھیرے میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اس وقت چہرے کی نامعلوم جھریاں اور وہ تڑپ جو راجرز اور لیزا کے رہوڈس میں موجودگی کی وجہ سے جوئس کے وجود میں سما گئی تھی، وہی حقیقت تھیں۔

جوئس نے میز پر سر کو ٹکا دیا۔

''کیا بات ہے جوئس؟'' نجی نے بستر پر لیٹے ہی لیٹے بے تعلق لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' جوئس نے سر اٹھا کر جذبات سے عاری لہجہ میں جواب دیا۔

نجی نے منہ بنا کر شانے اچکا دیے۔ انسان کی زندگی میں غم اور فکر، درد کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے، اس سے وہ ناواقف تھا۔

''جوئس'' نجی کی آواز دوبارہ آئی۔

جوئس نے آئینے میں نجی کو اپنی جانب کروٹ بدلتے دیکھ لیا تھا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو نجی۔'' جوئس ذرا جھنجلا کر بولی۔

''ہم تم شادی کیوں نہ کر لیں۔'' اچانک نجی بولا۔ اس کی استدعا میں خلوص نہیں تھا، وہ صرف جوئس کے

ردِعمل سے محفوظ ہونا چاہتا تھا۔

"شادی؟" جوئس کی حیرت زدہ آواز آئی۔ اُس کا رُخ آئینے کی طرف رہا۔ استعجاب کی لکیریں اس کے ابروؤں کے درمیان کھنچ گئی تھی۔

"ہاں..... ہاں..... شادی.....!" نجمی نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ اُسے یقین تھا کہ جوئس بھاگتی ہوئی آ کر اس سے چمٹ جائے گی۔ بعد میں کیا ہوگا اور وہ اس سے کس طرح نجات حاصل کرے گا؟ یہ طے کرنے کے لیے بہت وقت اس کے پاس تھا اور ہزار حیلے تھے۔

جوئس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو نجمی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جوئس کی پشت بدستور اس کی جانب تھی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ جوئس آہستہ آہستہ وِشی واشنٹ لوشن چہرے پر ملنے لگی۔ جوئس کے ضبط کے بند میں دراڑ پڑنے لگی۔ سکا ایک ہی تھا صرف رُخ مختلف تھے، جوئس نے سوچا۔

"نجمی تم نے آج تک یہ نہیں کہا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" جوئس بڑے اطمینان سے صاف الفاظ میں آئینے کی جانب رُخ کیے ہوئے بولی۔

"وہ تو ہے ہی" یہ کہتا ہوا نجمی دوبارہ چت لیٹ گیا اور سگریٹ کے دھوئیں کے دو تین چھلّے ہوا میں اڑا دیے۔

جوئس نجمی کے رُخ مڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کے لبوں پر چبھتی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں انجانی چمک۔ "نجمی بدقسمتی سے تمہاری عمر بتیس سال ہے۔ اگر تم پانچ سال کی عمر میں یہاں آتے تو میں تمہیں لیڈیز ہیئر ڈریسنگ سیلون میں کام کرنے کا مشورہ دیتی۔ سلون اسکوائر، چلسی، ریجنٹ اسٹریٹ، لندن کی کسی بھی لیڈیز ہیئر ڈریسنگ سیلون میں کام مل جاتا۔ تمہارا طویل قد و قامت، کسرتی جسم، دھوپ میں جلا ہوا سفید رنگ، سیاہ بال، چہرے پر گہرے بروت، آفٹر شیو کی خوشبو تو جسم سے بھوش کولون اور ایسٹ بیڈ کے پاؤڈر کی مست کر دینے والی مہک..... جوان لڑکیوں کے علاوہ ہر عمر کی عورتیں تمہارے ہیئر ڈریسنگ سیلون پر ٹوٹ پڑتیں۔" یہ کہہ کر جوئس کھلکھلا کر طنزیہ ہنسی۔

"یہ کیا بے وقوفی کی باتیں ہیں۔" نجمی خشک لہجے میں بولا۔

"اوہ.....! بے وقوفی! گفتگو کی نرمی اور شیرینی، سر کو تعظیماً بار بار خم دینا۔ یہ محض جوان لڑکیوں اور عورتوں کے لیے تم نے کیوں وقف کر رکھا ہے۔" جوئس نے سنجیدگی اور ذرا غصّہ سے پوچھا۔

جوئس کے الفاظ تیزاب کے قطروں کی طرح نجمی کے کانوں میں ٹپک رہے تھے۔ باوقار سیاح شہر کو اچانک منہدم کرنے پر تُل گیا تھا۔

"تم نے رائل ہوٹل کی Receptionist پالن سے یہ درخواست کیوں نہیں کی.....؟"

"پالن.....؟ کون پالن؟" نجمی درشتی سے بولا۔

"وہی پالن جو تمہارے کمرے میں آ جھکی ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" نجمی غصّے میں تقریباً چیخا۔ وہ اپنے جسم میں شاہانہ جلال کھولتا محسوس کر رہا تھا۔ بستر سے اُٹھ کر وہ کپڑے پہننے لگا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے، جیسے وہ کچھ کرنے والا ہے۔

جوئس بے اثر رہی۔ اُس کا چہرہ غصّے اور حقارت سے سرخ ہو رہا تھا۔ "غصہ مت دکھاؤ نجمی۔ یہ میرا ملک ہے، مجھے یہاں کے قانون معلوم ہیں۔" یہ کہتی ہوئی وہ اسٹول پر سے اُٹھی اور بیڈ سائڈ ٹیبل پر سے فون اٹھا کر اس نے ڈائل کیا۔ "ٹیکسی 105 نمبر گالوے روڈ کے لیے چاہیے۔ مسافر فوریگل کیسٹ ہاؤس جانا ہے۔"

جوئس نے فون رکھ دیا اور سنگار میز کے ساتھ پڑے اسٹول پر دوبارہ بیٹھ گئی۔ نجمی آئینے کے پاس رکھی مخمل آرام دہ کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ایک میری ہوئی بے بسی کی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کانپ رہی تھی۔ جوئس کی نگاہ راجرز کے کریڈٹ کارڈ پر اچانک پھر پڑی..... اس کی آنکھوں میں جیسے کانچ چبھ گیا۔ تصویر میں اُس نے سمندر کی نیلگوں موجوں پر بہتی ہوئی Yacht میں راجرز اور لیزا کو ساتھ دیکھا، پھر آپ ہی آپ اُس نے سر ہلایا جیسے اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کر رہی ہو۔ جوئس کا چہرہ دوبارہ سرخ ہو گیا، پھر وہ بڑی حقارت سے بولی: "تم دونوں ایک جیسے ہو۔ تم دونوں میں ایک ہی مفت ہے۔ یہ میرا قصور تھا کہ ایک کے ساتھ دل کا رشتہ جوڑ لیا۔ تم دونوں کی سمجھ میں زندگی کے لطیف رشتے نہیں آ سکتے۔

☆.....☆

دسویں سچ بیانی

پیاس

اشفاق بٹ

لالہ موسیٰ سے..... ایک نوجوان کی انوکھی آپ بیتی

اُسے معلوم تھا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوگا۔ اس لیے اکیس برس سے وہ اس کا انتظار کر رہا تھا اور اس کمی کو بھلانے کی بھرپور کوشش میں لگا رہا تھا، مگر وہ تھی کہ سمجھنے کی بجائے اُلجھتی ہی جا رہی تھی۔ "آخر کیوں.....؟" اس کا جواب تو اب تک اسے نہ ملا تھا اور اب وہ اس

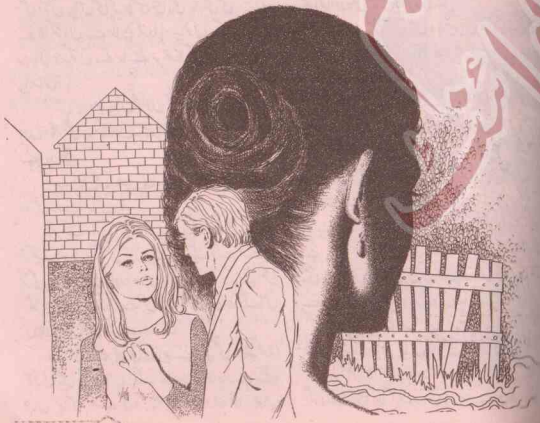

انجام تک پہنچ گیا تھا، جس کا علم اسے اکیس برسوں سے تھا۔ وہ اپنی ''تقدیر'' جو دیکھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ تقدیر اسے کہاں لے جائے گی۔

''پھانسی کے پھندے تک.....''

اور اب وہ اُسے شہر کے اس چوراہے کی طرف لے جا رہے تھے، جہاں ہزاروں انسان اسے پھانسی کے پھندے میں جھولتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ قانون اور اُس ملک کے شہری اکیس برسوں سے اُسے تلاش کر رہے تھے۔ اسے پھانسی دینے کے لیے۔

ان اکیس برسوں میں اس نے ایک ہی کام کیا تھا۔ ایک ہی بات سوچی تھی۔

''میری پیاس کیوں نہیں مٹتی..... میں ہر وقت پیاس..... جان لیوا پیاس کیوں محسوس کرتا رہتا ہوں۔''

ان اکیس برسوں میں جب شعوری طور پر اپنی بے حد و حساب کبھی نہ ختم ہونے والی پیاس کا شعور حاصل ہوا تھا۔ وہ اس تشنگی کو بجھانے میں الجھتا ہی چلا گیا تھا۔ اُس نے اتنا پانی پیا تھا کہ جس کا کوئی تھوڑ نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے شب و روز شراب پی کر پیاس بجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن پیاس تھی کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی..... اس نے ڈاکٹروں سے علاج کروایا، سیانوں کے پاس گیا، روحانی بزرگوں کے سامنے سر جھکا کر التجا کی، لیکن وہ پیاسا ہی رہا۔

''میں ہر دم پیاس محسوس کرتا ہوں۔ دریا پی چکا ہوں، پھر بھی پیاسا ہوں۔ میرا علاج کریں..... میرے لیے دعا کیجیے۔''

سب دوائیں، دعائیں بے کار اور بے ثمر ثابت ہوئیں۔ وہ پیاسا ہی رہا۔

پھر ایک رات اس نے پیاس بجھانے کی ایک نئی ترکیب سوچی، اکیس برس پہلے کی ایک رات اسے یہ ترکیب سجھائی دی، اور وہ اس پر عمل کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا اور اُسی روز سے اس ملک کا قانون اور لوگ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

اور آج اسے پھانسی دی جانے والی تھی۔ بند گھوڑا گاڑی میں اُسے اس چوک میں لے کر جا رہے تھے، جہاں پھانسی نصب تھی، جہاں جلاّد موجود تھا، جہاں ہزاروں انسان اس کے منتظر تھے۔

وہ سر جھکائے سوچ رہا تھا..... آخر یہ پیاس کیوں نہیں مٹتی۔

''کیا موت میری پیاس مٹا دے گی؟''

اُسے موت کا کوئی خوف نہیں تھا۔

☆.....☆

اکیس برس پہلے اس رات جب اس نے پہلی بار انسان کا خون پی کر اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کی تھی تو پھر سفّاکی اور درندگی کا ایک ایسا طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جس نے سیکڑوں انسانوں کی جان لے لی۔ وہ اکیس برسوں میں سیکڑوں انسانوں کا خون پی چکا تھا، پھر بھی پیاسا ہی تھا۔

پہلی بار جب اس نے ایک انسان کو قتل کر کے اس کا خون پیا تو گرم خون کے ذائقے نے اسے یہ احساس دلایا کہ اس کی پیاس بجھ رہی ہے۔ چند لمحوں کے لیے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سیراب ہو چکا ہو۔ جیسے کبھی نہ بجھنے والی پیاس ختم ہو گئی ہو۔ جیسے جھلسے ہوئے صحرا میں جَل تھل ہو گیا ہو، لیکن چند منٹ کے بعد پھر وہی جھلستا ہوا صحرا تھا اور وہی پیاس کا سُورج۔

وہ چند لمحے، جن میں وہ سیرابی کی ایک کیفیت سے پہلی بار دوچار ہوا تھا، پھر اسے کبھی دوبارہ نصیب نہ ہو سکے، حالاں کہ ان اکیس برسوں میں وہ سیکڑوں انسانوں کو قتل کر کے ان کا گرم گرم خون پی چکا تھا۔ ان چند لمحوں کی سیرابی کیفیت کو محسوس کرنے کے لیے وہ درندہ بن گیا تھا۔ اس کا سارا دن پچھتاوے میں گزرتا اور کئی کئی دن ویرانوں میں گزرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کوستا رہتا اور یہ سوچتے سوچتے تھک جاتا کہ آخر وہ اتنا پیاسا کیوں ہے.....؟ یہ کیسی پیاس ہے جو مٹنے کا نام نہیں لیتی..... پھر جب پیاس کی شدّت اس کی برداشت سے باہر ہو جاتی تو وہ درندہ بن جاتا۔ چیتے کی طرح کسی آدمی پر جھپٹتا اور اس کا گرم گرم گاڑھا اُبلتا ہوا خون پینے لگتا، لیکن پیاس پھر بھی باقی رہتی۔

وہ تسکراتا سمٹتا رہا اور قانون کا دائرہ اس کے اِرد گرد تنگ ہوتا چلا گیا۔ وہ کئی بار خطرے کی بُو سونگھ کر

تھا، لیکن اسے پکڑے جانے اور پھانسی پانے کا کوئی خوف نہ تھا۔ وہ تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ کیسی پیاس ہے جو بجھتی ہی نہیں۔

ایک سوال کے جواب کے لیے اُس نے گزشتہ اکیس برسوں میں اتنا سر کھپایا تھا۔ اتنا سوچا تھا کہ اس ایک سوال کے سوا اس کے ذہن میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ اس ایک سوال نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ اسے انسان سے درندہ بنا دیا تھا اور جب وہ گرم گرم اُبلتا ہوا خون پیتے ہوئے بالآخر پکڑا گیا تو اس نے قانون کے محافظوں سے کہا تھا۔ ''میں ہی وہ ہوں، جس کی تلاش میں تم اکیس سال سے سرٹکرا رہے تھے۔ میں نے سیکڑوں انسانوں کا خون کیا اور پیا ہے، لیکن میں پھر بھی پیاسا ہوں۔''

قانون کے محافظ ایک کمزور سے بھی بجھی آنکھوں اور زرد چہرے والے اچھے خاصے خوب صورت انسان کو حراست میں لے کر سوچ رہے تھے۔ کیا یہ وہی درندہ ہے، جس نے ملک میں بسنے والوں کی راتوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں، مگر یہ تو بہت کمزور..... بجھا بجھا سا اور کمزور سا انسان ہے..... کیا انسانوں کا اکیس برس سے خون پینے والا انسان ایسا ہو سکتا ہے۔ اُن کے تصوّرات میں تو وہ ایک درندہ تھا، مگر سامنا ایک کمزور انسان سے تھا، وہ اپنے ہر جُرم کا اعتراف کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''میں یہاں کیوں ہوں؟''

ہزاروں انسان جو اس کی تِکّا بوٹی کرنے کے لیے تیار رہتے تھے، اسے پھانسی کے پھندے کے نیچے کھڑا دیکھ کر حیران ہو رہے تھے..... یہی وہ قاتل..... وہ درندہ..... انسانی خون پینے والا ہے، اسے دیکھ کر دل میں رحم کا جذبہ کیوں پیدا ہو رہا ہے۔

''اچھا تو میں دنیا کو آخری بار دیکھ رہا ہوں۔'' ہزاروں انسانوں کا خون پینے والے پیاسے قاتل نے اپنے آپ سے کہا۔

''تو کیا میں یہ جانے بغیر ہی دنیا سے رُخصت ہو جاؤں گا کہ میں پیاسا کیوں رہا۔ ہر لمحہ پیاس میں کیوں بھٹکتا رہا۔''

انکشاف کا لمحہ آن پہنچا تھا۔

ہجوم میں کھڑی ایک عورت کی گود میں ایک شیر خوار بچہ بلبلا کر رونے لگا۔ پھانسی کے پھندے کے نیچے کھڑے مجرم نے اس عورت کو اور پھر روتے ہوئے بچے کی طرف دیکھا۔

وہ چیخا..... ''اسے دودھ پلا دو..... اسے دودھ پلا دو..... سنو لوگو۔ زندگی کے آخری لمحوں میں مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا ہے، جس نے مجھے درندہ بنا دیا تھا۔''

جلاّد نے اس کے سر پر کالی ٹوپی چڑھا دی، لیکن وہ پھر بھی بولتا چلا گیا۔

''ہاں! سنو..... میں ساری عمر اس لیے پیاسا رہا کہ مجھے اپنی ماں کا دودھ کبھی نصیب نہیں ہوا تھا..... ماں کا دودھ..... ماں کی ممتا..... سب بچوں میں بانٹ دو..... بانٹ دو.....''

جلاّد تختہ کھینچ چکا تھا۔

ہزاروں کے مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ سہمے ہوئے..... حیرت زدہ..... پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

☆.....☆

زمر نعیم کے شاہکار ناولٹ کا مجموعہ

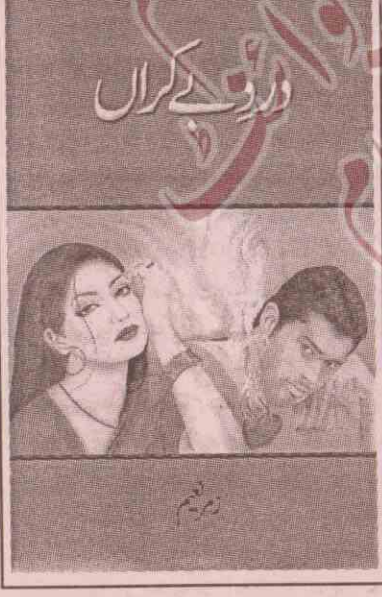

آتشِ جنوں

سلیم فاروقی

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے غداروں کا نام و نشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس مہم کے میں اُس نے اپنا سب کچھ ہار دیا لیکن حوصلے نہیں ہارا

انتقام کے جوالہ مکھی میں سب کچھ بھسم کر دینے کا حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی پُرخطر داستان

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے..... ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان' راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران میں اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم مُنّی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ مُنّی' راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مُنّی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلۂ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں' اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا' اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ' عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان' بیرسٹر بخاری کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے..... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں.....

راستے میں تیمور اور عمران' شیر خان پر قابو پا لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ بابر خان کے پاس پہنچتے ہیں اور وہاں تیمور اچانک ریوالور نکال کر بابر خان کی کنپٹی پر رکھ دیتا ہے۔ بابر خان سکتے کی کیفیت میں تیمور کو دیکھنے لگتا ہے۔

فائلوں کے حصول کے بعد عمران اور تیمور گھر آتے ہیں تو اُن کے گھر پر بم سے حملہ ہو چکا تھا۔ اس حملے میں ان کا بھائی ارسلان بھی کام آ جاتا ہے' اس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ یہ سب کچھ مشہدی نے کرایا تھا۔ جوابی وار کے طور پر عمران اور تیمور' مشہدی کے ایک قریبی ساتھی جان محمد کی دو بیٹیوں کو اغوا کر کے اسے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ اُن کی بہن کے بارے میں بتائے ورنہ اُس کی بیٹیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جان محمد کی بیٹیاں ندا اور حرا' عمران کو بھائی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں تو وہ بھی جذباتی ہو کر انہیں بہن کا درجہ دے کر اُن کے گھر چھوڑ کر آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کے بھائی عدنان کی آمد ہوتی ہے جسے وہ مُردہ تصور کر چکا تھا۔ آگے چل کر عمران' تیمور اور نادیہ اپنے دشمن بابر خان کو اغوا کرتے ہیں اور عمران اُسے معذور کر دینے کی دھمکی دیتے ہوئے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

غلام رسول مچھلی والے سے ملاقات کے دوران میں وہ انہیں کسی خطرے سے خبردار کرتے ہوئے اپنے خاص آدمی کے ذریعے روانہ کرتا ہے جہاں اُن کا ایک گینگ سے جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ لوگ انہیں مار بھگاتے ہیں' راستے میں اُن کا ایک جعلی پولیس انسپکٹر سے رابطہ ہوتا ہے اور پھر کہانی میں ایک نئے کردار کا اضافہ ہوتا ہے۔

عمران اپنی بہن کی تلاش میں اس کی دوست وردہ کے گھر پہنچتا ہے جہاں وردہ کے والد بتاتے ہیں کہ رات میں کسی

لڑکی کا فون آیا تھا' فون نمبر کی انکوائری پر معلوم ہوتا ہے' وہ نمبر اسٹیشن کے قریب کسی پی سی او کا ہے۔ عمران اور نادیہ کینٹ اسٹیشن پہنچتے ہیں جہاں نادیہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عمران ان اغواکاروں کو پکڑ کر پوچھ گچھ کرتا ہے۔

جان محمد جو کہ شہدی کا آدمی ہے لیکن اصل میں وہ عمران کے لیے کام کر رہا ہے۔ معلومات فراہم کرتا ہے کہ ان کے خاتمے کے لیے مشہدی نے جن کرائے کے قاتلوں کو امریکا سے بلایا ہے' ان کی تعداد پانچ ہے جن میں سے دو کا تعلق امریکا سے ہے ایک ہندو ہے اور دوسرا یہودی۔

آنے والا پولیس آفیسر عمران کو بتاتا ہے کہ وہ لوگ ایک خطرناک دہشت گرد کا پیچھا کر رہے تھے۔ انہیں شک ہے کہ وہ ارد گرد کے کسی بنگلے میں نہ گھس گیا ہو۔ عمران اسے بتاتا ہے کہ ان کے بنگلے پر موجود سیکورٹی کی موجودگی میں ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔

تیمور آ کر بتاتا ہے کہ انہوں نے آرملڈ کی لاش کے سینے پر "تتھے" والا لیٹر لگا دیا ہے۔ لاش کچھ دیر میں پولیس کو مل جائے گی۔ بلوچ کہتا ہے کہ اس نے شہدی کے ٹھکانے کا سراغ لگا لیا ہے۔ اسٹیمر پر اس کے ساتھ پانچ چھ آدمی ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ آپ ان لوگوں کے بارے میں انفارمیشن جمع کرو، میں آپریشن کی تیاری کرتا ہوں۔

ٹی وی چینلز آرملڈ کے بارے میں خبر نشر کرتے ہیں کہ مشہدی مقتول کو نہیں جانتے اور ان کا کام نے ان کے کسی دشمن نے ان کے خلاف کارروائی کی ہے۔ آپریشن پر روانگی سے قبل ہاشم نادیہ کو کہتا ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی، وہ خود اس وقت کے پی ٹی سی کے سیکورٹی افسر کے یونیفارم میں تھا۔ کے پی ٹی کے مین گیٹ پر سیکورٹی اہل کار نے جب ہاشم کو آفیسر کی یونیفارم میں دیکھا تو فوراً سیریٹ دیے۔ جیپ پر آگے بڑھتے ہوئے وہ اس ملاقاتی میں پہنچتے ہیں جہاں اسٹیمر لانچز اور بوٹس کھڑی تھیں۔ ہاشم بتاتا ہے کہ سامنے جو بڑا اسٹیمر ہے، وہ مشہدی کا ہے، جبکہ دوسرا اسٹیمر سیٹھ عبدالمنان کا ہے۔ عمران کہتا ہے کہ پہلے سیٹھ عبدالمنان کے اسٹیمر پر جایا جائے وہاں سے مشہدی کے اسٹیمر میں جانے میں آسانی ہوگی۔

اسٹیمر پہنچ کر بلوچ ایک کیبن کا دروازہ کھولتا ہے تو اندر ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی موجود ہوتے ہیں۔ وہ لڑکا بتاتا ہے کہ وہ سیٹھ عبدالمنان کا بیٹا ہے اور اسٹیمر پر اس کے علاوہ دو مزید آدمی موجود ہیں، جنہیں بلوچ پہلے ہی بے ہوش کر چکا تھا۔ ہاشم ان دونوں کو بھی رسیوں اور کاموتہ مار کر بے ہوش کر دیتا ہے اور بلوچ سے کہتا ہے کہ میں اسٹیمر کو مشہدی کے اسٹیمر کے ساتھ لگاؤں گا، پھر وہاں سے ہم مشہدی کے اسٹیمر میں چلے جائیں گے۔ مشہدی کے اسٹیمر کے نزدیک پہنچ کر وہ ڈیک پر موجود مسلح افراد سے کہتے ہیں کہ ان کا فرسٹ ایڈ باکس کہیں کھو گیا ہے اور ان کا ایک آدمی زخمی ہے۔ یہ کہہ کر عمران ان کے اسٹیمر پر کود جاتا ہے اس کے پیچھے ہاشم بھی تھا، جو کہ کے پی ٹی کے سیکورٹی افسر کے یونیفارم میں تھا، یہ دیکھ کر ان لوگوں نے اسلحہ نکال نکالا تھا۔ عمران اور ہاشم نے ان لوگوں کو قابو کر لیتے ہیں۔ وہاں سے وہ شہاب عرف شبو کے کیبن میں پہنچتے ہیں جہاں شہاب اپنی بیوی کے ساتھ موجود تھا۔ عمران ریوالور کی مدد سے انہیں قابو کرتا ہے، بلوچ ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا ہے۔ بلوچ اور ہاشم ان دونوں کو بوٹ میں چھوڑ آتے ہیں۔ بلوچ کہتا ہے کہ تیمور اور نادیہ ان کا انتظار کر رہے ہوں گے، ہاشم کو واپس بھیج دیا جائے، شبو سے تم نمٹ لیں گے۔ ہاشم وہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔ عمران بلوچ کو کہتا ہے کہ بوٹ کھلے سمندر میں لے چلو۔ بلوچ شبو سے پوچھ گچھ شروع کر دیتا ہے۔

شبو بتاتا ہے کہ ارسلان مشہدی کی قید سے فرار ہو گیا تھا جاتے جاتے مشہدی کی خفیہ فائل لے گیا ہے۔ انڈیا میں وہ "را" والوں کے مجھے چڑھ گیا اور اب تہاڑ جیل دہلی میں ہے۔ اچانک سامنے سے کوسٹ گارڈز والوں کی تیز رفتار بوٹ آتی ہے جسے دیکھ کر بلوچ اپنی بوٹ کی اسپیڈ بھی بڑھا دیتا ہے۔ کوسٹ گارڈز کی بوٹ کی طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی ہے، حملے میں شہاب مارا جاتا ہے۔

بلوچ بوٹ کو ایک تنگ کھاڑی میں لے جاتا ہے اور اس کا انجن بند کر دیتا ہے۔ کھاڑی میں بلوچ کو بوٹس کے انجن کی آواز سنائی دیتی ہے وہ کہتا ہے کہ "لگتا ہے کہ کوسٹ گارڈز والوں نے اب تک ہم لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ عمران بلوچ کو دیکھتا ہے جس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے، پھر پانی میں ایک چھپا کا ہوا اور کوئی تیرتا ہوا اس کھاڑی میں داخل ہو گیا۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

ہم لوگ دم سادھے کھاڑی کے اس سرے کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سے کوسٹ گارڈز کا ایک جاں باز اپنی جان داؤ پر لگا کر اندر کی طرف آ رہا تھا۔ مجھے اس جنونی کی دلیری پر رشک آنے لگا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ ہمارے پاس ہتھیار بھی ہیں۔ اگر ہماری بوٹ اس کھاڑی میں ہوئی تو ایک ہی گولی اس کا کام تمام کر دے گی، اس کے باوجود وہ نتائج کی پروا کیے بغیر موت کی اس وادی میں کود پڑا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے نڈر اور بی دار لوگ خال خال ہی دیکھے تھے۔ اس کا جنون دیکھ کر مجھے ارسلان یاد آیا..... وہ بھی اتنا ہی جنونی اور ضدی تھا۔

اس وقت سمندر کی لہروں کے خوف ناک شور کے سوا مجھے صرف ہلکی ہلکی چھپ چھپ سنائی دے رہی تھی۔

بلوچ کے ایک آدمی نے اپنی رائفل نکالی اور اس پر فائر کرنے کو تیار ہو گیا۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ "نہیں، فائرمت کرنا، ان کا ایک آدمی تو مر جائے گا لیکن پھر وہ اس کھاڑی کو نیست و نابود کر دیں گے۔"

میں نے بلوچ کو خوطہ خوری کا لباس پہنتے دیکھا۔ "تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس بدبخت کو ڈبو کر ماروں گا اور اس کی لاش کھاڑی کے باہر پھینک دوں گا۔" پھر وہ چھلانگ لگانے کے بجائے ایک مضبوط رسّا پکڑ کے پانی میں اتر گیا۔

کوسٹ گارڈز کی موٹر بوٹس کی فلیش لائٹس روشن تھیں، لیکن وہ کھاڑی کے اندر تک نہیں آ رہی تھیں، بس اس کے دہانے راستے سے چند فٹ کے فاصلے پر رہ رہی تھی۔

پانی میں چھلانگ لگانے والا جنونی کوسٹ گارڈز کا اہل کار اب یقیناً روشنی کی اس حد سے آگے بڑھ چکا تھا، کیوں کہ

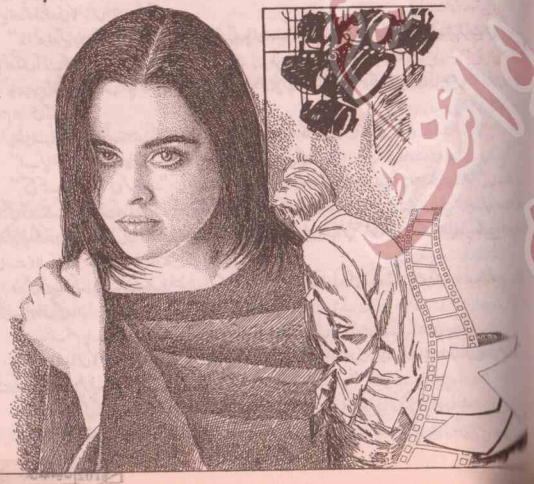

اس کے چھپاکوں کی آواز اب مجھے زیادہ واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔

اب کسی بھی لمحے بلوچ سے اس کا ٹکراؤ ہو سکتا تھا۔

"ماجدا!" کوئی میگا فون پر چیخا۔ "واپس آجاؤ۔ یہ کھاڑی ایسی نہیں ہے کہ اس میں اتنی بڑی واٹر بوٹ داخل ہو سکے۔"

جس وقت ہم کھاڑی میں داخل ہوئے، اس وقت دونوں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی اور میں نے کوسٹ گارڈز کی موٹر بوٹس کو اندھا کر دیا تھا۔ اسی افراتفری میں انہیں ہماری موٹر بوٹ کے سائز کا شاید کچھ اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

کھاڑی میں پانی کے چھپاکوں کی آواز کچھ اور واضح ہو گئی۔ میرا اندازہ تھا کہ بلوچ کوسٹ گارڈ کے اس اہل کار سے ٹکرا گیا ہے۔

پھر مجھے چھپاکوں کی وہ آوازیں دور ہوتی محسوس ہوئیں۔ وقت بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔

باہر سے مسلسل کوئی میگا فون پر چیخ رہا تھا۔ "ماجدا! کیا تم میری آواز سن رہے ہو.....؟ واپس آجاؤ، اس قسم کی کھاڑیوں میں عموماً شارک مچھلیاں بھی ہوتی ہیں۔"

اس کی آواز سن کر بلوچ کا آدمی بے ساختہ ہنسنے لگا۔ وہ بے آواز ہنستا ہوا عجیب سا لگ رہا تھا، پھر اس نے سرگوشی کی۔ "کوسٹ گارڈ کا یہ افسر یا تو کچھ جانتا نہیں ہے یا پھر اپنے ساتھی کی جان بچانے کو ایسا کہہ رہا ہے۔ ادھر شارک کہاں ہے واجہ! شارک مچھلی تو یہاں سے بہت دور کھلے پانی میں ہوتی ہے۔"

مزید کچھ دیر بعد کوئی چیخ کر بولا۔ "اس کھاڑی میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی موٹر بوٹ اس میں چٹانوں سے ٹکرائے بغیر داخل ہو سکے۔ ان لوگوں نے شاید پاکستانی سمندری حدود کراس کر لی ہیں۔ اب وہ اندر کی کوسٹ گارڈ کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔" یہ ماجد کی آواز تھی۔

وہ واپس جا چکا تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے سکون کا ایک طویل سانس خارج ہو گیا۔ چند منٹ بعد بلوچ بھی بوٹ پر آ گیا اور غوطہ خوری کا لباس اُتارنے لگا۔

"بڑا خیر ہو گیا واجہ!" اس نے کہا۔ "گولی کان کے پاس سے گزر گئی ہے۔ ہم نے تو سوچ لیا تھا کہ زندہ ان لوگ کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔"

باہر سرچ لائٹس کا رُخ اچانک بدل گیا، پھر مجھے موٹر بوٹس کے انجنوں کی آوازیں سنائی دیں جو رفتہ رفتہ معدوم ہو رہی تھیں۔

چند منٹ بعد وہاں صرف سمندر کی بپھری ہوئی لہروں کے شور کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔

"اب کیا، ہم صبح تک اسی کھاڑی میں قید رہیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"صبح تک!" بلوچ ہنس کر بولا۔ "صبح تک اگر ہم لوگ اس کھاڑی میں موجود رہے تو ضرور پکڑے جائیں گے۔ میں ابھی آدھے گھنٹے بعد اس کھاڑی سے نکلوں گا، میں جانتا ہوں کہ اب کوسٹ گارڈز کی موٹر بوٹس اپنی سمندری حدود کا ایک راؤنڈ لگا کر واپس چلی جائیں گی۔ میں ایسے راستے سے نکلوں گا کہ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی۔" پھر وہ اپنے آدمی سے بولا۔ "ذرا اچھی سی چائے بنا، میرا جسم درد کر رہا ہے۔"

وہ بھی عجیب لوگ تھے۔ موت سر پر منڈلا رہی تھی، ایک ساتھی کی لاش اب بھی بوٹ میں موجود تھی اور بلوچ کو چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

"جب تک ہم چائے پئیں گے، کوسٹ گارڈ والے راؤنڈ لگا کر واپس جا چکے ہوں گے۔" بلوچ نے کہا۔

چند منٹ بعد اس کا ایک آدمی چائے کے مگ لے آیا۔ اس نے ایک مگ میری طرف بڑھایا، دوسرا بلوچ کی طرف اور تیسرا تاج بخت کی طرف بڑھا دیا۔

وہ بالکل گم صم بیٹھی تھی۔ اس کے جسم میں ذرہ برابر بھی حرکت نہ ہوئی۔

"تاج بخت!" میں نے اس کا شانہ ہلایا۔

وہ یونہی کا یونہی لڑھک گئی۔ "ہاں..... کیا..... وہ لوگ اندر آ گئے؟"

"تم ہوش میں تو ہو؟" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "وہ لوگ واپس جا چکے ہیں، لو چائے پیو تا کہ تم حواس میں آ سکو۔"

اس نے چائے کا کپ پکڑ لیا۔

ہم چائے پی کر فارغ ہوئے تو بلوچ نے اپنے آدمی سے کہا۔ "جا، ذرا باہر کا جائزہ لے کر آ۔ یہ بد بخت لوگ کبھی کبھی ڈاج کے لیے بھی واپسی کا اعلان کرتے ہیں لیکن ان کی ایک دو لانچیں باہر موجود ہوتی ہیں۔"

بلوچ کے آدمی نے غوطہ خوری کا لباس پہنا اور فولادی رسّے کے ذریعے پانی میں اُتر گیا۔

ہم لوگ اس کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

اس کی واپسی میں آدھا گھنٹہ لگا۔ اس نے بتایا کہ باہر کوئی نہیں ہے، ہاں تھوڑی دیر پہلے مجھے بہت دور بوٹس کی روشنی نظر آئی تھی۔

"چل پھر لنگر اٹھا۔ میں اس کھاڑی سے نکلنے کے بعد لانچ کا انجن اسٹارٹ کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے واجہ!" اس نے کہا اور لنگر اٹھانے لگا۔ پھر مجھے بلوچ اور اس کے ساتھی کے ہاتھ میں دو پنچ نظر آئے۔ ان دونوں نے پنچوں کی مدد سے بوٹ کو کھاڑی سے باہر نکال لیا۔

کھاڑی سے باہر سمندر کی موجیں اتنی بپھری ہوئی تھیں کہ لگتا تھا، وہ ہماری بوٹ کو دوبارہ اس کھاڑی میں دھکیل دیں گی یا پھر ہم اس کھاڑی کی چٹانوں سے ٹکرا جائیں گے۔

بلوچ نے بلند آواز میں اپنے ساتھی سے کہا۔ "تو جا کر لانچ اسٹارٹ کر، میں اسے سنبھالتا ہوں۔"

فولادی بوٹ کا انجن غرّا لیا اور وہ ایک جھٹکے سے کھلے سمندر میں نکل آئی۔

بلوچ چھلانگ مار کے بوٹ کی کنٹرولنگ پر بیٹھ گیا۔ اس نے بوٹ کو دائرے کی شکل میں ایک لمبا چکر دیا اور پھر ایک طرف روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے آدمی کو آواز دی اور خود اوپر آ گیا۔

پھر اس نے اپنے مردہ ساتھی کی لاش اٹھائی اور کلمہ پڑھتے ہوئے سمندر کی نذر کر دی۔

"تم کیا چاہتی ہو تاج بخت؟" میں نے پوچھا۔ شہاب کی لاش کو اپنے ساتھ لے جاؤ گی یا پھر ہم اسے بھی پانی کے سپرد کر دیں۔"

تاج بخت ایک بار پھر سسکنے لگی اور بولی۔ "مرنے والا تو مر گیا۔ اب میں کیا چاہوں گی، اسے پانی میں دفن کریں یا مٹی میں۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ اب شہاب نہیں رہا۔"

"تم اس کی جیبوں کی تلاشی لے لو۔" بلوچ نے نرم لہجے میں کہا۔

تاج بخت نے سسکتے ہوئے شہاب کے کپڑوں کی تلاشی لی اس کی جیب میں سوائے ایک چابی کے کچھ بھی نہیں تھا، وہ سونے کے ارادے سے لیٹا تھا اس لیے اس وقت صرف ایک ٹراؤزر اور ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ میں تھا۔ چابی بھی اس کے ٹراؤزر کی جیب میں تھی۔

جب بلوچ اور اس کے ساتھی شہاب کی لاش کو سمندر میں پھینکنے کے لیے اٹھانے لگے تو تاج بخت ایک مرتبہ پھر اس کی لاش سے لپٹ کر رونے لگی، پھر اس نے ہاتھ کی روشنی میں کچھ دیر تک شہاب کے چہرے کا جائزہ لیا اور ایک طرف بیٹھ گئی۔ گویا اس نے اجازت دے دی ہو کہ شہاب کی لاش کو سمندر میں پھینک دیا جائے۔

بلوچ نے اپنے ساتھی کی مدد سے شہاب کی لاش اٹھائی اور اسے سمندر کی نذر کر دیا۔

پھر وہ اپنے آدمی سے بولا۔ "میں بوٹ کو سنبھالتا ہوں، تو اتنی دیر میں یہاں سے خون کے نشانات صاف کر دے۔"

"بوٹ کی باڈی پر بھی کوسٹ گارڈ کی گولیوں کے نشان ہیں واجہ!" اس کے آدمی نے کہا۔

"اُن نشانات کی فکر مت کر۔" بلوچ نے کہا اور بوٹ کا کنٹرول سنبھال لیا۔ بوٹ نے ایک جھٹکا لیا اور اس کی رفتار

میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوگیا۔ بوٹ کے پیچھے پانی کی ایک بہت خوب صورت لکیر سی بن رہی تھی۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس سے بہت انجوائے کرتا۔ بوٹ کی رفتار اتنی تیز تھی کہ سمندر کی بپھری ہوئی لہریں اس سے ٹکراتیں تو پانی کے چھینٹے بوٹ کے اندر بھی آتے تھے۔

تاج بخت ایک کونے میں گم صم بیٹھی تھی اور اتنی مسلسل سی ہچکولے کھاتی بوٹ میں اچھی خاصی روشنی ہوگئی۔ میں نے غور سے تاج بخت کا جائزہ لیا، وہ اپنے لباس اور حلیے سے خاصی معقول اور پڑھی لکھی لگتی تھی۔ وہ خاصی پرکشش اور جاذب نظر عورت تھی۔ اس کی عمر بھی اتنی نہیں تھی جتنی رات کے اندھیرے میں محسوس ہو رہی تھی۔

"تاج بخت!" میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھی۔ "تم جہاں جانا چاہو، میرے آدمی تمہیں چھوڑ دیں گے، تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔"

"میں..... میں اب کہاں جاؤں گی عمران صاحب؟" اس نے کہا۔ "شہاب کے علاوہ دنیا میں میرا تھا ہی کون؟"

"کوئی عزیز رشتے دار، بہن بھائی یا....."

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔" تاج بخت نے کہا۔ میں بہت چھوٹی تھی تو میری ماں مر گئی تھی، باپ نے میری وجہ سے دوسری شادی نہیں کی، وہ ماں سے بہت محبت کرتا تھا، پھر شاید اس کے غم میں مکمل کروہ بھی مجھے چھوڑ گیا تھا۔ میرے ماموں مجھے اپنے گھر لے گئے، ممانی کو میری آمد ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ دن رات مجھ سے نوکروں کی طرح کام لیتی تھی، لیکن ماموں کے سامنے ایسی بن جاتی تھی جیسے اسے مجھ سے بہت محبت ہو، شاید اسی وجہ سے وہ مجھے پڑھنے سے نہ روک سکی۔ ماموں کا ایک بیٹا اور بیٹی تھے۔ بیٹی تو میری ہم عمر تھی، بیٹا عمر میں مجھ سے چھوٹا تھا۔

میں اسکول سے آنے کے بعد گدھوں کی طرح کام کرتی، گندے برتن دھوتی، کپڑے دھوتی، گھر میں جھاڑو پوچھا کرتی اور رات کا کھانا پکانا بھی میری ذمے داری تھی۔

میں نے جیسے تیسے میٹرک کرلیا تو ممانی نے مجھے آگے پڑھانے سے انکار کردیا۔ ماموں کی حیثیت بھی ایسی نہ تھی کہ وہ مجھے مزید پڑھا سکتے۔

میں نے اپنے طور پر نیوشنز کر کے پرائیویٹ طور پر بی اے کیا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے اللہ کو میرے گریجویشن کا انتظار تھا۔ میرا بی اے کا رزلٹ آئے ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ ٹریفک کے کسی حادثے میں ماموں بھی جان بحق ہوگئے۔

ممانی نے تو ماموں کے چالیسویں کا انتظار بھی نہ کیا اور مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں نے اپنی ایک دوست کے گھر پناہ لی، پھر اس کے والد کے توسط سے مجھے ایک سرکاری اسکول میں ملازمت مل گئی۔"

"لیکن شہاب اور تمہارا رابطہ کہاں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بدنام زمانہ شخص تھا، دو بہر کے تمام کام کرتا تھا، پھر شہ....."

"اس سے ملاقات میں ایک فلمی پچویشن ہے، عمران صاحب!" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی تو اس کا پرکشش چہرہ مزید پرکشش ہوگیا۔

میں نے اس اسکول کی تین ٹیچروں کے ساتھ مل کر لانڈھی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا، وہ تینوں سندھ کے مختلف شہروں سے کراچی آئی تھیں۔

مالک مکان اچھا آدمی تھا لیکن اس کا بیٹا بہت اوباش تھا۔ وہ اکثر مختلف بہانوں سے ہمارے گھر آجاتا اور ہم لوگوں سے بھونڈے قسم کے مذاق کرتا۔ خاص طور پر وہ مجھے بہت ہی ہوس پرست نظروں سے دیکھتا تھا۔

ایک دن ہم لوگوں نے شاپنگ کا پروگرام بنایا، لیکن عین وقت پر مجھے شدید بخار ہوگیا۔ میری وجہ سے ان لوگوں نے پروگرام کینسل کرنا چاہا، لیکن میں نے انہیں زبردستی بھیج دیا کہ معمولی بخار ہے، ابھی چائے کے ساتھ ایک ٹیبلٹ لوں گی تو بہتر ہو جائے گا۔ میں نے چائے بنا کر ٹیبلٹ لی اور آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گئی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھی کہ محلے کا کوئی بچہ ہوگا۔ محلے کے کئی بچے ہمارے اسکول میں پڑھتے تھے اور اکثر آجاتے تھے۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو مالک مکان کا لوباش بیٹا غلام حسین تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کیا اندر آنے کو بھی نہیں کہو گی؟" اس نے مکروہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا، پھر مجھے آہستہ سے دھکیل کر گھر میں داخل ہوگیا۔

"تم چاہتے کیا ہو، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں اس وقت آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو مجھ سے اتنی دور دور کیوں رہتی ہے تو؟" اس نے گویا مجھے نظروں نظروں میں کھانے کی کوشش کی۔

"تو کون ہوتا ہے مجھ تاجی کہنے والا۔" میں ایک دم بھڑکی۔ "میرا نام تاج بخت ہے سمجھا، اب یہاں سے دفع ہوجا۔"

اس نے اچانک میری دونوں کلائیاں پکڑیں اور مجھے بیڈ پر دھکیل دیا۔ بخار کی شدت سے میں نڈھال تھی، لیکن اس وقت نہ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی طاقت آگئی کہ میں نے بستر پر لیٹے ہی لیٹے اس کے سینے پر دونوں پاؤں پوری قوت سے مار دیے۔ وہ اچھل کر چارپائی کی دوسری طرف گرا تو میں اسی حالت میں دروازے کی جھاڑ کھولنے لگی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے پکڑ سکتا، میں دروازہ کھول کر کنگے پیر، بغیر دوپٹے کے باہر نکل گئی۔

کھلی اس وقت سنسان تھی۔ غلام حسین نے میرا پیچھا کرنے کی کوشش کی اور دوڑ کر مجھے پکڑ لیا۔ وہ مجھے دبوچ کر ایک بار پھر گھر کی طرف لے چلا۔ اچانک پیچھے سے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ پھر کر مڑا۔ اس علاقے میں کس کی جرأت تھی کہ غلام حسین کا راستہ روکے یا اس پر ہاتھ اٹھائے۔

غلام حسین نے ایک ہاتھ سے میری کلائی پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے کمر میں اڑسا ہوا ریوالور نکال لیا، اس دن مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ غلام حسین مسلح بھی رہتا ہے۔

نووارد اس کے ریوالور سے ڈرنے کے بجائے غراکر بولا۔ "اس لڑکی کو چھوڑ دے اور اس کھلونے کو جیب میں رکھ لے۔"

"اپنے کام سے کام رکھ۔" غلام حسین غرا کر بولا۔ "تو شاید مجھے جانتا نہیں ہے۔"

"میں تجھ جیسے گھٹیا لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" نووارد نے اچانک غلام حسین کے ریوالور والے ہاتھ کی کلائی تھامی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پر زوردار گھونسہ رسید کیا۔

غلام حسین نے بوکھلا کر میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نووارد نے اپنی جیب سے پستول نکالا اور بولا۔ "میں بھی ان کھلونوں سے کھیلنے کا عادی ہوں، آئندہ اگر تو نے اس لڑکی کو پریشان کیا تو تیری لاش کا بھی پتا نہیں چلے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "چلو، ہم میرے ساتھ گھر چلو۔"

وہ مجھے گھر تک چھوڑ کر واپس جانے لگا تو میں نے کہا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟"

"شہاب!" اس نے مختصر جواب دیا اور بولا۔ "آپ میرا نمبر لکھ لیں، آئندہ کبھی اگر یہ آپ کو پریشان کرے تو مجھے ایک کال کر لیجیے گا۔ میں دیکھوں گا کہ یہ کتا بدمعاش ہے؟"

"یہ شہاب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ پھر اس سے پہلے تو میری فون پر باتیں ہوئیں، پھر ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں، وہ کم پڑھا لکھا ہونے کے باوجود بہت با اخلاق اور مہذب تھا۔ بس پھر چھ مہینے پہلے اس نے مجھ سے شادی کی پیشکش کی اور ہماری شادی ہوگئی۔" یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنسنے لگی، پھر اچانک سنجیدہ ہو کر بولی۔ "ہو سکتے تو آپ مجھے دارالامان یا العدی کے "اپنا گھر" چھوڑ دیں۔"

"ارے بھائی تم جوان ہو، پڑھی لکھی ہو، اسکول یا کسی دفتر میں جاب کرسکتی ہو، پھر ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

"لیکن مجھے تحفظ تو نصیب نہیں ہوگا، غلام حسین جیسے لوگ ہر ہر قدم پر گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں، میں ان درندوں کا مقابلہ کب تک کرسکتی ہوں؟"

"اچھا تم پریشان مت ہو۔ میں تمہارے بارے میں کچھ سوچتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر سمندر کی لہروں پر نظریں جما کر ڈوب گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد بلوچ آگیا اور بولا۔ "واجہ! ہم لوگ پہنچ گیا، یہاں سے تھوڑی دور بارا ایم حیدری کا ساحل ہے۔"

"ابراہیم حیدری؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ولیہ!" بلوچ مسکرا کر بولا۔ "ابھی پورٹ کی طرف سے جانا تو خطرناک تھا۔ کوسٹ گارڈ والوں کا کوئی بھی لانچ ہماری بوٹ پر گولیوں کے نشان دیکھ کر ہمیں روک لیتا۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "میں نے اپنے آدمیوں کو ٹیلی فون کر دیا ہے، وہ گاڑی لے کر آ گیا ہوگا۔"

اس وقت مجھے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ میں نے اسے اس وقت آف کر دیا تھا جب ہم کھاڑی میں تھے کہ کہیں نادیہ یا ہاشم کی کال نہ آ جائے۔

میں نے فوراً اپنا سیل فون آن کیا تو اس پر نادیہ، تیمور اور ہاشم کے بارہ کے قریب ایس ایم ایس تھے، وہ لوگ میری طرف سے فکرمند تھے۔

میں نادیہ کو کال کرنے ہی والا تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی، اسکرین پر نادیہ کا نام تھا، میں نے فوراً کال ریسیو کر لی، نادیہ خفگی سے بولی۔ "تم کہاں ہو عمران؟ ہم لوگ ساری رات تمہارے سیل فون پر کال کرتے رہے، پہلے تو سگنل ہی نہیں مل رہے تھے، پھر تمہارا سیل فون آف ہو گیا۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں نادیہ اور ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر گھر پہنچ رہا ہوں۔ ہاشم اور تیمور کو بھی بتا دو کہ ہمارا آپریشن کامیاب رہا ہے۔"

"لیکن تم ہو کہاں؟" نادیہ نے پوچھا، اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "میں جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں اور ایک گھنٹے بعد گھر پہنچ رہا ہوں۔"

"عمران..... تم....." نادیہ کی آواز کٹ کٹ کر آ رہی تھی، شاید یہاں بھی سگنلز کا پرابلم تھا۔

"نادیہ! شاید نیٹ ورک کام نہیں کر رہا ہے، میں..... گھر پہنچ کر تفصیل بتاؤں گا۔" اسی وقت سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ساحل پر بلوچ کے آدمی ایک گاڑی سمیت موجود تھے۔

اس نے اپنے آدمیوں کو وہیں چھوڑ کر بوٹ کے بارے میں کچھ ہدایات دیں اور مجھ سے بولا۔ "آؤ ولیہ! تمہیں گھر پہنچا دوں۔" پھر وہ تاج بخت سے مخاطب ہوا..... "تم کہاں جاؤ گی؟"

"یہ میرے ساتھ جائے گی۔" میں نے کہا۔

بلوچ نے مزید کچھ نہیں پوچھا، اس نے مجھے اپنے ساتھ والی سیٹ بٹھایا اور تاج بخت کے لیے بیک سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی اچھلتی کودتی کچے راستے پر روانہ ہو گئی۔ وہ ہارڈ جیپ تھی اس لیے کٹی جگہ ریت میں سے بہت آسانی سے گزر گئی۔

☆.....☆.....☆

میں گھر پہنچا تو نادیہ کے ساتھ ساتھ ہاشم اور تیمور بھی انتہائی پریشان تھے، وہ لوگ برآمدے میں کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ تیمور کے دوسرے ساتھی نعیم، ندیم اور عامر وغیرہ بھی تشویش میں مبتلا تھے اور برآمدے کے ارد گرد ہی موجود تھے۔ مجھے صحیح سلامت دیکھ کر ان سب کی جان میں جان آئی۔

"یار، تم بڑے عجیب آدمی ہو۔" ہاشم نے غصے میں کہا۔ "کم سے کم سیل فون پر ہمیں تو صورتحال سے آگاہ کر دیتے۔ مجھے اندازہ تھا کہ کھلے سمندر میں اکثر سیٹل فون کا نیٹ ورک کام نہیں کرتا ہے۔"

"یار! واقعات اتنی تیزی سے پیش آئے کہ میں تمہیں انعام نہ کر سکا۔" پھر میں نے انہیں تفصیل سے اس پورے آپریشن کے بارے میں بتایا۔

ہر شخص کو تاج بخت سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔

ہاشم نے کہا۔ "تاج بخت! تم رات بھر کی تھکی ہوئی ہو، تم جا کر فریش ہو جاؤ، پھر ناشتا کرنے کے بعد سو جانا۔" پھر وہ کلثوم سے مخاطب ہوا۔ "کلثوم! تاج بخت کو اوپر مہمانوں والے کمرے میں لے جاؤ۔"

اس کے جانے کے بعد تیمور نے مجھ سے کہا۔ "اگر ارسلان تہاڑ جیل میں ہے تو اسے وہاں سے رہائی کیسے دلائی جائے؟"

"میں بھی سارا وقت اس بارے میں سوچتا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تہاڑ جیل دہلی کی ناقابل تسخیر جیلوں میں شمار ہوتی ہے اور یہ بھی کنفرم نہیں ہے کہ ارسلان وہاں ہے بھی یا وہاں سے بھی بھاگ نکلا ہے۔ وہ جب شہنشاہ کی قید سے فرار ہو سکتا ہے تو تہاڑ جیل سے بھی فرار ہونے کی کوشش کر سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بھارتی حکام نے اسے وہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا ہو؟"

"کچھ بھی ہو۔" ہاشم نے کہا۔ "ہم یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھ سکتے۔ اس بارے میں کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔"

"بھارت میں تمہارے کسی سے تعلقات ہیں؟" میں نے ہاشم سے پوچھا۔

وہ چونک کر بولا۔ "ہاں بھارت میں کئی افراد سے میرے تعلقات ہیں لیکن ان میں کم سے کم دو تو ایسے ہیں جو خلوص سے میری مدد بھی کریں گے۔"

"تو پھر تم پہلے ان کے ذریعے کسی طرح یہ معلوم کراؤ کہ ارسلان اس وقت بھی وہاں ہے یا اسے کہیں اور شفٹ کیا جا چکا ہے؟"

"میں شام تک معلوم کر لوں گا۔" ہاشم نے کہا۔ "میں براہِ راست پاکستان سے کال نہیں کرنا چاہتا۔ ممکن ہے بھارتی حکومت نے پاکستان سے کی جانے والی کالز پر کسی قسم کی آبزرویشن لگا رکھی ہو۔"

"پھر؟" تیمور نے پوچھا۔ "آپ ان لوگوں سے کیسے رابطہ کریں گے؟"

"لندن میں میرا ایک دوست ہے، میں اسے کال کروں گا، وہ بھارت میں میرے کسی ساتھی سے رابطہ کرے گا، اس لیے میں نے شام تک کا وقت مانگا ہے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "یہ شیو کی بیوی کو تم اپنے ساتھ کیوں لے آئے؟ شیو شہنشاہ کا خاص آدمی تھا، ممکن ہے تاج بخت بھی شہنشاہ کے گینگ سے تعلق رکھتی ہو؟"

"اس کے بارے میں تو میں معلومات کروں گا، اس کے پاس اس کے ماموں کا ایڈریس بھی ہوگا اور اس اسکول کا بھی جہاں وہ پڑھاتی تھی، لانڈھی کے اس گھر کا پتا بھی ہوگا جہاں وہ رہتی تھی۔"

"اس کے علاوہ بلوچ کے کچھ آدمی شہنشاہ کے گینگ میں ہیں۔" ہاشم نے کہا۔ "ان کے ذریعے ہمیں معلومات مل سکتی ہیں کہ شہاب کی بیوی کا تعلق بھی گینگ سے ہے یا شہاب نے اس معاملات سے دور رکھا تھا۔"

"جب تک اس کے بارے میں مکمل معلومات نہیں ہو جاتیں، اسے باہر بھی نہ جانے دیں اور سیل فون بھی استعمال کرنے دیں۔" نادیہ نے کہا۔

"میں اس سلسلے میں گارڈز، چوکیدار اور اپنے دوسرے آدمیوں کو بھی تاکید کر دوں گا۔" تیمور نے کہا۔

"میرے خیال میں اب آپ بھی ذرا فریش ہو جائیں۔" نادیہ نے کہا۔ "آپ کا حلیہ بھی اس وقت بہت خراب ہو رہا ہے۔"

اس کے کہنے پر میں باتھ روم میں چلا گیا، واقعی رات بھر کی تھکن اور جگراہٹ سے میری حالت خراب تھی، میں شیو کرنے کے بعد دیر تک گرم پانی سے نہاتا رہا تو میری ساری تھکن کافور ہو گئی۔ اس وقت مجھے ان مچھیروں کی سخت جان اور مشکلات کا احساس ہوا جو پندرہ، بیس دن تک کھلے سمندر میں مچھلیاں پکڑتے رہتے ہیں۔ واقعی یہ ان ہی لوگوں کا حوصلہ ہے۔

میں نہا دھو کر فریش ہو کر باہر نکلا تو ناشتا تیار تھا۔

ناشتے کی میز پر کشش سی ایک لڑکی کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ اس کے سیاہ بال کھلے ہوئے تھے اور چہرے پہ بھی تروتازگی کے آثار تھے، پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ یہ تاج بخت ہے۔

نادیہ نے اسے اپنے کپڑے دے دیے تھے، لیکن وہ اس کے جسم پر خاصے تنگ تھے۔ ان چست کپڑوں میں اس کا انتہائی انگیز جسم قیامت اٹھا رہا تھا۔

"واہ بھئی" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم تو پہچانی ہی نہیں جارہی ہو تاج بخت۔"

"یہ سب آپ کی بیگم کی مہربانی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ان کے کپڑے میرے جسم پر تنگ ہیں لیکن....."

"میں آج تمہارے لیے کپڑے منگوالوں گی۔" نادیہ نے ہنس کر کہا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر نادیہ، تاج بخت کو دوبارہ اوپر لے گئی تاکہ وہ اطمینان سے سو جائے۔

میں نے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا شہبدی کی خبر لوں۔"

ایسا لگتا تھا جیسے وہ میری کال کے انتظار میں بیٹھا ہو۔

اس نے پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کرلی اور بولا..... "عمران! تم اب ناقابلِ برداشت ہوتے جارہے ہو۔"

"اب میں نے کیا کردیا؟" میں نے تجاہل کا مظاہرہ کیا۔

"کل رات تم نے میرے اسٹیئر پر حملہ کیا، میرے آدمیوں کو ہلاک کیا اور میرے سپروائزر کو اغوا کرلیا۔"

کہاں کی بانک رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "یہ تو میرے لیے بھی انکشاف ہے، میں بھلا تمہارے اسٹیئر پر حملہ کیوں کروں گے؟ وہ اسٹیئر کہاں جارہا تھا؟ اور تم کیا سمجھتے ہو، میرے پاس کوئی جنگی بوٹ ہے جو میں کھلے سمندر میں تمہارے اسٹیئر پر حملہ کرکے اطمینان سے واپس آجاؤں گا۔"

"کل میرے اسٹیئر پر کسی نے حملہ کیا ہے، وہ کھلے سمندر میں نہیں تھا بلکہ جیٹی پر لنگر انداز تھا۔ یہاں کس میں اتنی جرأت ہے کہ وہ میرے کسی اسٹیئر یا شپ کی طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھ لے؟"

"یہ تو تم خود ہی معلوم کرو کہ اتنی جرأت کس میں پیدا ہوگئی ہے۔"

"میں تمہارے اسٹیئر پر حملہ کیوں کروں گا؟ ہر بات کا کوئی نہ کوئی جواز ہوتا ہے شہبدی! جس طرح ہر قتل کا کوئی جواز ہوتا ہے، تمہارے اسٹیئر پر حملہ کرکے اور تمہارے ان تیسرے درجے کے بدمعاش ساتھیوں کو ہلاک کرکے مجھے کیا فائدہ کیا ہوگا، پھر تم کہہ رہے ہو کہ تمہارے ایک آدمی کو اغوا بھی کیا گیا ہے۔ میں اسے اغوا کیوں کروں گا؟"

"لیکن کل رات کوسٹ گارڈز اور ایک موٹر بوٹ کے درمیان کھلے سمندر میں مقابلہ ہوا ہے۔"

"تو پھر؟" میں نے کہا۔ "کوسٹ گارڈز اور اسمگلرز کے درمیان تو مقابلے ہوتے ہی رہتے ہیں، اس میں تمہارا اسٹیئر کہاں سے آگیا۔ کیا کوسٹ گارڈز نے تمہارے اسٹیئر پر بھی حملہ کیا تھا؟"

"میرے پہ تانے کی کوشش کررہا ہوں کہ ممکن ہے اس موٹر بوٹ میں میرے آدمی کو اغوا کیا گیا ہو؟"

"او بھائی!" میں نے کہا۔ "اوّل تو میں سمندر اور موٹر بوٹ یا لانچ کی الف بے بھی نہیں جانتا، تم کوسٹ گارڈز سے مقابلہ کروا رہے ہو یہ بہت مشکل ہے، تم کوسٹ گارڈز والوں سے معلوم کیوں نہیں کرتے کہ ان لوگوں نے ان موٹر بوٹ والوں کو گرفتار کرکے کہاں رکھا ہے۔ تمہارے تعلقات تو بہت اوپر تک ہیں، ان قیدیوں تک بھی تمہاری رسائی ہو جائے گی، پھر تم ڈائریکٹ ان ہی سے پوچھ لینا کہ انہوں نے تمہارے اسٹیئر پر حملہ کیا ہے یا پھر وہ کوئی اسمگلر ہیں؟"

"وہ موٹر بوٹ کوسٹ گارڈز پر فائرنگ کرنے کے بعد اچانک ہی غائب ہوگئی۔ کئی تلاش کے بعد بھی اس کا سراغ نہیں مل سکا۔"

"وہ کہیں غرق ہوگئی ہوگی۔" میں نے کہا کہ "لیکن یہ سب باتیں تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"صرف اس لیے کہ مجھے شبہ ہے کہ اس حرکت میں تمہارا ہاتھ ہے۔"

"اب تمہارے شکوک وشبہات کا تو میرے پاس کوئی حل نہیں ہے۔"

"ویسے بھی اب زیادہ دن تمہیں رعایت نہیں دوں گا۔ تمہاری موت کے لیے الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے؟"

"ویری گڈ!" میں چونک کر بولا۔ "وہ گنتی کیا ایک ہزار سے شروع ہوئی ہے، یا سو سے یا پھر دس سے؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم الٹی گنتی تو نہ سہی لیکن اگر تم نے ایک ہفتے کے اندر اندر شائستہ کے بارے میں نہیں بتایا تو پھر میری طرف سے الٹی گنتی ضرور شروع ہو جائے گی۔ ویسے بہت افسوس کی بات ہے۔" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "تم جیسا ڈان بھی ایسے مقاصد کے لیے عورتوں کو استعمال کرتا ہے۔"

"میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ شائستہ....."

"میں شائستہ کی بات نہیں کررہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تو ان عورتوں کی بات کررہا ہوں جو تمہارے ہیڈ ورک میں شامل ہیں۔"

"تو کیا تمہارے ساتھ کوئی عورت نہیں ہے؟" مشہدی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "عورت تو عورت، میرے ساتھ تو کوئی مرد بھی نہیں ہے۔ مشہدی صاحب! میں ون مین آدمی ہوں، سمجھے آپ؟"

"ون مین آدمی!" مشہدی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہا تھا، لیکن میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میں نے سیل فون کا اسپیکر کھول رکھا تھا اس لیے مشہدی کی باتیں وہاں موجود ہر شخص سن رہا تھا۔

"مشہدی کو اس قسم کی ڈوز ملتی رہنا چاہیے۔" ہاشم نے ہنس کر کہا۔ "اس سے اس کی خود اعتمادی بری طرح مجروح ہوئی ہوگی اور اسے احساس ہوگا کہ یہاں کوئی اور بھی ہے جو اس کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔"

"اس کا ایک فائدہ اور بھی ہوگا۔" تیمور نے کہا۔ "اس کے امپورٹڈ کرائے کے قاتل سب سے پہلے ہماری تلاش میں نکلیں گے اور ہمیں زیادہ انتظار کرنا پڑے گا۔"

اسی وقت میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اسکرین پر جان محمد کا نام تھا، میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے سیل فون کا اسپیکر آن کیا۔ "کیسے ہو جان محمد؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی تم کہو، تو بہ خیریت ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"کوئی نئی خبر؟" میں نے پوچھا۔

"تم کیا اخبار نہیں پڑھتے یا ٹی وی نہیں دیکھتے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیوں، خیریت تو ہے؟ اخبارات میں کوئی بڑی خبر چھپی ہے؟"

"امریکی حکومت نے آرنلڈ کی موت کا نوٹس لے لیا ہے۔ وہ آخر امریکی شہری تھا۔"

"یہ تو ہونا ہی تھا..... اب مشہدی پر دباؤ مزید بڑھ جائے گا۔"

"امریکی اخبارات نے لکھا ہے کہ آرنلڈ امریکا کا ایک بزنس مین تھا اور پاکستان کے ایک بزنس مین سے بزنس ڈیل کرنے کراچی گیا تھا، مشہدی شدید پریشر میں ہے، اسے یقین ہے کہ یہ آپ کے سوا کسی کا کام نہیں ہوسکتا۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اب آرنلڈ کا ساتھی جیک مشہدی کے ساتھیوں کے ذریعے کتوں کی طرح پورے شہر میں آپ کی بو سونگھتا پھر رہا ہے، اس نے قسم کھائی ہے کہ میں اس شخص کو اپنے ہاتھوں سے ماروں گا جس نے آرنلڈ کو قتل کیا ہے۔"

"جیک کے بارے میں مزید کیا اطلاع ہے۔" میں نے پوچھا۔ "اس کا حلیہ، عادت واطوار وغیرہ۔"

"وہ بھی آرنلڈ کی طرح لمبا تڑنگا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہر امریکن عموماً دراز قد ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کی خاص پہچان یہ ہے کہ وہ چلتے ہوئے خفیف سا لنگڑاتا ہے۔ وہ کسرتی جسم کا مالک ہے۔ صبح سویرے جوگنگ کا عادی ہے اور یہاں بھی وہ اپنی اس عادت سے باز نہیں آیا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ جم بھی پابندی سے جاتا ہے، ایکسرسائز تو وہ کہیں بھی کرسکتا ہے، لیکن جوگنگ کے لیے اس کا گھر سے باہر نکلنا ضروری ہے۔"

"وہ کس حیثیت سے پاکستان آیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"وہ پاکستان میں پاور پلانٹ کے امکانات پر غور کرنے اور ان کا جائزہ لینے کے لیے یہاں آیا ہے، امریکا پاکستان میں سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے۔"

"امریکا پاکستان میں سرمایہ کاری کرے گا؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"سرمایہ کاری تو بعد کا مسئلہ ہے، وہ اپنی کمپنی کے نمائندے کی حیثیت سے پاکستان آیا ہے اور یہاں سرمایہ کاری کے امکانات کا جائزہ لینے کے بعد وہ واپس چلا جائے گا۔"

"اور وہ پاور پلانٹ کہاں لگانا چاہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا ارادہ ہے کہ وہ سندھ کے کسی دور افتادہ علاقے میں پاور پلانٹ لگائے۔"

"یعنی وہ حکومتِ پاکستان کی دعوت پر یہاں آیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"حکومتِ پاکستان کی دعوت پر تو نہیں۔" جانِ محمد نے کہا۔ "وہ اپنے طور پر پاکستان آیا ہے، لیکن اس کے پاس پاکستان آنے کا ایک ٹھوس جواز موجود ہے۔ پھر وہ امریکن کرسٹل ایجنسی بھی اسے برداشت نہیں کرے گی جس کے لیے وہ کام کر رہا ہے۔ وہ کئی جرائم پیشہ ضرور ہے لیکن امریکا میں اس کا بہت رسوخ ہے، اس نے ملک کے مختلف ممالک میں امریکن سی آئی اے کے لیے بہت کام کیا ہے۔"

"یہ کہو کہ بہت قتل و غارت کیا ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں، دنیا کے لیے یہ قتل و غارت ہے لیکن امریکا کی نظر میں....."

"امریکا کی بات چھوڑ دو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم یہ بتا کر وکہ جیک، بوبی، فرانسیڈ اور راج اس وقت کہاں ہیں؟"

"میں یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" جان محمد نے کہا۔

"جیسے ہی کسی کے بارے میں کوئی اطلاع ملی، آپ کو انفارم کر دوں گا۔ ہاں، کل مشہدی کے ایک اسٹیئر پر کسی نے حملہ کر کے اس کے آدمیوں کو ہلاک کر دیا اور اس کے سپر وائزر کو اغوا کر لیا۔" جان محمد نے بتایا۔ "مشہدی کو یقین ہے کہ اس میں بھی آپ کا ہاتھ ہے۔"

"اس کا یقین دُرست ہے جان محمد!" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم اپنی پوری توجہ اب اس بات پر دو کہ کرائے کے قاتل کراچی میں ہیں تو کہاں ہیں؟"

"میں کوشش کر رہا ہوں کہ ان کے بارے میں آپ کو جلد سے جلد اطلاع فراہم کر دوں۔" جان محمد نے کہا۔ "ویسے آپ خود بھی پوری طرح چوکنے رہیں۔"

"میں تو ہر وقت چوکنا رہتا ہوں۔ میں تمہارے فون کرنے کا انتظار کروں گا۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

"ہم لوگوں کو واقعی بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔" ہاشم نے کہا۔ "جن لوگوں کو مشہدی نے بلایا ہے، وہ دنیا کے مانے ہوئے دہشت گرد اور سفاک قاتل ہوں گے۔"

"تم یہ سمجھتے ہو کہ اس نے ان لوگوں کو ہماری خاطر نہیں بلایا۔ ان کا اصل ہدف کوئی اور ہے۔ ہم تو بونس میں مارے جائیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ بونس وہ قاتل اصل سے پہلے ہی وصول نہ کر لیں۔" ہاشم نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"تو کیا ہم لوگ گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائیں؟" میں نے کہا۔

"میں صرف یہ جانتا ہوں کہ ہم اپنے حلیوں میں اتنی تبدیلی کر لیں کہ پہلی نظر میں پہچانے نہ جائیں۔" ہاشم نے کہا۔

"اس کے لیے کیا ہم سب اپنی پلاسٹک سرجری کرا لیں؟" میں نے کہا۔

"حلیے میں تبدیلی پلاسٹک سرجری کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔" ہاشم نے جواب دیا۔ میرا ایک دوست اس فن میں ماہر ہے وہ آج کل کینیڈا میں ہے، کسی ٹی وی ڈرامے کے شوٹ کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا ہے۔ وہ ایک آدھ روز میں آنے والا ہے، وہ ہمارے حلیوں میں ایسی تبدیلی کرے گا کہ ہم خود بھی ایک دوسرے کو نہ پہچان پائیں گے۔"

اچانک تیمور نے کہا۔ "ارسلان اگر "را" کی قید میں ہے تو ہم "را" کے اس اہم اہل کار راجن گپتا کو اٹھا سکتے ہیں اور

جان محمد کے بہ قول پاکستان میں شر پسند عناصر کی پشت پناہی کر رہا ہے اور مشہدی سے اس کا گٹھ جوڑ ہے۔"

"ہاں، وہ خود ہمارے پاس آئے گا اور کہے گا کہ میں راجن گپتا ہوں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "مجھے پکڑ لیں اور میرے بدلے "را" سے ارسلان کی ڈیمانڈ کریں۔"

"آپ تو بعض اوقات بہت زیادہ ہی ہیرا ہی مذاق بنانا شروع ہو جاتے ہیں۔" نادیہ نے کہا۔ وہ دوسروں کے سامنے مجھے آپ ہی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ "اگر تیمور بے چارے نے ایک تجویز پیش کی ہے تو اس کا مذاق اُڑانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں مذاق نہیں اُڑا رہا ہوں، بلکہ تیمور کی عقل کا ماتم کر رہا ہوں جو گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ راجن گپتا کیا اتنے آرام سے ہمارے ہاتھ لگے گا؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "را، والے اپنی شناخت پہلے بدلتے ہیں، ممکن ہے وہ کسی سیاسی پارٹی میں ہو، ممکن ہے یہاں آ کے بزنس کر رہا ہوں اور راجن گپتا کی بجائے اس کا نام ذکاء اللہ ہو۔ وہ لوگ اپنے چہرے مہرے اور حلیے بدل کر ہم میں گھل مل جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو تلاش کرنا بھوسے میں سوئی تلاش کرنے کے مترادف ہے۔"

اچانک میرے سیل فون کی بیل پھر بجنے لگی۔ اسکرین پر اپنے خبری کا نام ایک مرتبہ پھر دیکھ کر میں بری طرح چونکا، پھر میں نے اس کی کال ریسیو کی اور حسبِ عادت اسپیکر آن کر دیا۔ "ہاں جان محمد؟" میں نے پوچھا۔

"عمران صاحب! جیک کا سراغ مل گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا واقعی؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ ہاشم اور تیمور بھی چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

"کہاں ہے وہ؟" میں نے اپنے جذبات پر قابو پا کر پوچھا۔

"وہ کراچی کے کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔" اس نے کہا۔

"کس ہوٹل میں؟" میں نے کہا۔

"کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ہے....."

"مجھے ابھی صرف اتنی اطلاع ملی ہے کہ وہ کراچی کے کسی ہوٹل میں ہے۔" جان محمد نے کہا۔

"کراچی میں تو سیکڑوں ہوٹل ہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "کیا ہم ہر ہوٹل میں جا کر اسے ڈھونڈیں گے، پھر یہ بھی تو علم نہیں ہے کہ وہ کراچی کے کس ہوٹل میں اور کس نام سے ٹھہرا ہے؟"

"مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔" جان محمد نے کہا۔ "ہو سکتا ہے شام تک مزید اطلاع مل جائے، میں نے سوچا کہ آپ کو اس خبر سے تو آگاہ کر دوں۔" جان محمد نے کہا۔

"تمہارا بہت شکریہ جان محمد!" میں نے کہا۔ "تم ہمارے ساتھ اتنا تعاون کر رہے ہو، ویسے تم اپنا بھی خیال رکھنا، اگر مشہدی کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی کہ تم ہمیں اطلاعات فراہم کر رہے ہو تو....."

"میں جانتا ہوں عمران صاحب!" اس نے کہا۔ "یہ موت اور زندگی کا معاملہ ہے، میری صرف اتنی درخواست ہے کہ میرے بعد میری بیوہ ماں اور بیوی بچے بچ جائیں آپ ان کا خیال رکھیں گے۔"

"ارے ارے، یہ تم کیسی مایوسی کی باتیں کرنے لگے جان محمد؟" میں نے کہا۔ تم تو ہمارا حوصلہ بڑھاتے رہے ہو، اب تم بھی ایسی باتیں کرنے لگے ہو، تم بھی بہت زیادہ محتاط رہو اور اب مجھے فون کال مت کرنا، میں خود ہی تمہیں کال کر لوں گا۔ وہ کال میں اس نمبر سے نہیں کروں گا۔ یہ میں تمہارے تحفظ کے خیال سے کہہ رہا ہوں، خدا حافظ۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"میرے ذہن میں بھی یہ ہی خیال آیا تھا۔" ہاشم نے کہا۔ کرکٹ کی اصطلاح میں وہ بہت اچھا کھیل رہا ہے، ضروری نہیں کہ ہر بال پر چھکا ہی پڑ جائے، وہ کسی بھی وقت بیچ آؤٹ ہو سکتا ہے، ممکن ہے مشہدی اس کے سیل فون کا ریکارڈ منگوالے۔"

"جان محمد اتنا احمق نہیں ہے، وہ جس سم سے ہمیں کال کرتا ہوگا، وہ سم بعد میں استعمال نہیں کرتا ہوگا۔"

"وہ اس سم کے ذریعے ہی مشہدی کی نظر میں آسکتا ہے، مشہدی کے پاس تمہارا سیل نمبر ہے، لیکن اسے کسی وقت بھی تمہارے اس سیل نمبر کا علم ہوسکتا ہے جو تم عام طور پر استعمال کرتے ہو۔" ہاشم نے کہا۔ "تم نے اسے کال کرنے سے روک کر اچھا کیا۔"

"میرا تو ذہن ماؤف ہونے لگ گیا ہے۔" نادیہ نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔ "ہم پہلے ارسلان کو تلاش کریں یا اپنے ان دشمنوں سے نمٹیں جو ہماری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

"یہ تو حالات پہ منحصر ہے۔" تیمور نے کہا۔ "اس وقت کچھ بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ ارسلان جہاز میں ہے یا وہاں سے کہیں اور شفٹ ہو چکا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کرائے کے وہ قاتل کہاں ہیں جو ہماری گھات میں بیٹھے ہیں۔"

"وہ لوگ قدوائی کو قتل کرنے آئے ہیں۔" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"قدوائی صاحب! اگلے ہفتے حیدرآباد میں جلسۂ عام سے خطاب کر رہے ہیں۔" ہاشم نے چونک کر کہا۔ "انہیں خطرے سے بروقت آگاہ کرنا ضروری ہے۔"

"ہاں، لیکن وہ ہماری بات کا یقین کیسے کریں گے؟" تیمور نے کہا.....

"میں کوشش کروں گا کہ وہ ہماری بات کا یقین کرلیں۔" میں نے کہا۔ "اس سلسلے میں مجھے ان سے خود ملاقات کرنا ہوگی۔"

ہاشم نے کچھ کہے بغیر اپنا سیل فون نکالا اور کوئی نمبر ملا کر بولا۔ "ہیلو امان! میں ہاشم بول رہا ہوں....." اچھا نمبر محفوظ کرلیا تھا..... یار..... میرے نمبروں پر نہ جانا..... ممکن ہے آئندہ میں تمہیں کسی اور نمبر سے کال کروں..... ہاں تم نے کیوں کال کی تھی.....؟ اچھا..... وہ کب جائے گا..... ہاں یار بہت ضروری ہے..... اس کا نام ارسلان ہے..... نام لکھ لو..... کب تک..... ٹھیک ہے؟" اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

"امان لندن میں رہتا ہے، یہ بھی یہاں پاکستان میں میرے ساتھ ہوتا تھا۔ آج کل یہ وہاں اپنا بیسٹ اسٹور چلاتا ہے۔ میں نے اس کے ذریعے ارسلان کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے، اس کا ایک دوست دہلی میں ہے اور خاصا رسوخ رکھتا ہے، وہ کم سے کم اتنا تو معلوم کرسکتا ہے کہ ارسلان اس وقت کہاں ہے۔"

"ویسے "را" والے اپنے قیدیوں کو تنہا زنجیل یا کسی بھی مقامی جیل میں تو کم ہی رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان کے تو اپنے جیل ہیں، اپنے ٹارچر سیل ہیں، وہ پبلک جیل میں تو قیدیوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرسکتے۔"

"پہلے سے اندازے مت لگاؤ۔" ہاشم نے کہا۔ "ممکن ہے "را" نے اسے گرفتار کیا ہو، پھر بے ضرر سمجھ کر بھارتی پولیس کے حوالے کردیا ہو۔"

"ویسے ارسلان اتنا بے ضرر ہے نہیں۔" تیمور نے کہا۔ "وہ ایران میں تھا، پھر وہاں سے افغانستان پہنچا، پھر بھارت میں رانے اسے گرفتار کیا۔ ان لوگوں نے اس پر سنگین الزامات لگائے ہوں گے۔"

"میں نے کہا تھا کہ وقت سے پہلے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔" ہاشم نے جھنجلا کر کہا۔ "وقت سے پہلے قیاس آرائیاں مت کرو، پہلے کنفرم تو ہو جائے کہ ارسلان بھارت کی جیل میں ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ ہاشم کا موڈ خراب ہوگیا ہے، وہ بے چارہ تو اپنے طور پر ارسلان کے بارے میں معلومات حاصل کررہا تھا اور ہم بنا سوچے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔

ہاشم نے دوبارہ سیل فون جیب سے نکالا اور پھر کسی کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد لائن ملنے پر بولا۔

"ہیلو صغیر! شکر ہے تم واپس آگئے، میں توضیح سے تمہیں کال کررہا ہوں لیکن تمہارا نمبر آف تھا، اچھا ابھی تھوڑی دیر پہلے پہنچے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے بہت زیادہ طویل سفر کیا ہے اس لیے تھکن بھی ہوگی، ٹھیک ہے تم آرام کرو، صبح بات

ہوگی..... نہیں، ایسی کوئی ایمرجنسی نہیں ہے، تم آرام کرلو، کل ملاقات کرتے ہیں، خدا حافظ۔"

"کس کال کی ہاشم؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے میک اپ آرٹسٹ دوست صغیر کو۔" ہاشم نے کہا۔ "وہ کل صبح بلکہ دوپہر تک آئے گا۔ اس کی توصیح گیارہ بجے ہوتی ہے، میں خود جا کر اسے لے آؤں گا۔"

"وہ شخص قابل اعتبار تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہے، پھر میں اسے یہاں نہیں بلاؤں گا، بلکہ ہم کسی ہوٹل میں کمرہ بک کرالیتے ہیں اسے وہیں بلالیں گے، کمرے ابھی بک ہو جائیں تو اچھا ہے۔"

"تیمور اور نادیہ اس کام میں ایکسپرٹ ہیں۔" میں نے کہا۔ "بلکہ نادیہ میری پی اے کے طور پر ہوٹل ٹیلی فون کرے گی۔"

"یہ کام تو میں ابھی اور اسی وقت کرسکتی ہوں۔" نادیہ نے کہا۔ "کسی ہوٹل میں کمرہ بک کرانا ہے؟"

"کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں۔" ہاشم نے کہا۔

"جہاں سوئمنگ پول اچھا ہو۔" تیمور نے لقمہ دیا۔

نادیہ کمرے سے باہر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک ڈائری لے آئی۔ "اس میں بڑے بڑے اداروں، پی آئی اے، اسٹیل ملز، بجلی کینٹس، ریلوے اور سیکریٹریٹ کے فون نمبرز بھی ہیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "کتنے کمرے بک کراؤں؟"

"دو کمرے کافی ہوں گے۔" تیمور نے کہا۔

"ایک کمرے میں ہاشم بھائی اور میں گزارہ کرلیں گے اور دوسرے کمرے میں....."

"تم تین کمرے بک کراؤ۔" میں نے کہا۔ "میں ملتان کا ایک صنعت کار اور جاگیردار ہوں اور تیمور اور ہاشم میرے ساتھی ہیں۔"

نادیہ نے مختلف ہوٹلز میں کمروں کی بکنگ کے لیے کوشش کی۔ اس دوران ہم لوگ اپنے طور پر حالات کا تجزیہ کرنے لگے۔

"ہمیں ریجنٹ پلازہ میں تین کمرے مل گئے ہیں، ایک ہی فلور پر آمنے سامنے۔" نادیہ نے کہا۔ "میں نے مسٹر اظفر خاکوانی اینڈ کمپنیز کے نام سے کمرے بک کرائے ہیں۔" نادیہ نے بتایا۔

"ارے یار! تم تو بہت تیز ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

☆.....☆.....☆

رات تک ہاشم کے دوست امان کا ٹیلی فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ارسلان نامی ایک نوجوان چار دن پہلے تک تہاڑ جیل میں تھا لیکن اب اسے وہاں سے شفٹ کردیا گیا ہے، اس پر دہشت گردی، ڈکیتی اور قتل کے سنگین الزامات ہیں، اسے "را" والے جیل سے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔ "اب وہ لوگ اسے کہاں لے گئے ہیں؟"

"کل تک یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔" ہاشم نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ یہ تصدیق ہوگئی کہ ارسلان زندہ ہے اور کچھ دن پہلے تک تہاڑ میں تھا۔ یہاں تک توشیخ کی اطلاع بالکل درست تھی۔"

میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے اب تک ارسلان کے زندہ ہونے کا یقین نہیں تھا۔ آج مجھے واقعی یقین آ گیا ہے کہ ارسلان زندہ ہے۔"

میرے ساتھ ساتھ تیمور اور نادیہ بھی آنسو بہانے لگے۔ تیمور بچوں کی طرح سسکتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا اور بولا۔ "عمران بھائی! یقین تو مجھے بھی نہیں تھا لیکن میں آپ کی وجہ سے کچھ بولتا نہیں تھا۔ میرا دوست، میرا بھائی زندہ ہے، مجھے بھی آج ہی اس بات پر یقین آیا ہے۔"

میں نے تیمور کے آنسو اپنی ہتھیلی سے خشک کیے اور نرمی سے کہا۔ ”آپ لوگوں نے کبھی کسی چھوٹ کے مضبوط اور توانا جوان کو لڑکیوں کی طرح بلک بچوں کی طرح آنسو بہاتے دیکھا ہے؟“

”اگر انہوں نے کسی چھوٹ ایک انچ کے ناقابل تسخیر جوان کو عورت کی طرح آنسو بہاتے دیکھا ہوگا تو یقیناً انہوں نے مجھے بھی دیکھا ہوگا۔“ تیمور نے میرا جملہ مجھ ہی پر الٹ دیا۔

میں نے پیار سے اس کے ایک دھپ لگائی اور بولا۔ ”احمق! یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“

”تو پھر اسی خوشی میں ایک زبردست ڈنر ہو جائے۔“ تیمور نے ہنس کر کہا۔

”ویسے بھی ہم لوگ کل کاذون اور رات ہوٹل میں گزارنے والے ہیں۔“

”تم نے اس قیام میں رات کہاں سے شامل کرلی؟“ میں نے کہا۔

”صغیر کا کام مشکل سے دو تین گھنٹے میں نمٹ جائے گا۔“

”اس کے بعد تو ہمیں کسی سے چھپنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔“ تیمور نے جواز پیش کیا۔ ”پھر تو کوئی ہمیں پہچان بھی نہیں پائے گا۔“

”چلو، پھر کل کاذون میری طرف سے۔“ ہاشم نے کہا۔ ”میں نے بھی عمر سے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں آزادی سے ڈنر نہیں کیا، ابھی تک مفرور قیدیوں کی سی زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس کا خیال پہلے کیوں نہیں آیا؟“

”اس لیے کہتے ہیں، دیر آید درست آید!“ میں نے کہا۔ ”آپ میں بھی کوئی مصلحت ہی ہوگی۔“

پھر میں مزید کچھ کہنے والا تھا کہ مجھے تاج بخت دکھائی دی۔ وہ خوب دن بھر کی سوئی تھی اور اب فریش ہو کر آئی تھی۔ اس کے جسم پر اب بھی نادیہ ہی کے کپڑے تھے۔

”اوہو!“ نادیہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں تو بالکل بھول ہی گئی کہ تاج بخت کے لیے کپڑے منگانے ہیں۔“

”کپڑے اتنے ضروری نہیں ہیں۔“ تاج بخت نے کہا۔ ”کپڑے تو کل بھی آسکتے ہیں۔“ پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”آپ لوگوں نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہارا اپنا کیا فیصلہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے تو ابھی تک کوئی فیصلہ کیا ہی نہیں، میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ کچھ بھی سوچ سکوں۔ میرا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا ہے۔“

”تم مشہدی کو جانتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اس کا صرف نام سنا ہے۔“ تاج بخت نے جواب دیا۔ ”کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ شہاب مجھے اپنے دوستوں سے نہیں ملاتا تھا۔“

”بہت اچھا کرتا تھا۔“ تیمور نے کہا۔ ”بیوی کو تو گھر میں محدود رہنا چاہیے۔“

”جب تک تمہارا انہیں معقول بندوبست نہیں ہو جاتا تم ہمارے ساتھ رہو گی۔“ میں نے کہا۔

”اس نے ممنونیت سے مجھے دیکھا، لیکن بولی کچھ نہیں۔“

”یار بکٹوم سے کہہ کہ ہمیں کافی ہی پلا دے۔“ میں نے تیمور سے کہا۔

”کافی تو میں بھی بہت اچھی بنا لیتی ہوں۔“ تاج بخت نے کہا۔ ”آپ لوگ کیسی کافی پسند کرتے ہیں، فرنچ یا اٹالین؟“ اس نے پوچھا۔ ”یا پھر بلیک کافی؟“

”ہم لوگ ان چونچلوں میں نہیں پڑتے۔ سیدھی سادی پاکستانی یا امریکن کافی پیتے ہیں؟“ ہاشم مسکرا کر بولا۔

”میں ابھی آپ لوگوں کے لیے کافی لے کر آتی ہوں۔“ تاج بخت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”چلو میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔“ نادیہ نے کہا۔ ”یوں بھی تمہیں معلوم نہیں ہوگا کہ کچن میں کون سی چیز کہاں رکھی ہے؟“

وہ تاج بخت کے ساتھ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ہاشم نے کہا۔ ”یہ نادیہ تو ضرورت سے زیادہ ہی محتاط ہے۔ اسے شبہ ہوگا کہ تاج بخت کافی میں کچھ ملا نہ دے۔“

”یہ اچھی بات ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”کسی پہ بھی اتنی جلدی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔“ تھوڑی دیر بعد تاج بخت کافی کی ٹرالی لے کر آگئی۔ وہ ہمارے ساتھ بیٹھتے ہوئے جھجک رہی تھی، نادیہ کے اصرار پر وہ ہمارے ساتھ بیٹھ گئی۔

پھر ہم لوگ کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے نادیہ کو اشارہ کیا کہ اب تاج بخت کو بیڈ روم میں لے جائے۔

نادیہ تاج بخت کو یہ کہہ کر اوپر لے گئی کہ ان لوگوں کے درمیان بیٹھ کر کیا فائدہ؟ چلو ہم اپنی باتیں کرتے ہیں۔

تاج بخت مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد میرے سیل فون کی بیل بجی، اسکرین پر جان محمد کا نام تھا۔

میں نے فوراً کال ریسیو کرلی اور کہا۔ ”ہاں، جان محمد!“

”جیک کے بارے میں.....“

”تم فون بند کرو! میں نے کہا۔ ”میں تمہیں کال کرتا ہوں۔“ میں نے فوراً سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر تیمور کا سیل فون لے کر اس سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس کوئی اور سم بھی ہے یا یہی ایک سم ہے؟“

”میرے پاس تو وہی کی ایک سم بھی ہے، ریسیو کرنے والے کو اسکرین پر وہی کا نمبر نظر آئے گا۔“

”تو پھر اپنے سیل فون میں وہی سم لگا لو۔“ میں نے کہا۔ ”ہو سکے تو ایک ایسی سم مجھے بھی لا دو۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”ایسی سم کو بلوا اور ایا والٹ نکال کر اس میں سے ایک سم نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ سم بھی آپ رکھ لیں۔ میں عامر سے دوسری سم لے لوں گا۔“

میں نے اپنے سیل فون میں دوسری سم بھی لگا لی اور جان محمد کو کال کی۔

کچھ دیر بیل بجتی رہی، پھر جان محمد نے کیل ریسیو کر لیا اور محتاط انداز میں بولا۔ ”ہیلو.....!“

”میاں جان محمد!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اب بتاؤ، تم کیا کہہ رہے تھے؟“

”عمران صاحب! آپ وہی میں ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں کہاں ہوں، اس بات کو چھوڑو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تم مجھے بتاؤ کیا کہنے والے تھے؟“

”جیک کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں نہیں بلکہ کراچی ایئر پورٹ پر واقع ایک ہوٹل میں مقیم ہے۔ ہوٹل کا نام ”ایئر پورٹ اِن“ ہے۔“

”وہاں وہ کس نام سے ٹھہرا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو مجھے نہیں معلوم!“ اس نے کہا۔ ”جن لوگوں سے مجھے یہ اطلاعات ملتی ہیں، انہیں بھی علم نہیں ہے کہ وہ وہاں کس نام سے مقیم ہے؟“

”شکریہ جان محمد!“ میں نے کہا۔ ”میں دیکھتا ہوں۔ آئندہ جب بھی مجھ سے بات کرنا ہو تو اس وہی کے نمبر پر کرنا۔ کبھی بھی تو اکسٹرا وہی ٹیلی فون کرتے ہو گے؟“

”بالکل، میرے کچھ دوست اور بیوی کے دو تین رشتے دار وہی میں ہیں۔ میں اکثر وہاں کال کرتا رہتا ہوں۔“

”ٹھیک!“ میں نے کہا۔ ”اب اگر خدانخواستہ کبھی مشہدی کو تم پر شبہ بھی ہوا اور اس نے تمہاری کالز کا ریکارڈ کمپنی سے اٹھوایا بھی تو وہ وہی کا نمبر دیکھ کر کسی شبہے میں مبتلا نہیں ہوگا۔“ پھر میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”اپنا بہت خیال رکھنا، خدا حافظ!“ اس نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

”مجھے جان محمد کی طرف سے بہت فکر ہے۔“ وہ اس وقت دشمنوں کے درمیان میں ہے جیسے دانتوں کے درمیان زبان!“ میں نے کہا۔

”مجھے بھی یہ ہی خدشہ ہے۔“ ہاشم نے کہا۔ ”کہ اس کی کوئی لغزش اسے لے نہ ڈوبے۔ اس سے کہنا کہ آئندہ تمہیں

کسی پی سی او یا کسی ایسی جم سے کال کرے جو وہ صرف تمہیں ہی کال کرنے کے لیے استعمال کرے۔"

"میلوڈرامہ بنانے والے اتنے غیر فرنے دار نہیں ہوتے کہ وہ لوگوں کے بارے میں دوسروں کو بتاتیں۔" تیمور نے کہا۔

"تم شاید بھول رہے ہو کہ وہ مشہدی ہے، کوئی عام آدمی نہیں ہے، پولیس، بیوروکریٹس اور سیاست دان جس کی مٹھی میں ہوں، اس کے لیے کسی سیل پہنچ سے ریکارڈ نکالنا کیا مشکل ہے؟" ہاشم نے کہا۔

پھر ہمارا موضوع گفتگو "را" کی طرف ہوگیا۔ میں نے "را" کا صرف نام سنا تھا۔ ابھی تک اس سے میرا سابقہ نہیں پڑا تھا۔

"تم "را" کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" میں نے ہاشم سے پوچھا۔

"را، کے بارے میں کون نہیں جانتا۔" ہاشم نے کہا۔

"میں اس جاننے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس طرح تو میں بھی جانتا ہوں کہ یہ بھارت کی خفیہ ایجنسی ہے۔ اس کے ایجنٹ انتہائی مکار اور چالاک ہوتے ہیں۔ نہ صرف مکار ہوتے ہیں بلکہ انتہائی خطرناک بھی ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ لوگ اتنے مکار ہیں کہ ان میں سے بیشتر اپنی شناخت بدل کر پاکستان میں بھی موجود ہیں، ان لوگوں کو سب سے بڑا ایڈوانٹیج یہ ہے کہ ان کی شکل وصورت، رہن سہن، زبان سب کچھ ہم جیسی ہے۔ زبان میں جو تھوڑے بہت ہندی کے الفاظ ہوتے ہیں، یہ ان پر بھی قابو پالیتے ہیں۔"

"میرا واسطہ "را" کے دو ایجنٹوں سے پڑ چکا ہے۔" ہاشم نے کہا۔ "یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں مشہدی کے ساتھ کام کرتا تھا۔ دونوں انتہائی مکار تھے اور میرے ہاتھوں مارے گئے۔ ان میں سے ایک "را" کا بیورو چیف تھا۔ میں اسے بیورو چیف ہی کہوں گا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ کبھی "را" سے اس قسم کا واسطہ بھی پڑنے والا ہے تو میں ان سے "را" کے مزید ایجنٹوں کے نام اور پتے بھی حاصل کر لیتا۔ خیر، یہ کوئی ایسا ناممکن کام بھی نہیں ہے۔ میں ان کے ایڈریس اور نام وغیرہ تو تھوڑی سی محنت کے بعد اب بھی حاصل کر سکتا ہوں۔" ہاشم نے کہا۔ "پہلے ارسلان کے بارے میں تفصیلات کا علم ہو جائے۔"

پھر ہم لوگ سونے کے لیے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

ہاشم کا دوست صغیر واقعی مجھے بہت باکمال میک اپ آرٹسٹ لگا۔ اس نے میری آنکھوں میں نیلے آئی لینس لگائے، بالوں کا اسٹائل بدلا، میرے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی اور مونچھوں کا اضافہ کیا اور مجھے بہت نفیس فریم کا چشمہ دے کر بولا۔ "اسے لگا کر ذرا آئینے میں اپنی شکل دیکھیں۔"

میں نے چشمہ لگا کر آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو خود چونک اُٹھا۔ آئینے میں ایک اجنبی چہرہ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جیسے آپ کی داڑھی اور مونچھیں اس حد تک بڑھ جائیں تو آپ یہ مصنوعی داڑھی اور مونچھیں نکال دیں۔ اس کے علاوہ اس نے مجھے اوپر کے دانتوں پر لگانے کے لیے مصنوعی دانت بھی دیے اور بولا کہ اگر آپ کوشش ہو کہ کوئی آپ کو اس حلیے میں بھی پہچان سکتا ہے تو آپ اپنے دانتوں پر یہ دانت فٹ کر لیں، اس سے آپ کو تھوڑی سی ابھن تو ہوگی، آپ کا چہرہ بھی خاصا بدنما ہو جائے گا لیکن آپ کے نزدیکی دوست بھی اس حلیے میں آپ کو پہچان نہ سکیں گے۔" تیمور کو اس نے لمبے بالوں کی ایک وگ دی، آنکھوں میں بلیک آئی لینسز لگائے، اسے بھی اس قسم کا چشمہ دیا جیسے آج کل عموماً گلوکار وغیرہ پہنتے ہیں، اس نے تیمور کو مسلسل جینز اور ٹی شرٹ کے ساتھ جیکٹ پہننے کا مشورہ دیا اور اس کے ہاتھ میں ایک گٹار بھی تھما دیا۔ اب وہ اپنے چہرے سے کوئی ایسا گلوکار لگ رہا تھا جیسے کسی میوزک بینڈ سے تعلق رکھتا ہو۔

ہاشم کے بالوں کو اس نے بلیچ کر کے بالکل سفید کر دیا، اس کے بالوں کو بھی کسی حد تک گھنگریالا بنا دیا اور اسے بھی مصنوعی مونچھیں لگا دیں۔ وہ بھی بالکل سفید تھیں، اب ہاشم دیکھنے میں ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی جوان آدمی کے بال سفید ہو جاتے ہیں، بالوں کی رنگت اور مونچھوں سے ہاشم کی شخصیت نہ صرف بالکل بدل گئی بلکہ اس کی شخصیت میں ایک طرح کا وقار پیدا ہو گیا۔

نادیہ پر اس نے زیادہ محنت نہیں کی، اس کے بالوں کا اسٹائل تبدیل کیا اور اسے مسلسل اسکن ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پہننے کا مشورہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی اس نے نیلے آئی لینسز لگا دیے اور اس کے چہرے پر ایک نفیس فریم کے چشمے کا اضافہ بھی ہو گیا۔ اس سے نادیہ کی شخصیت میں اتنی تبدیلی آ گئی کہ اسے پہلی نظر میں تو میں بھی نہیں پہچان سکا۔

صغیر نے ہاشم کو مشورہ دیا کہ تمہیں ہر ہفتے اپنے بال بلیچ کرنا ہوں گے اس کے لیے اس نے ہاشم کو ایک محلول دیا اور بولا۔ "یہ محلول مارکیٹ میں بھی ملتا ہے، اس کا نام بھی بوتل پر موجود تھا، ہاں جب تمہاری اصل مونچھیں نکل آئیں تو ان مونچھوں کو بھی بلیچ کر لینا۔"

اس نے تیمور کو بھی یہی مشورہ دیا کہ "اگر یہ میک اپ زیادہ دنوں تک برقرار رکھنا چاہتے ہو تو اپنے بال بڑھاؤ۔ اصل بالوں سے تمہاری شکل وصورت میں مزید تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔"

اس نے یہ کام دو گھنٹے کے اندر اندر ختم کر لیا اور ہاشم سے بولا۔ "یار، میں اب چلوں گا، مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔"

"صغیر صاحب! کچھ دیر تو ٹھہریں، ہمارے ساتھ ایک کپ کافی پی لیں۔"

"خاکوانی صاحب!" اس نے کہا۔ "میں کافی ضرور پیتا لیکن اس وقت واقعی مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

ہاشم نے زبردستی اس کی جیب میں چند بڑے نوٹ ٹھونس دیے، کیوں کہ وہ پیسے لینے پر آمادہ نہیں تھا۔

"یہ بال کب تک گھنگریالے رہیں گے؟" ہاشم نے پوچھا۔

"اس کی مدت چھ ماہ ہے، چھ ماہ بعد آپ پھر نہیں سے بھی ری باؤنڈنگ کرا سکتے ہیں، اگر میں پاکستان ہوا تو میں ہی کر دوں گا۔ چھ مہینے سے پہلے ان بالوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوگی، بے شک آپ دن میں کئی دفعہ نہائیں، شیمپو کریں یا صابن سے دھوئیں۔" وہ اپنا بیگ اٹھا کر رخصت ہو گیا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

"تم قیلولہ مت کرو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اس وقت تمہاری شکل مجھے انتہائی مکروہ بلکہ زہر لگ رہی ہے۔"

"میں نے کیا کر دیا۔" تیمور ہتھا کر بولا۔

"کیا تو صغیر نے ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑے گا۔ اس حلیے میں تم مجھے غلیظ پپی لگ رہے ہو۔"

"عمران بھائی کیا ہو گیا آپ کو؟" تیمور خفگی سے بولا۔ "میں دن میں دو دفعہ نہاتا ہوں اور....."

نادیہ بے اختیار ہنس پڑی اور بولی۔ "اصل میں عمران کا مقصد جسمانی غلاظت سے نہیں ہے، تمہارا حلیہ ہی ایسا ہے کہ....."

"اچھا، تم قیلولہ ہی مت کرنا پھر۔" تیمور نے جھنجلا کر کہا۔

"بھئی پروگرام یہ ہے کہ پہلے ہم یہاں سے چیک آؤٹ کریں گے، پھر کسی فائیو اسٹار کے ریسٹورنٹ میں ڈنر کریں گے۔"

"کھائیں گے، پئیں گے، گھومیں گے، پھریں گے اور کیا؟" تیمور نے ایک مشہور ہندی گانے کا بول دہرایا۔

"لیکن چیک آؤٹ کرنے کے لیے ہمارا کاؤنٹر پر جانا ضروری ہے۔" نادیہ نے کہا۔

"ہمارا نہیں، صرف تمہارا۔" ہاشم نے کہا۔ "تمہارے باس خاکوانی صاحب، ابھی تھوڑی دیر پہلے ایمرجنسی میں لاہور چلے گئے ہیں۔"

"بگ بگ ٹکر تو مجھے دیکھ کر ہی چوپٹ ہو گئی۔" نادیہ نے کہا۔

"اسے اتنا دکھ ہوگا جب تم آئی تھیں تو تمہاری شکل کیسی تھی؟" ہاشم نے ہنس کر کہا۔ "اور ممکن ہے اس بگ بگ ٹکر کی آپ ڈیوٹی ہی نہ ہو۔"

میں یہاں اپنی لینڈ کروزر میں آیا تھا۔ میں نے چوکیدار کو گاڑی کی چابی دیتے ہوئے اسے گاڑی کا رجسٹریشن نمبر بتایا اور اس سے کہا۔ "سلور گرے لینڈ کروزر ہے۔"

''اوکے سر!'' اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور روانہ ہو گیا۔

ہم لوگ گاڑی کے انتظار میں کھڑے ہی تھے کہ ہمارے نزدیک ایک گاڑی آ کر رکی اور ہوٹل کے پورچ ہی میں رک گئی۔ وہ سیاہ رنگ کی پجیرو تھی۔

پورچ میں کھڑے گارڈ نے اعتراض کیا تو اس نے کہا۔

''میرا ایک دوست یہاں ٹھہرا ہوا ہے، میں اسے پک کرنے آیا ہوں۔'' ڈرائیور نے یہ جملہ انگلش میں ادا کیا تھا اس لیے سیکورٹی گارڈ کی سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ وہ مزید دس منٹ یہاں کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ سیکورٹی گارڈ ہماری طرف آیا اور ہاشم سے بولا۔ ''سر! آپ ان لوگوں کو سمجھا دیں کہ گاڑی یہاں نہ روکیں بلکہ کچھ آگے جا کر روک لیں۔ دوسری گاڑیوں کو یہاں آنے میں دشواری ہو رہی ہے۔'' ہاشم سر ہلا کر آگے بڑھا اور ڈرائیور سے انگلش میں کہا۔ ''مسٹر! اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو اپنی گاڑی کچھ آگے جا کر روک لو، یہاں آنے والی دوسری گاڑیوں کے لیے رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔''

''شیور را'' گورے نے کہا اور اپنی گاڑی کچھ آگے بڑھا دی۔

پھر وہ گاڑی سے باہر آ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ہمارے نزدیک آ کر ٹھہر گیا۔

اس وقت اندر سے ایک اور مقامی آدمی برآمد ہوا۔ دونوں نے ہاتھ ملایا اور غیر ملکی اسے لے کر اپنی ہر سنڈیز کی طرف بڑھا۔

اچانک میری نظر اس کی چال پر پڑی، وہ بہت خفیف سا لنگڑا رہا تھا، میں اسے دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا۔

ضروری نہیں تھا کہ وہی جیک ہو لیکن ہو بھی سکتا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا تاکہ اگر مقامی آدمی اس کا نام لے تو میں اس بات کی تصدیق کر سکوں کہ وہ جیک ہے یا نہیں۔

وہ دونوں گاڑی کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

میں وہاں سے ٹہلتا ہوا کچھ اس طرح گزرا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہوں۔

اچانک میرے کانوں میں مقامی آدمی کی آواز آئی۔ ''اوکے مسٹر جیک! میں آپ کی ڈیمانڈ پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں یوں اچھلے جیسے میرا پاؤں دہکتے ہوئے انگارے پر پڑا ہو۔

میں تیزی سے واپس آیا، اس وقت تک پارکنگ بوائے ہماری گاڑی نہیں لایا تھا۔ جیک گاڑی میں بیٹھ کر اس کا انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میں نے گاڑی کا رجسٹریشن نمبر ذہن نشین کر لیا۔ مقامی آدمی باہر ہی کھڑا تھا۔ پھر جیک وہاں سے رخصت ہو گیا اور مقامی آدمی دوبارہ اندر چلا گیا۔

میں نے ہاشم کو بتایا کہ وہ سیاہ مرسڈیز میں جیک جا رہا ہے۔ یہ پارکنگ والا کہاں رہ گیا۔

''تمہیں یقین ہے؟'' ہاشم نے پوچھا۔

''مجھے یقین ہے میں نے اس کی چال میں خفیف سی لنگڑاہٹ بھی دیکھی ہے، اس کا حلیہ اور جسامت بھی اسی کی طرح ہے پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے ملاقاتی نے اسے مسٹر جیک کہہ کر مخاطب کیا ہے۔'' پھر اچانک ایک خیال آیا۔ میں نے نادیہ سے کہا۔ ''وہ گورے سوٹ میں جو مقامی آدمی ہوٹل میں جا رہا ہے، اس کے بارے میں معلوم کرو کہ وہ کس کمرے میں مقیم ہے۔ اگر مقیم نہیں ہے تو اس کا تعاقب کرو کہ وہ اس وقت کہاں جا رہا ہے۔ تیمور! تم نادیہ کے پیچھے جاؤ، لیکن اس سے فاصلے پر رہنا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اس سیاہ مرسڈیز کا پیچھا کر سکوں لیکن یہ ہوٹل کا ڈرائیور کہاں مر گیا۔''

میں نے ارد گرد نظر دوڑائی کہ کوئی ٹیکسی ہی نظر آ جائے، لیکن اس وقت وہاں دور دور تک ٹیکسی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

جیک کی روانگی کے دس منٹ بعد ہماری گاڑی آئی۔ اس وقت تک تو جیک نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہو گا۔

میں ہوٹل کے ڈرائیور پر برس پڑا۔ ''کہاں رہ گئے تھے تم! تم لوگوں کی سروس کا اسٹائل یہی ہے، میں ایک اہم میٹنگ سے لیٹ ہو گیا۔''

''سر! اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔'' ہوٹل بوائے نے عاجزی سے کہا۔ ''آپ کی گاڑی کا ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا، مجھے ٹائر بدلنے میں کچھ دیر ضرور لگی ہے، ورنہ آپ کو اتنی زحمت نہ ہوتی۔''

''اب اس کے پیچھے جانا فضول ہے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''میں گاڑی کہیں باہر پارک کرتا ہوں۔ تم نادیہ اور تیمور کو دیکھو وہ کیا کر رہے ہیں؟'' ہاشم گاڑی میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے ہوٹل کے گیٹ سے باہر لے گیا۔

میں ہوٹل کے اندر داخل ہو گیا، ہوٹل کے لابی میں مجھے تیمور نظر آیا، میں نے اس سے نادیہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے لفٹ کی طرف اشارہ کر دیا۔

نادیہ اور وہ مقامی آدمی جو جیک سے باتیں کر رہا تھا اس وقت لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ان کے ساتھ دو تین اور افراد بھی کھڑے تھے جو اوپر جانے کے منتظر تھے۔

''تم سے میں نے کہا تھا کہ نادیہ کے پیچھے رہو۔'' میں نے تیمور سے کہا۔ ''اب اگر وہ لفٹ میں چلی گئی تو کیا تم اڑ کر اس کا تعاقب کرو گے۔ کبھی اپنی عقل بھی استعمال کر لیا کرو۔ لفٹ میں تو دو اجنبی بھی ایک ساتھ سفر کرتے ہیں۔'' اسے جھاڑ لگانے کے بعد میں تیزی سے نادیہ کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس کے پیچھے کچھ لوگوں میں تیمور کھڑا تھا۔

مجھے اچانک جھٹکا سا لگا۔ تو پھر وہ کون تھا میں نے مڑ کر دیکھا، میں نے جس شخص کو جھاڑ پلائی تھی، وہ ابھی تک مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ چہرے سے وہ مجھے انالین لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شکر ہے اسے اردو نہیں آتی ہو گی ورنہ وہ بھی برا ہی طور پر مجھ پر برہم ہو جاتا کہ کون نادیہ اور کیسی نادیہ؟

اسی دوران میں لفٹ نیچے آ گئی۔

ہمارے مطلوبہ آدمی کے ساتھ نادیہ اور دو تین افراد اور لفٹ میں سوار ہوئے، میں نے تیمور کو اشارہ کیا، پھر خود بھی لفٹ میں سوار ہو گیا۔ نادیہ نے حیرت سے مجھے دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔ وہ شخص ساتویں فلور پر اترا۔ اس کے ساتھ نادیہ اور میں بھی اس فلور پر اترے، ہمارے علاوہ ایک غیر ملکی بھی تھا جو شاید اپنے ہی کسی مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔

کوریڈور میں، دانستہ میں نے نادیہ کو مخاطب کیا۔ ''ہیلو بے بی، کہاں جا رہی ہو؟''

نادیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''جہاں تم جا رہے ہو بابا!''

میں اس مقامی آدمی کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ہم اپنی باتوں میں مگن ہیں اور اس کی طرف دھیان نہیں دے رہے ہیں۔ وہ چلتے چلتے کمرا نمبر ساتھ سو آٹھ کے سامنے ٹھہر گیا، اس نے اپنی جیب سے چابی نکالی تو میں سمجھ گیا کہ وہ اس کمرے میں تنہا ہے۔

اس نے دروازے میں چابی لگائی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے ہی والا تھا کہ میں بھی خاصی تیزی سے پلٹا اور اپنے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اس کی کمر پر رکھ دیا اور غرا کر بولا۔ ''خاموشی سے اندر چلو۔''

''کک..... کون..... ہو..... تم؟'' وہ ہکلا کر بولا۔

میں نے ریوالور بظاہر اس کے پیٹ میں لگاتے ہوئے کہا۔ ''زیادہ بکواس نہیں، میرا ریوالور بے آواز چلتا ہے، اندر چلو۔''

اس نے بہت زیادہ خوف زدہ ہونے کی اداکاری کی جسے میں نے صاف محسوس کر لیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے اسے حکم دیا۔ اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھو اور انہیں دوبارہ حرکت دینے کی کوشش مت کرنا ورنہ میں گولی چلانے میں دیر نہیں کروں گا۔''

اس شخص نے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھے، دو قدم آگے بڑھا، پھر پھرتی سے پلٹ کر میرے ریوالور والے ہاتھ پر لات ماری۔ میرا ریوالور اچھل کر دور جا گرا۔ اس کی دوسری لات میرے پیٹ پر پڑی، میں پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ اس نے ایک دم اپنا ریوالور نکال کر میری کن پٹی سے لگا دیا۔

یہ ہے تجسس، سنسنی خیز اور ہولناک آپ بیتی ابھی جاری ہے۔

بقیہ واقعات آئندہ ماہ کے ''سچی کہانیاں'' میں ملاحظہ فرمائیں

سات سمندر پار سے، زندگی کی تصویریں

پہلی بدیسی کہانی

دسیسۂ ابلیس

ٹالسٹائے

ٹالسٹائے کے عجائب خانے سے ایک روسی کہانی

ایک کسان کا قصہ، شیطان اُس پر مہربان ہو گیا تھا

روس کا ایک غریب کسان علی الصباح ہل چلانے کی غرض سے کھیت میں گیا۔ اُس نے چند چپاتیاں دوپہر کے کھانے کے لیے اپنے پاس رکھ لیں۔ کام کے آغاز سے پہلے اُس نے اپنے کوٹ تلے چھپا کر کھیت کے کنارے یہ روٹیاں احتیاط سے رکھ دیں۔ دوپہر سے قبل جب تکان سے اُس کی طبیعت بوجھل ہوگئی اور بھوک چمک اٹھی تو اُس نے گھوڑے کو ہل سے الگ کر کے چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود گھنے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر روٹی کھانے کی تیاری کرنے لگا۔ کوٹ اٹھایا تو روٹیوں کا کہیں وجود نہیں تھا، وہ بہت حیران ہوا کہ صبح سے کوئی اِدھر سے نہیں گزرا، روٹیاں کدھر گئیں۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، تاہم وہ بہت زیادہ فکرمند نہیں ہوا۔

اُدھر جھاڑی کے عقب میں ابلیس کا ایک چیلا چھپا بیٹھا تھا۔ اُسی نے روٹی چرائی تھی اور اَب اس انتظار میں بیٹھا تھا کہ کسان گالی گلوچ اور بدزبانی سے اپنی پریشانی کا مداوا کرے گا، تو اُس کا اعمال نامہ سیاہ ہونے کا کچھ سامان ہو جائے گا، مگر اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کسان اطمینان سے اُٹھا، رہٹ سے اپنی پیاس بجھائی، تھوڑی دیر سستایا اور پھر حسبِ سابق گھوڑے کو ہل میں جوتا اور کام شروع کر دیا۔ ابلیس کے چیلے کو شدید مایوسی ہوئی، وہ فوراً ابلیس کے پاس گیا اور رپورٹ پیش کی۔

ابلیس نے اُسے سست قرار دیتے ہوئے ڈانٹ پلائی، ”اپنی نالائقی کا حل مجھ سے پوچھتے ہو۔“ پھر متنبہ کیا: ”اگر تین سال کے اندر اس فاش غلطی کا ازالہ نہ کیا تو تجھے شدید ترین سزا کا مستحق سمجھا جائے گا۔“

ابلیس کے چیلے نے اپنے آپ کو ایک عام کسان کے قالب میں ڈھال لیا اور اُسی کسان کے پاس چلا گیا۔ کھانے اور رہنے کے عوض اُس کے کام میں ہاتھ بٹانے کی پیش کش کی، جسے بخوشی قبول کر لیا گیا۔

پہلے سال اُس نے کسان کو مشورہ دیا کہ وہ نشیبی علاقے میں بیج کاشت کرے۔ اُس کی ہدایت پر عمل کیا گیا۔ اُس سال بارش بالکل نہ ہوئی۔ سورج کی تپش سے فصلیں خاکستر ہو گئیں، مگر ہمارے کسان کو مطلق نقصان پہنچا اور پہلے سے کہیں زیادہ جھاڑ ہاتھ لگا۔ اگلے سال ابلیس نے اسے پہاڑی ڈھلان پر کاشت کرنے کا مشورہ دیا، جس پر بہ خوشی عمل کیا گیا۔ اس مرتبہ بارشیں ضرورت سے زیادہ ہوئیں اور علاقے بھر کی فصلیں پانی میں ڈوب کر تباہ ہو گئیں، مگر ہمارے کسان کو بیش از بیش فائدہ پہنچا اور غلے سے کمرے بھر گئے۔ اُس کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ منڈی میں بھاؤ تیز ہو گئے۔ غلے کی فروخت سے

بعد بھی اتنا کچھ بچ گیا کہ اناج کی کمپت کے لیے کوئی دوسری راہ تلاش کی جانے لگی۔

اِس مشکل کا حل بھی چیلے نے تلاش کر لیا اور بتایا کہ گیہوں سے کس طرح ووڈکا (روسی شراب) تیار کی جاتی ہے۔ کسان نے وہ مشروب خود بھی چکھا اور بہ طور کاروبار اُسے فروخت کرنا بھی شروع کر دیا۔ دولت کی ریل پیل نے اُس کے دماغ سے مفلسی اور تنگ دستی کے ایام کی یاد

اس طرح محو کر دی جیسے وہ دور کبھی اُس پر گزرا ہی نہ تھا۔

چیلا اپنے سردار ابلیس کے پاس حاضر ہوا اور بولا۔ ”جس مقصد میں پہلے ناکامی ہوئی تھی، اب اُس میں خوب کامیاب ہوں۔“

سردار نے جواب دیا۔ ”میں جب تک اپنی آنکھوں سے یہ کام یابی نہ دیکھ لوں گا، اُس وقت تک یقین نہ کروں گا۔“

دونوں زمین کی طرف گئے اور کسان کے گھر چھپ کر بیٹھ گئے۔ ایک چھوٹی سی میز کے گرد مختلف قبائل کے سردار اور بڑے بڑے زمیں دار براجمان تھے۔ کسان کی بیوی ووڈکا کے جام بھر بھر کے اُنہیں پیش کر رہی تھی۔ جب وہ میز کے پاس سے گزرنے لگی تو ایک گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ رہا۔ ساری شراب بہ گئی۔ کسان اُٹھ کھڑا ہوا اور غضب ناک آواز میں دھاڑا، ”اے پاگل عورت! کیا یہ کوئی غلیظ پانی ہے جسے بے دردی سے بہا رہی ہے۔“

چیلے نے ابلیس کو اشارہ کیا اور دونوں مسکرانے لگے۔

اتفاق سے ایک تھکا ہارا غریب کسان اپنی پیاس بجھانے کی غرض سے اُدھر آ نکلا اور ووڈکا طلب کی۔ کسان نے جھڑک کر جواب دیا، ”چلو چلو، اپنی راہ لو۔ میں نے کوئی سرائے نہیں کھول رکھی کہ ہر آنے جانے والے کی بھوک پیاس کا خیال رکھوں۔“

وہ بے چارہ جھینپ کر ایک طرف چلا گیا۔ ابلیس مسکرایا، مگر چیلے نے جواب دیا، ”ابھی تو بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ ذرا انتظار کرو۔“

پہلا دَور چلا تو وہ ایک دوسرے کی تعریفیں کرنے لگے اور ایسی تقریریں کیں جو جھوٹ کا پلندہ تھیں۔ ابلیس نے مسکرا کر کہا، ”اگر یہ لوگ ایک دوسرے کو اسی طرح دھوکا دینے لگے تو یہ مشروب بہت مفید چیز ہے۔ اِس طرح یہ ہمارے کارکنوں میں اضافہ کرنے کا موجب بنے گا۔“

چیلا کہنے لگا، ”ابھی تو لومڑیوں کی طرح تعریفیں کر کے ایک دوسرے کو خوش کر رہے ہیں، جلد ہی یہ بھیڑیوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔“

دوسرا دَور چلتے ہی کسانوں نے بکواس شروع کر دی جو بالآخر دست بہ دست جنگ پہ منتج ہوئی، وہ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے اور مہماں نواز کسان کی خوب مرمّت کی گئی۔

چیلے نے ابلیس سے کہا۔ ”ابھی یہ جنگلی سؤروں کی حرکات بھی کریں گے۔ خاموشی سے انتظار کرو۔“

تیسرا دَور چلا۔ اُنہوں نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا، حتیٰ کہ آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ایک دوسرے کی بات سنے بغیر انہوں نے وہ طوفانِ بدتمیزی بپا کیا کہ الامان و الحفیظ۔ برتن اِدھر اُدھر پھینکے جانے لگے۔ اس قدر افراتفری بپا ہوئی کہ جدھر جس کا منہ اُٹھا، بھاگ نکلا، کئی غنودگی کی حالت میں صحن میں گر پڑے اور باقی ماندہ لڑکھڑاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ ہمارے کسان نے عالم بے خودی میں باہر کا رُخ کیا، مگر صحن کی بدرو میں گر پڑا اور کیچڑ اُٹھا اُٹھا کر اپنے جسم، چہرے اور بالوں میں ملنے لگا۔ ساتھ ہی حیوانوں کی طرح چلّاتا رہا۔

ابلیس اس ساری کارروائی پر از خود خوش ہوا اور اُس نے اپنے چیلے کو جی بھر کر داد دی۔ پھر پوچھا، ”یہ عجیب و غریب مشروب تم نے کیسے تیار کیا۔ غالباً تم نے مختلف جنگلی جانوروں کے سے خصائل پیدا کیے ہیں۔“

چیلے نے جواب دیا، ”بالکل نہیں، میں نے صرف یہ اندازہ کر لیا تھا کہ کسان کے پاس اتنا غلّہ ہو گیا جس کی اُسے ضرورت نہ تھی۔ جانوروں کے خصائل کا مادّہ انسان کے اندر ہوتا ہے۔ رزق کی فراوانی اُس کے حیوانی خصائل اُجاگر کر دیتی ہے اور وہی خدا کی نعمت، جسے کھا کر وہ اطمینان کی نیند سوتا ہے، اُس کے لیے عیش و عشرت، لوٹ کھسوٹ اور بے حیائی کے دروازے کھول دیتی ہے۔“

ابلیس نے یہ سن کر چیلے کو اپنا نائب بنا لیا۔

☆.....☆

ہم ایک دن نکل آئے تھے خواب سے باہر
سو ہم نے رنج اٹھائے حساب سے باہر

عصرِ حاضر کے نمائندہ شاعر

فہیم شناس کاظمی

کا شعری مجموعہ

”خواب سے باہر“

منظر عام پر آگیا ہے

کتاب ملنے کا پتہ

فکشن ہاؤس

18۔ مزنگ روڈ۔ لاہور

V.P پارسل کے لیے رجوع کریں

042-7249218-7237430

اعزاز دگر

میبل ڈوووڈنکا

افریقی قبائل کے ایک بڑے سردار کی کہانی
افریقہ کی ایک عظیم مصنفہ کے قلم کا شاہکار

اکوا سن کا سردارِ اعظم نانا اڈاکو اپنی تاج پوشی کی بیسویں سال گرہ منا رہا تھا۔ دارالحکومت اکوائی میں دور دراز گاؤں اور شہروں سے لوگ آ آ کر جمع ہو رہے تھے۔

یہ کوکوا (cocoa) کی فصل فروخت ہونے کے دن تھے، اس لیے لوگوں کے پاس خوب پیسا تھا۔ زمیں دار اور کاشت کار جی کھول کر پیسا خرچ کر رہے تھے۔ پرانے دوست برسوں بعد مل رہے تھے اور ایک دوسرے کی خوب میزبانی کر رہے تھے۔ تحائف کا تبادلہ ہو رہا تھا اور شراب لٹائی جا رہی تھی، کسی کو کسی بات کی فکر نہ تھی۔ ہر شخص شاد و مان نظر آتا تھا۔ بہت کم لوگ مغربی لباس میں تھے ورنہ ہر طرف لوگ اپنا روایتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ سونے کے زیورات، رنگ برنگے کپڑے، ہر طرف رنگ ہی رنگ تھا۔ عورت کے کانوں میں بھی سونے کی بالیاں اور گلے میں سونے کی زنجیریں تھیں۔

حکومتی اہل کاروں نے موسیقی کا انتظام کر رکھا تھا اور رقص کے لیے بڑے بڑے ڈھول پیٹے جا رہے تھے۔

اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ لوگوں کا ازدحام اسٹیٹ پارک کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں تقریب منعقد ہونی تھی۔ درختوں کے بڑے بڑے تنوں سے پورے اسٹیٹ پارک کو سجایا گیا تھا۔

سردارِ اعظم ایک پالکی میں سوار تھا۔ پالکی کے اوپر ایک بڑی سی رنگ دار چھتری تھی جسے ایک مستعد جوان لے کر چل رہا تھا۔ سردار کے سر پر سنہری تاج تھا۔ گلے میں تہ در تہ سونے کی زنجیروں کا ہار سینے تک جھول رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کلائی سے لے کر کہنی تک سونے کے کڑے تھے۔ داہنے ہاتھ میں سجی ہوئی ہاتھی کی کئی ہوئی دُم تھی جو وہ نعرہ لگاتے ہجوم کی جانب اُٹھا کر ہلا رہا تھا۔ پالکی کے آگے بہ مشکل بارہ سال کا ایک لڑکا سردار کا خاندانی تلوار اُٹھا کر چل رہا تھا۔

سردار تخت پر جلوہ افروز ہو چکا تو مختلف قبیلوں کے سردار اپنے اپنے منصب کے لحاظ سے باری باری اس کے پاس آتے اور تحائف پیش کرتے رہے۔ ہر قبیلے کے سردار کے ساتھ ایک چھتری بردار تھا۔ ہر چھتری کا رنگ مختلف تھا۔ شاید یہ اس کے قبیلے کی شناخت کے لیے تھا۔ تحائف پیش کرنے والوں کی ایک طویل قطار تھی۔ جیسے ہی کوئی تحفہ پیش کرنے کے لیے سردار کے روبرو پیش ہوتا، مجمع زوردار تالیوں اور

مبارک باد کے الفاظ سے آسمان سر پر اُٹھا لیتا۔ ڈرم پر مسلسل رقص کی تھاپ بجائی جا رہی تھی۔ قریبی اہل کار ڈسٹرکٹ کمشنر کیپٹن ہابس اس کے برابر بیٹھے مغربی لباس سے آراستہ ایک مسخرے نے بندر کی کھال کی بنی ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور سامنے کھڑا کرتب دکھا رہا اور منہ بگاڑ بگاڑ کر لوگوں کو ہنسا رہا تھا

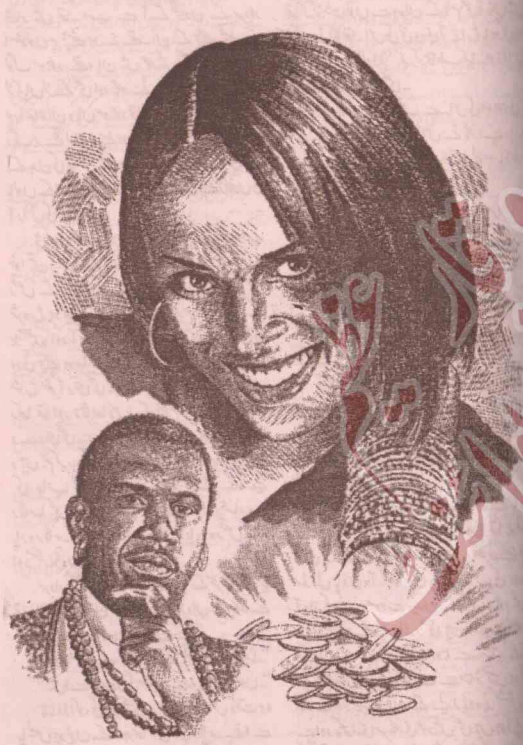

لیکن سردارِ اعظم نہیں ہنس رہا تھا، کیوں کہ یہ روایت کے خلاف تھا کہ سردارِ اعظم، سرداروں کا سردار عام

لوگوں کے سامنے منہ پھاڑ کر ہنسے۔

اسٹیٹ پارک کا منظر قابلِ دید تھا۔ ہر قبیلہ علیحدہ قطار میں تھا۔ سب سے آگے قبیلوں کے سردار اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے پیچھے قبیلے کے لوگ موجود تھے، اِن میں عورتیں بھی تھیں، جوان لڑکیاں لڑکے بھی اور چھوٹے بچے بھی۔ لوگوں کا پورا پورا خاندان وہاں موجود تھا۔ خواتین تتلیوں کی طرح رنگ برنگے لباس پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے لباس ان کے بدن کی نمائش میں معاون ہو رہے تھے۔ ان کے بالوں کے انداز مختلف تھے۔ طرح طرح سے زلفوں کی آرائش کی گئی تھی۔

ڈرم کی تھاپ تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی، اب خواتین، اس رسم کے موقع پر کیے جانے والے رقص کے لیے خود کو ترتیب دے رہی تھیں، پھر رقص شروع ہو گیا۔ رقاصائیں کچھ قدم دوڑ کر آگے بڑھتیں اور آہستہ قدموں سے دائیں بائیں ہوتی ہوئی پیچھے ہو جاتیں، ایک رقاصہ بہ طور خاص بڑی شوخ نظر آ رہی تھی۔ اس نے سبز رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور رقاصاؤں کے ہجوم میں منفرد دکھائی دے رہی تھی۔ سردارِ اعظم کی نگاہ اس پر پڑی تو گویا وہیں جم کر رہ گئی۔ اس نے مٹھی بھر سکے رقاصاؤں کی جانب اُچھال دیے۔ سکے لوٹنے کے لیے رقاصائیں جھپٹ پڑیں لیکن اُس لالہ رخسار، ماہ پارہ رقاصہ نے کوئی دھیان نہیں دیا، وہ رقص کرتی اور مسکراتی رہی۔

سردارِ اعظم رقاصہ کے بسمل سراپا کے سحر میں آ گیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر اپنے رازداں اہل کار سے دریافت کیا۔ ”وہ حسین رقاصہ کون ہے؟“

”مجھے افسوس ہے، میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“

”میں اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

نانا اڈاکو، کی عمر پچپن برس تھی اور اس وقت وہ چالیس بیویوں کے شوہر تھا لیکن اس رقاصہ نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ اس کے ہیجان انگیز رقص اور قیامت خیز جمال نے اڈاکو کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ڈال دیے تھے۔ وہ ایک عجیب نشے میں ڈوب رہا تھا۔ اپنی چالیس بیویوں میں اُسے کوئی دل کشی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ان سے اتنا دور ہو چکا تھا کہ گزشتہ دنوں سے وہ ان کے نام بھی آپس میں گڈ مڈ کرنے لگا تھا۔ اس کی نئی بیوی تو چراغ پا ہو گئی جب اس نے اسے ”اوڈا“ کہہ کر مخاطب کیا۔ اوڈا اس کی پرانی اور بوڑھی بیوی تھی۔

”یہ رقاصہ بالکل مختلف ہے۔ اس کی موجودگی سے محل میں رونق آ جائے گی۔“ اس نے پھر اپنے رازداں اہل کار سے سرگوشی کی۔ ”میں اس کے لیے سو پاؤنڈ (سو سونے کے سکے) ادا کروں گا۔“

”ہو سکتا ہے وہ پہلے سے شادی شدہ ہو سردار!“ اہل کار نے خدشہ ظاہر کیا۔

”میں اس کے شوہر کو بھی جتنی رقم وہ چاہے، دے دوں گا۔“ سردارِ اعظم نے فیصلہ سنایا۔ اہل کار اپنے آقا سے خوب واقف تھا، وہ جانتا تھا، وہ قانعانہ، قانع کو اگر کوئی لڑکی پسند آ جائے تو وہ اسے حاصل کر کے ہی رہتا ہے۔

”خزانچی سے پچاس پاؤنڈ لے کر رقاصہ کے رشتے داروں کو تلاش کرو اور انہیں یہ رقم ادا کرو۔ آج کی شب جب وہ میرے محل میں حاضر ہو تو بقایا پچاس پاؤنڈ بھی ادا کر دیے جائیں گے۔ تم یہاں اپنی جگہ کو جوں کو توں دوار ابھی سے اس مہم پر نکل پڑو۔“

نانا اڈاکو، معاملات جلد سے جلد نبٹانے کا عادی تھا۔ وہ دُنیا کے دیگر مردوں کی طرح تھا جو نسوانی حسن پر کھنے کے لیے ایک ایک چیز پر نظر رکھتے ہیں۔ سڈول پاؤں، آنکھوں کی چمک، ناک کی بناوٹ، آواز کی خوب صورت، بدن کے قوس۔ عورتیں بھی مردوں کو پرکھنے کا پیمانہ رکھتی ہیں، لیکن ان کا پیمانہ مردوں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ شاید کچھ یوں ہے کہ وہ مردوں کی وجاہت سے متاثر نہیں ہوتیں، امارت اور حیثیت اُن کے لیے زیادہ پُرکشش ہوتی ہے اور کچھ ایسی سرپھری عورتیں بھی ہیں جو ایسے مرد کی تجسّو میں رہتی ہیں جو پُرجوش عاشق بھی ہو اور جس کی مالی حیثیت بھی مستحکم ہو اور اگر ایسا مرد دست یاب نہ ہو سکے تو پھر وہ تمام عمر شادی کے بغیر ہی رہنا بہتر سمجھتی ہیں۔

شام کے چھ بجتے بجتے نانا اڈاکو اس تمام تقریب سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ واپسی کے لیے اپنی پالکی میں سوار ہوا تو راحت محسوس کی۔ اس کے اُٹھتے ہی دیگر قبیلوں کے سردار بھی اُٹھنے لگے۔ جمع جلا چلّا کے مبارک باد دے رہا تھا۔ ڈھول کی آواز اور تیز ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں پارک سے مجمع بھی چھٹنے لگا۔

سردارِ اعظم نے غسل کیا اور بروکیڈ کا بیزار اور سنہرا لباس زیب تن کیا۔ دو غلام سر جھکائے دائیں بائیں کھڑے شتر مرغ کے بڑے بڑے پَروں سے اسے جھلا جھل رہے تھے۔ سردارِ اعظم اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک طشتری میں سونے کے پچاس سکے رکھے تھے۔ وہ اپنے ہم راز کی اہلیت سے خوب واقف تھا۔ اُسے یقین تھا کہ مشن کام یاب ہی رہے گا اور آج کی شب وہ اپنی خواب گاہ کی دلہن سے سجائے گا۔

اس نے ضرور نشہ کیا ہو گا۔ نہ معلوم کب اس کی آنکھ کھلی جب وہ جاگا تو اس نے دیکھا رقاصہ اس کے قدموں میں جھکی ہے۔ وہ اُٹھا اور اس نے رقاصہ کو بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا۔ ”کیا تم یہاں آ کر خوش ہو؟“ اس نے رقاصہ کو خود میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

”سردارِ اعظم کی نظرِ التفات میرے لیے باعثِ اعزاز ہے۔“

”بہت خوب! کیا نام ہے تمہارا؟“

”اِی فُو۔ میرے آقا۔“

”یہ ایک خوب صورت نام ہے اور تم ایک خوب صورت عورت ہو۔ یہ رہے تمہارے بقایا پچاس سونے کے سکّے۔ ہم آج بہت خاموشی سے شادی کی شب منائیں گے اور بعد میں شادی کی رسم ادا کریں گے۔“

نانا اڈاکو، یہ طریقہ آزمانے والا پہلا مرد نہیں تھا۔ یہودی، عیسائی، مسلمان، ہندو، بدھ مت، غیر مہذب اور قدیم دنیا کے تمام مردوں نے بھی یہی الفاظ تقریباً اسی انداز میں اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے کہے ہیں۔

”میں یہ رقم اپنی ماں کو دینا چاہتی ہوں۔“ ذہین لڑکی نے جواب دیا۔ ”وہ یہاں راہ داری میں موجود ہے۔ اجازت ہو تو میں یہ رقم اس کے حوالے کر آؤں؟“

سردارِ اعظم نے بہ خوشی اجازت دے دی۔

اِی فُو نے واپس آ کر کہا۔ ”سردارِ اعظم! میری ماں اور میرے دوسرے رشتے دار آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے فراخ دلی سے سونے کے سو سکّے عطا کیے۔“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں میری حسین محبوبہ!“ اس نے رقاصہ کے سینے پر جھولتے موتیوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

”ان کا خیال ہے کہ آپ نے مجھ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات محسوس کی ہو گی جو اتنی بڑی رقم بخش دی۔“ اِی فُو نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

”تم واقعی حسین ہو، کیا ان کی آنکھیں نہیں ہیں؟“

”سردارِ اعظم! میں خود بھی کچھ سمجھنے سے قاصر ہوں۔“

”تم نہیں سمجھ سکو گی بے وقوف لڑکی! تم سامنے آئینے میں اپنا سراپا دیکھو۔“

لڑکی شرارت سے مسکرائی، آئینے کے قریب گئی، آئینے میں خود کو دیکھا اور واپس آ کر سردار کے پہلو میں اپنا سر رکھ دیا۔

”تم ایک ماہ جمال لڑکی ہو اِی فُو!“ سردار نے اس کے سیاہ بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں جذبات کی شدت نمایاں تھی۔

”لیکن میرے آقا! میں تو ہمیشہ ہی سے ایسی ہوں، کیا نہیں ہوں؟“

”میں سمجھتا ہوں، تم ہمیشہ ہی سے ایسی شعلہ بدن ہو گی لیکن میں نے تو تمہیں آج دیکھا ہے۔“

”آپ نے مجھے آج پہلی بار دیکھا ہے؟“

”ہاں۔ آج پہلی بار!“

”کیا آپ بھول گئے؟“

”کیا بھول گیا میری.....؟“

”یہی کہ پچاس پاؤنڈ سے کہ دو برس پہلے آپ نے اسی طرح پہلے بھی مجھ سے شادی کی تھی۔“

☆.....☆

تیسری بدیسی کہانی

گوشہ گیر

رشاد نوری

یادوں کی پرورش کرتے دو گوشہ گیر بوڑھوں کی کہانی

ترکی کی ایک آئینہ تحریر

ہمارے گھر کے سامنے پانچ چھ ہزار میٹر رقبے کے ایک بڑے باغ میں ایک پرانا گھر ہے۔ اُس میں ایک بوڑھا اپنی بوڑھی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ اُن کے علاوہ اُن کی ایک بوڑھی خدمت گار ہے جو اکثر سودا سلف خریدنے کے لیے بازار جاتی ہے۔ اُس کے علاوہ اُن کا کوئی بھی رشتے دار نہیں ہے۔ وہ کسی سے نہیں ملتے۔ اُن کے باغ کی اونچی اونچی دیواروں کے باوجود محلے کے لوگ جانتے ہیں کہ وہ کون ہیں اور کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ میرے پڑوسیوں میں سے ایک شخص نے اس مختصر خاندان کے بارے میں سارے احوال سے مجھے آگاہ کیا۔

''یہ بوڑھا جوڑا اردمیلی کے مہاجروں میں سے ہے۔ وہ بہت دولت مند ہیں، لیکن بہت کنجوس بھی ہیں۔ نہ اچھا کھاتے ہیں، نہ اچھا چاہتے ہیں، پھٹے پرانے کپڑے پہنتے ہیں۔ سردی کے موسم میں آگ تک نہیں جلاتے۔ وہ اپنی آمدنی بینک میں جمع کرتے ہیں۔ کیا وہ یہ سارے پیسے قبر میں لے جائیں گے۔ اُن کے بچے اور رشتے دار بھی نہیں۔ اِس باغ میں سب کے سب آلو بخارے کے درخت ہیں۔ مئی کے مہینے میں آلو بخارے جب سُرخ ہونے لگتے ہیں تو وہ میاں بیوی ہفتوں باغ کی رکھوالی کرتے ہیں۔ رات کے وقت پہرہ دیتے ہیں اُن میں سے ایک گھر میں سوتا ہے تو دوسرا لاٹھی لے کر رات بھر باغ کی نگہبانی کرتا ہے، تاکہ محلے کے آوارہ بچے آلو بخارے توڑ نہ سکیں۔ شدید سردی کے دنوں میں وہ بیمار پڑ جاتے ہیں۔ حالاں کہ باغ اُن کا اپنا ہے، لیکن اِس کے باوجود نہ وہ خود اِس کے پھل کھاتے ہیں اور نہ ملازمہ کو کھانے کی اجازت دیتے ہیں، لیکن اُن کے سخت پہرے کے باوجود محلے کے آوارہ لڑکے اور مفت خورے باغ میں سے آلو بخارے کی ٹوکریاں بھر کر لے جاتے ہیں۔''

''آخر میں آلو بخارے جب خوب پک جاتے ہیں تو اُنہیں منڈی میں بیچنے کے لیے وہ ریڑھی بانوں کو بلاتے ہیں اور دونوں بوڑھے میاں بیوی پیدل اُن کے ساتھ ساتھ جاتے ہیں تاکہ تولنے میں اُن کے ساتھ کوئی دھوکے بازی نہ ہو۔''

''اُن کا ایک ہم شہر بوڑھا وکیل اُن کی جائیداد کا کرایہ وصول کر کے انہیں ہر مہینے پہنچاتا ہے۔ وکیل کے منشی نے بتایا کہ جوں ہی وہ اُن میاں بیوی کو کرایہ دیتا ہے، وہ رونا شروع کر دیتے ہیں۔ اب آپ گئے ہوں گے کہ دونوں کتنے لالچی اور حریص ہیں، روپے پیسے کی ہر کسی کو ضرورت ہوتی ہے، لیکن وہ کچھ زیادہ ہی حریص ہیں، یعنی اتنے لالچی ہیں کہ اُن سے کرایہ لیتے ہوئے اُنہیں رونا آنے لگتا ہے۔''

''صرف بیماری..... یہ بھی ایک طرح کی بیماری ہے۔'' یہ سب سن کر میں نے کہا اور اُن کے بارے میں زیادہ کچھ نہ بولا۔

مئی کا مہینہ آیا۔ یہ باغ ہمارے گھر کے سامنے ہے۔ مئی میں باغ آلو بخارے کے سمندر کی طرح ہو گیا۔ وہ پرانا گھر اب تو مکمل طور پر آلو بخارے کے درختوں کے جھنڈ میں گم ہو گیا تھا۔ میرے پڑوسی نے سچ کہا تھا کہ بوڑھے میاں بیوی دن رات باغ میں پہرہ نہ دے سکے۔ آخر پھل توڑنے کا وقت آ گیا۔ لو سے کے دروازے کے سامنے ریڑھیاں آئیں اور وہ سب کے سب آلو بخارے اُن میں لاد کر منڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔

جولائی کے ابتدائی دن تھے۔ میں گھر کے سامنے محلے کے امام سے باتیں کر رہا تھا۔ پرانے گھر سے اُن بوڑھوں کی خدمت گار نکلی۔ وہ میری طرف آئی اور رُومی زبان میں پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب! ہمارے مالک سلام کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ بیگم ذرا بیمار ہے، ہمارے گھر تشریف لائیے۔ آپ کی فیس ہم ایک ایک کورش ادا کریں گے۔''

مجھے ایک ضروری کام تھا، اُس کے باوجود میں نے کہا۔ ''اچھا چلو، میں آتا ہوں۔''

امام نے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے کان میں کہا، ''آپ نے اچھا خریدار پکڑ لیا ہے۔ ہمارا صدقہ محفوظ رکھیے گا۔''

امام کے اس مزاحیہ جملے کا جواب میں نے بھی مذاق میں دیا۔ ''اگر وہ فیاض لوگ یہ کہتے ہیں کہ میری فیس کو روش ادا کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بیماری غالباً پیچیدہ ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد میں اپنا کام ختم کر کے اپنی مریضہ کو آپ کے پاس بھیج دوں گا امام آفندی!''

امام نے پھر میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا اور کہا، ''اُن سے زیادہ وصول کیجیے تاکہ محلے والوں کی فلاح کے کام آ سکے۔''

بیماری زیادہ پیچیدہ نہیں تھی۔ اُسے ہلکا سا زکام ہو گیا تھا۔ بڑھیا عمر رسیدہ تھی، اس لیے بیماری کا اثر زیادہ ہوا تھا۔

میں حیران رہ گیا، جب مجھے خندہ پیشانی سے ایک لمبی دُعا دینے کے بعد اُس نے کہا: ”میں آپ کو تکلیف دینا تو نہیں چاہتی تھی لیکن میرے میاں قائل نہ ہو سکے۔“

میں نے پہلے تو سوچا کہ اُن کی دعائیں اور باتیں دل سے نہیں نکلیں، اور وہ میری فیس بھی نہیں دیں گے کیوں کہ مریضہ کا خیال تھا، بیماری بہت معمولی ہے اور کہیں اُس کا علاج مہنگا نہ پڑ جائے جو لوگ اپنے باغ سے ایک آلو بخارا بھی توڑ کر نہ کھائیں، اُن کے لیے ایسا کچھ ہونا معمول کی بات ہے۔ وہ تو اپنی آمدنی کے پیسے لیتے وقت خوشی سے رو پڑتے تھے۔ میں بیمار بڑھیا کا معائنہ کرنے کے بعد نسخہ لکھنے لگا۔

اس دوران بڑھیا نے اپنے شوہر کے کان میں کچھ کہا۔ بوڑھا ایک دم غصّے میں آ گیا اور بڑبڑانے لگا۔ ”خدا کے لیے مجھے پریشان نہ کرو! میرا دُکھ میرے لیے کافی ہے۔ تمہاری دیکھ بھال میں نہیں کر سکتا۔“

لیکن وہ بیمار عورتوں کے مخصوص انداز میں ضد کرنے لگی۔ ”نہیں نہیں، آپ مجھے قتل بھی کر دیں تب بھی میں نہیں چاہتی!“

بوڑھے شوہر نے مجھ سے مخاطب ہو کر وضاحت کی۔ ”ڈاکٹر صاحب! بڑھاپے کی وجہ سے یہ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگی ہے۔ پہلے یہ ایسی نہیں تھی، میں جو کچھ کہتا تھا، یہ کرتی تھی۔ اب یہ کہتی ہے کہ میں علاج کرانا نہیں چاہتی ہوں، ڈاکٹر صاحب بے فائدہ نسخہ لکھیں!“

میں مسکرایا اور میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے سوچا، غالباً عورت اپنے شوہر سے زیادہ منحوس ہے۔ ممکن ہے، وہ پیسے خرچ نہ کرنے کے لیے دوا نہ چاہتی ہو۔ میں نے اُن کا گھر اور ساز و سامان غور سے دیکھا۔ وہ باتیں جو میرے بڑوں نے مجھے بتائی تھیں، ٹھیک لگتی تھیں۔ اُن کا گھر دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ ایک امیر جوڑا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اُن کے پاس کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں۔ خاص طور پر اُس کمرے میں شاید حیوان بھی رہنا پسند نہ کریں جس میں بیمار عورت لیٹی ہوئی تھی۔ ضدی بڑھیا نے پھر کہا، ”میں دوا وغیرہ نہیں لوں گی، دوا پی کر کیا کروں گی۔ میں مر جانا چاہتی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“

اُس کی بجھی ہوئی آنکھوں سے اُس کے چہرے پر بھرے پرتپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ میں جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

بوڑھے شوہر نے مجھ لیجے میں کہا، ”اس میز کی دراز میں پیسے ہیں بیٹا! آپ کی جتنی فیس بنتی ہو، اُس سے لے لیں۔“

میں حیران رہ گیا۔ یہ ایک تعجب خیز بات تھی کہ وہ لوگ میز کی دراز میں پیسے رکھتے ہیں اور اپنے گھر آنے والے شخص سے کہتے ہیں کہ آپ کو جس قدر پیسے چاہئیں، وہاں سے لے لیں۔

چار دن بعد انہوں نے مجھے آلو بخارے والے گھر میں پھر بلایا۔ بوڑھی عورت اب بہتر تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے چائے بنانے پر اصرار کیا۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں حیران رہ گیا کہ اُن دونوں کا اخلاق بہت ہی اچھا ہے۔

اس دوران بڑھیا نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ کے بچّے ہیں یا نہیں؟“

”بیگم صاحبہ! میری کوئی اولاد نہیں۔“ میں نے کہا۔

”کیا خدا نے اولاد نہیں دی بیٹا!“

”کاش وہ دیتا بیگم صاحبہ! دو بچّے پیدا ہوئے تھے، لیکن دو سال پہلے چند روز کے اندر اندر خدا نے دونوں کو لے لیا۔ میں بہت تنہا ہوں۔“

”خدا آپ کی اور اُن کی ماں کی عمر دراز کرے۔ آپ جوان ہیں، خدا پھر دے گا، ان شاء اللہ۔ ویسے اُن دونوں بچّوں کو کیا بیماری تھی؟“

”ایک ہڈّیوں کی بیماری سے مر گیا، دوسرا دماغ میں ورم ہونے سے، کیوں کہ ایک حادثے میں وہ سیڑھیوں سے گر پڑا تھا۔“

دونوں بوڑھے ایک دم زور زور سے رونے لگے۔ میں ششدر رہ گیا۔ عورت نے آہ بھری اور کہا۔ ”آہ بیٹا! اس بیماری نے آپ کو بھی پریشان کیا۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی کہانی سنانے لگی۔

”ہم اپنے ملک میں بہت امیر تھے۔ ہمارے بیٹے

بیٹیاں اور نواسے نواسیاں تھیں۔ جنگِ بلقان میں کچھ مارے گئے، کچھ کھو گئے۔ ہم دونوں بوڑھے اپنی ایک نواسی زہرہ کے ساتھ استنبول آ گئے۔ ہمارے سب بچے مارے گئے تھے، صرف زہرہ باقی بچی تھی۔ اپنے مرنے والے اور کھو جانے والے بچوں کی ساری محبتیں ہم نے اُسے دیں۔ اپنے ملک میں ہمارے پاس بے پناہ دولت تھی، لیکن استنبول میں ہم قلاش ہو گئے تھے۔ میں بوڑھا تھا، اس لیے کام نہیں کر سکتا تھا۔ استنبول میں ہمارے دو تین ہم شہر رہتے تھے، خدا اُن کا بھلا کرے، وہ کبھی کبھی ہمیں کچھ پیسے دے دیتے تھے۔ ہمارے پاس پہننے کے لیے کپڑے تک نہ تھے۔ زہرہ بے چاری گداگروں کی طرح رہتی تھی۔ سات آٹھ سال پہلے اِس کوچے کے سامنے ایک کھیت تھا۔ اُس پر دو تین پرانے گھر تھے۔ ہم میاں بیوی اُن گھروں میں سے ایک گھر کے تنگ سے کمرے میں زندگی بسر کرنے لگے۔ بہار کے موسم میں ایک دن ہم اِس باغ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس وقت الو بخارے پکے ہوئے تھے۔ ہماری چھوٹی سی بچی زہرہ لال لال آلو بخارے دیکھ کر کھانے کے لیے بے تاب ہوئی اور رونے لگی۔ دروازے کے آگے ایک باریش کھڑا تھا۔ میں نے جرأت کر کے اُس کے لیے دو تین آلو بخارے مانگے۔ سنگ دل باریش نے سنی اَن سنی کر دی اور کوئی جواب نہ دیا، بلکہ اپنا رُخ دوسری طرف پھیر لیا۔

”میں زہرہ کے ساتھ گھر واپس آئی۔ بچّی روتی تھی اور میں بھی۔ بوڑھا شوہر بھی ناراض ہوا کہ باغ باں سے کیوں مانگے۔ اپنے پرانے ملک کی زمینوں پر ہزاروں غریب لوگوں کا پیٹ بھرنے والے کی اولاد گداگروں کی طرح اِدھر اُدھر سے خیرات مانگے، یہ بات اُسے بے چین کرتی تھی۔

”چند دنوں کے بعد ٹوٹے پھوٹے گھروں میں رہنے والے دیگر بچوں نے زہرہ کو ورغلایا اور آلو بخارے چوری کرنے کے لیے اُسے اپنے باغ میں لے گئے۔ باغ باں نے بچوں کو دیکھا تو ہاتھوں میں پتھر اور لاٹھی لے کر درختوں کی طرف دوڑا۔ زہرہ نے بھی چوری نہیں کی تھی۔ وہ باغ باں کو دیکھ کر ڈر گئی اور اُس نے سوچے سمجھے بغیر درخت سے چھلانگ لگا دی۔ اُس کا سر پتھر پر لگا۔ سر پر گہری چوٹ آئی۔ ایک نیک آدمی نے اُسے اپنی گود میں اُٹھا لیا اور گھر لے آیا۔ ہماری نواسی کے لیے لمبے لمبے گھنگھریالے بال تھے۔ بالوں کا کچھ خون سے لت پت اُس کی پیشانی پر چپک گیا تھا۔ تین چار دن بعد زہرہ شدید بیمار ہو گئی۔ وہ تیز بخار کی وجہ سے کروٹیں لیتی رہتی، اُس کی آنکھیں ٹیڑھی ہو جاتیں۔ ہم اُسے بلدیہ کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

”بچّی درخت سے گری ہے اور سر پر گہری چوٹ آئی ہے، اِس کے سر میں ورم ہو گیا ہے، اُس ڈاکٹر نے کہا۔ ”خدا سے مایوس تو نہیں ہونا چاہیے، لیکن بے چاری کا حال اچھا نہیں۔“

”ہماری بچّی چند دن بعد مر گئی۔ ہم دونوں تنہا رہ گئے۔ ایک دو سال بعد ہمارے سابق ملک سے ہمیں بہت سی دولت مل گئی اور ہم پھر امیر ہو گئے، لیکن یہ دولت ہمارے کسی کام کی! ہم اس کا کیا کریں، ہماری عمر کے لوگ دولت اپنے بچوں اور اولاد کے لیے جمع کرتے ہیں۔ ہاں ڈاکٹر آفندی! ہماری املاک کا کرایہ جب ہمیں ملتا ہے تو ہم دونوں رونا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم دولت کس کے لیے جمع کریں، دوسرے محلوں میں ہم نہیں رہ سکتے۔ ہم نے یہ گھر خریدا ہے، یہ سوچ کر کہ ہماری پیاری نواسی زہرہ اِس آلو بخارے کے درخت کے نیچے سو رہی ہے۔ آلو بخارے پکنے کا وقت آتا ہے تو ہم ایک دم چوکنے ہو جاتے ہیں اور ہم میاں بیوی رات دن چوکی داری کرتے ہیں، تاکہ کوئی بھی درختوں کے قریب نہ جائے اور کوئی ماں ایک بار پھر اپنی بچّی کے لیے بین نہ کرے۔

”اِن درختوں سے ہم ایک بھی آلو بخارا کھانا نہیں چاہتے۔ زہرہ نے اِنہی آلو بخاروں کے لیے اپنی جان دے دی تھی۔ آلو بخارے جب پک جاتے ہیں تو ہم انہیں بیچنے کا خیال تک نہیں کرتے، بلکہ بڑھیوں میں بھر کر قبرستان کی طرف واقع یتیم خانے لے جاتے ہیں اور وہاں اُن لاوارث اور غریب بچوں میں تقسیم کر دیتے ہیں جو انہیں خرید نہیں سکتے۔

☆.....☆

سرحد پار سے پہلی کہانی

امربیل

عصمت چغتائی

سرحد پار سے عصمت آپا کے نشتر قلم کا شاہکار،

جو اُن کی اردو ادب میں عظمت کا کھلا اعتراف ہے

بڑی ممانی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ سارے خاندان کو شجاعت ماموں کی دوسری شادی کی فکر ڈسنے لگی۔ اٹھتے بیٹھتے دلہن تلاش کی جانے لگی۔ جب بھی کھانے پینے سے نمٹ کر بیویاں بیٹوں کی نئی یا بیٹیوں کا جہیز ناتھنے بیٹھتیں تو ماموں کے لیے دلہن تجویز کی جانے لگتی۔

''ارے اپنی کنیز فاطمہ کیسی رہیں گی؟''

''اے ہے بی، گھاس تو نہیں کھا گئی ہو، کنیز فاطمہ کی ساس نے سن لیا تو ناک چوٹی کاٹ کر تھیلی پر رکھ دیں گی۔ جوان بیٹے کی میت اٹھتے ہی وہ بہو کے گرد کنڈل ڈال کے بیٹھ گئیں وہ دن اور آج کا دن، دہلیز سے قدم نہ اتارنے دیا۔ گوڑی کا میکے میں کوئی مرا جیتا ہوتا تو شاید بھی آنا جانا ہو جاتا۔''

''اور بھئی بجھن بھتا کو کیا کنواری نہیں ملے گی جو جھوٹا پتل چاٹیں گے۔ لوگ بیٹیاں تھال میں سجا کے دینے کو تیار ہیں۔ چالیس کے تو لگتے بھی نہیں۔'' اصغری خانم بولیں۔

''اوئی خدا خیر کرے ابو اپورے دس سال نگل رہی ہو! اللہ رکھے، خالی کے مہینے میں پورے پچاس بھر کے.....''

اللہ! بے چاری امتیازی پھپھو بول کے پچھتائیں۔ شجاعت ماموں کی پانچ بہنیں ایک طرف اور وہ گوڑی ایک طرف اور ماشاء اللہ سے پانچوں بہنوں کی رال بس کندھوں پر پڑی تھیں، یہ گز گز بھر کی۔ کوئی بچا ہو جاتا، بس پانچوں ایک دم مورچہ باندھ کر ڈٹ جاتیں، پھر مجال ہے جو کوئی مغلائی پٹھانی تک میدان میں ٹک جائے۔ بے چاری شیتانیوں سیدانیوں کی تو بات ہی نہ پوچھیے..... بڑی بڑی دل گردے والیوں کے چھکے چھوٹ جاتے۔

مگر امتیازی پھپھو بھی ان پانچ پانڈوؤں پر سو کوروؤں سے بھاری پڑتیں۔ ان کا سب سے خطرناک حربہ ان کی چیختی ہوئی برے کی لوک جیسی آواز تھی۔ بولنا جو شروع کرتیں تو ایسا لگتا جیسے مشین گن کی گولیاں ایک کان سے گھستی ہیں اور دوسرے کان سے دن سے نکل جاتی ہیں۔ جیسے ہی ان کی کسی سے تکرار شروع ہوتی، سارے محلے میں ٹرنٹ خبر دوڑ جاتی کہ پھپھی امتیازی ابو کی کسی سے چل پڑی اور بیویاں کوٹھے لانگتی، پھیچے پھلانگتی دنگل کی جانب بلہ بول دیتیں۔

امتیازی پھپھو کی پانچوں بہنوں نے وہ ٹانگ لی کہ غریب تکو بن گئیں۔ ان کی سمجھلی بیٹی گوری خانم اب تک کنواری دھری تھیں۔ چھتیسواں سال چھاتی پر سوار تھا، مگر کہیں نصیبہ گھلنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ کنوارے

ملتے نہیں، بیاہے رنڈوے نہیں ہوتے۔ پہلے زمانے میں تو ہر مرد تین چار کو ٹھکانے لگا دیتا تھا، مگر جب سے یہ اسپتال اور ڈاکٹر پیدا ہوئے ہیں، بیویوں نے مرنے کی قسم کھالی ہے، جسے دیکھو عاقبت کے بورے سینے پر ٹنکی ہوئی ہے۔ بڑی ممانی کی بیماری کے دنوں میں ہی امتیازی پھپھو نے حساب لگالیا تھا، لیکن ان کے فرشتوں کو بھی پتا نہ تھا کہ دوہاجو کے لیے بھی کنویں میں بانس ڈالنے پڑیں گے۔

شجاعت ماموں کی عمر کا مسئلہ بڑی نازک صورت اختیار کرگیا۔ قمر آرا اور نور خالہ کے لیے تو وہ ابھی لڑکے ہی تھے، اس لیے وہ تو ہارے ہول کے برسوں کی گنتی ہی بار بار گھلا ڈال دیتیں، کیوں کہ ان کی عمر کا حساب لگ جانے سے خود خالاؤں کی عمر پر شہ پڑتی تھی، لہٰذا پانچوں بہنیں بالکل مختلف سمت سے حملہ آور ہوگئیں۔ انہوں نے فوراً امتیازی پھپھو کے نواس داماد کا ذکر چھیڑ دیا جس کا تذکرہ پھپھو کی دُکھتی رگ تھا، کیوں کہ وہ ان کی نواسی پر سَوت لے آیا تھا۔

مگر ہماری پھپھو بھی کھری مغلانی تھیں، جن کے والد شاہی فوج میں برق انداز تھے۔ وہ کہاں مار کھانے والوں سے تھیں۔ جھٹ پینترا بدل کر وار خالی دیا اور شہزادی بیگم کی پوٹلی پرٹوٹ پڑیں جو گلے بندوں خاندان کی ناک کٹوا رہی تھی، کیوں کہ وہ روز ڈولی میں بیٹھ کر دھکتوں کے اسکول میں پڑھنے جایا کرتی تھی۔ اس زمانے میں اسکول جانا اتنا بھیانک سمجھا جاتا تھا جتنا آج کل کوئی فلموں میں ناچنے گانے لگے۔

شجاعت ماموں بڑے معقول آدمی تھے۔ نہایت ستھرا نقشہ، چھریرا بدن، درمیانہ قد۔ امتیازی پھپھو سارے میں بہتی پھرتی تھیں کہ خضاب لگاتے ہیں، مگر آج تک کسی نے کوئی سفید بال ان کے سر میں نہیں دیکھا۔ اس لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ خضاب لگانا کب شروع کیا۔ یوں دیکھنے میں بالکل جوان لگتے تھے، واقعی چالیس کے نہیں جتنے تھے۔ جب ان پر پیغاموں کی بہت زور کی بارش ہوئی تو بوکھلا کر انہوں نے معاملہ بہنوں کے سپرد کردیا۔ اتنا کہہ کر کہ لوٹ پاٹ اتنی چھچوری نہ ہو کہ ان کی بیٹی لگے اور ایسی کھوسٹ بھی نہ ہو کہ ان کی لتاں لگے۔

بڑی ڈھونڈ مچی، آخر قرعہ رخسانہ بیگم کے نام پڑا۔

”اوئی، کیا خوفناتا ہوا نام ہے!“ امتیازی پھپھو کو کچھ نہ سوجھا تو نام ہی میں کیڑے نکالنے لگیں، مگر بہنوں نے ایسا مورچہ کسا کہ ان کی کسی نے نہ سنی۔

”لونڈیا سولہ سے ایک دن زیادہ کی ہو تو سوجھتے صبح سوجھتے شام، اوپر سے ہفتے کا پانی، مگر ان کی کسی نہ سنی۔ وہ اپنی گوری بیگم کی ناؤ پار لگانے کے لیے خواہی نہ خواہی دندناتی گھسیں۔

رخسانہ بیگم تھی کہ بس کوئی دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے، جیسے پہلی کا نازک سا ہلال ہو یا چاند کسی نے اتار لیا ہو۔ شکل دیکھتے جاؤ پر جی نہ بھرے۔ تو لوتو بانچ پس کے بعد چھٹا پھول نہ چڑھے۔ رنگت ایسی جیسے دمکتا لنرن۔ جسم میں ہڈی کا نام نہیں، جیسے سخت بید کی لوئی پرگانے کا ملمس چیڑ دیا ہو..... نواہیت میں غضب کی جیسے دودھ میں عرعر تورتوں کا ست نچوڑ کر بھر دیا ہو، گرم گرم پیس کی تھی تھیں، بشایہ بقول پھپھو سولہ برس کی ہوں گی، مگر انیس بیس کی الحان سی۔ بہنوں نے ماموں کو پچیسواں سال بتایا تھا، انیس ذرا سا تکلف تو ہوا، مگر پھر چال کے، کہنی تو کوئی بڑا جرم نہیں۔

سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ بے انتہا مفلس گھر کا بوجھ تھیں، دونوں طرف کا خرچہ ماموں کے سر پر ہا۔ جب رخسانہ ممانی بیاہ کر آئیں تو انہیں غور سے دیکھ کے ماموں کے پسینے چھوٹ گئے۔

”باجی، یہ تو بالکل بچی ہے!“ انہوں نے بوکھلا کر کہا۔

”اوئی خدا خیر کرے، اے میاں تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ مرد سانھا اور بانھا۔ بڑی جیسی اور کیسی۔ دو چار بیچے رہیں گے۔ نہ یہ رنگ روغن نہ یہ چھلاوا سی کمر رہے ہی نہ بازوؤں کا لوچ۔ برابر کی نہ لگنے لگے تو جو پور کا حال سومیرا۔ میں تو کہوں دس سال میں بڑی بھابی جان کی طرح ہو جائے گی۔“

”پھر ہم اپنے پیر ان کے لیے ساڑھے بارہ برس کی لائیں گے۔“ نوشابہ چہکیں۔

”ہشت!“ ماموں شرما گئے۔

”دوسری بیوی نہیں جیتی، اس لیے تیسری۔“ شمہ بیگم بولیں۔

”کیا بک رہی ہو؟“

”ہاں میاں بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں۔ دوسری تو تیسری کا صدمہ ہوتی ہے۔ اسی لیے پرانے زمانے میں لوگ دوسری شادی کرتا ہے کردیا کرتے تھے، تاکہ پھر جو دلہن آئے وہ تیسری ہو۔“

بہنوں نے سمجھایا اور ماموں کھسک گئے پھر جلد ہی رخسانہ بیگم نے بھی سمجھا دیا۔ دو تین سال میں اچھے کھانے کپڑے اور عاشق زار میاں نے وہ جادو پھیرا کہ پہلی کا چاند چودھویں کا ماہتاب ہوگیا، وہ چاند نی چٹکی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھپک گئیں۔ پور پور سے شعاعیں پھوٹ نکلیں۔ شجاعت ماموں پر ایسا نشہ سوار ہوا کہ بالکل دھت ہوگئے۔ شکر ہے جلد ہی پنشن ہونے والی تھی، ورنہ آئے دن کے دفتر سے غوطہ ضرور رنگ لاتے۔

بہنوں کے دے دے کر ایک بہتا تھے۔ بڑی ممانی تو دلہا پاے ہی میں جی سے اتر گئی تھیں۔ ان کی کمان کبھی چڑھی ہی نہیں۔ جب تک زندہ رہیں صورت کو ترستی رہیں۔ آل اولاد خدا نے دی ہی نہیں کہ ادھر جی بہل جاتا۔ میاں بہنوں کے چہیتے بھائی۔ صورت نہ دیکھیں تو کھانا نہ بیچے۔ دفتر سے سیدھے کسی بہن کے یہاں پہنچتے، رات کا کھانا وہیں ہے کھا کر آتے، پھر بھی روزانہ خوان سجائے رات تک بیٹھی راہ تکا کرتیں۔ کسی دن اتفاق سے کھا لیتے تو ان کی زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا۔ آئے دن بہنوں کے ہاں ہنگامے رہتے۔ جھٹوں کو بھی مادوج کو بھی ہالینیں کریہ بے چاری وہاں غریب الوطن سی لگتیں۔ سب نے بلانا چھوڑ دیا۔ شجاعت ماموں کو بھی یار دوستوں کی دعوت کرنی ہوتی یا قوالی اور مجرے کی محفلیں جمتیں تو بیوی کو بتانا بھی نہ چاہتا، بہنیں سب انتظام کردیتیں، پیسا انہی کے ہاتھ میں روپیہ دیے دیتے۔

کسی نے ممانی کو رائے دی کہ میاں کو قابو کرنے کا بس ایک گر ہے۔ اُسے ایسے کھانے کھلاؤ کہ کسی کے گھر کا نوالہ منہ کو نہ لگے۔ بس جی، ممانی نے کھانا پکانے کی ٹھان لیں۔ مگر کیا کھیر اور بادام کے گگلے، دم کا مرغ اور مچھلی کے کباب پکائے، جنہیں کھا کر ماموں نے فیصلہ کیا کہ وہ انہیں زہر دے کر مارنا چاہتی ہیں۔

ممانی خون تھوک تھوک کر مر گئیں۔

مگر نئی نویلی کا جادو تو آتے ہی سر چڑھ کر بولنے لگا۔

نہ کہیں آنے کے رہے نہ جانے کے، نہ کسی کا آنا بھایا۔ بس میاں ہیں اور بیوی، کیا باغ و بہار سا بھائی چنگی بھلی کے گھر سے بان کی طرح بے رحم اور بے مروت ہوگئیں، دنیا اُجاڑ ہوگئی۔ اپنے پاؤں آپ کلہاڑی ماری۔ گوری بیگم سے شادی کرادی ہوتی تو یوں بہتا صاحب القفلانہ ہو جاتے۔

”اے بھابی بہتا کو آنچل میں کب تک باندھے رکھو گی؟ مرد ذات ہے کوئی جھنڈ لٹا نہیں کہ ہر دم کو لہے سے لگائے بیٹھی ہیں۔“

لاکھ طعنے دیے جاتے، دلہن بیگم ہیں کہ کبھی ہنس رہی ہیں اور میاں کا منھ کے اُلو گھمائے جاتے ہیں، اپنی جورو ہے، کسی پڑوسی کی نہیں کہ بس تکے جا رہے ہیں، بچو تو کی طرح۔

ماموں وہ ماموں ہی نہ رہے۔ اجی کیسی تو الیاں کیسے مجرے، بس بیوی تکی کا ناچ نچا رہی ہیں، آپ ناچ رہے ہیں۔

”اے بس، اور تھوڑے دن کے چونچلے ہیں، پھر بھاری ہو انہیں کہ سارا دل بہلا خستہ۔ ایک نہ ایک دن تو بھائی کا جی بھر ہی گا۔“ دلوں کو تسلی دی گئی۔

اللہ اللہ کر کے رخسانہ ممانی کا پیر بھاری ہوا تو اللہ تو بہ! نہ اُلٹیاں طبیعت ماندی، چہرے پر اور چاند سا کھل اُٹھے۔ کیا مجال جو ذرا سی آکس آجائے۔ وہی شوخیاں، وہی انداز مستانہ۔ جوتی دلہنوں کے ہوا کرتے ہیں اور ماموں کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ انہیں اٹھا کر پلکوں میں چھپالیں۔ دل نکال کے قدموں میں ڈال دیتے۔ جی سے اُترنے کے بجائے وہ تو دماغ پر بھی چھا گئیں۔

پورے دنوں میں بھی رخسانہ ممانی کے حسن کو گہن نہ لگا۔ جسم پھیل گیا مگر چاند دمکتا رہا۔ نہ پیر پر سوجن، نہ آنکھوں کے گرد حلقے، نہ چلنے پھرنے میں کوئی تکلیف۔

جاپے کے بعد چٹ سے کھڑی ہو گئیں۔ کیا مجال جو کمر پار برابر موٹی ہوئی ہو، وہی کنواریوں جیسا لچک دار جسم بھلی بیوی کے جاپے میں بال بھر جاتے ہیں، ان کے وہ ادبدا کے بڑھے کو خود سر دھونا شوار ہو گیا۔

ہاں بیوی کے بدلے ماموں ذرا جھک گئے، جیسے بچہ انہوں نے ہی پیدا کیا ہو۔ تھوڑی سی توند کچھ نکل آئی۔

گالوں میں لمبی لمبی قاشیں گہری ہوگئیں، بال پہلے سے زیادہ سفید ہوگئے، اگر داڑھی نہ بنی ہوتی تو گالوں پر چبوتی کے سفید سفید انڈے پھوٹ آتے۔

جب دو سال بعد بیٹی ہوئی تو مامیوں کی تو نداور آگے کھسک آئی۔ آنکھوں کے نیچے کھال لٹکنے لگی۔ مچلی داڑھ کا درد قابو سے باہر ہوگیا تو مجبوراً نکلوانا پڑی۔ ایک اینٹ کھسکی تو ساری عمارت ہی چوپٹ ڈھیلی ہوگئیں۔

ان دنوں ممانی کی عقل داڑھ نکل رہی تھی۔

شیخاعت ماموں کی بتیسی اصلی دانتوں سے زیادہ حسین تھی، عمر کا الزام نزلے کے سر گیا۔

اعتبار کی پنچھو کے حساب سے رخسانہ چھبیس برس کی تھیں، کو اب بھی وہ کبھی بچوں کے ساتھ رسہا چھو کڑی کی مچانے کے موڈ میں آجاتیں تو سولہ برس کی لگتیں۔ کئی سال سے عمر کا بریڈ مارک گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ان کی عمر اڑیل ٹٹو کی طرح ایک جگہ جم گئی ہے اور آگے کھسکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ندوں کے دل پر آرے چلتے۔ ویسے بھی جب اپنے ہاتھ پیر تھکنے لگیں تو نوجوانوں کی شوخیاں منہ زور گھوڑے کی دولتی کی طرح کلیجے میں لگتی ہیں اور ممانی تو صاف امانت میں خیانت کر رہی تھیں اور بھل منساہٹ کا تو یہ تقاضا تھا کہ وہ شوہر کو اپنا خدائے مجازی سمجھتیں، اچھے بُرے میں ان کا ساتھ دیتیں۔ یہ نہیں کہ وہ تھکے ماندے بیٹھے ہیں اور بیگم بے تحاشا مرغیوں کے پیچھے دوڑ رہی ہیں۔

"اے بھائی، تم پر خدا کی سنوار، نہ سر کی خبر ہے نہ پیر کی، بڑ دنگی بنی مرغیاں کھد بڑ رہی ہوا"

"اے تو کیا کروں خالہ، موئی ملی....."

"لوئی، ولو اور سنو! اے بی میں تمہاری خالہ کب سے ہوگئی؟ چھن بھائی مجھ سے چار سال بڑے ہیں ماشاء اللہ۔ بڑا بھائی باپ برابر ہے۔ تم بھی میری بڑی ہو، خبردار جو تم نے پھر مجھے خالہ کہا۔"

"بی بہت اچھا....." شادی سے پہلے رخسانہ ممانی کی امّاں ان کی دو پٹا بدل بہن کہلاتی تھیں۔

وہی حسن اور کم سنی، جس نے ایک دن شجاعت ماموں کو غلام بنالیا تھا۔ اب ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ لنگڑا بچہ جب دوسرے بچوں کے ساتھ نہیں دوڑ پاتا تو چڑ کر چلی جاتا ہے کہ تم بے ایمانی کر رہے ہو۔ ممانی ان کے ساتھ دغا کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی تو انہیں لڑکیوں بالیوں کی طرح ہنسا یا دوڑتے بھاگتے دیکھ کر ماموں کے دل میں ٹیس اٹھنے لگتیں، وہ جل کر کوئلہ ہو جاتے۔

"لونڈوں کو لبھانے کے لیے کیا تن تن کر چلتی ہو۔"

وہ زہر اگلنے لگے۔ "ہاں اب کوئی جوان پٹھا ڈھونڈو۔"

ممانی پہلے تو ہنس کے ٹال دیتیں، پھر جھینپ کر گنوار ہو جاتیں اس پر ماموں اور بھی چراغ پا ہوتے اور بھاری بھاری الزام لگاتے۔

تب ممانی سناٹے میں رہ جاتیں۔ موٹے موٹے آنسو جھلک آتے۔ الٹی سے دوپٹا کھینچ کر وہ اپنا جسم ڈھک کر سر جھکائے کمرے میں چلی جاتیں۔ ماموں کا کلیجہ کٹ جاتا، ان کے پیروں تلے سے زمین کھسک جاتی، وہ ان کے آنسو پونچھتے، ان کے قدموں میں سر پھوڑتے، ان کے آگے ناک رگڑتے، رونے لگتے۔

"میں کمینہ ہوں، حرام زادہ ہوں، جوتی لے کر مجھے چاہے مارو۔ میری جان، میری ملکہ، شہزادی۔"

اور رخسانہ ممانی اپنی روپہلی باہنیں ان کے گلے میں ڈال کر بھوں بھوں رونیں۔

"تمہارا عاشق زار ہوں میری جان۔ رشک وحسد سے جل جل کر خاک ہوا جاتا ہوں۔ تم تو ننھے کو دودھ لیتی ہو تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے سالے کا گلا گھونٹ دوں، مجھے معاف کر دو میری جان۔" وہ جھٹ معاف کر دیتیں۔ اتنا معاف کرتیں کہ شجاعت ماموں کی آنکھوں کے حلقے اور ادرے ہو جاتے اور وہ بڑی دیر تک تھکے ہوئے خچر کی طرح ہانپا کرتے۔

پھر ایسے بھی دن آگئے کہ وہ معافی بھی نہ مانگ سکے۔ کئی کئی دن وہ روٹھے پڑے رہتے۔ بہنوں کی امید یں بندھ جاتیں۔

"ستیا جان بھائی کو کڑھا کڑھا کر مار رہے ہیں۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ یہ آئے دن کی دانتا کل کل رنگ لائے گی۔"

ممانی چھپ چھپ کر گھنٹوں روتیں۔ آنسو بھری آنکھوں میں لال ڈورے اور بھی ستم ڈھانے لگتے۔ ہوا زرد چہرہ جیسے سونے کی گنی کسی بے ایمان سنار کی ملاوٹ بڑھا دی ہو۔ پھیکے پھیکے ہونٹ، ماتھے پر ابھی ہی ایک وارفتہ لٹ۔ دیکھنے والے کلیجہ تھام کر رہ جاتے۔ حسن سوگوار کو دیکھ کر ماموں کے کندھے اور جھک جاتے، آنکھوں کی ویرانی بھی بڑھ جاتی۔

ایک بیل ہوتی ہے..... امر بیل۔ ہرے ہرے سنپولیے جیسے ڈھل..... جڑ نہیں ہوتی..... یہ ہرے ڈھل کسی بھی سرسبز پیڑ پر ڈال دیے جائیں تو بیل اس کا رس چوس کر پھیلتی پھولتی ہے، جتنی یہ بیل پھیلتی ہے اتنا ہی وہ پیڑ سوکھتا جاتا ہے۔

جوں جوں رخسانہ بیگم کے چمن کھلتے جاتے تھے، ماموں سوکھتے جاتے تھے۔ بہنیں سر جوڑ کر پھر پھر کرتیں۔ بھائی کی دن بدن گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر ان کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ بالکل ٹھرک ہو گئے تھے۔ گتھیا کی شکایت تو تھی ہی، نزلہ الگ عذاب جان ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے کہا۔ خضاب قطعی موافق نہیں، مجبوراً مہندی لگانے لگے۔

بے چاری رخسانہ ایک ایک سے بال سفید کرنے کے نسخے پوچھتی پھرتی تھیں۔ کسی نے کہا گھوڑے کا خون بدا لو تو بال جلدی سفید ہو جائیں گے۔ ڈھیانے عطر سر میں جھونک لیا۔ ماموں کی ناک میں جو شامت الغمر کی مدہوش کن خوشبو کی لپٹیں پہنچیں تو وہ وہ غلیظ عیب انہوں نے ممانی پر لگائے کہ اگر بچوں کا خیال نہ ہوتا تو ممانی کنویں میں کود جاتیں، ان کے بال سفید ہونے کی بجائے اور بلا لم اور چمک دار ہو کر ڈسنے لگے۔

ممانی کی جوانی کے توڑ کے لیے ماموں نے طب یونانی کی تمام معجونیں، مقویات، کشتے اور تیل استعمال کر ڈالے۔ تھوڑے دنوں کے لیے ان کی بھاگتی ہوئی جوانی تھم گئی۔ بالکل لوٹ آیا۔ ممانی نے کچھ دیانداری کے داؤ پیچ تو سیکھے نہ تھے، خود رو پودا تھیں۔ بھی کسی نے باریکیاں نہ سمجھائیں۔ اٹھائیس سال کی تھیں، مگر اٹھارہ برس جیسی ناتجربہ کار اور الہڑ۔

موٹر بہت چلاؤ تو انجن جل جاتا ہے۔ دواؤں کا ردعمل جو شروع ہوا تو شجاعت ماموں ڈھے گئے۔ ایک دم بڑھاپا ٹوٹ پڑا۔ اگر وہ جسم اور دماغ کو اتنا نہ تھکاتے تو باسٹھ برس میں یوں لٹیا نہ ڈوب جاتی۔ اب وہ اپنی عمر سے زیادہ لگنے لگے۔

بہنیں زار و قطار روتیں۔ حکیم ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ لوگوں نے جوان بننے کے تولاکھوں نسخے ایجاد کیے۔ قبل از وقت بوڑھا ہونے کی کوئی دوا نہیں، جو ممانی کو کھلا دی جاتی۔ ضرور ان پر کوئی سدا بہار قسم کا جن یا پیر مرد عاشق تھا کہ کسی طور سے ان کی جوانی ڈھلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ تعویذ گنڈے ہار ٹونے ٹوٹکے چت ہو گئے۔

امر بیل پھیلتی رہی۔

برگد کا پیڑ سوکھتا رہا۔

تصویر ہو تو کوئی بگاڑے، مجسمہ ہو تو پٹخ کر چکنا چور کر دے۔ اللہ کے ہاتھوں کا بنایا مٹی کا پتلا، اگر حسین بھی ہو اور زندہ بھی، اس کی ہر سانس میں جوانی کی گرمی مہک رہی ہو تو پھر کچھ بس نہیں چلتا۔ اس کے چڑھتے ہوئے سورج کو اتارنے کی ایک ہی ترکیب ہوسکتی ہے کہ کھانے کی مار دی جائے۔ گھی، گوشت، انڈے، دودھ قطعی بند۔ جب سے شجاعت ماموں کا ہاضمہ جواب دے گیا تھا۔ ممانی صرف بچوں کے لیے گوشت وغیرہ منگاتی تھیں۔ کبھی کبھار ایک نوالہ خود چکھ لیتی تھیں۔ اب اس سے بھی پرہیز کر لیا۔ سب کو امید بندھ گئی کہ اب ان شاء اللہ ضرور بڑھاپا تشریف لے آئے گا۔

"اے بھالی یہ کیا اچھال چھگا لونڈیوں کی طرح موئی شلوار قمیص پہنتی ہو اور کبھی گھاگھرا بھی جاتی ہو۔" نند کہتیں..... "بھاری بھرکم کپڑے پہنو کہ اپنی عمری لگو۔"

ممانی نے نکا ہوا دوپٹا اور غرارہ پہن لیا۔

"دکی یار کی بغل میں جانے کی تیاری ہے۔" ماموں نے کچھ کے دیے۔ ممانی کپڑوں سے بھی خوف کھانے لگیں۔

"اے بی یہ کیا ایک آدھ وقت کی نماز پڑھتی ہو۔ پنج وقتہ کی عادت ڈالو۔"

ممانی پنج وقتہ نماز پڑھنے لگیں۔ جب سے ماموں کی نیند بوڑھی اور خرلی ہوئی تھی، تہجد کے وقت سے جاگنا پڑتا تھا۔

"میرے مرنے کے نفل پڑھ رہی ہو۔" ماموں بسورتے۔ دیلی تو تھیں، دن رات کی دانتا کل کل سے اور بھی دھان پان ہوگئیں۔ گھی گوشت سے پرہیز ہوا تو

رنگ اور بھی نتھر آیا، جلد ایسی شفاف ہوگئی کہ جیسے کوئی دم میں بلور کی طرح آر پار نظر آنے لگے گا۔ چہرے پر عجب نور سا اُتر آیا۔ پہلے دیکھنے والوں کی رال ٹپکتی تھی، اب ان کے قدموں میں سر پٹخنے کی تمنا جاگنے لگی۔ جب صبح سویرے نمازِ فجر کے بعد قرآن کی تلاوت کرتیں تو ان کے چہرے پر اور بھی تقدس اور پاکیزگی طاری ہوجاتی۔ وہ اور بھی کمسن اور کنواری لگنے لگی۔

ماموں کی قبر اور پاس کھسک آئی اور وہ انہیں منہ بھر بھر کے کوستے اور گالیاں دیتے کہ بھانجوں بھتیجوں کے بعد وہ جنوں اور فرشتوں کو رغلا رہی ہیں، چلے کھینچ کھینچ کر جن قابو میں کرلیے ہیں، ان سے جادو کی بوٹیاں منگا کر کھاتی ہیں۔

خضاب کے بعد اب مہندی بھی ماموں کو آنکھیں دکھانے لگی تھی۔ مہندی لگاتے تو چھینکیں آکر نزلہ ہوجاتا۔ ویسے بھی انہیں مہندی سے گھن آنے لگی تھی۔ رخسانہ ممانی ان کے بالوں میں مہندی لگاتیں تو باوجود احتیاط کے ان کے ہاتھوں میں بھی شمیں لودیے لگتیں۔ ان کے ہاتھ دیکھ کر شجاعت ماموں کو ایسا معلوم ہوتا جیسے مہندی میں نہیں ممانی نے ان کے خونِ دل میں ہاتھ ڈبولیے ہیں۔ وہی ہاتھ جنہیں وہ بھی چٹیل کی منہ بند کلیاں کہہ کر چوما کرتے تھے، آنکھوں سے لگاتے تھے، اشکرے کے خوں خوار بچوں کی طرح ان کی آنکھوں میں گھسے جاتے تھے۔

جتنا چھتا وہ ان کی منڈیز مین پر گھستے، ممانی صندل کی طرح مہکتیں۔

بہنیں گھر سے ترمال تیار کر کے بھائی کو کھلانے لاتیں کہ کہیں بھاوج زہر نہ کھلا رہی ہو۔ اپنے ہاتھ سے سامنے کھلاتیں، مگر ان کھانوں سے ماموں کا حال اور پتلا ہوجاتا۔ بواسیر کی پرانی شکایت نے وہ زور پکڑا کہ رہا سہا خون بھی نچوڑ لیا۔ ابھی تک اس نامراد گھٹنے کا اثر باقی تھا، جو انہوں نے پچھلے جاڑوں میں مراد آباد کے ایک نامی گرامی حکیم صاحب کا نسخہ لے کر کئی سوکی لاگت سے تیار کرایا تھا۔ نسخہ بے حد شاہی قسم کا تھا، جسے مُردہ کھالیتا تو تنتنا کر کھڑا ہوجاتا، مگر ماموں گوندنی کی طرح پھوڑوں سے لد گئے۔

دُکھیا ممانی، گھی کو سیکڑوں بار پانی سے دھوتیں۔ اس میں گندھک اور بہت سی دوائیں کوٹ چھان کر ملاتیں۔ دھجریوں مرہم تھوپا جاتا۔ پتلیوں میں نیم کے پتوں کا پانی اوتا جاتیں اور صبح وشام پیپ، خون دھوتیں، ان میں سے چند پھوڑے مستقل ناسور بن گئے تھے اور ماموں کو نگل رہے تھے۔

پھر ایک دن تو اندھیر ہی ہوگیا۔ ماموں بہت کمزور ہوگئے تھے۔ بہنیں بیٹھی بھاوج کا کھڑاروتی تھیں کہ کچی بڑھیا خدا جانے کہاں سے آن مری۔ پہلے تو وہ شجاعت ماموں کو نانا جان سمجھ کر ان سے فلرٹ کرنے لگی۔ کسی زمانے میں نانا جان اس پر بہت مہربان رہ چکے تھے۔ بڑھیا نامراد کی مت ماری گئی تھی۔ نانا جان کو مرے بیس برس ہوچکے تھے اور وہ اپنی چیر بھری آنکھوں میں پرانے خواب جگانے پر مُصر تھی، بڑی لے دے کے بعد وہ ماموں کا اصلی مقام بھی تو مرحومہ ممانی کا ماتم پرسی تھی۔

''ہے ہے۔ کیا بڑھاپے میں دغا دے گیں۔''

اچانک اس کی نظر ممانی پر جاپڑی۔ ممانی صحن میں کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ عجب پیارے انداز میں وہ گردن نیہوڑائے بیٹھی تھیں، جیسے تصویر محوِ نظارہ ہوں۔ کبوتران کی بلوریں پلکی ہوئی ہتھیلی کو گدگدا رہے تھے اور وہ بے اختیار ہنس رہی تھیں۔

''ہائے میں مرئی!'' بڑھیا نے اپنا چاپتی جیسا سینہ کوٹ کر رخسانہ ممانی کی طرف ہوا میں بلائیں لے کر کنپٹیوں پر دسوں انگلیاں چٹر چٹر چٹخائیں۔ ''اللہ پاک نظر بد سے بچائے۔ بیٹا تو چاند کا ٹکڑا ہے! میں جانوں میٹھا برس لگا ہے۔ اسے میاں۔'' وہ رازداری کے انداز میں ماموں کے قریب کھسکی۔ ''سوداگروں کا منجلا بیٹا ولایت پاس کر کے آیا ہے۔ اللہ تم بس چاند اور سورج کی جوڑی رہے گی۔''

کسی زمانے میں بڑھیا بڑے معرکے کی مشاطہ تھی اب اس کا بازار بند ہوچکا تھا۔ چونڈا سفید ہوا، ہاتھ بیڑے عذور ہوئی تو ٹکڑے مانگ کر گزر اوقات کرنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر تک تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ بڑھیا مُردار کیا بک رہی ہے۔ سوداگروں کا منجھلا بیٹا جو ولایت پاس تھا سب کی نگاہوں میں تھا۔ کسی کو شبہ بھی نہ ہوا کہ ناشدنی قطامہ رخسانہ ممانی کا رشتہ لگانے کی تاک میں ہے۔

''امام حسین کی قسم، میاں میں تو کنگنوں کی جوڑی لوں گی۔ بات چھیڑوں؟''

بات جو واضح ہوئی اور پانی مراتو بھڑوں کا چھتہ چھڑ گیا۔ چاروں طرف سے توپیں دغنے لگیں۔

''ہٹے ہٹے مجھ جنم پٹی کو کیا خبر؟'' بڑھیا سلیپر پہنتی رپٹی باہر کی طرف، چلتے چلتے اس نے ممانی کی صورت پر ایک مشتبہ نظر ڈالی۔ ''منہ پر تو صاف کنوار پَنا برس رہا ہے۔''

اس دن شجاعت ماموں نے قرآن اُٹھا کر سب کے سامنے کہہ دیا کہ یہ دونوں بچے ان کے کہیں۔ اڑوس پڑوس کی مہربانیوں کا پھل ہیں، جن سے رخسانہ بیگم تاک جھانک کیا کرتی ہیں۔

اس رات وہ روتے رہے، کراہتے رہے، انگاروں پر لوٹتے رہے۔ اس رات انہیں بڑی ممانی بہت یاد آئیں، ان کے بال کُل از وقت پک گئے تھے، ان کی جوانی، ان کی دُلہنایا آنسوؤں میں بہہ گیا۔ ننگی اور پارسائی کا مجسمہ، وفا کی پتلی، ان کے منہ کا بڑھاپا بھی انہوں نے اپنے وجود میں سمیٹ لیا اور شریف بیویوں کی طرح جنت کو سدھار ہیں۔ آج وہ ہوتیں تو یہ درد، یہ سوزش یہ سفید جڑوں والے بہنری گلے ہال، یہ رستے ناسور یہ تنہائی کٹ جاتی، پھر بڑھاپا یوں نہ دہلاتا۔ دونوں ساتھ بوڑھے ہوتے۔ ایک دوسرے کے دُکھ کو سمجھتے، سہارا دیتے۔

امر بیل دن دُونی رات چوگنی پھیلتی گئی۔ بڑے پیڑ کا تنا کھوکھلا ہوگیا، ٹہنیاں جھول گئیں، پتے جھڑ گئے۔ بیل پاس کے دوسرے ہرے بھرے پیڑ پر رینگ گئی۔

کیسا جاں سوز سماں تھا، شجاعت ماموں کی میت صحن میں بنی سنوری رکھی ہوئی تھی۔ بہنیں پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ ماموں نے اپنی ساری جائیداد بہنوں کے نام ہبہ کردی تھی۔

رخسانہ ممانی سب سے الگ تھلگ دور سے لگی بیٹھی تھیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اتنی حسین اور سوگوار بیوہ زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ سفید کپڑوں میں وہ عجیب

پُراسرار خواب لگ رہی تھیں۔ رو رو کر آنکھیں مخمور اور بوجھل ہورہی تھیں۔ زرد چہرہ پکھراج کے نگینے کی طرح دمک رہا تھا۔ پُرسے کو آنے والے سب کچھ بھول کر بس انہیں تکتے رہ جاتے۔ انہیں مرحوم کی خوش نصیبی پر رشک آرہا تھا۔

ممانی پر بے پناہ بے بسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ خوف اور سراسیمگی سے ان کا چہرہ اور بھی بھولا لگ رہا تھا۔ دونوں بچے ان کے پہلو سے لگے بیٹھے تھے۔ وہ ان کی بڑی بہن لگ رہی تھیں۔

وہ گم صم بیٹھی تھیں، جیسے قدرت کے سب سے مشاق فنکار نے اپنے بے مثل قلم سے کوئی شاہ کار بنا کر سجا دیا ہو۔

☆.....☆

سرحد پار سے دوسری کہانی

اونٹ کی کل

شرون کمار ورما

مشہور ترین کہانی کار شرون کمار ورما کی ایک تاثر انگیز معاشرتی تھیم کہانی

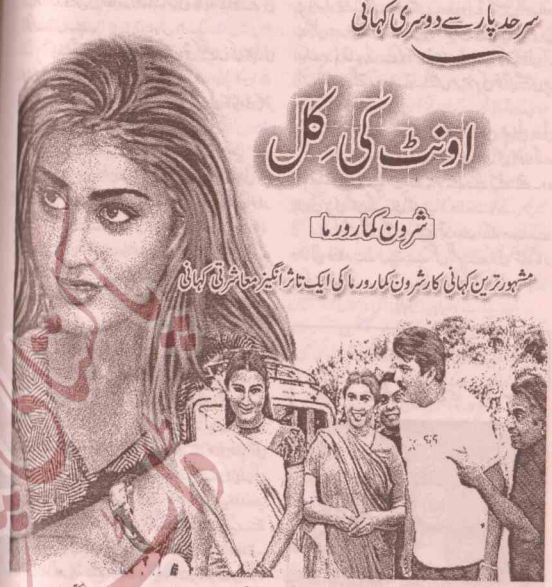

رجنی رمیش کے قریب سے کھڑا اوس پھٹ پھٹاتی غسل خانے کی طرف چلی گئی۔ اندر جا کر اُس نے کھٹاک سے دروازہ بند کرلیا۔ رمیش پل بھر کے لیے خالی الذہن کھڑا رہ گیا، پھر غسل خانے کے قریب جا کر اونچی آواز میں بولا۔ ”ٹھنڈے پانی سے مت نہاؤ، میں پانی گرم کیے دیتا ہوں۔ آج سردی بہت ہے۔“

رجنی نے جواب میں پورا نل کھول دیا۔ رمیش نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا اور اندر آ کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ رجنی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ رجنی اتنی سردی میں ٹھنڈے پانی سے نہا رہی ہے۔ سامنے قالین پر ککو اپنی چابی والی ریل سے کھیل رہا تھا ریل پٹری پر ایک ہی چکر میں دوڑے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد رجنی نہا کر نکلی اور گیلے کپڑے بازو پر سنبھالے ہوئے اندر آ گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُسے زور کی چھینک آئی۔ رمیش چونک پڑا۔ ”دیکھا نا سردی لگ گئی۔“ وہ بولا ”تم ہانو گی ہی نہیں، کبھی بس بچوں کی طرح ضد کیے جاؤ گی۔“ اُس نے بڑھ کر گیلے کپڑے اُس کے ہاتھ سے لے لیے۔

رجنی نے جواب دینے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ دوسری چھینک آئی، پھر تیسری، پھر چوتھی۔ رمیش کپڑے کرسی پر پھینک کر تیزی سے پچھلے کمرے میں گیا اور رجنی کا گرم شال اُٹھا لایا۔ ”لو اوڑھ لو۔“ وہ شال اُس کے شانوں پر ڈال کر بولا۔ ”اناسین کی دو گولیاں گرم گرم چائے کے ساتھ کھالو، الماری میں رکھی ہیں۔“

”نہیں، ایسی کون سی مصیبت آ پڑی ہے۔“ رجنی نے جواب دیا۔ اس کے دل میں اپنے نیک اور معصوم شوہر کے لیے پیار اُمڈ آیا۔ اُس نے تکھیوں سے رمیش کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

”اندر جا کر کپڑے بدل لو، سردی زیادہ ہے۔“ رمیش نے کرسی سے گیلے کپڑے اُٹھائے اور چھت پر اُنھیں سکھانے کے لیے چلا گیا۔

رجنی نے غصے سے شال اُتار پھینکا اور پچھلے کمرے میں چلی گئی۔ رمیش نیچے آیا تو شال نیچے قالین پر پڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُس نے پچھلے کمرے کی طرف دیکھا، دروازہ بند تھا۔ اُس نے یوں ہی ککو کی طرف دیکھا اور جا کر نیچے کے کپڑے تبدیل کر دیے۔ وہ اُسے غسل خانے میں لے گیا، پھر اپنے کپڑے پہنانے لگا۔ ابھی وہ اُسے جوتے پہنا رہا تھا کہ رجنی آ گئی اور رمیش کے ہاتھ سے جوتے لے کر خود پہنانے لگی۔ ”اتنی جلدی کاہے کی تھی۔“ اُس نے کہا، پھر ککو سے بولا۔ ”ککو، ڈیڈی بے کو ہر پیڈیو پر کرکٹ کی کمنٹری سنیں۔ کپڑے ہم کی سے پوچھیں گے۔“ ککو نے پیار سے نیچے کی پیشانی چوم لی، اُسے پھر بہلانے لگی۔

”میں کہتا ہوں تم کمبل اوڑھ کر لیٹ رہو، سردی لگ گئی تو بگڑا زکام نہ ہو جاتا ہے۔“ رمیش نے نرمی اور پیار سے کہا۔ ”موسی کو سونگھا ہو گیا تھا۔ اسی طرح چھینکیں آئی تھیں، بھی بھی ہو جاتا ہے تو بگڑا تھا، تم سمجھتیں کیوں نہیں ہو؟“

”میں مری نہیں جاتی۔“ رجنی نے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”تم تو عورتوں سے بھی بڑھ گئے۔“ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چلو ستیار ہو جاؤ، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

رمیش کو اچانک احساس ہوا کہ رجنی ناراض ہو گئی ہے۔ یہ اُسے کبھی کبھی ہو گیا جاتا ہے؟ اُس نے سوچا۔ رجنی سے بے پناہ محبت تھی۔ اُس کے دل میں کبھی دوسری عورت کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ شادی سے پہلے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُس کی تمام تر محبت، اُس کا خلوص اور توجہ ہونے والی بیوی کے لیے ہے۔ اُس کے دوست جسبیر واٹھ کے گرما گرم شعر پڑھا کرتے تھے اور عشق کیا کرتا تھا اور دوست اُس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے ”جملہ حقوق بحق بیوی محفوظ۔“

وہ رجنی کو ناراض نہیں کر سکتا۔ اُسے ”شادی شدہ زندگی“ نامی کتاب کے یہ الفاظ یاد آ گئے۔ ”بیوی اگر ناراض ہو تو اسے نظر انداز مت کیجیے۔“ وہ اس کے پیچھے کچن میں چلا گیا۔ رجنی گنگناتی ہوئی کام میں مصروف تھی۔ رمیش پل بھر کے لیے چوکھٹ پر کھڑا رہا، پھر آہستہ سے بولا۔ ”ناراض ہو گئیں رجنی؟“

رجنی چونک پڑی۔ بھلا کیا تک ہوئی۔ ناراض کب ہوئی تھی؟ یہ انہیں میری ناراضی کی بو کہاں سے آ جاتی ہے؟ اور اسے غصہ آنے لگا۔ رمیش کی انہی باتوں پر اسے غصہ آ جاتا تھا۔ اُس کے جی میں آئی کہ کیتلی زمین پر دے مارے اور رمیش سے لڑنا شروع کر دے، اُسے جی بھر کے سنائے۔ گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دے، لیکن وہ خاموش کھڑی اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس طرح بھی کچھ نہیں ہو گا، کیوں کہ رمیش چپ چاپ سب کچھ برداشت کر لے گا۔ وہ اسی طرح چوکھٹ پر ہاتھ رکھے کھڑا رہے گا۔ نہ وہ غصے میں آئے گا، نہ چیخ چیخ کر بات کرے گا، نہ جھگڑے گا۔ بس مظلوم بنا سنتا رہے گا اور جب وہ بول بول کر تھک جائے گی تو دھیرے سے کہے گا۔ ”پھر کہتا ہوں، سردی لگ گئی ہے۔“ اور وہ خاموش رہ جائے گی۔ اس سے زیادہ کچھ نہ ہو گا۔ ”جاؤ، اندر بیٹھو جا کر، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”ناراض تو نہیں ہو نا؟“ اس نے پوچھا۔ وہ ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ رمیش بڑی معصومیت سے لوٹ آیا۔

وہ چائے پی رہا تھا کہ پڑوس کی مسز اپاسوری آ گئی۔ وہ پریشان سی، گھبرائی ہوئی سی تھی۔ ایک ہاتھ میں کھانے دان تھا، دوسرے میں مردانہ کوٹ۔ وہ سیدھی رجنی کے پاس آ کر بیٹھی۔ ”کیا بات ہے، گھبرائی گھبرائی سی ہو؟“ رجنی نے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”وہ مجھے لڑکر کچھ کھائے پیے بغیر دفتر چلے گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں رات کو گھر نہیں آؤں گا۔“ اپا کی آنکھیں بھر آئیں۔

"کیوں؟" رجنی نے توے پر پراٹھا ڈالتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات ہو تو بتاؤں بھی۔" اپما نے آنکھیں پونچھیں۔ "کل ٹائپ اور سوٹ پریس کرنے کے لیے کہہ گئے تھے۔ میں آفس کر گئی، بس صبح سے یہی لڑنے لگے، جائے دانی توڑ ڈالی، بھوکے پیاسے دفتر چلے گئے، کوٹ بھی نہیں پہن گئے۔ اتنی سردی ہے۔"

"بچہ ہے سوری بھی۔" رمیش بولا۔ "خوامخواہ رعب جماتا ہے بیوی پر بے وقوف، خود پریس کرلیتا، بیوی کوئی نوکرانی تو نہیں ہوتی۔"

"کوٹ اور کھانا بھجوانا ہے دفتر؟" رجنی نے خاوند کی بات نظر انداز کر کے کہا۔ "دے جاؤ، یہ لے جائیں گے ساتھ۔"

"میں سوچتی ہوں، خود ہی چلی جاؤں، ورنہ وہ کھائیں گے نہیں۔" اپما نے جواب دیا۔

"یہ تو سراسر ظلم ہے عورت ذات پر۔ ماں، باپ، بھائی، خاوند بھی حکومت کرنا چاہتے ہیں بے چاری پر۔ ہمارے شاستروں میں تو عورت کو دیوی کہا گیا ہے، اسے مرد کے برابر جگہ دی گئی۔ کوئی پوجا کوئی پکیہ اس کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ عورت کی تو پوجا کرنی چاہیے۔" رمیش چائے پینا بھول گیا۔

"یہ تم بات بات میں شاستر واستر نہ لے بیٹھا کرو۔" رجنی نے چڑ کر کہا۔

"تم بھی عجیب عورت ہو۔" رمیش بولا۔ "میں تمہیں لوگوں کی طرف داری کر رہا ہوں۔ تم سے ہمدردی کرو تو اور چڑ جاتی ہو خوامخواہ۔"

"تم اپنی ہمدردی رہنے دو، اپما کو ساتھ لے جاؤ۔" رجنی نے فیصلہ سنا دیا۔

رمیش دفتر چلا گیا۔ رجنی کچن میں کام کرتے ہوئے مسٹر اور مسز سوری کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ دو بچوں کے والدین آپس میں ناراض ہو جاتے ہیں۔ بچوں کی طرح لڑنے لگتے ہیں۔ کبھی اپما روٹھی تو سوری منہ لٹکا یا ہوا پھر رہا ہے، وہ ناراض ہوا تو اپما پریشان ہو رہی ہے۔ وہ مسکرا دی۔ اُسے اس میں کچھ برا نہیں لگا۔ اچھا ہی لگا کچھ رومانٹک سا۔ وہ گنگنانے لگی۔

جن سے روٹھی رہوں۔

کام سے فارغ ہو کر وہ اندر آئی۔ کمرے میں پہنچتے ہی اُس کا غصہ عود کر آیا۔ رمیش نے حسب معمول بستر جھاڑ کر بچھا دیے تھے۔ ہر چیز اپنی جگہ رکھی ہوئی تھی جیسے اُس کا مذاق اُڑا رہی ہو کہ تم بھی ہمارے درمیان کہیں جائے آرٹ کا نادر اور بیش قیمت نمونہ۔ ہاتھی دانت کی لکشمی کی مورتی، جیسے مسکرا مسکرا کر کہے جا رہی ہو، آؤ دیوی یہاں براجمان ہو جاؤ۔ رجنی نے محسوس کیا کہ وہ پاگل ہو جائے گی۔

پانچ سال سے سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا۔ ایک بے رنگ، بے روح یکسانی، ایک بے کیف مختصر سا دائرہ جس میں وہ چابی کی ریل کی طرح گھومے جا رہی تھی۔ پانچ سال سے وہ اس گھر میں کسی اپنے چھوٹے سے گھر میں..... نیک معصوم خاوند کے گھر میں، اور اب ڈھائی سال کا خوب صورت صحت مند گڈو بھی تھا۔ یہی تو اُس نے بھگوان سے مانگا تھا۔ اُس کی گنتی پوری ہوئی تھی، پھر بھی کہیں کوئی کمی سی رہ گئی تھی، اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کی اس گھر میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ شیشے کا کھلونا ہے جسے رمیش نہایت احتیاط سے بڑی دیکھ بھال سے سنبھالے ہوئے ہے۔

وہ رمیش کے شاستروں کی دیوی ہے۔ جس کی وہ عزت کرتا ہے، پوجا کرتا ہے۔ کھڑے کھڑے اُس نے لکشمی کے خوب صورت، چھوٹے سے مُکھ کی طرف دیکھا وہ بھی اس مورتی کی طرح ہے، اُس کے جی میں آئی کہ مورتی اُٹھا کر فرش پر دے مارے، فریم چیر اُڑ دے، بستر اُٹھا کر باہر پھینک دے، کمرے کی ہر چیز جگہ سے ہٹا دے، زندگی کا یہ دائرہ ختم کر دے لیکن وہ صرف کھڑی رہی، پھر وہ جھکی کہ شاید رمیش کی جرابیں پلنگ کے نیچے پڑی ہوں؟ مگر اُس کے بیڈروم سلیپر نہایت قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔

وہ غسل خانے کی طرف گئی کہ شاید اُس کا شیو کٹ وہاں پڑا ہو؟ مگر وہ سب کچھ دھو کر الماری میں رکھ گیا تھا۔ رات کو جو کتاب پڑھ رہا تھا، شاید تکیے کے نیچے ہو؟ مگر وہ بھی ریک میں اپنی جگہ گئی۔ وہ بھی اپنا کام کرنا نہیں بھولتا تھا۔ اپنا ہی کیا، اُسے تو یہ تک معلوم تھا کہ رجنی کی نیلی ساڑی کہاں رکھی ہے؟ اور سفید بلاؤز کہاں پڑا ہے؟ وہ کبھی غصے نہیں ہوا اور ڈھائی سال سے اسی طرح ایک اصولی سی محبت کیے جا رہا تھا۔

جیسے صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک دفتر میں ڈیوٹی دیتا تھا۔ رجنی جیسے اس گھر میں مہمان ہو، جس کی آسائش اور جس کے آرام کا پورا خیال رکھا جا رہا ہو۔ وہ گھر بار ہر آگئی اور سکھو کو لے کر اوپر چھت پر چلی گئی۔ چھت پر جا کر سکھو اپنے کھیل میں مصروف ہو گیا۔ وہی چابی والی ریل اور لاٹنوں کا محدود دائرہ۔ مختصر سا دائرہ۔ رجنی نے یوں ہی اُدھر دیکھا۔ کیا واہیات کھیل ہے۔ ریل ایک ہی دائرے میں جا رہی ہے، نہ کہیں پہنچتی ہے، نہ رُکتی ہے۔ اگر اس کی چابی ختم نہ ہو تو یہ اسی طرح چکر کاٹتی رہتی ہے۔ وہ بور ہونے لگی۔ کاش یہ اُلٹ جائے۔ وہ اُٹھ کر منڈیر پر جھک گئی۔ سامنے والے گھر میں ایک بچہ ماں کے ہاتھوں سے میلا ئی کھینچ کر بھاگ گیا تھا اور وہ اسے ڈانٹ رہی تھی، بچہ مسکرا رہا تھا، ماں سے ہنسی ضبط نہیں ہو رہی تھی۔ وہ منڈیر سے ہٹ آئی۔

چارپائی پر بیٹھ کے وہ سوئٹر بننے لگی۔ وہ بار بار سکھو کی طرف دیکھتی۔ سکھو اپنے کھیل میں مگن تھا۔ وہ بغور اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ بالکل رمیش کا نقشہ تھا۔ وہی پیشانی، وہی آنکھیں۔ وہی لب، وہی خم گیں، وہی سنجیدگی۔ اُس نے اون اور سلائیاں رکھ دیں۔ چھت پر دو کبوتر آ بیٹھے تھے، رجنی نے سکھو کو آواز دی۔ "سکھو! دیکھ کبوتر، پکڑ لے بھاگ کر۔"

سکھو نے سرسری نظر سے کبوتروں کو دیکھا اور انجن میں چابی بھرنے لگا۔ رجنی جیسے تھک کر لیٹ گئی۔

کچھ دیر بعد برتن صاف کرنے والی آ گئی اور اسے اپنی تنہائی سے نجات ملی۔ وہ سکھو کو لے کر نیچے اُتر آئی اور پھولاں کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ اچانک اُس کی نظر پھولاں کی پیشانی پر پڑی۔ "اری یہ بڑی کیوں باندھ رکھی ہے؟"

"کچھ نہیں بی بی جی، یوں ہی۔" پھولاں مسکرا دی۔

"یوں ہی کیا؟ گر پڑی تھی کیا؟"

"نہیں، راموں کے باپو نے مارا تھا۔"

"کیوں؟" رجنی قریب کھسک آئی۔

"بجی میں نمک چباتی پڑ گیا تھا۔"

رجنی خاموش ہو گئی۔ پھولاں برتن دھوتے ہوئے بولی۔ "پہلے مارا پھر آپ پٹی کرانے لے گیا۔ گرم گرم دودھ لا کر پلایا..... اور....."

"اور کیا؟"

"سر دبایا، ماپیماں مانگیں۔" پھولاں مسکرا دی۔

"پہلے بھی لڑائی ہوتی ہے بھی؟" رجنی نے پوچھا۔

"لو، میاں بی بی کہاں نہیں لڑتے جھگڑتے۔ جب راموں کا باپو مارتا ہے تو میں میکے جانے کو تیار ہو جاتی ہوں، بس جھٹ منا لیتا ہے۔ ان مردوں کو سو طریقے آتے ہیں منانے کے۔ عورت کا دل یوں بھی نرم ہوتا ہے۔"

"تو بھی مان جاتی ہے؟"

"تو کیا بیچ چھوڑ کر چلی جایا کروں؟ لو، ایسا ہوا ہے کبھی؟" رجنی خاموش ہو گئی۔

رات کا کھانا تیار کرتے ہوئے رجنی نے سالن میں دانستہ نمک تیز کر دیا۔ رمیش بڑے اطمینان سے کھاتا رہا۔ اُس نے ایک بار بھی شکایت نہیں کی۔ رجنی چوکنی ہو گئی۔

جب وہ کام سے فارغ ہو کر اندر پہنچی تو رمیش پڑھ رہا تھا۔ سکھو سو گیا تھا۔ وہ یوں ہی کمرے میں گھومتی رہی، پھر جا کر ڈریسنگ ٹیبل پر کریم لگانے لگی۔ رمیش نے کروٹ بدلی، پھر ناراض ہو گئی۔ رمیش نے سوچا۔ اسے یہ ہوتا کیا ہے۔ کبھی کبھی؟ بالکل بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ اُس نے کتاب بند کر کے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے، سردی تو نہیں لگ رہی ہے؟"

رجنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رمیش نے اُس کی سسکیاں سنیں اور اُٹھ کر بستر پر جا بیٹھا۔ "یہ کیا ہوا؟" رمیش کی آواز میں درد تھا۔

رجنی جھٹکے سے اُٹھی اور کارنس سے لکشمی کی مورتی اُٹھا لائی۔ "تم اس کی آرتی اتارو جا کر۔"

رمیش کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ بس مورتی ہاتھ میں تھامے رجنی کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

☆.....☆

ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ "ناگن"۔ آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کردے گا۔ ہزاروں سال کی چتنیا پر پھیلا زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر:2

نئے پڑھنے والوں کے لیے گزشتہ قسط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آجائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر سال دن میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو تاز و دم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آچکا تھا۔

وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جارہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ مہاراج کو ٹھکانے لگا دیا جائے تاکہ یہ بادشاہت اس کے حصے میں آجائے۔ آخری بلیدان کے لیے جوڑے کا بندوبست ہو چکا تھا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کررہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کرکے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کررہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہ ہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے بلک جھپکتے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پجاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ جو عجیب سی نظروں سے صابو کو دیکھ رہے تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔ راستے میں ان کی ملاقات رندھیر سے ہوتی ہے، جو انہیں اپنے گھر لے جاتا ہے۔ شکنتلا کا حسن دیکھ کر

اس کی نیت خراب ہو جاتی ہے۔ ایک روز ازجن باہر جاتا ہے تو رندھیر شکنتلا کے ساتھ زور زبردستی کرتا ہے۔ شکنتلا غصے میں اسے بتاتی ہے کہ وہ انسان نہیں ناگن ہے اور چول کر رندھیر نے انہیں اپنے گھر میں جگہ دی ہے، اس لیے وہ اس کی جان بخشی کر رہی ہے۔ یہ کہہ کر وہ ناگن کا روپ دھار کر نکاسی آب کے رستے باہر نکل جاتی ہے۔ رندھیر بدحواس ہو کر باہر آتا ہے اور سانپ سانپ چلاتے لگتا ہے۔ اس کی چیخ پکار سن کر لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ ازجن بھی سانپ کا روپ دھار کر رندھیر کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آجاتی ہے اور کہتی ہے۔ ”ازجن کے قاتلوں! تم نے میرے ناگ کی بھتیا کر کے بڑا اتیاچار کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔“

شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔ مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

شکنتلا سوچتی ہے کہ ناگ تو مر گیا، اب اس کا انتقام اور آئندہ زندگی کے بہترین نتائج کے لیے اس کا شاہی محل میں ہونا ضروری ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

تمام کنیزیں سر جھکائے خاموشی سے نکل گئیں..... البتہ کوشیلیا نے جاتے ہوئے شکنتلا کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔

”ادھر آؤ..... بیٹھ جاؤ۔“ مہاراجہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا..... اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی مہاراج کے قریب بستر پر بیٹھ گئی۔

”کوئی چنتا نہ کرو.....“ مہاراجہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تمہاری معصومیت اور صاف گوئی کے سبب ہم تمہیں پسند کر چکے ہیں۔ آج سے تم ہماری کنیز ہو اب کوئی مائی کا لعل تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔“

شکنتلا نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مہاراجہ کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر باقاعدہ رام ناتھ کے قدموں میں گر پڑی..... ”میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں..... آپ نے مجھے عزت دی..... ورنہ وہ لوگ تو صرف میری عزت کے لیٹرے تھے!“

رام ناتھ مشفقانہ انداز میں بولے۔ ”اوپر آجاؤ..... جوتے اتار دو.....“ اور شکنتلا آہستگی کے ساتھ بستر کے اوپر آ گئی..... اسے اپنی منزل مراد اور جادو اثر جوانی پر پورا اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر ایک دفعہ مہاراج اس کی مٹھی میں آ گئے تو زندگی عیش سے گزرے گی۔ کافی دیر باتیں کرتے کرتے شکنتلا بظاہر سونے لگی اور مہاراج اس کو حسرت سے دیکھتے ہوئے نیند کی وادی میں چلے گئے..... مہاراجہ جان بوجھ کر احتیاط برت رہے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ پہلے ہی دن اپنی کمزور خواہش کا اظہار کر دیں اور شکنتلا بھی ابھی ناگ کے غم سے باہر نہ آئی تھی اور اس کی بھی کوشش تھی کہ مہاراجہ کو ابھی اپنے سے دور رکھ کر حالات کا جائزہ لے۔

☆.....☆.....☆

تابانہ شمالی ہندوستان کی ایک بہت بڑی ہندو ریاست تھی۔ معدنیات اور اچھی فصلوں کی وجہ سے ریاست مالی طور پر بڑی مستحکم تھی۔ مہاراجہ رام ناتھ تقریباً پچاس کے پیٹے میں تھے اور گزشتہ بارہ برسوں سے اپنے والد مہاراجہ پال ناتھ کی وفات کے بعد یہاں کے مطلق العنان حکمران تھے۔

بنیادی طور پر مہاراجہ رنگین مزاج طبیعت رکھتے تھے۔ درپہ دون ان کا پایہ تخت تھا اور وہاں بہت بڑا محل تھا۔ جس کے حرم میں سینکڑوں کنیزیں اور غلام تھے۔ مہاراجہ کی ایک ہی بیوی تھی ماریہ..... تقریباً تیس سال کی تھی خاصی خوبصورت اور دبدبے والی۔ لیکن مہاراجہ سے اس کی زیادہ نہ بنتی تھی۔

درپہ دون پہنچ کر مہاراجہ رام ناتھ نے اپنے محل میں اپنی خاص کنیز کوشیلیا کو طلب کیا اور شکنتلا کو اس کے حوالے کر کے حکم دیا کہ اس کے آرام و سکون کا خاص خیال رکھا جائے اس کے لیے محل میں بہترین خواب گاہ اور نئی پوشاکوں کا بندوبست کیا جائے..... کسی قسم کی کمی نہ رہ جائے۔

شکنتلا پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ رام ناتھ اس کے حسن کے جال میں پھنس چکا ہے۔ وہ ایک کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ کوشیلیا کمرے میں داخل ہوئی اور مصنوعی خیر مسکراہٹ کے ساتھ جھک کر کہا۔ اور طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”شہزادی جی میں مہاراجہ کی کنیز خاص کوشیلیا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیے اور اشنان فرمالیجیے۔ مہاراجہ شام کو آپ کے ساتھ تخلیہ چاہتے ہیں۔“ اور شکنتلا کٹھ کی خاموشی سے چل دی۔

کوشیلیا اسے نہانے والے کمرے میں لے گئی۔ دو اور کنیزیں بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں جو اپنی حرکات سے کوشیلیا کے ماتحت دکھائی دیتی تھیں..... کیونکہ کوشیلیا کا رویہ ان کے ساتھ حکمرانہ تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد شکنتلا گرم پانی اور خوشبودار صابن سے غسل کر رہی تھی۔ اسے بڑا مزا آ رہا تھا لیکن جیسے ہی اس نے سامنے دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا..... اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی!

☆.....☆.....☆

جھاجھوں پانی برس رہا تھا..... تیز طوفانی بارش اور ہوا کے تھپیڑے چل رہے تھے۔ سیاہ کالے بادل جیسے آج ہی برسنے کی قسم کھائے ہوئے تھے۔ دلاور ایک بہت بڑی چٹان کی اوٹ میں کھڑا بارش تھمنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ درھم پور کسی کام کے سلسلے میں گیا تھا۔ وہاں دوستوں سے گپ شپ کرتے کرتے شام ہو گئی..... بارش کے آثار دیکھ کر وہ فوراً چل پڑا تاکہ بارش سے پہلے گھر پہنچ جائے..... اس کی بیوی غزالہ اس کا انتظار کر رہی ہوگی وہ اس کو صبح ہی کہہ رہی تھی کہ جلدی آجانا نوشابہ کو آج بخار ہے۔ نوشابہ دلاور کی پانچ چھ سالہ اکلوتی اولاد تھی۔

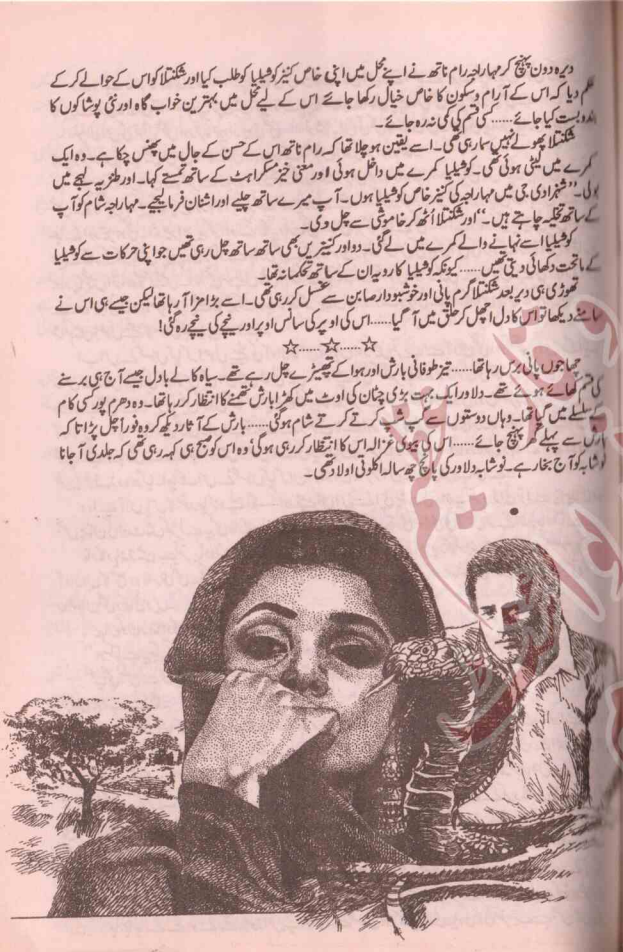

دلاور ایک عام سا دکاندار تھا..... اپنے مکان کی بیٹھک میں اس نے اشیائے صرف کی دکان کھول رکھی تھی وہ چھریرے بدن کا جوان تھا..... باپ بچپن میں ہی وفات پا چکا تھا اور دو سال پہلے ماں بھی دنیا چھوڑ گئی تھی۔

غزالہ اس کی خوش شکل اور فرمانبردار بیوی تھی..... تو شابہ ان کی کل کائنات تھی۔ اس کی پیاری پیاری زندگی سے بھرپور شرارتیں اور باتیں ہی ان کا اثاثہ تھیں۔ دلاور ایک مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔

دھرم پور گاؤں اس کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ گھر راست ویران اور دشوار تھا..... درمیان میں ایک پہاڑی آتی تھی جس کے دائیں بائیں گھاٹیاں اور اکا دکا درخت اور پودے تھے..... وگرنہ تمام راستہ بنجر اور ویران تھا! بارش تھمنے کے بجائے اور تیز ہوگئی۔ اندھیرا مزید گہرا ہونے لگا۔ رات کی سیاہی ہر سُو چھانے لگی..... اب دلاور کی پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ کیونکہ بارش اپنی پوری رفتار سے جاری تھی۔ دلاور سوچ رہا تھا کہ اس کی بیوی اس کی راہ تک رہی ہوگی تو شابہ کا بخار پتا نہیں اترا ہوگا کہ نہیں..... وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کہیں سے ڈھول بجنے کی آواز آرہی ہے۔ وہ حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہاں دور دور تک ویرانی ہے اور پھر اس بلا کی تیز بارش اور گہری شام میں ڈھول بجنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

اب اس نے محسوس کیا کہ ڈھول پیٹنے کی آواز خاصی نمایاں اور کہیں قریب سے آرہی تھی اور گھنگھروؤں کے ایک خاص لے میں بجنے کی آوازیں بھی اس میں شامل تھیں..... جیسے کوئی گھنگرو باندھ کر ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہا ہو۔ دلاور بے چینی سے دائیں بائیں گردن گھما کر دیکھنے لگا لیکن تاحدِ نظر اسے اپنے علاوہ کوئی ذی روح نظر نہ آیا..... لیکن..... آوازیں..... بدستور آرہی تھیں۔ اور اب تو بہت سے ڈھول تاشے اور گھنگرو ایک ساتھ بج رہے تھے۔ شام کے اس گھٹا ٹوپ ماحول اور بارش کے بے انتہا شور میں ڈھول تاشے کی یہ نمایاں پُراسرار آوازیں..... دلاور کا دل دہلانے لگیں..... وہ بُری طرح خوف زدہ ہوگیا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ ان آوازوں کا مرکز اس کے کہیں قریب ہی ہے۔

وہ اپنے آس پاس کا بغور جائزہ لینے لگا..... اور جیسے ہی اس نے اپنی پشت کی جانب نظر دوڑائی تو اسے پتا چلا کہ وہ جس چٹان کی اوٹ میں کھڑا ہے یہ کسی غار کا دہانہ ہے۔ قطرا تنا ہے کہ ایک آدمی تھوڑی سی کوشش کر کے اندر جا سکتا ہے۔

غار کا دہانہ زمین سے تقریباً دو فٹ بلند تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ غار کے دہانہ پر رکھ کر اندر جھانکا تو اسے معلوم ہوا کہ آوازوں کا منبع وہ غار ہی تھی۔ ڈھول تاشوں کی واضح طور پر آوازیں آنے لگیں اور ساتھ ہی اندھیرے میں چلتی بجتی روشنیاں بھی دکھائی دیں۔

"یہاں کون رہتا ہوگا؟" دلاور نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"ہوسکتا ہے یہ کچھ گھر جرائم پیشہ لوگوں کی آماجگاہ ہو۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ یہ غار اندر سے خوبصورت اور آرام دہ دیکھ کر کسی نے اس کو اپنا گھر بنالیا ہو۔" وہ اپنے سوال کے خود ہی جواب دینے لگا۔

دلاور نے محسوس کیا کہ یہ غار اندر کچھ دور آگے جا کر خاصی کشادہ ہے۔ ڈھول باجوں کی دھمک کے ساتھ اب دلاور رقص کرنے والوں کی آوازیں بھی سُن رہا تھا۔ یہ پُراسرار غار دلاور کے لیے معہ ثابت ہو رہی تھی اس کے اندر کا ہم ہر انسان سر اُٹھانے لگا..... اس نے غار کی اندرونی حالت اور اس کے باسیوں کا سراغ لگانے کا فیصلہ کرلیا اس نے سوچا کہ میں ان لوگوں کے قریب نہ جاؤں گا۔ بلکہ دور رہ کر اندھیرے کی اوٹ میں حالات کا جائزہ لے کر دیکھوں گا کہ یہ تمام پیشہ لوگوں کا ٹھکانہ ہے یا کسی غریب گھرانے کی سرچھپائی کی جگہ..... اگر جرائم پیشہ لوگ ہوئے تو حاکم کو اطلاع کردوں گا..... ہوسکتا ہے کہ کچھ انعام واکرام مل جائے اور زندگی خوش حال ہوجائے..... یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ آہستگی سے غار کے اندر داخل ہوگیا اور دور ناچتے گاتے لوگوں پر نگاہ جما کر اندھیرے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اندر بارش کا ہوتھ بھاگی نہ دے رہا تھا۔ غار کی چھت زیادہ اونچی نہ تھی تاہم کھڑے ہونے میں اسے کوئی دشواری ہوئی..... جا بجا جالے لگے ہوئے تھے۔ تھوڑا قریب ہوا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ شادی بیاہ کی کوئی تقریب ہے جس میں بارہ

لوگ ناچ گا کر دھما چوکڑی مچائے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ آجا بھی رہے تھے۔ ابھی وہ ان کی شکلیں واضح طور پر دیکھنے میں کامیاب نہ ہوا تھا کہ اس کے پاؤں کسی نرم نرم جسم پر پڑے۔ دلاور اس اچانک افتاد سے گڑبڑا کر رہ گیا اور توازن قائم نہ رکھ سکا..... اور فرش پر گرتا چلا گیا..... فرش پر گرتے ہی اس نے اپنے نیچے چھوٹے چھوٹے بچوں کی موجودگی محسوس کی..... اور اچانک پورا غار بچوں کی چیخوں سے گونج اُٹھا..... کئی بچوں نے بیک وقت ایسے رونا اور چیخنا شروع کردیا جیسے بچے کسی بھاری چیز سے ٹکرا کر زخمی ہوگئے ہوں۔ دلاور بوکھلا کر فوری طور پر کھڑا ہوگیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف نگاہ دوڑانے لگا..... لیکن اسے کوئی پتہ نظر نہ آیا لیکن اس نے اٹھتے ہی اپنے جسم سے کئی چھوٹے چھوٹے بچے ٹکراتے اور چلاتے ہوئے محسوس کیے..... بچے اس سے ٹکرا رہے تھے۔ لیکن باوجود بھرپور کوشش کے اسے کسی بچے کا ہیولہ تک دکھائی نہ دیا۔

لیکن غار بچوں کی بھاگ دوڑ اور چیخوں سے پوری طرح گونج رہی تھی۔ اچانک ڈھول تاشوں کی آواز بند ہوگئی اور ناچتے گاتے لوگ اسے اپنی طرف بڑھتے نظر آئے۔ اب دلاور نے کسی بڑی مصیبت سے دوچار ہونے سے پیشتر غار سے نکل کر فرار کا فیصلہ کرلیا..... اور واپس مڑ کر اندھا دھند دوڑنا شروع کردیا۔ غار کا دہانہ زیادہ دور نہ تھا اور اسے باآسانی دکھائی دے رہا تھا..... ایک ہی جست لگا کر دلاور غار سے باہر آگیا۔

بارش تقریباً بند ہوچکی تھی..... اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی..... غار سے باہر آتے ہی دلاور نے سانس پھیپھڑوں میں کھینچا اور پوری رفتار سے اپنے گھر کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ وہ دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ تنومند جوان ہونے کے باوجود نابدہ بچوں اور غار کی پُراسراریت سے وہ بری طرح خوفزدہ ہوچکا تھا۔

گرتا پڑتا وہ اپنے محلے میں داخل ہوا..... اور پھر جیسے ہی اس نے اپنے گھر کی دہلیز پھلانگی..... حیرت سے اسے زور دار جھٹکا لگا۔

☆.....☆.....☆

اس کے گھر کا صحن کیچڑ سے بھرے چند پنڈال کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔

محلے بھر کی عورتیں اس کے گھر میں موجود تھیں!

اور اس کی بیوی غزالہ کی دلدوز چیخیں گلیجہ پھاڑ رہی تھیں۔

دلاور کو دیکھ کر عورتیں ایک طرف ہوگئیں اور اسے راستہ دینے لگیں دلاور مجنونانہ انداز میں لپکا..... اور عورتوں کے گھیرے میں پڑی چارپائی تک جا پہنچا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی..... چارپائی پر اس کی پانچ سالہ بیٹی نوشابہ کا بے کفن لاشہ پڑا تھا..... اس کے بازو اور ٹانگیں بری طرح مڑے تڑے تھے۔

اس کی جواں سال بیوی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ عورتیں بلکتے ہوئے اسے بتا رہی تھیں کہ کچھ دیر پہلے نوشابہ اچھی بھلی تھی۔ اچانک اسے کوئی دورہ پڑ گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں مڑنا شروع ہوگئے۔ وہ سخت اذیت کا شکار ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کے سامنے اس نے سخت بے چارگی میں جاں جان آفریں کے سپرد کردی۔ بزرگ عورتیں کہہ رہی تھیں کہ اسے جنات نے مارا ہے۔ دلاور یہ باتیں سن کر سب کا منہ تک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں..... معصوم بچی کی بے وقت موت..... غزالہ اور دلاور کو پاگل کرنے کے لیے کافی تھی۔

☆.....☆.....☆

دلاور چارپائی پر پشت کے بل لیٹا..... دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے ٹکٹکی باندھے ایک ٹک چھت کو دیکھے جا رہا تھا..... غزالہ سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنی گود میں نوشابہ کے کپڑے اور کھلونے رکھے انہیں ہاتھ سے ہوئے مسل رہی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ دلاور سمجھ چکا تھا کہ اس غار میں جنات کا قبضہ ہے..... اور ان کے بے پاؤں کے نیچے آکر کچلے گئے اور..... انتقامی کارروائی کے طور پر بدلہ اس کی معصوم بچی سے لیا گیا..... آج اس جاں گسل واقعے کو گزرے تین دن ہوچکے تھے۔ دلاور نے یہ بات کسی کو نہ بتائی تھی..... بلکہ وہ خود کو ہی اپنی بچی کا قاتل تصور کر رہا تھا۔ اچانک دلاور

کو اپنے بازو پر ناقابل برداشت چبھن اور چوٹ کا احساس ہوا..... وہ تڑپ کر سیدھا ہو گیا اور پھر اگر وہ فوری طور پر اپنا سر پیچھے نہ کر لیتا تو کنپٹی اس کے سر پر پڑ چکی ہوتی۔ غزالہ نے کنپٹی اس کے بازو پر ماری تھی جس سے اسے شدید درد ہوا تھا۔

"غزالہ..... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟....." دلاور اچھل کر ایک بار پھر پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ کیونکہ کنپٹی سے غزالہ دوسری مرتبہ اس پر وار کر چکی تھی۔

اب جو دلاور نے غزالہ کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے خوبصورت چہرہ اچھا خاصا بگڑا ہوا لگا..... اس کے ناک کے نتھنے خاصے پھول چکے تھے اور ایک طرف سے ہونٹ اتنا نیچے لٹک گیا تھا کہ دانت اور مسوڑے بھی نظر آ رہے تھے۔ دلاور تیزی سے اس کے کنپٹی والے سیدھے ہاتھ کی طرف بڑھا..... اور ایک جھٹکے سے کنپٹی چھیننے کی کوشش کی لیکن اسے آگے بڑھتے دیکھ کر غزالہ نے اپنا الٹا ہاتھ زور سے گھمایا تو دلاور کو اپنا چہرہ برعت سے پیچھے کرنا پڑا اور غزالہ کا ہاتھ دلاور کے دائیں شانے پر اس زور سے لگا کہ دلاور جھنجلا کر رہ گیا۔ "یہ غزالہ کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔" یہ خیال ذہن میں ابھرتے ہی ..... سنسنی کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی گئی..... کیونکہ غزالہ کا چہرہ مکمل طور پر بگڑ کر خوفناک صورت اختیار کر گیا تھا..... اور اس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو چکا تھا۔

اب دلاور کو یقین ہو چلا کہ غزالہ کے اندر کوئی جنات حلول کر چکے ہیں۔ خوف سے دلاور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور خنک موسم میں بھی اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا..... اس نے فوراً خارجی دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور ننگے پاؤں بھاگ نکلا۔ غزالہ کنپٹی تھامے اس کے پیچھے غراتی ہوئی لپکی!

☆.....☆.....☆

سامنے ایک قدم آدم آئینہ تھا..... آئینے میں شگفتلا نے دیکھا کہ ایک ناگن غسل کر رہی ہے۔ اس نے تیزی کے ساتھ اپنے آپ کو دیکھا تو وہ انسانی روپ میں ہی تھی۔ لیکن آئینے میں پھر دیکھا تو ناگن نظر آ رہی تھی۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں آئینے کے اندر اپنے اصل روپ میں ہی دکھائی دے رہی ہوں۔" شگفتلا پُرفکر سوچتے ہوئے اپنے آپ سے مخاطب ہوئی۔ پھر اس نے تیزی سے چاروں طرف دیکھا لیکن اس کے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا!! "یہ تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ آئینے سے بچ کر رہنا ہوگا۔" شگفتلا نے ایک بار پھر آئینے کے اندر اپنا بھرپور جائزہ لیا اور گہری آنکھوں سے اپنے وجود کو دیکھنے کی چند لمحے گزرے تھے کہ تراخ کی آواز کے ساتھ آئینہ کرچی کرچی ہو کر گر پڑا..... شگفتلا چونک پڑی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی تک اس کے وجود کے اندر چھپی ہوئی کنیز وہاں اور مطلق طور پر سامنے نہ آئی تھیں۔ اب وہ جلدی جلدی غسل کر کے باہر آ گئی جہاں مشاطہ کنیزیں اس کی منتظر تھیں وہ اسے کمرۂ خاص میں سنوارنے کے لیے لے گئیں پہلے اس کو انتہائی قیمتی لباس پہنایا گیا۔ شاہی جوتے پہنائے گئے۔ ہونٹوں پر لالی اور آنکھوں میں ڈورے کھینچے گئے..... شگفتلا کے بال ہال میں موتی پروئے گئے۔ عطر و خوشبو کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ شکل و صورت سے تو وہ پہلے ہی حسینہ عالم تھی اور پہ سے شاہی سنگھار سے اس کا روپ اپنی جولانیوں پر آ گیا۔ تمام کنیزیں اس کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر شگفتلا کو شاہی حجلہ عروسی پہنچا دیا گیا۔ دوپہر کا پُرتکلف کھانا کھلا کر کوشیلیا کہنے لگی۔

"شگفتلا اب تم آرام کرو....." اور پھر دو کنیزیں اسے مور محل جھلنے لگیں! شگفتلا شہزادیوں کی مانند گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند کر نیم دراز ہو گئی۔ کمرہ خاصا کشادہ ہونے کی وجہ سے ٹھنڈا بھی تھا۔ سانپ کی حیثیت سے اسے سونے کی طلب نہ ہوتی تھی تاہم اپنی مرضی سے وہ جب چاہے سو سکتی تھی۔ اب اسے ارجن یاد آنے لگا..... اس کی موت سے شگفتلا بہت دکھی تھی! اس کا دل اس بات کو تسلیم نہ کر پاتا تھا کہ ارجن مر چکا ہے وقت نے اسے مہلت ہی نہ دی تھی کہ وہ اس کی لاش کو ہی دیکھ لیتی رفتہ رفتہ اس کا دکھ انتقام میں بدلنے لگا۔ وہ سوچنے لگی کہ میں ذرا ہاتھ اٹھا رہوں۔ رندھیر کے گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔ گاؤں کے ایک ایک آدمی کو تڑپا تڑپا کر نہ ماروں تو میرا نام شگفتلا نہیں۔ یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی آہستگی کے ساتھ اس کا پاؤں ہلا رہا ہے۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک کنیز اس کے پاؤں کا انگوٹھا آہستہ آہستہ سہلا رہی تھی۔

"اٹھیے سرکار خاصی شام ہو گئی!" کنیز نے انتہائی ادب سے اسے مخاطب کیا اور وہ ایک انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔

ایک بار پھر خدمت گزاری شروع ہو گئی! اسے شام کی چائے اور ہلکی پھلکی غذا دی گئی۔ پھر منہ ہاتھ دھلا کر منے سر سے اس کا بناؤ سنگھار کیا گیا۔ اس کے بعد چہل قدمی کے لیے گل کے باغ میں لے جایا گیا جہاں چاروں طرف پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ نرم نرم گھاس پر وہ ننگے پاؤں کچھ دیر ٹہلتی رہی باغ کے عین وسط میں خوبصورت فوارے نصب تھے۔ ایک طرف چھوٹی سی آبشار بنائی گئی تھی۔ کنیزیں اس کے پیچھے پیچھے اس کی بھاری لباس ہاتھوں سے سہارے ہوئے تھیں۔ شگفتلا کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک ملکہ تصور کرنے لگی۔ اب اندھیرا چھانے لگا تھا۔ کچھ دیر باغ کی سیر کرنے کے بعد اس کو واپس اپنے کمرے کی طرف لے جایا گیا۔ طویل برآمدے سے گزر کر وہ واپس اپنے کمرے کی طرف آنے لگی جہاں خاص مستعد کھڑے تھے۔ کچھ غلام اور کنیزیں آ جا رہے تھے وہ جس جس راستے سے گزرتی سب سر کو جھکا لیتے۔ شگفتلا کی گردن آہستہ آہستہ فخر سے بلند ہونے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ مہاراجہ نے اس کے بارے میں کوئی خاص ہدایات جاری کر رکھی ہیں اسی لیے اسے اتنا اہم درجہ دیا جا رہا ہے۔

وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور اپنے اطلس و کمخواب کے بستر پر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ کنیزیں خدمت کے لیے مستعد کھڑی تھیں۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" اس نے اپنے دائیں ہاتھ کھڑی کنیز سے پوچھا۔ "میرا نام پونم ہے۔ میں مہاراجہ کی خاص کنیروں میں سے ہوں۔"

"اور تمہارا۔" اس نے بائیں طرف والی لڑکی سے سوال کیا۔ "جی میرا نام کملا ہے۔"

"کب سے شاہی محل میں ہو؟"

"جی ہوش ہی یہاں سنبھالا ہے میری ماں بھی محل کی داسی تھی! میں پیدا ہی یہاں ہوئی ہوں۔"

شگفتلا کنیزوں سے باتیں بھی کر رہی تھی اور چاروں طرف نظریں بھی دوڑا رہی تھی کہ کہیں کمرے میں کوئی آئینہ تو نہیں..... لیکن وہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اچانک باہر پہرے دار سپاہیوں کی آوازیں ابھریں۔ باادب ہوشیار..... سرکار تشریف لاتے ہیں اور تمام کنیزیں ہم کرسیا جگہ سیدھی ہو گئیں! پونم نے آگے بڑھ کر شگفتلا کا لباس درست کیا اور عروسی دوپٹہ قدرے صحیح کر گھونگھٹ نکال دیا۔ تھوڑی دیر بعد مہاراجہ رام ناتھ تشریف لائے! اور کنیزوں کو ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے باہر جانے کا اشارہ دیا۔ سب باندیاں باہر نکل گئیں۔ شگفتلا اپنے بازوؤں میں آپ ہی سمٹنے لگی۔

مہاراجہ رام ناتھ بلنگ کی پٹی بیٹھ گئے۔ اور شگفتلا سے مخاطب ہوئے۔

"شگفتلا..... ہمارے حرم میں سینکڑوں کنیزیں موجود ہیں ہماری خوبصورت بیوی بھی ہے لیکن رام جانے، تجھ جیسی سُندر کنیا ہم نے جیون بھر نہ دیکھی نہ سنی، جس وقت تجھے گرفتار کر کے ہمارے حضور پیش کیا گیا تب سے اب تک ہر لحہ تمہاری کومل صورت ہماری آنکھوں میں پھرتی رہی..... ہم دو دن بڑے ہی بے کل رہے! تجھے دیکھ کر ہمارا من چاہے کہ ہماری مہارانی ہماری ملکہ تجھے ہی ہونا چاہیے۔ تمہارے کان ہم سارے جگ سے ٹکر لے سکتے ہیں۔"

"لیکن مہاراج!" شگفتلا نے سر اٹھایا..... تو مہاراج اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس سے قبل مہاراجہ نے اسے میلے کچیلے گندے کپڑوں میں دیکھا تھا کیونکہ بھاگتے بھاگتے شگفتلا کے کپڑے میلے اور صورت مٹی سے اٹ گئی تھی۔

لیکن اس وقت جب اس نے اپنچہ سامنے کیا تو شاہانہ لباس، بناؤ سنگھار سے اس کا حسن نکھر گیا تھا! وہ اس سے مہاراجہ کو آکاش سے اترتی ہوئی اپسرا معلوم ہوئی! مہاراج اس کی بڑی بڑی خوبصورت سبز آنکھوں کی تاب نہ لا سکے اور نیچے دیکھتے ہوئے جذبات سے لرزتی آواز میں بولے۔

"بولو..... بولو شگفتلا کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"مہاراج آپ کیا میری ایک اپچا پوری کر سکتے ہیں۔"

"کیوں نہیں..... ایک کیوں ایک سو ایک بتاؤ۔" مہاراج پر شگفتلا کے حسن کا جادو چھانے لگا۔

''مہاراج آپ نے ابھی کہا ہے کہ آپ کا من چاہتا ہے کہ مجھے آپ کی مہارانی ہونا چاہیے۔''

''ہاں ہاں بالکل یہی بات ہے۔'' مہاراج نے سرشاری سے کہا۔

''تو پھر مہاراج..... مجھے بنا لیجیے نا اپنی رانی۔ مجھ سے پھیرے لے لیں نا۔''

''کیوں نہیں میرے من کی ملکہ.....'' مہاراج اس کے تیج چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے بولے۔

''ہم کل ہی تجھ سے پھیرے لے لیں گے اگلی صبح ہم بھرے دربار میں تمہیں اپنی رانی بنانے کا اعلان کر دیں گے۔''

''میں بھی آپ کو دیکھتے ہی آپ سے فریفتہ ہو چکی ہوں..... آپ مجھے بالکل اپنے خوابوں کے شہزادے لگے ہیں۔ اتنا بھرپور اور مکمل مرد میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔'' شکنتلا اب مہاراج کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے تیار ہو چکی تھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسا وقت پھر کبھی نہیں آئے گا۔ وہ ناز و انداز کے تمام حربے استعمال کرنے پر تل گئی۔

مہاراج بھی اپنی تعریف سن کر پھولے نہ سما رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ پلنگ کے اوپر آ چکے تھے اور ان کے ہاتھ اب گستاخی کرنے لگے تھے۔ شکنتلا دانستہ چھوئی موئی بن رہی تھی۔

''مہاراج.....'' شکنتلا ایک جانب سمٹتے ہوئے بولی۔

''آج انتظار کر لیں کل تو ہمارے پھیرے ہو ہی جانے ہیں۔''

''پھیرے تو ہوتے ہی رہیں گے شکنتلا۔'' رام ناتھ اس کی پتلی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گویا ہوئے..... ''لیکن آج مجھ سے رہا نہ جائے گا۔''

''ٹھہریے مہاراج..... میں آپ کی بنتی کرتی ہوں..... میں بھی نہ چاہوں گی کہ جب آپ کی پتنی بن کر بابل جاؤں..... تو میرے دل میں کوئی ندامت ہو..... میں سمجھتی ہوں کہ آپ کے اندر اتنا آتم وشواس (خود اعتمادی) موجود ہے۔ کل رات تو میں آپ کی پتنی بن کر سامنے آ ہی جاؤں گی۔''

''تم نے ہمیں بڑی سمسیا سے دوچار کر دیا ہے شکنتلا۔'' مہاراج گہری سانس لیتے ہوئے بولے..... ''رام قسم کل ہم تمہیں اپنی پتنی بنا ہی لیں گے اچھا ہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے.....'' مہاراج رام ناتھ فیصلہ کن لہجے میں شکنتلا کو چھوڑ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوتے ہوئے بولے۔

شکنتلا کا دل خوشی سے نہال ہو گیا اس کے من میں لڈو پھوٹنے لگے! بالآخر اختیار زندگی گزارنے کا خواب اسے اب پورا ہوتا نظر آنے لگا اور نہ کنیزوں اور باندیوں کی کیا زندگی اور وقعت ہوتی ہے! یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی! امراء کی نظر میں کنیزیں اور باندیاں وہ پھول ہوتی ہیں جنہیں جب چاہا مسل دیا اور جب چاہا جوتوں تلے روند دیا!

''ناراض ہو گئے مرے ساجن.....؟''

شکنتلا مہاراج کے جسم پر بوجھ ڈال کر بیٹھتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بولی۔

''نہیں نہیں شکنتلا تم سے روٹھ کر میں نے کافر ہونا ہے!''

''میں تو سوچ رہا ہوں کہ کل کب آئے گی جب تمہارے سر پر ملکہ کا تاج ہوگا اور تمہارے حسن کی سلطنت پر تمہارے عشق کا راج ہوگا۔''

☆.....☆.....☆

راج محل کے وسیع ایوان میں دربار لگا ہوا تھا۔ یہ ایک سجا سجایا ہال تھا جو سرخ اور سفید سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا تھا۔ پورے ہال میں دیوار سے دیوار تک قالین بچھے تھے اور پوری چھت کے نیچے جا بجا فانوس لٹک رہے تھے..... ان میں شمعیں روشن تھیں چھت کے عین درمیان ایک بہت بڑا مرکزی فانوس تھا جس میں جلتی شمعیں فانوس کے رنگ برنگی شیشوں سے توس قزح کی روشنیاں بکھیر رہی تھیں..... اس کے علاوہ ہال کے اندر کھڑکیوں کے نیچے بھی قطار در قطار سینکڑوں شمعیں جل رہی تھیں جن کی وجہ سے پورا دربار یقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ہال کے بیچوں بیچ مرکزی دروازے سے داخل ہوتے ہی آمنے سامنے خوبصورت کرسیاں پہلو بہ پہلو رکھی تھیں جن پر تمام درباری درجہ بدرجہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیوں کی

قطاریں جہاں جا کر ختم ہوتی تھیں! وہاں سے کچھ فاصلے کے بعد شاہی کابینہ کے صوفے تھے۔ جو کہ نیم دائرے میں تھے۔ یہ تعداد میں سات تھے پہلے نمبر پر سپہ سالار بلگرام بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ شاہی پنڈت گرو نرائن جو کہ کالی کے مندر کے بڑے پجاری تھے اس سے آگے تابانہ کے انتظامی وزیر پریم لال تھے۔ اس کے بعد وزیر اعظم ہال ٹھاکرے بالکل درمیان والے صوفے پر بیٹھے تھے۔ آگے چلیں تو شاہی طبیب اور بعد میں شاہی جادوگر سامری اور سب سے آخر میں مہاراجہ رام ناتھ کے خصوصی مشیر رام دیال تشریف فرما تھے۔ جو مہاراج رام ناتھ کے سگے چھوٹے بھائی اور ولی عہد بھی تھے۔ ان تمام صوفوں کا رُخ شاہی چبوترے کی طرف اور پشت دربار یوں کی طرف تھی۔ شاہی چبوترہ فرش سے قدرے بلند اور مزید خوبصورت تھا..... جس پر آج تین تخت پڑے تھے..... جبکہ آج سے قبل ہمیشہ دو کرسیاں ہوتی تھیں ایک مہاراجہ رام ناتھ اور دوسری مہارانی ماریہ کے لیے۔ تمام وزیروں، مشیروں اور درباریوں کا موضوع سخن بھی یہی تیسرا تخت تھا۔ شاہی چبوترے کے تینوں تخت ابھی خالی تھے۔

شاہی چبوترے کے پیچھے ایک بہت بڑا بھاری پردہ لٹکا ہوا تھا..... مہاراجہ اور رانی کی آمد ہمیشہ اسی پردے کی اوٹ سے ہوتی تھی۔

تمام پہرے دار اور سرکاری اہلکار اپنی جگہ پر چاق چوبند کھڑے تھے اچانک شاہی چوبدار کی گرجدار آواز ابھری۔ ''با ادب..... ہوشیار..... ریاست تابانہ کے مہاراجہ عزت مآب رام ناتھ تشریف لاتے ہیں۔'' چوبدار کی یہ آواز مناسب وقفے سے تین بار ابھری۔ تیسری آواز کے پہنچتے ہی لمحے بعد شاہی چبوترے کے پیچھے لگا پردہ ہلا اور زرق برق لباسوں میں ملبوس دو کنیزیں برآمد ہوئیں اور پردے کے دائیں بائیں ہو کر پردے کے آخر میں کھڑی ہو گئیں۔ ڈوریاں کھینچنی شروع کر دیں۔ اب پردے کے دونوں حصے مخالف سمت سمٹنے لگے آدھے سے زیادہ پردہ ہٹ جانے کے بعد مہاراجہ اور رانی ماریہ شاہی لباسوں میں پوری تمکنت کے ساتھ چلتے ہوئے آئے۔ دونوں کی پشت پر دو دو کنیزیں تھیں جو ان کے بھاری لباس کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ دونوں خراماں خراماں چلتے ہوئے آئے۔ مہاراجہ درمیان والے تخت پر اور مہارانی بائیں جانب کے تخت پر بیٹھ گئیں ان کی آمد کے ساتھ ہی پورا دربار اٹھ کھڑا ہو گیا۔ پورے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ سانسوں کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ سوئی بھی گرے تو آواز ابھرے کے مصداق خاموشی طاری تھی۔

مہاراجہ رام ناتھ نے خود بیٹھنے کے بعد دونوں ہاتھ پھیلا کر نیچے کی جانب جھکائے تمام لوگ آہستگی سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ رانی ماریہ کا چہرہ بناؤ سنگھار کے باوجود ستا ہوا تھا اور آنکھیں یوں سوج رہی تھیں جیسے وہ روتی رہی ہوں۔ اُن کی پلکوں کے بھیگے گوشے ہر شخص محسوس کر رہا تھا۔

اب مہاراجہ رام ناتھ دربار سے گویا ہوئے..... ''آج کا یہ غیر معمولی دربار بلانے کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ ہم سب کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''مبارک سلامت.....'' پورے دربار سے شور و غل بلند ہوا..... مہاراجہ نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش کیا اور گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولے..... ''آج اور اسی وقت شادی کی رسوم ادا کی جائیں گی!''

وزیر اعظم ہال ٹھاکرے یہ سُن کر کھڑے ہوئے اور پنڈت گرو نرائن کو رسوم کی ادائیگی کا حکم دیا۔

کچھ ہی دیر میں تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے اور اب باری تھی نئی رانی اور رام ناتھ کی ہونے والی دلہن کی آمد کی۔ رام ناتھ مہاراج کی اجازت کے بعد چوبدار کی آواز پھر بلند ہوئی۔ ''باادب ہوشیار! ریاست تابانہ کی نئی رانی شکنتلا تشریف لاتی ہیں۔'' اس کے چند لمحوں کے بعد پردے کے پیچھے سے دلہن آتی نظر آئی۔ شکنتلا اس وقت سرخ رنگ کے لہنگے میں ملبوس ایک دوشیزہ نہیں بلکہ بہت بڑا گھونگھٹ کی جلو میں لمبا گھونگھٹ نکالے آ رہی تھی۔ مہاراجہ کی کنیز خاص کوشلیا چلتے میں شکنتلا کی رہنمائی کر رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی تخت تک آئی اور تخت پر بٹھا کر اس کا لباس درست کرنے اور سنبھالنے لگی۔ دربار میں ایک بار پھر مبارک سلامت کا شور غوغا بلند ہوا اور مہاراجہ کے اشارے سے خاموشی چھا گئی۔ تقریباً دو گھنٹے تک پنڈت گرو نرائن نے شادی کی رسوم ادا کیں۔ رام ناتھ اور شکنتلا کے سات پھیرے آگ کے الاؤ کے

گرد مکمل ہوئے۔ اس دوران تمام وقت رانی ماریہ خاموشی سے گم صم بیٹھی رہی اور اب باری تھی نئی رانی کے دیدار اور کھ دکھلائی کی۔ مہاراجہ رام ناتھ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے شکنتلا کا گھونگھٹ اٹھایا۔ شکنتلا کا پریوں جیسا حسن اور رنگ روپ دیکھ کر پورے دربار کو سانپ سونگھ گیا۔ وزیراعظم، سپہ سالار، پنڈت اور دیگر اعلیٰ عہدیداروں سمیت سبھی لوگ انگشت بدنداں رہ گئے اور لگے مہاراجہ کے ذوق کی داد دینے لیکن..... شاہی جادوگر سامری ان سب سے الگ ایک ٹک آنکھیں سیکیڑے رانی شکنتلا کو دیکھ کر گہری سوچ میں ڈبکیاں لگا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

شکنتلا اور مہاراجہ رام ناتھ کی شادی کو آج تیسرا روز تھا۔ پوری ریاست تابانہ میں اس بات کا اعلان کر دیا گیا کہ نئی رانی شکنتلا کو باقاعدہ مہارانی کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی رانی ماریہ کا احتجاج مسترد کر دیا گیا تھا۔ شاہی محل میں اب ہر طرف شکنتلا کی باتیں تھیں۔ ماریہ کو الگ حویلی میں منتقل کر دیا گیا اور راج محل میں مہاراجہ کے ساتھ اب صرف شکنتلا تھی۔ مہاراج اب اس پر مکمل طور پر فریفتہ ہو چکے تھے شکنتلا بھی ان کو سرشام سے دن چڑھے تک جلوۂ عروسی میں ہی رکھتی آج مہاراجہ نئی شادی کے بعد پہلی مرتبہ سرکاری کام کے لیے باقاعدہ دربار گئے تھے اور اس وقت شکنتلا کا کمرہ کنیزوں اور باندیوں سے بھرا پڑا تھا۔ سب ہی کنیزیں اور باندیاں اس کی قسمت پر رشک بلکہ حسد کر رہی تھیں۔ کیونکہ شکنتلا کی آمد کنیزوں ہی کی ماند ہوئی تھی لیکن چند ہی دنوں میں قسمت کی گھمن گھیری سے اب رانی بلکہ مہارانی بن کر حکومت کر رہی تھی۔ کوشیلیا جو شروع میں اسے بھی مغموم بنانے کا سوچ رہی تھی آج اس کا قرب حاصل کرنے کے جتن کر رہی تھی اور کنیزوں کو شکنتلا سے دور اور خود پاس کھڑے ہونے کی تگ و دو میں مصروف تھی۔ اس بات کو شکنتلا نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ کوشیلیا بات پر دوسری کنیزوں کو جھڑکتی اور دوسری کنیزیں ہم جانی تھیں۔ پھر شکنتلا نے دیکھا کہ ایک چودہ پندرہ سالہ کمسن معصوم کنیز کو کوشیلیا نے اس بری طرح ڈانٹ پلائی اور بے رحمی سے اس کے بال کھینچے کہ وہ بے چاری چیخ مار کے نیچے اتر کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے کوشیلیا کیوں ڈانٹ رہی ہو اس بے چاری کو۔" شکنتلا نے پوچھا تو کوشیلیا گڑبڑا گئی وہ سمجھی تھی کہ کنیزوں کے اس رش اور شور میں شکنتلا اس کی حرکت سے بے خبر ہے۔

"کچھ نہیں ملکہ عالیہ۔ کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی کوئی کام بگھاڑ بیٹھی اسے!" کوشیلیا نیچری سے بات بنانے کی کوشش میں بولی۔

"اس سے تو کس سے بات کر رہی ہے کوشیلیا؟ جو بات پوچھی ہے اس کا صحیح جواب کیوں نہیں دے رہی ہو!" شکنتلا نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کرتے ہوئے قدرے درشت لہجے میں کوشیلیا کو کہا تو وہ گھبرائی اور پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"مہارانی جی! دراصل محل کی سب کنیزیں اور باندیاں میری ماتحت ہیں ان کے امور کی نگرانی کرنا اور ان سے کام پرس کرنے کا اختیار بھی مجھے دیا گیا ہے اور میں ان کی نگران ہوں۔" کوشیلیا نے قدرے تحریر لہجے میں انگلی پر دوپٹا لپیٹتے اور دائیں بائیں ملتے ہوئے کہا۔ "آپ کو بھی راج محل کی ساری باتوں کا علم نہیں ہے نا آہستہ آہستہ پتا چل جائے گا۔"

"بکواس مت کرو کوشیلیا ہم پر طنز کرتی ہو۔" شکنتلا نے اپنی سوچ کے تحت ایک دم غصے کے انداز میں کہا تو تمام کنیزوں کے رنگ فق ہو گئے اور وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر مؤدب کھڑی ہو گئیں۔ کوشیلیا سٹپٹا کر رہ گئی! اس نے تو سوچا بھی تھا کہ مہاراجی یوں غصے میں آ جائیں گی۔

"کس نے تجھے بتایا تھا ان کا نگران ہے؟" شکنتلا اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"جی..... جی وہ..... مہارانی ماریہ نے جی۔ میں ان کی کنیز خاص بھی ہوں اور مہاراج رام ناتھ کی بھی ماتحت ہوں....." کوشیلیا نے حالات کروٹ لیتے دیکھ کر اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے قدرے خود اعتمادی اور فخریہ لہجے میں کہا تو مہارانی شکنتلا آپے سے ہی باہر ہو گئیں اور فوری طور پر پلنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئیں۔

"کوشیلیا....." شکنتلا مجھے سے گرجی۔

"جی مہارانی جی۔" کوشیلیا خوفزدہ ہو گئی تو شکنتلا نے اٹھایا ہاتھ کر کے اس کے منہ پر جمادیا تڑاخ کی آواز گونجی اور زور دار تھپڑ کوشیلیا کے بائیں گال کو سرخ کرتا چلا گیا تو اس کی سٹی گم ہو گئی۔ تمام کنیزیں پلنگ سے ہٹ کر نظریں جھکا کر کھڑی ہو گئیں۔

"تجھے جرأت کیسے ہوئی کمینی میرے سامنے کسی اور کو مہارانی کہنے کی۔ مہاراجہ رام ناتھ کی مہارانی اور ریاست تابانہ کی ملکہ صرف میں ہوں۔ تیری گستاخی کے پیش نظر تجھے ان کنیزوں کی سربراہی سے فارغ کیا جاتا ہے!"

"لڑکی دور آؤ....." شکنتلا نے سہمی ہوئی کم سن کنیز کو بلایا جسے کوشیلیا نے ڈانٹا اور اس کے بال کھینچے تھے۔ وہ فوراً آگے بڑھی اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" شکنتلا اپنی مسہری پر بیٹھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

"جی پریہ۔" وہ بدستور خوفزدہ تھی۔

"کب سے اس محل میں ہو؟"

"تقریباً چھ ماہ سے مہارانی جی۔"

"کہاں سے آئی تھی؟"

"جی نیلاب سے۔ وہاں سے آنے والے ایک سوداگر نے مجھے دربار میں پیش کیا تھا۔"

"وہ سوداگر تجھے کہاں سے لایا تھا؟"

"مہارانی جی جب سے ہوش سنبھالا اپنے آپ کو اسی سوداگر کی حویلی میں پایا تھا میری ماں بھی وہیں تھی۔ جسے سوداگر نے ایک دن کسی کے ہاتھ بیچ دیا۔ اور مجھے اپنے تجارتی قافلے کے ساتھ تابانہ لے آیا اور دربار میں پیش کر دیا۔" کنیز نے معلوم انداز میں آپ بیتی سنائی۔

"ہوں....." شکنتلا ہوں کو لمبا کر کے اپنی انگلی ٹھوڑی کے تل کے اوپر رکھ کر سوچنے کے انداز میں بولی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نئی کنیز ہو؟"

"جی ملکہ عالیہ۔" پریہ ادب سے بولی۔

"آج سے تم محل کی سب کنیزوں کی سربراہ ہو۔" شکنتلا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"جی.....؟" پریہ قدرے گھبراہٹ اور خوشگوار حیرت سے بولی۔ دیگر کنیزیں بھی رانی کا یہ حکم سن کر ششدر رہ گئیں۔

"میں اس قابل کہاں ملکہ عالیہ....."

"شکنتلا کا حکم ہے۔" شکنتلا نے تفاخر سے گردن اکڑا کر کہا۔

"جو حکم ملکہ عالیہ!" پریہ سر جھکا کر مسکنے لگی۔ اسے نئی ملکہ کے آتے ہی ایسی کایا پلٹنے کی اُمید نہ تھی وہ تو کنیزوں کی بھی باندی تھی اسے تو سب کے کام کرنے پڑتے تھے اور کوشیلیا کے ساتھ ساتھ دیگر پرانی اور گھاگ کنیزیں بھی اس پر دن میں کئی مرتبہ ہاتھ اٹھا دیتی تھیں۔ اف تک کرنے کی اس کی اس جرأت نہ تھی اور کہاں پلک جھپکنے میں وہ شاہی محل کی تینتکڑوں کنیزوں پر کنیز خاص بنا دی گئی تھی یعنی محل میں اب وہ شکنتلا کے بعد سب سے معزز ہو جائے گی! سب کنیزیں باندیاں اور خدام اس کی اطاعت کریں گے۔ یہ سوچ کر اور آنے والے لمحات کا تصور کر کے وہ خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔ کوشیلیا زندگی سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ وہ عرش سے فرش پر آ گری تھی۔ یہ ذلت اور تنزلی اس سے برداشت نہ ہو رہی تھی لیکن شکنتلا کے آگے وہ بے بس تھی۔ وہ ایک کنیز ہونے کے ناطے ملکہ کے اختیارات کی حد سے بخوبی واقف تھی۔

"کوشیلیا تُو نے تو بہن کی بے ہماری! آج مہاراجہ کے آنے پر ہم تمہاری خبر لیں گے۔ اور یہ تُو اچھی طرح جانتی ہے ہماری ذرا سی شکایت تمہارے لیے کتنی بڑی مصیبت بن سکتی ہے۔"

"مہارانی جی....." کوشیلیا شکنتلا کے قدموں میں گر پڑی..... "شما کر دیجیے۔ میری کیا مجال کہ آپ کی توہین کرنے کا سوچوں۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"غلط فہمی کی بنی کیا ہم بے وقوف ہیں کہ ہمیں غلط فہمی ہوگی....." شکنتلا نے جھنویں اچکائیں۔ کوشیلا اس وقت تھر تھر کانپ رہی تھی..... اسے پتا تھا کہ مہاراجہ اپنی دلہن کی خوشنودی کی خاطر اس کی گردن بھی اڑا سکتے ہیں۔ اس کی تو قسمت ہی خراب تھی۔ ادھر شکنتلا بھی یہی چاہتی تھی کہ کوشیلا کو اس حد تک خوفزدہ کر دیا جائے کہ وہ اور باقی کنیزیں اس سے اس طرح ڈریں جیسے کوئی کٹنی سے ڈرتا ہے۔

"ملکہ عالیہ....." کوشیلا اس کے قدموں سے لپٹتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کی باندی اور داسی ہوں۔ آپ کے قدموں کی دھول ہوں۔ صرف ایک بار..... شما کر دیں۔"

شکنتلا کی آنکھوں میں چمک گہری ہونے لگی..... اسے اب اس ماحول میں مزہ آنے لگا تھا۔ اپنی اہمیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ بالآخر اس نے احسان جتاتے ہوئے کہا۔

"آج پہلی اور آخری بار معاف کر رہی ہوں اور سب کی سب کان کھول کر سن لو میرے کسی حکم سے کسی نے ذرہ برابر بھی کوتاہی کرنے کی کوشش کی تو اس کو عبرت کا نشان بنا دوں گی..... جاؤ دفعان ہو جاؤ سب کی سب!" شکنتلا نے ہاتھ اٹھایا اور شاہانہ انداز میں باہر کی طرف اشارہ کر کے سب کنیزوں کو کہا! تو سب کی سب خراماں خراماں چلتی ہوئی کمرے سے باہر جانے لگیں۔

"پریہ تم ٹھہرو۔" شکنتلا نے پریہ کو آواز دے کر روک لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں پریہ کے علاوہ کوشیلا سمیت سب باہر جا چکی تھیں۔

اب کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ "سنو پریہ....." شکنتلا سکوت توڑتے ہوئے مخاطب ہوئی..... تجھے کنیزوں کی سردار بنانے کی وجہ یہ ہے کہ کوشیلا پہلی رانی ماریہ کی کنیز خاص ہے جسے میں شاہی محل سے نکلوا کر دوسری حویلی بھجوا چکی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں کی سب باتیں اسے پہنچائے۔ تم چونکہ یہاں نئی بھی ہو اور کم عمر بھی اس لیے تم کو منتخب کیا ہے مجھے وشواس ہے کہ تم میری آشاؤں پر پورا اترو گی۔"

"مہارانی جی۔" پریہ شکنتلا کے گورے گورے پیروں کو چھوتے ہوئے بولی۔

"آپ نے مجھ ہم ذات پر جو وشواس کیا ہے میں آپ کو اس میں پورا اتر کر دکھاؤں گی۔ یہاں کی کوئی خبر ہماری حویلی میں تو جا ہی نہ سکے گی۔ بلکہ وہاں آپ کے خلاف جو سازش ہوگی اس کو بھی بروقت آپ تک پہنچانے کا انتظام کروں گی۔"

"شاباش..... پریہ شاباش مجھے تم سے یہی امید ہے اور سنو....." شکنتلا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی پائنتی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پریہ جھجکتے ہوئے مسہری کی پائنتی پر ٹک گئی۔

"چند باتیں ذہن نشین کر لو..... پہلی بات یہ ہے کہ تمہیں سب کنیزوں اور غلاموں کی سربراہ بنایا گیا ہے۔ کسی سے نرمی نہ برتنا اور اپنا رویہ تبدیل کر کے یہاں سے نکلنے والی سب کو حاکمانہ رویہ سے مخاطب کرنا اور سب کو میرا فرمان اور اپنے حکم کے تابع کرنا آج سے سب تمہیں کنیز عالیہ کہیں گے۔"

"کر پا بے حضور آپ کی۔" پریہ اپنا معصوم سا چہرہ اوپر کر کے سر ہلا کر بولی۔ "کوشیلا کو ماریہ کی حویلی کبھی نہ جانے دینا۔ تا کہ یہ خبر بھی حویلی تک نہ پہنچ پائے اور کوشیلا کے یہاں سے باہر جاتے ہی سب کنیزوں کے درمیان خوب ڈر کر رہنا ہے..... اس وقت تک جب تک وہ تمہارے پاؤں نہ پڑ جائے بالکل لحاظ نہ کرنا۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ مہارانی جی، کوشیلا نے بھی میرے ساتھ کم ظلم نہیں کیے، مجھ سے پوچھنے سے لے کر رات گئے تک کام کروانا اور رات کو مجھے اس کا بدن دبانا پڑتا اور مار اور جھڑکیاں علیحدہ سننا پڑتیں اور مجھے ملنے والے تمام انعامات بھی بخششیں بھی مجھ سے یہی لے لیتی۔ آپ فکر نہ کریں میں بھی گن گن کر بدلا لوں گی۔" پریہ نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے اب جاؤ۔ جلدی میں مجھے ایک اہم کام جو تجھ سے میرے لیے کرنا ہوگا۔ بتاؤں گی۔" یہ کہہ کر شکنتلا نیم دراز ہو کر آنکھیں موندلیں اور پریہ دبے قدموں باہر نکل گئی۔ زیر لب فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ دائیں انگلی پر دوبارہ

ہوئے جب وہ شکنتلا کی شاہی خواب گاہ سے باہر نکلی تو اس کے من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ خواب گاہ میں داخل ہونے تک وہ بے بس معمولی باندی تھی جو کسی کے کسی حکم سے انکار نہ کر سکتی تھی۔ کنیزیں بھی اس سے معتبر تھیں۔ لیکن خواب گاہ سے نکلتے ہوئے اس کی زندگی میں انقلاب آ چکا تھا اب وہ تمام فرائض اور کاموں سے آزاد تھی۔ اب حکم چلانا اور عیش کرنا ہی اس کا مقدر تھے۔ حکم چلانے کا تو اسے پتا ہی نہ تھا۔ ہمیشہ حکم سن کر سر جھکائی آئی تھی۔ پریہ ابھی سوچوں میں غلطاں چلی جا رہی تھی کہ اسے دور برآمدے میں معمول کنیزیں کوشیلا کنیزوں کے جلوس میں کھڑی تیز تیز ہاتھ ہلا کر باتیں کرتی نظر آئی۔ شاید اپنی مسند خلافت بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پریہ کو مہارانی شکنتلا کی بات یاد آ گئی کہ یہاں سے باہر نکلتے ہی سب کنیزوں کے سامنے اس کی درگت بنا دینا..... یہ بات یاد آتے ہی پریہ مسکرانے لگی۔ مہارانی شکنتلا جب یہ چاہتی ہے تو اس کی خوشنودی ضرور حاصل کرنی چاہیے، خرامِ خراماں چلتی ہوئی کوشیلا اور اس کے ٹولے کے پاس پہنچ گئی۔ عام کنیزوں کو پریہ کے کنیز عالیہ بننے کا پتا چل چکا تھا یہی وجہ تھی کہ سب اس کے لیے راستہ چھوڑنے لگیں اور وہ زیرِ لب مسکراتی ہوئی کوشیلا تک پہنچ گئی آج پہلی بار وہ خود کوشیلا تک آئی تھی ورنہ ہمیشہ وہ اس سے کئی بلاتی تھی۔ کوشیلا کی جبیں عرق آلود ہونے لگی۔ پریہ نے تمام کنیزوں پر طائرانہ نگاہ دوڑائی تو سب نے سر جھکا دیے۔ پریہ کو ان کی آنکھوں میں اپنے لیے خوف واحترام کا جذبہ نظر آیا۔ پریہ کے دل میں عجیب طرح کی خوشیوں بھری لہریں اٹھنے لگیں۔ ان کنیزوں میں اپنی گھاگ اور چلتر بھی موجود تھیں جو بریہ کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتیں لیکن اس وقت بھیگی بلی بنی تھیں۔

"کوشیلا۔" پریہ آواز کو رعب دار بناتے ہوئے مخاطب ہوئی۔

"جج جی۔" کوشیلا بمشکل بول سکی۔

"سب کو لے کر اپنے کمرے میں آ جاؤ۔" پریہ نے زندگی میں پہلی بار کسی کو حکم دیا تو اسے خود بھی عجیب سا لگا۔ حکم دے کر وہ پلٹی اور کوشیلا کے کمرے کی طرف چل دی۔ یہ کمرہ پریہ کا دیکھا بھالا تھا۔ کمرے میں خوب صورت شیشوں سے مزین صندل کی خوشبودار لکڑی کا خوب صورت تخت پوش بچھا تھا۔ جہاں بیٹھ کر کوشیلا اپنی مجلس لگاتی اور تمام غلام کنیزیں فرش پر بیٹھتیں۔ پریہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی تخت پوش تک آئی اور پھر اس پر بیٹھ گئی۔ کوشیلا اور دیگر کنیزوں اور غلام کے ہمراہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ کوشیلا کا رنگ فق تھا۔ سب کنیزیں تخت سے ہٹ کر نیم دائرے میں کھڑی ہو گئیں۔ پریہ کے مسند پر بیٹھ جانے کا کہا۔ کوشیلا سمیت سب فرش پر بیٹھ گئے۔

"تم کھڑی رہو کوشیلا۔" پریہ اچانک اچانک کڑک دار آواز میں بولی تو کوشیلا گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بارے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اسی اثنا میں نرملا اور پونم جو آج تک کوشیلا کی دست راست تھیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر کے کھڑی ہو گئیں اور پریہ کے پیچھے دائیں بائیں کھڑی ہو کر مور چھل جھلنے لگیں، تا کہ اس کی خوشنودی حاصل کر کے اپنی حیثیت برقرار رکھ سکیں۔ پریہ نے دونوں پر اچٹتی نگاہ ڈالی اور پھر کوشیلا کی طرف متوجہ ہوئی، جو نرملا اور پونم کی آنکھیں بدلتے دیکھ کر متوحش ہو چکی تھی۔

"نیچے سے بیڈ نکالو....." پریہ نے پونم کو حکم دیا تو پونم نے جھک کر تخت پوش کی نچلی دراز سے وہ بلکدار اور خوب صورت بید نکال کر پریہ کے ہاتھ میں تھما دیا، جو کوشیلا جب پکڑ لی تو پھر کسی نہ کسی غلام یا کنیز کی کھال اُدھڑ نا لازمی امر ہوتا۔ پریہ نے وہ لمبے بید کھما کھما کر تخت پوش سے نیچے اُتر کر کوشیلا کی طرف بڑھنے لگی۔ کوشیلا کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ "دنی مہارانی شکنتلا سے آج تو نے جو بدتمیزی کی ہے مجھے میں اس کی سزا دوں گی۔ انہوں نے تجھ پر ترس کھایا تھا، لیکن میں نہیں کھاؤں گی۔" پریہ نے طنزیہ لہجے میں کہا اور زور سے گھما کر چھڑی کوشیلا کے بازو پر ماری تو وہ بلبلا اٹھی۔ اس کے بعد اس نے کوشیلا کو بید سے نہایت بیدردی سے پیٹنا شروع کر دیا۔ کوشیلا کی دردناک چیخیں گونجنے لگیں۔ کوشیلا بچاؤ کے لیے کمرے میں بھاگنے لگی، لیکن جس طرف جاتی، کنیزیں پھر دھکے دے کر اسے پریہ کے سامنے لا پھینکتیں اور پریہ پھر اِدھر اُدھر اس کی پٹائی کرنے لگتی۔ کوشیلا کے جسم پر جا بجا نیل پڑنا شروع ہو گئے۔ وہ بار بار بھاگتی گرتی اور پریہ کے آگے

ہاتھ جوڑتی، لیکن پریہ ہونٹوں سے مسکان بکھیرتی خاموشی کے ساتھ بید پوری قوت سے کوشلیا پر برساتی رہی۔ ایک ہاتھ تھک جاتا تو بید دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیتی..... خاصی درگت بنانے کے بعد پریہ نے بید پھینک دیا اور تخت پوش پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اس کا بھی سارا وجود پسینے پسینے تھا اور سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ زملا پھرتی سے بالکل نئے خوشبودار تولیہ سے پریہ کا پسینہ صاف کرنے لگی، جب کہ پونم کے اشارے پر دو اور کنیزیں آگے بڑھیں اور پریہ کو موربھل چلنے لگیں..... اتنے میں زملا نے انماس کے تازہ رس سے بھرا ٹھنڈا ٹھنڈا ایک بڑا سا جاندی کا کٹورہ پریہ کی طرف بڑھا دیا۔ کوشلیا سب کے درمیان عبرت کا نشان بنی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''یہ سزا مجھے مہارانی شکنتلا سے بدتمیزی کی وجہ سے دی گئی ہے اور جو سلوک تو میرے ساتھ کر رہی ہے، اس کا حساب میں بعد میں کروں گی۔ لے جاؤ اس کو باہر چلچلاتی دھوپ میں اسی حالت میں سورج ڈوبنے تک بھوکا پیاسا کھڑا رکھو..... اگر کسی نے اس کے ساتھ کوئی ہمدردی کرنے یا وفاداری نبھانے کی کوشش کی تو اُس کا اس سے بھی بُرا حشر کروں گی۔ شام کو اسی جگہ خصوصی اجلاس ہوگا۔ تمام کنیزوں کو بتا دو کہ کنیز عالیہ پریہ نے تمہیں طلب کیا ہے۔'' پریہ فخر سے گردن اکڑا کر بولی۔

☆.....☆

پریہ جو انتہائی معمولی باندی تھی۔ جس کا سارا دن محل کے کام کاج کرتے گزر جاتا۔ وہ کھانا کھانے اور پانی پینے کے لیے بھی اپنے گروہ کی بڑی کنیز کی اجازت کی محتاج تھی۔ شاہی محلوں اور امراء کی حویلیوں میں..... ایک حرم ہوتا تھا، جس میں چار درجے ہوتے تھے۔ سب سے نچلا درجہ باندی کا تھا، جو صفائی ستھرائی، کھانا پکانا..... کپڑے دھونا یا اس نوع کے دیگر کام کرتی، یعنی باندی درجہ چہارم کی کمی کمین کہلاتی۔ ان میں سات آٹھ سال سے لے کر بارہ، تیرہ سال کی عمر کی لڑکیاں اور وہ غلام عورتیں، جو جوانی کی حدود پھلانگ کر بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ جاتیں اور کسی دل کش مصرف کے قابل نہ رہ جاتیں، شامل ہوتیں۔ درجہ سوم میں لونڈی آتی تھی۔ یہ نوعمر خوب صورت لڑکیاں عیاش امراء یا شاہی افراد کے ''تصرف'' میں رہتیں اور آقا کے دوستوں کو بھی بطور تحفہ پیش ہو جاتیں۔ (اس کی متوازی اصطلاح میں لڑکوں کے لیے لونڈے کا لفظ استعمال ہوتا ہے) اس کے بعد درجہ دوم کی کنیز آتی ہے..... کنیز وہ عورتیں ہوتی تھیں جو اپنے آقا یا رئیس خاندان یا راجہ کی خاص منظورِ نظر ہوتیں۔ ان سے نہ تو مشقت لی جاتی اور نہ ہی دریغ استعمال کیا جاتا۔ یہ راجہ مہاراجہ یا حویلی کے امیر کی خاص رازدار ہوتیں اور صرف اس کے ذاتی استعمال میں ہوتیں۔ محل یا حویلی کے ہر حصے تک ان کی رسائی اور اثر و رسوخ ہوتا جب کہ باندیاں اور لونڈیاں محدود نقل و حرکت کر سکتیں..... اور ان کے مختلف گروہوں کی نگراں بھی مختلف کنیزیں ہی ہوتیں۔ وہ ہر وقت زرق برق لباسوں میں فارغ گھومتی رہتیں۔

درجہ اول میں وہ لڑکیاں آتی تھیں جو راجی ماؤں کے آقا کی ناجائز اولاد ہوتیں، یعنی راجہ ان کا باپ ہوتا، لیکن ان کی ماں رانی نہ ہوتی، بلکہ اس کی کنیز ہوتی..... یہ کوئی کہلاتیں..... ''گولی'' اپنے آقا کو باپ تو نہ کہہ سکتی تھیں، مگر ان کو رہنے کے لیے الگ حویلی یا کم از کم الگ کمرے دیے جاتے، خدمت کے لیے باندیاں بھی ملتیں، وظیفہ بھی مقرر ہوتا، کہیں آنے جانے کے لیے ''پالکی'' کی سہولت بھی حاصل ہوتی۔ ''گولی'' راج کماری کے انداز میں رہتی، لیکن نہ تو اسے کوئی بیلی آگے سے دیکھ سکتا..... اور نہ یہ کسی پر پیار بھری نظریں ڈال سکتیں۔ راجاؤں اور شاہی خاندانوں کی نظر میں یہ ناجائز ہوتیں، لہٰذا اونچے خاندان والے ان کا رشتہ نہ لیتے اور نیچ اور متوسط طبقے میں راجے اور امراء اپنی ناجائز بیٹی کا رشتہ بھی دینا اپنی توہین گردانتے، یوں ''گولیوں'' کی بھاری اکثریت جوانی کے ارمان دل میں لیے بڑھاپے کی دہلیز پھلانگ جاتیں۔ ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے حرم میں سیکڑوں غلام عورتیں تھیں، مگر ان میں کوئی لونڈی نہ تھی اور پریہ تو ابھی صرف چودہ سال کی دبلی پتلی سانولی رنگت سہمی سہمی ڈری ڈری چوتھے درجے کی مخلوق، یعنی معمولی باندی تھی، جو نچلے درجے کے تمام کام کرتی۔ پریہ براہِ راست کنیز خاص کوشلیا کی ذاتی خدمت گار تھی۔ کوشلیا رانی ماریہ کے جہیز میں آئی تھی اور ماریہ کی پالی ہوئی کنیز تھی، لہٰذا ماریہ نے اسے کنیز خاص بنا رکھا تھا۔

ماریہ کو بارہ سال گزر گئے تھے، یوں کوشلیا بھی گزشتہ بارہ سال سے محل کے اندر ہر باندی، لونڈی اور کنیز کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ کوشلیا خوب صورت، دراز قد، گندمی رنگت اور بھاری وجود کی حامل تھی۔ یہ انتہائی کینہ پرور اور ظالم عورت تھی۔ کئی بار معمولی خطا پر اس نے پریہ کو سخت سزائیں دی تھیں۔ پریہ کو کوشلیا کے چھوٹے موٹے کام کرنے والی باندی آج مقدر نے پہلی بار ہی کنیز کی رانی کے کمرے کے اندر تک بھی..... وہ بھی کوشلیا کے حکم سے، لیکن مقدر مقدر ہی ہوتا ہے.....

ایک باندی کی حیثیت سے شاہی قبیلہ عروسی میں داخل ہونے والی پریہ، جو کوشلیا کی آواز سن کر ہم جاتی اور اسے غصے میں دیکھ کر اس کی روح فنا ہو جاتی، کمرے سے باہر آئی تو کنیز خاص بن چکی تھی..... اور وہی کوشلیا جو محل کی سیڑھیوں کنیزوں کے لیے بلا کو (خانم) تھی..... اب جلتی دھوپ میں تپتے فرش پر ننھوں سے پَور بھوکی پیاسی کھڑی رو رہی تھی۔ یہ سب کچھ ایک گھنٹہ کے اندر ہو گیا تھا۔ پریہ کوشلیا والے کمرے پر قبضہ حاصل کر کے آرام دہ بستر پر لیٹی تھی..... مسہری کے چاروں کونوں پر کھڑی باندیاں اس کو موربھل جھل رہی تھیں۔ دو باندیاں اس کا جسم داب رہی تھیں۔ اونچی چھت والے خاصے کشادہ کمرے میں بے شمار کھڑکیاں اور روشن دان تھے، جن کے باریک ریشمی پردے ہوا سے سرسرا رہے تھے۔ پورا فرش دبیز قالین سے ڈھکا تھا۔ کشادہ اور ہوادار ہونے کے باعث یہاں گرمی کا احساس نہ تھا۔ ٹھنڈے مشروبات اور موسمی پھلوں سے پریہ دل بہلا رہی تھی اور اپنی قسمت پر ناز اں تھی..... نئی مہارانی شکنتلا پر اسے بے پناہ پیار آ رہا تھا، جس کے محل میں قدم رنجہ فرمانے ہی اس کے بھاگ جاگ اُٹھے تھے..... اور وہ کنیزیں جو ہیچ تک اس سے تحکمانہ اور ذلت آمیز انداز میں بات کرتی تھیں، اب اس کی خدمت گزاری کر رہی تھیں..... اور کھلی کھڑکیوں سے باہر وہ کچھ درجہ سخت کرکی میں جلتی کوشلیا بھی نظر آ رہی تھی، جو بری حالت میں خود اس کے حکم سے دھوپ میں گرم فرش پر بھوکی پیاسی کھڑی تھی۔ یہ خاصی دیر اسے دیکھتی رہی، پھر اس کو وہ بے شمار مناظر یاد آنے لگے جب وہ خود اسی طرح کھڑی ہوتی اور کوشلیا کمرے میں آرام فرما رہی یا خواری کنیزوں کے ساتھ ٹھکھلیاں نظر آ رہی ہوتی۔ یہ سوچ کر فرحت سے اس نے ہونٹ بھینچ لیے اور آنکھیں موند لیں۔ یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی..... زندگی میں پہلی بار بھرپور سکون سے سوئی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو شام ہونے والی تھی۔ وہ انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھی دیکھا تو کمرے کا وہی منظر تھا۔ وہی باندیاں اس کو موربھل جھل رہی تھیں۔ اسی طرح اس کا جسم دبایا جا رہا تھا۔ حالاں کہ کم از کم چھ گھنٹے گزر گئے تھے، لیکن کوشلیا کے ساتھ پریہ کا سلوک دیکھ کر شاید یہ سب بری طرح ڈر گئی تھیں۔ کوشلیا کا خیال آتے ہی پریہ نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو کوشلیا اسی جگہ اسی حالت میں کھڑکی تھی کہ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں..... آنکھوں میں وحشت نمایاں تھی..... وہ خوب صورت زلفیں جو جمع تھیں، نہایت بکھری تھیں، اب وہ آوارہ، بکھری اور گرد و غبار سے اَٹ چکی تھیں۔ قامت اور تمکنت سے اس کا بُرا حال تھا۔ تپتے فرش پر وہ ایک پاؤں اُٹھاتی، پھر اسے زمین پر رکھ کر دوسرا اٹھاتی۔ شاید سارا دن اسے ایسے کرتے ہی گزرا تھا..... پریہ اس کی حالت دیکھ کر مسکرائی اور اسے ایک عجیب طرح کی لذت محسوس ہونے لگی..... شاید اختیارات کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ پریہ نے جاگتے ہی پہلے کنیزیں اس کی دل جوئی اور خدمت گزاری میں مگن ہو گئیں۔ پریہ اُٹھ کر بیٹھ گئی تو ایک کنیز نے جھک کر ہولی اس کے پاؤں میں پہنائی..... ابھی وہ جوتے پہن ہی رہی تھی کہ ایک کنیز سوشیلا نے حاضر ہونے کی اجازت مانگی۔

''کنیز عالیہ'' سوشیلا سر جھکا کر بولی..... ''آپ کے لیے نئی پوشاکیں تیار ہو کر آ گئی ہیں۔ آپ اشنان کر لیجیے۔'' اور پریہ ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے گلابی رنگ کی نئی قیمتی ساڑھی پہن کر بیٹھ گئی۔ وہ کنیزیں اس کے سولہ سنگھار مکمل کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد کھانے کا دور چلا۔ اس دوران بھی کنیزیں اس کے بال سنوارتی رہیں۔ کھانے کے بعد پریہ قالین پر ٹہل قدمی کرنے لگی اور آنے والے وقت کے بارے میں منصوبے بنانے لگی..... آج وہ اپنے آپ کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا پورا وجود ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔ زندگی کا پہلا دن تھا جب نہ اسے کوئی کام بتانے والا تھا نہ جھڑکیوں اور مار کا خوف، نہ موسم کی شدت کا احساس..... بس طمانیت ہی طمانیت۔ اردگرد کنیزوں پر جب بھی نظر پڑتی، اس کی گردن فخر سے بلند ہونے لگتی..... وہ اپنے آپ کو ممتاز تصور کرنے لگتی۔ خاصی دیر ٹہل قدمی کرتے کرتے اچانک اسے ایک خیال اُبھرا کہ رام کو جب تمام کنیزیں اور غلام، جنہیں میں نے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے، آئیں تو سب پر اپنی ہمہ داری کا ایسا رعب

قائم کر دیا جائے کہ میری ہوا سے بھی سب ڈریں..... اور پھر وہ دل ہی دل میں فاتحہ ترتیب دینے لگی اور پھر نرملا، پونم اور سوشیلا کو بلا کر ہدایات دینے لگی۔

☆.....☆

محل کی تمام کنیزیں، باندیاں اور لونڈیاں پریہ کے کمرے کے باہر برآمدے میں جمع ہو چکی تھیں، جب کہ کشادہ کمرے کے اندر پریہ شیان دارمسہری پر نیم دراز تھی۔ گلابی ساڑھی اور غضب کے بناؤ سنگھار کی بدولت وہ اس وقت بڑی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ اردگرد چند کنیزیں ہاتھ میں جھاڑ لیے کھڑی تھیں۔ جب سے اب تک پریہ میں خاصا اعتماد آ چکا تھا۔ نرملا نامی کنیز دروازے میں کھڑی ہو گئی اور اس نے ایک کنیز کو پرآمدے سے اندر بھیج دیا۔ پریہ اسے جانتی تھی، وہ کومل تھی۔ اکثر یہ دونوں اٹھتی بیٹھتی باتیں کرتی رہتیں۔ کومل کو امید تھی کہ پریہ اس سے اچھی طرح ملے گی، لیکن پریہ آنکھوں میں اجنبیت لیے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر غرور کا تاثر چھایا رہا۔ کومل نرملا کی ہدایت کے مطابق آگے بڑھی اور پریہ کے پاؤں چھو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی، پھر اسی طرح ایک کے بعد ایک کنیزیں اندر آنے لگیں اور پریہ کے چرن چھو کر وفاداری کا خاموش اعلان کرنے لگیں۔ پریہ سب کو احساس برتری کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سب کنیزیں پریہ کے پاؤں چھو چھو کر کمرے کی دیواروں کے ساتھ کھڑی ہونے لگیں۔ جب سب اندر آ چکیں تو پریہ بیڈ سے اٹھنے لگی۔ پونم نے جھک کر خوب صورت جوتے اس کے پاؤں میں پہنائے اور پریہ کھڑی ہو گئی۔ ”کوشیلا کو پیش کیا جائے.....“ پریہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ چند ہی لمحات میں کوشیلا شکستہ حال، خوف زدہ انداز میں کمرے میں آ گئی اور پریہ کو سامنے پا کر مارے خوف کے رک گئی۔

”پدھارییے..... کنیز عالیہ پدھارییے!“ پریہ نے مسکرا کر طنز بھرے انداز میں کہا تو کوشیلا تھوڑا سا آگے سرک آئی اور پھر رک گئی۔ ”کیا حال ہے.....“ پریہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر پونم کی طرف دیکھ کر بولی۔ ذرا بیدلانا..... اس کی بات سن کر کوشیلا کا رنگ مزید زرد پڑ گیا۔ کنیز عالیہ کو شیلا نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”میں آپ کی باندی اور پیروں کی دھول ہوں..... دیا کر دیجیے۔“ اور پریہ جو بید ہاتھ میں پکڑ چکی تھی..... قدم قدم چلتی کوشیلا کے پاس آ گئی اور دائیں ہاتھ میں بید کو تھام کر ہولے ہولے کوشیلا کے منہ پر مارنے لگی۔ جس کی وجہ سے کوشیلا نے ہاتھ منہ کے آڑے کر لیے۔ ”میری باندی اور پیروں کی دھول تمہیں بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ کام میں خود کرا لوں گی.....“ بید کہتے ہوئے اس کے ہاتھ تیزی سے حرکت کرنے لگے اور کوشیلا پہلے سسکنے پھر رونے اور بالآخر چیخنے چلانے لگی اور پریہ مسکراہٹ سجائے اس کے جسم کے ہر حصے پر آزادانہ بید برسانے لگی..... کوشیلا نے پھر صبح والا رقص شروع کر دیا اور وہ ضربوں سے بچاؤ کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگی، لیکن اردگرد کی کنیزیں اسے پریہ کے قریب رہنے پر مجبور کر دیتیں۔ صبح کا تماشہ تو چند ایک کنیزوں نے ہی دیکھا تھا..... لیکن اس وقت تو محل کی چند کنیزوں کے سوا تقریباً تمام کنیزیں کوشیلا کا حشر دیکھ کر مارے خوف کے گنگ ہو گئیں..... وہ دھان پان سی پریہ کا یہ ظالمانہ انداز دیکھ کر حیران بھی تھیں، کوشیلا کی چیخ پکار سے چھت لرز رہی تھی، لیکن پریہ ایک ہی رفتار سے بید برسائے بغیر کہ اس کو کہاں کہاں لگ رہی ہے، بید برسائی رہی۔ کافی دیر بعد جب غالباً خود ہی تھک گئی تو آرٹیفک پر لیٹ گئی۔ کنیزیں اس کا پسینہ خشک اور حواس بحال کرنے لگیں..... جب کہ کوشیلا صبح سے اب تک تین مرتبہ پریہ کے ہاتھوں بری طرح زدوکوب ہونے کے بعد نشانہ ستم سے بھرے وجود کے ساتھ فرش پر پڑی سسک رہی تھی..... تمام کنیزوں نے اس کی ابتر حالت اور بھیانک انجام دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگانا شروع کر دیے۔

”آج صبح نئی مہارانی شکنتلا کے حکم پر کوشیلا کو کنیزوں کی سرداری سے برطرف کر دیا گیا ہے اور مجھے کنیز عالیہ بنا دیا گیا ہے..... تم سب پر لازم ہے کہ مجھے صرف کنیز عالیہ کہہ کر مخاطب کرو۔ یاد رکھنا کہ بھول کر بھی نام لینے والے کو میں سخت سزا دوں گی اور ایک بات سب کان کھول کر سن لو۔ میرے کسی حکم کی ذرہ برابر بھی حکم عدولی ہوئی تو کھال ادھیڑ دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے پریہ نے سب کی طرف نخوت بھری نظروں سے دیکھا..... اختیارات کے نشے کی چربی اس کی آنکھوں

پڑھ چکی تھی۔ ”اور اب تم سب یہاں سے دفع ہو جاؤ..... اور اس کو بھی لے جاؤ۔“ کوشیلا کی طرف اشارہ کر کے پریہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....☆

”میرا دادا جادوگر، میرا باپ جادوگر اور..... میں شاہی جادوگر..... میرا جادو کبھی جھوٹ نہیں بولتا، بلکہ سچ چڑھ کر بولتا ہے۔ میرا نام سامری جادوگر ہے۔ بڑے بڑے خاندانی جادوگر میرا نام سن کر راستہ بدل لیتے ہیں۔ بڑے بڑے نامور ساحر میرے آگے پانی بھرتے ہیں۔ میرا علم غلط نہیں ہو سکتا۔ ماریہ جی..... یہ لڑکی عام لڑکی نہیں ہے۔“

”پر تو تم کل سے آج تک سو مرتبہ کہہ چکے ہو سامری۔“ رانی ماریہ نے جھلا کر کہا۔ آخر کسی بھی تو بتاؤ اگر شکنتلا عام لڑکی نہیں تو پھر کون ہے؟“ ”کیا اسے اُجاڑنے کے لیے میرا ہی قہر آگے کم ملا تھا۔“ ماریہ روہانسی ہو کر بولی۔

”اسی بات پر تو میں حیران ہوں کہ میرا علم آگے کیوں نہیں بولتا..... اس سے آگے مجھے بادلوں کا غبار کیوں دکھائی دیتا ہے۔ البتہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ عام لڑکی نہیں۔ اگر کل تک مجھے اس کے بارے میں تفصیل معلوم نہ ہوئی تو پھر مجھے اپنے گرو استاد شداد جادوگر کی روح سے رابطہ کرنا پڑے گا!“

”کل کیوں..... آج کیوں نہیں رابطہ کر لیتے اس سے؟“

”رانی ماریہ جی آپ نہیں سمجھیں گی! یہ جادو کی نگری ہے۔ کالے علم کے کھیل ہیں! اس کی روایتیں بھی اپنی اس کی حکایتیں بھی اپنی۔ گرو استاد کی روح سے رات کو ہی رابطہ ہو سکے گا۔“

”لیکن تو تو میرا پرانا مہراز ہے اسامری..... تو مجھے بتا ہمیں اس محل میں سے کیسے نجات پاؤں جب سے شکنتلا نے شاہی محل میں قدم رکھا ہے۔ مہاراج مجھے اہمیت ہی نہیں دیتے، بلکہ مجھے محل سے علیحدہ کر کے اس حویلی میں بٹھا دیا گیا ہے۔ مجھے بتاؤ سامری، میں کیا کروں۔ تم میری سہیلکا کرو۔“

”چنتا نہ کریں ماریہ جی.....“ شاہی جادوگر سامری نے، جو مضبوط قد کاٹھ، بھرے بھرے چہرے، بڑی بڑی مونچھوں اور سفاچٹ کنجاسر، تو بے تحاشا سیاہ رنگت کا مالک تھا، نے اپنا منکے جیسا سر ہلا کر بولا..... ”میرا نام بھی سامری ہے۔ پرسوں دن کا سورج نئی ملکہ کے سارے رازوں سے پردہ اُٹھا کر ہی طلاع ہو گا۔“

”ویسے مجھے اندازے سے تو سامری، تیرے خیال میں یہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔“ رانی ضد کرنے لگی۔

”رانی جی..... ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا اور ابھی مہاراجہ اس کے خلاف کوئی لفظ سننا بھی نہیں چاہتے۔ میری مانو تو جلدی بازی نہ کرو۔ مجھے ابھی گرو شداد کی روح سے مشورہ کر لینے دو۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ شکنتلا کو میں شاہی محل سے باہر نکال کر رہوں گا، لیکن..... مجھے کیا فائدہ ہو گا ماریہ جی.....؟“ سامری ایک آنکھ بند کر کے ماریہ کے چہرے کو بغور دیکھ کر بولا.....

”تو فکر نہ کر سامری، جو تو چاہے گا تجھے وہی ملے گا۔“ ماریہ نے لاپروائی سے کہا۔

”کہہ تو جانا۔“ سامری نے معنی خیز انداز میں کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

ماریہ کے شاہی جادوگر سامری سے خاصے اچھے تعلقات تھے۔ سامری ماریہ پر بُری نظر بھی رکھتا تھا..... اور ماریہ کو اپنے حسن اور سامری کی نیت کا بخوبی علم تھا۔ سامری کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اس وقت سامری کو اپنی شاہی حویلی میں بلایا تھا۔ سامری کے جانے کے بعد مہارانی ماریہ اپنے سرخ اور سبز لبے بھاری تلے دار اس کو چھنے لگی۔ پھر ڈھیلی کر کے کھڑکی تک آئی اور باغ کا نظارہ کرنے لگی اور سوچنے لگی۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی، مہاراجہ رام ناتھ کو اس کے چڑچڑے مزاج اور سخت رویے کے باعث دوسری شادی کرنے کی جرأت نہ ہوئی تھی اور ماریہ اپنی شکی مزاج طبیعت کی بناء پر ہر وقت اور ہر جگہ رام ناتھ کی نگرانی رکھتی، تاہم کنیزوں اور باندیوں سے دل بہلانا شاہانہ روایت تھی، لہٰذا اس رسم میں وہ مداخلت نہ کر سکی کہ کنیز کو زرخرید ہوتی ہے، اس سے ماریہ کو کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

کوشیلا تمام کنیزوں، غلاموں اور باندیوں کی سربراہ تھی۔ اس نے ماریہ کے لیے جاسوسی کا نظام پھیلا دیا تھا۔ اسی وجہ سے مہاراجہ کی ہر حرکت کا ماریہ کو پل بھر میں پتا چل جاتا۔ شکنتلا اور دیگر دیہاتیوں کی گرفتاری کا بھی ماریہ کو مہاراجہ کے محل

پہنچنے سے پہلے ہی پتا چل گیا تھا اور شگفتلا کی مہارانی کی کنیز بننے کی خواہش کا بھی علم ہو گیا تھا، اسی بناء پر ماریہ نے کوئی قدم نہ اٹھایا تھا، لیکن نہ معلوم شگفتلا نے راتوں رات مہارانی پر کیا جادو کیا کہ انہوں نے دوسرے ہی دن شگفتلا سے نہ صرف شادی کر لی، بلکہ ماریہ کو شاہی محل سے دوسری حویلی منتقل کر دیا۔ ماریہ بہت روئی پیٹی، خودکشی کی بھی دھمکی دی، لیکن رام نا تھا کا فیصلہ تبدیل نہ ہوا اور انہوں نے شگفتلا کو مہارانی قرار دے دیا۔

یہ سب باتیں اب ماریہ کو مبہم نہیں ہو رہی تھیں۔ اس نے سامری سے مدد طلب کی تو اس نے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا کہ اس کا لالچ بھی شگفتلا کے ماضی میں جھانکنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اب سامری اپنے استاد سے مدد لینے کا کہہ کر گیا تھا، آج صبح سے شاہی محل سے اس کی جاسوس کنیزوں نے کوئی خبر بھی نہ پہنچائی تھی۔ کوشیلیا..... کوشیلیا کا خیال آتے ہی ماریہ اچانک چونک پڑی۔ آج صبح سے کوشیلیا نہ آئی تھی۔ اس طرح تو کبھی نہیں ہوا۔ کوشیلیا تو ایک عرصے سے ہر روز صبح اسے محل کے تمام واقعات آ کر بتاتی تھی، لیکن آج وہ غائب تھی۔ کوشیلیا کیوں نہیں آئی..... کہیں شگفتلا کو پتا تو نہیں چل گیا کہ کوشیلیا مہارانی کی جاسوسہ ہے؟ یہ خیال آتے ہی ماریہ نے زور سے تالی بجائی، فوراً ہی پہرے دار غلام اندر داخل ہوا..... اور جھک کر بولا "کیا حکم ہے مہارانی؟" اور مؤدب کھڑا ہو گیا اور سوالیہ نظروں سے مہارانی ماریہ کو دیکھنے لگا۔

"سادھنا کنیز کو شاہی محل روانہ کر دو اور کہو کہ کوشیلیا کو بلا لائے۔"

☆.....☆

"پریہ کی بچی آج بڑی بن ٹھن کر کھڑی ہے۔" سادھنا نے پیچھے سے آ کر ایک زوردار چپت پریہ کے سر پر جمائی..... "کہاں کے ارادے ہیں؟" سادھنا دوڑی ہوئی آئی تھی اور چپ جماتے وقت توازن نہ رکھ سکی اور پریہ کے اوپر اس زور سے گری کہ دونوں ہی دھڑام سے گھاس کے اوپر آ گریں۔ وہ پریہ کی قریبی سہیلی تھی۔ دونوں فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئیں، مگر پریہ نے اٹھتے ہی ایک زوردار طمانچہ سادھنا کے منہ پر رسید کیا اور دھاڑ کر بولی.....

"الو کی پٹھی..... تجھے کنیز عالیہ سے بات کرنے کی تمیز نہیں؟"

"اوہ....." سادھنا اپنا ہاتھ گال پر رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پریہ کو دیکھنے لگی۔ پونم اور کملا فوراً آگے بڑھ کر پریہ کی ساڑھی سے گرد جھاڑنے اور سلیوٹیں درست کرنے لگیں۔ یہ منظر سادھنا کو حواس باختہ کر دینے کے لیے کافی تھا کہ ایک ماہ پہلے آنے والی محل کی عام، عامی باندی کا لباس اس سے کہیں زیادہ معتبر کنیز کی نہایت فراں برداری سے درست کر رہی تھیں اور لباس درست کرنے کے بعد ہاتھ باندھ کر مؤدبانہ انداز میں نگاہیں جھکا کر کھڑی ہو گئیں۔

"کس کام سے آئی ہو؟" پریہ اپنے بالوں کی خوب صورت پونیوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ سادھنا کو یوں لگ رہا تھا جیسے پریہ اسے پہچانتی ہی نہ ہو۔

"کوشیلیا جی کو بلانے آئی ہوں۔" سادھنا قدرے خوف زدہ ہو کر بولی۔ وہ ابھی تک صورتحال کو پوری طرح سمجھ نہ پائی تھی۔

"کوشیلیا جی....." پریہ آنکھیں مٹکا کر طنزیہ انداز میں سادھنا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے مخاطب ہوئی۔

"کس نے بلایا ہے اسے؟" پریہ بدستور سادھنا کو چڑ کر رہی تھی۔

"جی..... وہ..... بی وہ....." سادھنا یہ نہ کہہ سکی کہ اسے رانی ماریہ نے بلا بھیجا ہے۔

"سیدھی طرح جواب دو اور پونم اس کو بتاؤ کہ ہم کون ہیں اور کوشیلیا کی کیا وقعت ہے..... اور پھر اسے ذرا میرے کمرے میں لے آؤ۔" یہ کہہ کر چوٹیوں کو ہاتھ کے جھٹکے سے پیچھے پھینکتی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔

"کوشیلیا جی کہاں ہیں؟" سادھنا گھٹے گھٹے لہجے میں کملا اور پونم سے مخاطب ہوئی۔

"پریہ اب کنیز خاص ہیں، سادھنا اور کوشیلیا کی حیثیت اب صرف ادنیٰ باندی کی سی ہے۔"

"یہ کیسے ہوا.....؟" سادھنا حیرت سے بولی.....

"پریہ نہایت معمولی اور بے حیثیت باندی تھی اور اکثر اوقات کوشیلیا کے ستم کا نشانہ بنتی رہتی تھی۔"

"یہ ستم کا نشانہ ہی کنیز عالیہ بننے کا بہانہ بن گیا ہے۔" کملا سادھنا کو سمجھانے کے انداز میں بولی۔

"نئی مہارانی شگفتلا نے آتے ہی کوشیلیا کی جگہ پریہ کو کنیز خاص بنا کر کنیز عالیہ کا خطاب دے دیا ہے اور اب تو سب کنیزوں، باندیوں اور غلاموں کو مہارانی کی طرف سے فرمان جاری کر دیا گیا ہے کہ پریہ کو نام سے نہ بلایا جائے، بلکہ پورے احترام سے کنیز عالیہ کہا جائے اور غلطی سے بھی نام پکارنے والے کو کڑی سزا دینے کا پریہ کو پورا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔"

"حیرت ہے۔" سادھنا منہ میں انگلی دبا کر بولی..... "کل صبح تک تو یہ ڈری ڈری سہمی سہمی سی رہتی تھی اور آج دیکھو جیسے مہارانی یہی ہے۔"

"ششش خاموش۔" پونم ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولی..... "ایسی بات منہ سے نہ نکالنا، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ تم تو کل سے آج کی بات کر رہی ہو۔ یہ تو کل جس وقت شگفتلا جی نے اسے کنیز عالیہ کا درجہ دیا..... تب سے ہی شگفتلا جی کے کمرے سے باہر آتے ہی اس کے تیور دیکھنے والے تھے۔" پھر انہوں نے مصر پھسر کے انداز میں کوشیلیا کی درگت بنانے کا قصہ سنا ڈالا۔

"یہ تو بہت ظالم نکلی ہے پونم....." سادھنا لرز کر بولی..... اب مجھے کیوں اپنے کمرے میں بلا رہی ہے؟"

"کیا پتا.....؟" کملا آنکھیں مٹکا کر بولی.....

"ہو سکتا ہے تم پر اپنی دہشت قائم کرنے کے لیے تمہیں بھی سزا دینی ہو۔"

"نہیں....." سادھنا کا رنگ اڑ گیا۔ "میں یہیں سے ماریہ رانی کی حویلی میں لوٹ جاؤں گی۔"

"یہ وہاں سے بھی تمہیں شگفتلا سے بہتر بنوا لے گی۔ مہارانی ماریہ کی بجائے شگفتلا کی بات مانیں گے۔"

"نہیں نہیں، میں وہیں جاؤں گی۔ میں پریہ کے کمرے میں ہرگز نہ جاؤں گی۔ مجھے حویلی جانے دو۔" سادھنا واپس مڑی تو پونم اور کملا راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں اور کملا بولی۔

"دیکھو سادھنا ہمیں تم سے ہمدردی ضرور ہے، لیکن اگر ہم تمہیں پریہ جی کے پاس لے نہ گئیں..... تو ہمیں پریہ جی سے کون بچائے گا؟ چلو سیدھی طرح کنیز عالیہ کے پاس۔" پونم تیور بدل کر سخت لہجے میں بولی اور پھر کملا اور پونم نے دونوں بازوؤں سے سادھنا کو پکڑا اور کنیز خاص پریہ کے کمرے کی طرف لے چلیں۔ سادھنا مارے خوف کے گنگ ہو گئی۔

پریہ نے دائیں ہاتھ میں موٹا بید پکڑ رکھا تھا، جسے وہ بائیں ہاتھ پر ہولے ہولے مار رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جلتے انگل رہی تھیں۔

"سچ سچ بتاؤ۔ ماریہ کی حویلی سے یہاں کس کا رن آئی ہو؟ پریہ نے بید ٹھوڑی کے نیچے کے نیچے رکھ کر سادھنا کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے کہا۔ سادھنا سے کوئی جواب نہیں بن پڑا اور وہ چپ چاپ نگر نگر پریہ کو تکنے لگی۔ خوف اور پریشانی سے اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ سادھنا سے کوئی جواب نہ پا کر پریہ نے زور سے بید اس کے شانے پر دے مارا.....

"اُف....." وہ کسمسائی۔

"بولو..... ورنہ کھال اُدھیڑ دوں گی۔" پریہ ایک دفعہ پھر بید زور سے سادھنا کے دوسرے بازو پر مار کر بولی۔ سادھنا دونوں ہاتھ اپنے شانوں پر رکھ کر سسکنے لگی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ "مجھے آنسو نہیں جواب چاہیے....." پریہ ساڑھی کے پلو کو سنبھال کر بولی۔

"م..... م..... مجھے..... میں....." سادھنا کے ہونٹ کانپنے لگے۔

"تو اس طرح نہیں مانے گی....." پریہ نے ایک کہ سادھنا کے کھلے بال اپنی مٹھی میں زور سے مروڑ کر پکڑ لیے۔ سادھنا کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

"بتاتی ہوں..... کنیز عالیہ..... بتاتی ہوں..... بھگوان کے لیے میرے بال چھوڑ دیں۔"

"جلدی بتاؤ کیسی..... کس نیت سے یہاں آئی ہو اور کس نے تمہیں بھیجا ہے۔" پریہ نے مٹھی پر لپٹے بالوں کو زوردار جھٹکا دے کر کہا۔ تمام کنیزیں پیچھے ہٹ کر سر جھکا کر کھڑی تھیں..... سادھنا باقاعدہ کانپ رہی تھی۔

"مجھے مہارانی ماریہ نے بھیجا تھا..... کہ کوشیلیا کا پتا کر کے آؤ کہ وہ صبح سے کیوں نہیں آئی۔"

"اچھا..... تو....." پریہ نے اس کے بال چھوڑ کر اپنی ساڑھی درست کرتے ہوئے کوشیلیا پر نظریں جما کر کہا.....

"کوشیلیا..... ماریہ کی جاسوس ہے اور تو بھی ماریہ کی جاسوسی کرنے آئی ہے۔ کملا..... پونم۔ ان دونوں کو مہارانی جی کے کمرے میں لے آؤ اور سنو، پہلے تسلی کر لینا کہ کمرے میں مہارانجہ یا کوئی اور نہ ہو۔" یہ کہہ کر پریہ خود کمرے سے نکل کر شکنتلا کے کمرے کی طرف چل دی۔ کوشیلیا اور ساودھنا بھی اس کے پیچھے پیچھے مردہ قدموں سے چلنے لگیں۔ پونم اور کملا ان کے پیچھے مستعد تھیں۔ شکنتلا اپنی خواب گاہ میں موجود تھی۔ شاہانہ لباس اور بناؤ سنگھار کے ساتھ شراب کا برتن ہاتھ میں پکڑے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔ وہ کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ کمرے کے باہر غلام پہریدار تھے اور دو کنیزیں کسی بھی حکم کی تعمیل کے لیے موجود تھیں۔ پریہ کو دیکھ کر پہریداروں نے فوراً راستہ دے دیا۔ دروازے پر رُک کر پریہ نے آواز دی.....

"ملکہ عالیہ پریہ حاضر ہو سکتی ہے۔"

"آ ذرپریہ آ جاؤ....." اور پریہ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئی اور جھک کر شکنتلا کو آداب کیا۔

"کیسی ہو میری جان!" شکنتلا مسکراتے ہوئے بولی۔ "کنیز خاص کا عہدہ کیسا لگ رہا ہے؟ کچھ تمہارا احترام بھی غلام اور کنیزیں کرتی ہیں یا نچی سمجھ کر مذاق ہی اُڑاتی ہیں۔"

"آپ کے ہوتے ہوئے..... کس کی مجال جو احترام نہ کرے۔ بس آپ کی کرپا ہونی چاہیے، پریہ اگر سو جانیں بھی ملکہ پر قربان کر دے تو اس احسان کا بدلہ نہ اتار سکے گی۔"

"کہو کیسے آنا ہوا....." شکنتلا صوفے پر بیٹھ کر مشروب کا ہلکا سا گھونٹ لے کر آب خورہ قریب کھڑی کنیز کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"پریہ کی جان آپ پر قربان..... ملکہ عالیہ..... پہلی رانی ماریہ کی جاسوسہ کو گرفتار کر لائی ہوں۔"

"بہت خوب....." شکنتلا مسرت سے بولی۔ "جلدی سے پیش کرو، ہم بھی تو اس کا دیدار کرنے کا شرف حاصل کریں۔" پریہ نے اپنا بغل میں دبے کرتال بجائی..... تو پونم اور کملا نے ساودھنا اور کوشیلیا کو اندر دھکیل دیا۔ "جہاں پناہ! یہ ساودھنا ہے جو کوشیلیا کو تلاش کرتے ہوئے ماریہ کے حکم پر یہاں تک آئی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا....." ملکہ عالیہ شکنتلا بائیں ہاتھ سے زلفوں کو درست اور دائیں ہاتھ سے مشروب کا چھوٹا سا گھونٹ لے کر بولی۔ "کہ ہمارا اندازہ درست تھا کہ ماریہ نے یہاں ضرور اپنی جاسوس تعظیم کا جال بچھایا ہوا ہے۔"

"جی ملکہ عالیہ..... بالکل ایسا ہی ہے۔" پریہ مؤدب انداز سے بولی۔

"ان کی حالت بتا رہی ہے کہ تم نے کچھ تو تفتیش ضرور کی ہے۔" شکنتلا ساودھنا کی حالت دیکھ کر مسکرائی۔

"جی ملکہ عالیہ۔" پریہ زمین پر بیٹھ کر شکنتلا کے پاؤں کو ہاتھوں سے چھو کر بولی۔

"یہ بتاؤ کہ ان دونوں نے کوئی انکشاف بھی کیا ہے یا نہیں؟"

"نہیں ملکہ عالیہ۔ سوائے اس کے کہ یہ ساودھنا رانی ماریہ کے کہنے پر کوشیلیا کو بلانے آئی تھی اور کوشیلیا ہر روز صبح رانی ماریہ کو پورے محل کی خبر دیتی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مہارانجہ رام ناتھ تمام دن کیا کرتے ہیں، ان کی تمام مصروفیات کا علم رانی کو ہوتا ہوگا۔" شکنتلا پُرسوچ لہجے میں اپنے آپ سے مخاطب ہوئی اور پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "ہو نہ ہو پریہ ان دونوں کے علاوہ بھی بہت سی کنیزیں اور غلام رانی کے لیے جاسوسی کرتے ہوں گے اور کچھ کی نشاندہی یہ دونوں ضرور کریں گی۔ پریہ ان کی کھال اُتار دو یا بڈیاں توڑ دو..... بہر حال کل صبح تک تمام جاسوس ہمارے حضور پیش کیے جائیں۔" ملکہ شکنتلا نے تالی بجائی تو پریہ کے پیچھے کھڑی پونم اور کملا فوراً اندر آ گئیں۔

"ان دونوں کو لے جا کر کال کوٹھڑی میں بند کر دو اور سنو ہاتھ اور پاؤں بھی باندھ دینا۔ فوراً ہی پونم اور کملا نے

اور ساودھنا کو بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی لے گئیں۔

"دیکھ پریہ..... پورے محل میں ایک تجھے ہی نے چنا ہے، تو میری کنیز ہی نہیں بلکہ آج سے میری رازداں بھی ہے۔ میرے بعد سب سے زیادہ بھیدیں اس محل میں تمہیں پراپت ہوں گی۔ کل تک تو محض ایک ہدایتی ہیں..... جس کی ذمے داری کام کرنا بڑی کنیزوں کی خدمت کرنا تھا۔ پرتوتاب تو بیگموں کنیزوں کے لیے کنیز عالیہ ہے، تو تمہاری عمر بہت تھوڑی ہے اور دیکھنے میں بھی تو زیادہ صحت مند نہیں، لیکن پریہ اچھی خوراک اور اچھا لباس تمہاری حیثیت بدل دیں گے۔ اختیارات کا نشہ تجھے اپنی عمر سے زیادہ اور جسمانی طور پر مضبوط کنیزوں اور غلاموں پر بھاری کر دے گا اور یہ سب کچھ تجھے میرے کارن حاصل ہو رہا ہے۔"

"مہارانی جی..... میں آپ پر قربان۔" پریہ نے شکنتلا کے گورے ہاتھ چوم کر کہا۔ "آج میں جو کچھ بھی ہوں صرف آپ کی وجہ سے ہوں۔ آپ چاہیں تو ابھی میری حیثیت نالی کے کیڑے جیسی ہو جائے۔"

"بس یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا پریہ۔ میری حیثیت اور اپنی اوقات کبھی نہ بھولنا، اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔"

"مہارانی جی! میں ہمیشہ آپ کی داسی رہوں گی۔ جو خدمت بھی آپ مجھے سونپیں گی، اس کو پورا کرنا میرا فرض ہے۔ آپ کے آنے سے ہی تو مجھے جینے کا سلیقہ آیا ہے۔"

"پریہ آنے والا وقت شکنتلا کی مٹھی میں ہوگا۔ دولت اور طاقت میرے غلام ہوں گے اور اگر تُو میرا ساتھ دے گی..... تو ساری زندگی پریشن گزارے گی، بس اپنے دل کو سخت اور ظالم بنانا ہو....."

"مہارانی! وہ تو میں نے ایک دن میں ہی اپنے آپ کو ظلم کرنے کا عادی بنا لیا ہے۔ کل کوشیلیا کو جی بھر کر بید کے ساتھ مارا اور اس کو بھوکا پیاسا رکھا ہے خون میں نہلا دیا اور میرے دل میں رحم کی کوئی لہر نہیں آئی۔"

"یہ تو بہت عام سی بات ہے پریہ۔ جلد ہی مجھے کسی کا خون کرنے کا کہوں گی اور تو فکر نہ کر، کوئی تیری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے گا..... بس تیرا کام صرف یہ ہے کہ چند جاسوس تیار کرو جو ہمیں تمام وزیروں اور دربار کے اعلیٰ عہدیداروں کے مکمل تاریخ جغرافیہ سے آگاہ کریں۔

"یہ کام میں آج سے ہی شروع کر دوں گی آپ اوش چنانہ کریں۔"

"اب تم سدھارو پریہ اور کل صبح میرے پاس آنا۔"

"لیکن..... مہارانی جی..... آپ نے وہ راز تو مجھے بتایا ہی نہیں؟"

"ہوں....." شکنتلا سوچ میں ڈوب گئی۔

"اگر ابھی نہیں پریہ، ابھی تمہارا من کچا ہے، شاید تم یہ بات ہضم نہ کر پاؤ۔"

"نہیں مہارانی جی..... آپ اپنی داسی پر مکمل وشواس کر سکتی ہیں۔"

"پریہ....." شکنتلا اُٹھ کر بیٹھ گئی اور قدرے غصے سے بولی۔ "بحث مت کیا کرو میرے ساتھ....." اور پریہ کانپ کر رہ گئی۔

"ناراض نہ ہوں..... پریہ آپ کی ادنیٰ داسی ہے۔ آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔ شما کر دیجیے....." اور شکنتلا فخر سے مسکرانے لگی اور بولی "آئندہ احتیاط کرنا اور ہاں کوشیلیا اور ساودھنا کے ساتھ کیا سلوک کرو گی؟"

"مہارانی جی! آج سے ان کو بھوکا پیاسا رکھ کر پوچھنے کی کوشش کروں گی کہ مزید ان لوگوں کے نام بتائیں جو ماریہ کے لیے کام کرتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک لیکن اگر بتانے میں پس وپیش کریں تو کوڑوں سے ان کی کھال جسم سے الگ کر دو، ہم کل صبح تک تمام جاسوس گرفتار اپنے حضور دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"پرنتو مہارانی جی! ایک اور بھول پراپت کر دیجیے۔"

"بولو بولو....."

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی تیسری قسط ماہ فروری میں ملاحظہ کیجیے)

پہلا شعلہ

کالک

ایڈیسن ادریس مسیح

رات کی کالک، دن کے اُجالوں میں نور بکھیرتی، قصے کہانیوں میں ڈھل جاتی ہے

ایڈیسن کے مشاق قلم سے نکلا شعلہ

رات پہلے پہر میں تھی۔ دن بھر رنگوں، روشنیوں میں ڈوبا شہر اب چُپ کی گہری چادر اوڑھے تاریکیوں کی اتھاہ میں جا پڑا تھا۔ ڈرا دور پہلے تک سڑک پر لگی بتیاں روشن تھیں تو گاڑھی پیلی روشنی میں منظر کے نقوش ذرا واضح تھے، پھر بجلی بند ہوگئی تو سب کچھ جیسے گم ہوگیا۔ سڑکیں، عمارتیں، چرند پرند، آدمی، پیڑ پودے سب پر جیسے کوئی کالک مل گیا ہو۔ آسمان گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کا کوئی بھولا بھٹکا جھونکا گھنے درختوں کی شاخوں میں رستہ ڈھونڈتا تو سرسراتے پتوں کی آواز دور تک سنی جاتی تھی۔

اچانک رات کا کچھ حصہ کٹ کر جیسے چلنے لگا۔ تاریکی کے رینگتے قدموں کی چاپ نوحہ کناں ہوئی۔ دور افق پر اونگھتے چاند نے سیاہ بادلوں کی بکل سے سر نکال کر دیکھا، کالی چادر میں مستور کوئی عورت تھی۔ لرزتے ہاتھوں میں پوٹلی سی تھامے، جس کے تھم تھم کر بڑھتے قدم اس جھولے کے پاس آ کر ہانپنے لگے تھے، جس پر چُپ رہو تھا۔

''مُنّی نہ کریں جھولے میں ڈال دیں''

پوٹلی رات کے حوالے کر کے وہ عورت تیزی سے پلٹ گئی۔ نومولود کسمسایا اور پھر رونے لگا۔ عورت کے قدموں میں تیزی آ گئی اور ہواؤں میں بھی.....

پیپل کی ایک شاخ ٹوٹ کر لٹک گئی اور قریب ہی ایک کتیا چاند کی طرف منہ کر کے رونے لگی۔ کتیا کی منحوس آوازیں سن کر چوکیدار ہڑبڑا کر نیند سے جاگا اور پھر دوبارہ آنکھیں بند کر کے ایک موٹی سی گالی بکی اور سر دائیں شانے پر لڑھکا دیا۔

تیز ہوا میں تیرتا بادل کا ایک ٹکڑا چاند کے اوپر آن ٹھہرا..... تاریک رات پھر بیتنے لگی۔

☆.....☆

پان کے بند کھوکھے سے ذرا آگے سرخ رنگ سا جھلملاتا تھا اور سانس روک دینے والی تیز مہک کے ساتھ دھیمے سُروں میں کوئی شوخ سا نغمہ گنگناہٹ سے ذرا تیز آواز میں خاموشی کے پردے چاک کر رہا تھا۔

موٹر سائیکل روشنی پھیلاتی۔ سرخ پوش نے سیاہ سڑک پر پیک پھینکی اور ٹن کر کھڑی ہوگئی۔ روشنی کے تعاقب میں پھٹ پھٹ کرتی موٹر سائیکل پر بیٹھے نوجوان نے اسے دیکھ کر رفتار کم کر دی۔ سرخی سے گتھرے ہونٹ مسکرائے اور لمبے گلابی ناخنوں والے ہاتھ فضا میں لہرا کر رکنے کا اشارہ کرنے لگے۔

نوجوان نے ہیڈ لائٹ کی روشنی میں دیکھا، تیز رنگوں کے میک اپ تلے نقوش قبول عام، مگر جسم تو بہ شکن تھا۔

موٹر سائیکل رک گئی۔ سرخ پوش اک ادائے خاص سے بال لہرا کر ہونٹ چوسنے لگی۔

نوجوان کا دل بری طرح دھڑکا اور موٹر سائیکل چل پڑی۔ چمکتا سرخ رنگ اب ترنّاٹے سے سیاہ سڑک پر پسلتی موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر مچلتا تھا۔

محجوبیں فضا تیز سانس روک دینے والی خوشبو سے مہکا اور بوجھل ہوگئی تھی۔

☆.....☆

چاپ قدموں میں دبائے وہ صحن میں بچھے تخت کے پاس آ ٹھہرا۔ بڑے بڑے پھولوں والی سرخ چادر کے نیچے گٹھری بنا لیٹا وجود مرد کا تھا۔ اس کا انداز اسے نیچے لٹی مردانہ چپیل سے ہوا۔

چند ثانیے کھڑے اس بے حرکت وجود کو دیکھا کیے، پھر اس نے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

کمرے میں ترتیب سے تین چارپائیاں بچھی تھیں۔ دیوار کے ساتھ بچھی چارپائی پر بڑھیا نیند میں بڑبڑا رہی تھی۔ اس کے بعد والی چارپائی پر ایک ادھیڑ عمر عورت گردن تک کھیس اوڑھے منہ کھولے پڑی تھی۔ پہلو میں آٹھ، نو برس کا لڑکا محو استراحت تھا، جس کی ایک ٹانگ چارپائی سے نیچے لٹک رہی تھی۔ آخری چارپائی پر دو نوجوان لڑکیاں ایک دوسرے میں اُلجھی پڑی سو رہی تھیں۔ دن بھر کپڑے کے چاک پکڑ پکڑ کر چلنے والی پوں بے سُدھ پڑی تھیں کہ بازو کی ادھڑی سلائی سے بغل کے بال جھانک رہے تھے۔

کمرے میں کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ اس کے مایوس قدموں نے دوسرے کمرے کی راہ ٹٹولی، مگر اس کے دروازے پر موٹا سا تالا لگا تھا، جس کی چابی یقیناً ادھیڑ عمر عورت کے تکیے تلے تھی یا پھر چولی میں.....

وہ واپس پلٹا اور بے آواز قدموں سے صحن پار کر گیا۔ منڈ پر پر ہاتھ جما کر اس نے گلی میں جھانکا۔ تاریک گلی سنسان پڑی تھی۔ اس نے ایک آخری نظر سرخ چادر کے نیچے وجود کی بے خبری کو تاکا، جبھی اس کی نظر کونے میں بندھے بکری کے بچے پر پڑی۔

ڈھائے میں تھپے اس کے ہونٹوں پر دبیز مسکراہٹ رینگ گئی اور وہ بھک گر بکری کے بچے کی رسی کھولنے لگا۔

☆.....☆

رکشا قبرستان کی ٹوٹی دیوار کے پاس رُک گیا تھا۔ مکروہ چہرے والی خبیث بڑھیا نے سر نکال کر ادھر اُدھر دیکھا اور اندر اُتر گئی۔ جھاڑ جھنکاڑ سے اَٹی پرانی ملیامیٹ ہوتی قبروں کو روندتے اس کے پیروں میں موٹے موٹے سیاہ دھاگے بندھے تھے، جن میں پھنسی ایک ایک سیپی میل سے اَٹی تھی۔

اونچے ٹیکے والی پرانی قبر پر جلتے دیے کی آنکھ پھیل رہی تھی۔ گھنے برگد کی جڑوں میں سوتے نیولے نے گردن اُٹھا کر اسے دیکھا اور ٹھہرا کر دوسری طرف بھاگ گیا۔ اوپر شاخ پر بیٹھے کوے نے بھی چونک کر جھرجھری سی بھری اور چونچ پروں میں دبا کر پھاپنے لگا۔

بڑھیا برگد کے نیچے بیٹھ کر کسلفی جلانے لگی۔ جھینگر بے چین راگ الاپنے لگے، ہوائیں جنتر پڑھنے لگیں۔ قبرستان کے داخلی، آہنی دروازے کے پاس بنی کٹیا میں بوڑھے چوکیدار نے ٹوٹی چارپائی پر کروٹ لی اور نیند میں ہی کچھ بڑبڑانے لگا۔ خبیث بڑھیا نے طویل کش لیا اور جھولے سے سیاہ کپڑے کی بنی گڑیا نکال کر اس میں سوئیاں گاڑنے لگی۔

دیے نے گھبرا کر آنکھ بند کر لی۔ کوا کانپنے لگا۔ کٹیا میں دوسری کھٹیا پر سوئی چوکیدار کی بیوی کی چھاتی سے چمٹے چسک چسک کرتے بچے کا پیشاب خطا ہو گیا۔ عورت نے کسمسا کر بچے کو پہلو میں لڑھکا دیا۔

خبیث بڑھیا کے ہونٹ تیز تیز ہلنے لگے، آنکھوں میں دہشت بڑھنے لگی۔ کالی گڑیا چت پڑی پٹی پٹی آنکھوں سے سیاہ آسمان پر پیلے پڑتے چاند کو گھورنے لگی، جس میں نظر آتے موہوم سے صدیوں پرانے سائے نے چھینی بھری کروٹ لی تھی۔

بڑھیا الاؤ گڑھا کھود رہی تھی۔ کھرپی کی کھرچ نے نیچے زمین پر سوئے مردے کی نیند میں خلل ڈال دیا۔

☆.....☆

تاریک کمرے میں ٹیلی ویژن کی اسکرین سے پھوٹتی روشنی نے داغدار اجالا بکھیر رکھا تھا۔ پرانے گدے والے خراب پائنتی والے پلنگ پر پتلی پتلی ٹانگیں پھیلائے آدمی کے ایک ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول تھا اور دوسرا.....!!

دن بھر سوئیوں، سلائیوں، رنگ برنگے دھاگے کپڑوں اور رنگ رنگیلی عورتوں میں اُلجھی بے رونق آنکھوں میں لال لال جارحانہ سا رنگ جھلملا تھا۔ شہر بھر کی عورتوں کی قمیصوں، چولیوں کا ناپ لیتے درزی کی تھکی تھکی آنکھیں اسکرین پر ایک دوسرے میں مدغم ننگے جسموں میں اپنی پوشیدہ حسرتوں کی تکمیل ڈھونڈ رہی تھیں۔

اس نے تھوک نگل کر بیڈ کے کونے پر سوئے اپنے نابالغ بیٹے کو گھور کر دیکھا اور اسے سوتا پا کر دوبارہ اسکرین پر متوجہ ہو گیا۔

بیڈ کے کونے پر سوتے بنے ہوئے بیٹے نے آدھی کھلی ہوئی اپنی آنکھوں پر بازو کا میچا تھوڑا اور بڑھا کر کانوں سے اپنے میں اُبھل پتھل تیز ہوئی اور شریانوں میں بھاگتے لہو کی گردش نے اور رفتار پکڑ لی۔

☆.....☆

چھن چھن کی قریب آتی آواز اور بیسنٹ کے ٹھنڈے چبوترے پر لیٹا وہ جو تیزی سے اُٹھ بیٹھا۔ خمار آلود آنکھوں نے گاڑھے اندھیرے کو گھورا۔ چارخانے کی سبز دھوتی پر کھنچی قمیص کی آستین چڑھائے سر والے نے دانے بازو کی مخصوص حرکت ہاتھ میں تھامے لوہے کے اسٹینڈ میں رکھی تیل کی شیشیاں چھن چھنا کر ساکت ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

بیٹھے وجود نے زبان گھما کر سیٹی ماری۔ شیشیاں چھنکاتے ہاتھ تھم گئے اور پتلی مونچھوں تلے موٹے ہونٹ مسکرانے لگے۔

اسپتنک اوّل

14 اکتوبر 1957ء کو سوویت یونین نے خلائی دوڑ میں امریکہ پر سبقت حاصل کرتے ہوئے دنیا کا پہلا مصنوعی سیارہ ''اسپتنک اول'' زمین کے مدار میں روانہ کیا۔ ''اسپتنک اول'' کا ڈیزائن سوویت سائنسدان سرگول یوف نے تیار کیا تھا۔ اس کا وزن 83.6 کلوگرام (185 پونڈ) اور رفتار 17896 میل فی گھنٹہ تھی اور یہ زمین سے 896 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع اپنے مدار میں زمین کے گرد ایک چکر 96.2 منٹ میں مکمل کرتا تھا۔ تقریباً ایک ماہ بعد 3 نومبر 1957ء کو سوویت یونین نے اپنا دوسرا مصنوعی سیارہ ''اسپتنک دوم'' بھی خلاء میں روانہ کر دیا۔ اس مصنوعی سیارے میں ایک کتیا کو بھی خلاء کے سفر پر روانہ کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد کسی جاندار پر مرتب ہونے والے خلائی اثرات اور بے وزنی کی کیفیت کا مطالعہ کرنا تھا۔ ''اسپتنک دوم'' سطحِ زمین سے 1038 میل کی بلندی پر 14 اپریل 1958 تک محوِ پرواز رہا۔

مالیشے کے قریب آنے تک آدمی جو گوام کا چوکیدار تھا، چبوترے سے اُٹھ کر گودام کا دروازہ کھول چکا تھا۔ اندر چاولوں کی بوریوں کے آگے بنی پختہ فرش پر رلی بچھی تھی۔ چھت سے لٹکنے کم طاقت کے بلب کے گرد پتنگے اُڑتے تھے اور پرانی دیواروں میں بنی بلوں میں چوہے چرل چرل کرتے تھے۔

بوریوں پر لیٹی حاملہ بلی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مانوس پرلی پر لیٹے چوکیدار کی ٹانگوں پر مالش کر رہا تھا۔ بلی نے مطمئن ہو کر پھر آنکھیں موند لیں اور خیالوں میں مرغی کی سوندی ران چبھوڑنے لگی۔

اچانک ''دھپ'' کی آواز کے ساتھ ہی سست نڈھال بلی نے دوبارہ گردن اٹھا کر دیکھا۔ چوہوں کے چرل چرل تھم گئی۔ کئی پتنگے بلب سے ٹکرا کر پھٹ گئے بلی کے پیٹ میں اینٹھیں بڑھ گئی۔

مالیشیے نے چوکیدار کی شلوار رتی سے نیچے چارخانے کی دھوتی پر پٹخ دی تھی۔

☆.....☆

خستہ دیواروں کے سائے سائے موہیے اور سدا بہار کے چھوٹے چھوٹے جھاڑ تھے۔ موہیے کی نئی کھلتی کلیوں کی گرم گرم سانسیں ہوا کو معطر کر رہی تھیں۔ گجوں کی چنبیلوں سے بنی چھت کے بانس سے بندھے پنجرے میں قید بڑی سی چونچ والے توتے نے دانے پر میں دھنسا را اٹھایا اور نیلے آسمان پر دور دور بجھتے ستاروں کی ٹمٹماہٹ کو مدھم ہوتے دیکھ کر پر پھڑائے اور زور سے ٹیں ٹیں کر کے دونوں بازو دمرے پر اٹھا کر دم کے نیچے پچکاری ماری۔

کونے میں رکھے ڈربے میں مرغی انڈے پر سے اٹھی اور پلاسٹک کے سرخ ڈھکن میں پانی پینے لگی۔

اندر کمرے میں بوسیدہ چٹائی پر عورت کے بوڑھے ابھرے رگوں والے ہاتھ دعا کے لیے بلند ہو گئے اور ایک طرف صوفے پر اوندھی پڑی لڑکی کے جوان ہاتھوں نے چادر کھینچ کر رات بھر خون پر مصروف رہے کان ڈھانپ لیے۔

رات بھر بھونکنا کتا بالآخر خاموش ہو گیا۔ آوارہ ہوا سبک خرام ہوئی۔

پیڑوں پر پرندے حمد و ثناء میں مصروف ہوئے۔

آنکھیں ملتے سورج نے بڑھیا کے دعا کو اٹھے رعشہ زدہ ہاتھوں کی کانپتی انگلیوں میں اُنگڑائی لی اور پوری آنکھیں کھول دیں۔ ایدھی سینٹر کے باہر بندھا جھولا اب پھر خالی تھا۔

سفید چادر میں بچھی چارپائی پر بیٹھی خبیث صورت بڑھیا تسبیح رول رہی تھی۔ لال آنکھوں والا درزی اپنے نابالغ بیٹے کو رات میں جلدی سو جانے کی تلقین کر رہا تھا، تاکہ صبح سویرے اٹھنے میں دشواری نہ ہو۔ سرخ پوش عورت پچکن میں انڈے پھینٹ رہی تھی۔

دن نکل آیا تھا۔ کرن کرن اجالا بانٹتے سورج نے زمین زادوں کی ساری کالک رات کی کالی چادر میں باندھ کر ایک طرف رکھ دی تھی۔

☆.....☆

میں بے گناہ ہوں

الماس روحی

کراچی سے ہی ایک اور ایسی آئینہ تحریر جس
کی لپٹیں ہمیں اپنے اردگرد ہی محسوس ہوں گی

''وہ مجھے ارشد سے جتنا دور رہنے کی نصیحت کرتی تھی۔ میرا دل اتنا ہی ارشد کی قربت کے لیے مچلتا تھا۔ اب میں اُسے کیا بتاتی کہ میں سب کچھ اپنا اس کے سپرد کر چکی ہوں اور اس سپردگی کے وسیلے سے جس کیفیت جس نشے کی لذت سے میں آشنا ہوئی وہ دنیا کی تمام لذتوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ میرے اندر کی ساری فصیلیں، اس کی آتی جاتی سانسوں کو محسوس کر کے مسمار ہوتی چلی جاتیں اور میں اس کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ کر کہیں بہت دور چلی جاتی۔ میرے تو انگ انگ میں اس کا پیار نشہ بن کر اترا تھا۔ میں تو پور پور اس کی تھی۔ میرے شگفتہ ہونٹوں پر جو گلابوں کی سی شگفتگی تھی۔ اُسے وہ اپنے اندر جذب کر چکا تھا اور اس کے بدن کی خوشبو میرے اندر اُتر چکی تھی۔ میری ویران زندگی میں وہ بہار بن کر آیا تھا۔ مجھے اب کسی کی بھی پروا نہیں تھی رباب تمہاری نصیحتوں کی بھی نہیں۔''

وفا جو بہت دیر سے گم سم بیٹھی تھی۔ ارشد، رباب اور اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ماں کی چیخ پکار سے چونک گئی اور خیالوں سے حقیقت کی دنیا میں واپس آئی۔

''کمبخت ترے باپ نے یہ گلاس لا کر دیا تھا جو توڑ دیا۔'' وہ ٹوٹا ہوا گلاس اس کو دکھا کر پوچھ رہی تھیں۔ جس کا اُس سے برتن دھونے کے دوران کنارہ چھو گیا تھا۔

''پھینک دو اس کو اماں یہ گلاس میرا باپ نہیں لایا تھا تو لتاں تم اپنے جہیز میں بھی نہیں لائی تھیں۔ یہ تو کشور آپا نے سلائی کے پیسے سے خریدا تھا۔''

اماں جو بُری بیٹھی تھیں۔ اس کی زبان درازی پر اسے کوسنے اور گالیاں دینے لگیں اور اس کے زیرلب بڑبڑانے پر لتاں کو تاؤ ایسا آیا کہ وہ اسے بال پکڑ کر مارنے لگیں۔ آخر ہمیشہ کی طرح آسے آپا اور ندیم بھائی نے بچایا اور وہ ہانپتی کانپتی چھوٹے کمرے میں جا کر رونے لگی، جو گھر کا اسٹور روم تھا۔

یہ ہر روز کی کہانی تھی۔ لتاں کو اُس سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ بھی تو اُسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ لتاں کی سگی بیٹی نہیں ہے، سوتیلی ہے۔ لتاں کہیں کوڑے کے ڈھیر سے اُسے اٹھا لائی تھیں۔ جیسے ہی سب اولادوں میں اُس کا خیال بہت کم رکھتی تھیں۔ وہ لتاں کی بددعاؤں کے سائے تلے پلی بڑھی تھی۔ اس کا کتنا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنی بہن صائمہ کی طرح ماں کی گود میں سر رکھ کر سوئے۔ یا آپا کے سر کی جوئیں نکالتی لتاں کے آگے وہ اپنا سر بھی دے دے۔ ندیم بھائی، بسمل اور فرخ کی طرح لتاں اُسے بھی پلیٹ بھر کر سالن دیں اور وہ خوب سیر ہو کر کھائے۔ صائمہ جمیل اور فرخ جنہیں لتاں اپنے سے لپٹا لیتی ہیں اور ان کے ماتھے اور گالوں پر پیار کرتی ہیں، اُسے بھی ایسے لپٹا لیں اور اُسے بھی ایسے پیار کریں، مگر لتاں تو اُسے لاتوں گھونسوں سے بے تحاشا مارتی تھیں۔ غلطی اس کے اور بہن بھائی بھی کرتے تھے۔ اماں ان کو اتنا نہیں کچھ کہتی تھیں، جتنا اُسے سننا پڑتا تھا اور ایسے ہی لمحوں میں وہ اکثر سوچا کرتی تھی۔ اے کاش وہ ذرا دیر کے لیے لتاں کی اماں بنتی تو پھر بتاتی، دھتکار اور پھٹکار کیا ہوتی ہے؟

اباجب دوپہر میں دکان سے آرام کرنے کی غرض سے آتے تو لتاں ان کے پہلو میں بیٹھی رہتیں۔ آپا کھانا لا کر دیتیں اور وہ ابا کے پاس جیسے ہی آ کر بیٹھتی، اماں بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتیں۔ وہ تنگ آ کر دور جا بیٹھتی۔ سب بچے ابا اماں کے اردگرد رہتے، پھر ابا کے اشارے یا سرگوشی کے بنا اماں سب بچوں کو کمرے سے باہر نکال دیتیں۔ ساری دوپہری اماں ابا بڑے کمرے میں رہتے اور کمرے کا دروازہ بند رہتا۔ بہن بھائی جب اِدھر اُدھر ہو جاتے تو وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں دروازے کے قریب جاتی اور دروازے کے سوراخوں پر آنکھیں گاڑ دیتی، مگر سامنے رکھی ٹوٹی ہوئی الماری کے کچھ بھی تو نظر نہیں آتا تھا، اور جو سرگوشیاں سنائی دیتیں واضح نہیں ہوتی تھی۔

آخر وہ پھر تھک ہار کر باہر کھیلنے چلی جاتی۔ جب گھر لوٹتی آپا سے بھائی سے اس کی لڑائی ہو جاتی اور وہ مار تے تو وہ اماں کو پکارتی اور تب اماں غصے میں بھری کمرے کا دروازہ کھولتی، بکھرے بالوں اور بغیر دوپٹے کے اماں آ کر سیدھے اس کی کمر پر لات مارتیں۔ پیچھے ابا تہ بند اڑاتے ہوئے آ جاتے اور سب بچوں کو پیٹ ڈالتے۔

وہ جب بھی سنتی کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے یا ماں شفیق اور مہربان ہوتی ہے، اُسے ایسا لگتا یہ کہانی ماں ہے۔ ماں حقیقت میں کب ایسی ہوتی ہے، ہوتی ہوگی مگر میری ماں ایسی نہیں۔ مار کھانے کے بعد وہ ماں سے اور بھی متنفر ہو جاتی۔ وہ تخیل میں مہربان عورت کا پیکر تراشنے لگی۔ اور اس سے کلام کرتی، بہن بھائی اس کا مذاق اُڑاتے تو وہ مارنے کو دوڑتی۔

وفا بہت محبت کرنے والی لڑکی تھی، مگر رشتوں کے عدم توازن نے اُسے بے حس بنا دیا تھا۔ اُسے پناہ کی تلاش رہتی تھی۔ یہ تلاش شعور کی دنیا میں جب اس نے قدم رکھا تھا تب سے تھی۔ اس لیے تو اُسے پی ٹی کی مس عفیفہ بہت اچھی لگتی تھیں، وہ اُسے پیار کرتی تھیں۔ جب گیمز ہوتے اور وہ دوڑ میں حصہ لیتی، تو سب سے آگے ہوتی۔ مس بانہیں پھیلائے اس کی منتظر ہوتیں اور وہ دوڑتی ہوئی ان کے سینے سے لگ جاتی۔ کس قدر گداز تھا مس کا سینہ، جی چاہتا وہ اسی طرح مس کے سینے سے لگی رہے اور مس اس کی پیٹھ کو سہلاتے ہوئے شاباش شاباش کہتی رہیں۔ دیوانی تھی وہ مس عفیفہ کی۔ کوئی لڑکی اُس کے سامنے مس عفیفہ کو بُرا نہیں کہہ سکتی تھی۔ اگر کسی کے منہ سے ان کے خلاف کچھ نکل جاتا تو وہ ایسی شامت بلاتی کہ توبہ ہی بھلی۔ مس عفیفہ کے مل جانے سے اس کے ذہن میں مہربان پیکر کا وہ ہیولہ اب نہیں رہا تھا، جس سے وہ ہم کلام رہتی تھی۔ اب وہ تنہائی میں گھر کا کام کرتے ہوئے خیال ہی خیالوں میں مس عفیفہ سے کلام کرتی۔ ہر صبح ان کے لیے پھول لے کر جاتی اور انہیں پھول دیتے ہوئے اپنا ماتھا اور گال پیار کے لیے آگے کر دیتی۔ اور ان کے چومنے پر وہ خوشی سے پاگل ہو جایا کرتی۔ اب اس کو ماں سے کوئی شکایت نہیں رہی تھی، نہ کوئی گلہ تھا، نہ ماں ابا کے پہلو میں یا بند کمرے میں ابا کے ساتھ بُری لگتی اور نہ اُسے اپنے بہن بھائیوں کو لپٹاتے ہوئے ان پر غصہ آتا۔ اس پر تو اسکول جانے کی فکر ہر وقت لاحق رہتی کہ صبح اسکول جانا ہے۔ جس دن مس عفیفہ اُسے پیار نہیں کرتیں یا اسکول نہیں آتیں۔ اُسے سب کچھ اُس روز بُرا لگتا۔ کلاس میں بھی اچھا کام نہیں کرتی۔ ساتھی لڑکیوں سے لڑتی گھر میں سب سے زبان درازی کرتی۔ چیزیں پٹختی اور دوسرے روز مس عفیفہ کے نہ آنے پر اور پیار نہ کرنے پر گلے شکوے کرتی۔ مس جب پیار کرتیں اور نرم اور میٹھے لہجے میں سمجھاتیں تو وہ خوش ہو جاتی۔

☆.....☆

مس عفیفہ کا اچانک تبادلہ ہوا اور وہ اس کے اسکول ہی سے نہیں شہر سے بھی چلی گئیں، اُن کے یوں چلے جانے کا وفا کو بہت صدمہ ہوا۔ کافی عرصے بیمار رہی اور پھر خود بخود ٹھیک ہوتی چلی گئی۔ اس کی کلاس میں انجم نام کی لڑکی داخل ہوئی جسے سب پیار سے بلی کہتے تھے۔ بلی بھرے بھرے گداز جسم کی لڑکی تھی۔ جسامت میں وہ سب سے بڑی تھی اور اسے مس عفیفہ جیسی لگتی تھی، اس لیے اسے ماٹیٹر بنا دیا گیا۔ بلی سے وفا کی خوب بنی۔ دونوں کا پس منظر ایک تھا۔ گھر کے ماحول سے باغی تھیں اور ایسی بغاوت نے دونوں کو قریب کر دیا۔ ہاف ٹائم میں رسّی کودتے ہوئے بلی جب اس کی کمر پر ہاتھ رکھتی اور وہ بلی کے کولہوں پر تو اُسے بہت اچھا لگتا۔ بات کرتے ہوئے وہ بلی سے ناراض ہوتی تو بلی اس کا ہاتھ چوم لیتی اور وہ راضی ہو جاتی۔ یہ سوچ کر کہ کل رات سوتے ہوئے ایک آنکھ کھلے ابا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اماں کو ایسا ہی منا رہے تھے۔ بلی کو ابا اماں کی باتیں مزے لے لے کر بتانے لگتی اور دونوں ہنس دیتیں، درختوں کے پیچھے جا کر بلی وفا کو کبھی آنکھوں، کبھی ہونٹوں اور کبھی

گردن پر چومتی اور بتاتی میرے ابو نے رات میری امی کو ایسے ہی چوما تھا۔ فارغ ٹائم میں وفا بلی کی کود میں پیچھے ڈیسک پر جا کر لیٹ جاتی اور بلی جھکی جھکی دیکھتیں اور بے شرم و بے حیا کہہ کر دوڑوں کو پھبتیں اور بے تکان سے جا کر کہتیں۔ سب ٹیچرز انہیں الگ الگ رہنے کی ہدایت کرتیں، مگر وہ دونوں باز نہیں آتیں۔ آخر دونوں کے سیکشن الگ کر دیے گئے، مگر دونوں سب کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتیں۔ بلی کے پوسوں کی عادی وفا اور وفا کے ہاتھوں کو مضبوطی سے گرفت میں لے کر اس سے بغل گیر ہونے والی بلی، جنسی تعلقات کی اس حد تک سے آگہی تھیں، جہاں دونوں کے درمیان حجاب نہیں رہا تھا۔ آپسی پاہاف ٹائم میں وقت مقررہ پر وفا باتھ روم جانے کی اور بلی پانی پینے جانے کی اجازت لے کر بڑی ہوشیاری سے باتھ روم میں آ جاتیں اور ایک دوسرے کو سکین پہنچانے کے ہر حربے کو استعمال کرنے سے دریغ نہ کرتیں۔ ان کو یہ احساس تک نہ تھا کہ وہ ہم جنسیت کا شکار ہو چکی ہیں اور گناہ گار ہو رہی ہیں۔

میٹرک کے بعد بلی کی شادی ہو گئی اور وفا آگے پڑھ گئی۔ غربت اور کثرت اولاد سے جو مسائل اس کے گھر میں تھے۔ جس کی وجہ سے رشتے بوجھ بن گئے تھے، جہاں محبت اور خلوص کی بجائے خود غرضی نمایاں تھی۔ وہ شدید زخمی ہوتی تھی۔ بھائی ہر چیز اگر صرف خود کھاتے، یا زیادہ سے زیادہ ماں اس کے کیا حصے بخرے کرتیں، چھوٹے بھائی پپو کو دے کر ماں خود کھاتی جیسے ان کی یہ آخری اولاد ہو۔ آخر ماں کا بھی تو دل تھا۔ وہ انسان تھی، پھر بیٹیاں ایسے گھرانوں میں نوکرانیوں سے کم نہیں ہوتیں۔ ان روکھی سوکھی دے دی جائے تو بڑی بات ہوتی ہے۔ دو بہنوں کی نسبت اس کے حصے میں ہمیشہ بچا کھچا کھانا اور کپڑا آتا تھا۔

زندگی کی یہ تلخی اُسے جستجو پر مجبور کرتی تھی۔ گھر کی دہلیز سے باہر دنیا کو دیکھتی تو دنیا اُسے بڑی رنگین لگتی تھی۔ کتنا فرق تھا، اس دنیا اور میں اُس دنیا میں۔ جو اس کی پناہ گاہ تھی۔ یہاں کے تو رنگ بھدّے تھے۔ وہ اکتا جاتی، دریچے اور دہلیز سے جھانک جھانک کر باہر کی دنیا کو دیکھتی۔ اپنے چہرے پر پڑتی راہگیروں کی نگاہیں نہ جانے کیوں اُسے اچھی لگتی تھیں کہ کوئی تو اُسے توجہ سے دیکھ رہا ہے۔ نوکریوں پر جاتی عورتوں کے کپڑوں کو دیکھ کر ساری تفصیل سارے مشین پر بیٹھی آپا کو بتاتی۔ ایسے میں ماں جو سر سے دوپٹا کھینچے چارپائی پر سارا دن پڑی رہتی تھی۔ اُسے گالیاں دینے لگتی اور وہ پھر زباں چلانے لگتی۔

اُسے اپنے گھر والوں سے بڑی شکایت تھی۔ ان سے کیا کہتی، محلے میں رباب ہی تھی جس سے اس کی دوستی تھی۔ اس نے اپنا سلائی سینٹر کھولا ہوا تھا۔ وہ اماں اور ابا کی مخالفت کے باوجود رباب سے کڑھائی کے ٹانکے سیکھنے جاتی تھی۔ رباب بغیر کسی فیس کے اُسے سکھاتی۔ کپڑا، دھاگہ، فریم بھی تو اُسے رباب نے دیا تھا اور پھر وہ نصیحتیں جو وہ کیا کرتی۔ ابا اماں کا احترام، بہن بھائیوں سے محبت کی تلقین کرتی۔ لوگوں سے بُرے سلوک کے بدلے اچھے سلوک کی ترغیب دیتی۔ بہت دل لگتی تھیں اس کی باتیں۔ سب کچھ اچھا کہتی تھی، مگر ارشد کے سلسلے میں نہ جانے رباب اور اس کی باتیں بُری لگنے لگی تھیں۔

☆.....☆

ارشد ندیم بھائی کا دوست تھا عمر میں بڑا تھا۔ پنجاب کا رہنے والا تھا۔ حصولِ رزق کے لیے کراچی آیا تھا۔ مائی صابراں کے بچے مکان کے کمرے میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتا تھا۔ مہینے پر چندہ کر کے وی سی آر پر فلم دیکھنے والوں میں ارشد بھی شامل تھا۔ ندیم بھائی نے کیا روزگار ڈھونڈا تھا۔ اُن کا ایک سینما گھر تھا۔ محلے کے سبھی لوگ آتے تھے۔ وفا کو لیا چوڑا، کورا چنا ارشد بہت اچھا لگتا تھا اور خود ارشد بھی بڑی بڑی آنکھوں والی وفا پر فریفتہ تھا۔ موقعے کی تلاش میں تھا۔ دس دس روپے کے ہار بندوں اور چوڑیوں

سے ہر دوسرے روز وفا کو نوازتا رہتا تھا، محض اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے۔ اُدھر وفا محبت کے اس انداز پر واری واری جاتی تھی۔

آخر ایک روز وفا اپنی رضا سے وہ کچھ کر بیٹھی جو اُسے کبھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس ایک دن کی قربت نے اُسے ارشد کا عادی بنا دیا۔

اب ابا ایاں کی طرح وہ موقع محل تلاش کرتے تو اُسے ایسے موقع پر ہنسی آتی، کتنی جلدی وہ اماں بن گئی تھی۔ اب اُسے اماں ابا کے ملاپ پر غصہ نہیں آتا تھا۔ وہ تشنہ نہیں رہی تھی۔ ارشد تو محبت کا سمندر تھا، جس نے اُسے سیراب کیا تھا۔

ایک مرد کی محبت پا کر اس کے تو چہرے کے خدوخال ہی بدل رہے تھے۔ رنگ روپ نکھر رہا تھا۔ خوش رہنے سے جسم بھر گیا تھا۔ وہ کچھ دنوں سے اماں اماں سی لگ رہی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر آخر وہ اماں بن ہی گئی۔

گھر کا ہر فرد حیران تھا۔ وفا کو ہوا کیا ہے، کچھ دنوں پہلے زیادہ سے زیادہ کھانا کھا رہی تھی۔ ہر وقت بھوک کا رونا رو رہی تھی اور اب تے پر تے کیے جا رہی ہے۔

رنگ زرد، آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ وقت بے وقت کھانا مانگنے والی لڑکی کا جی ہر چیز سے کیوں اُوبھ گیا ہے۔

اُس کی جاہل ماں کو یہ بات ذرا دیر میں سمجھ میں آئی، لیکن آ ہی گئی۔ آخر نو دس بچے یونہی تو نہ پیدا کیے تھے۔ اس تجربے سے تو وہ کئی بار گزر چکی تھی۔ آگہی کے اُس لمحے میں اماں نے وہ سینہ کوبی کی اور وہ آہ زاری کی کہ محلے بھر میں شور برپا کر دیا۔

گناہ کے احساس نے ارشد کو وفا سے چوکنا تو پہلے ہی کر دیا تھا، محلے کے اُبھرتے شور نے اُسے بھاگنے پر مجبور کر دیا اور وہ بہت دور چلا گیا۔

اماں ابا نے حسبِ معمول وفا کو لاتوں گھوسوں سے خوب مارا۔ اماں ابا مارتے جاتے تھے اور ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے جاتے تھے۔

''دیکھا کمبخت نے کہیں منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔ کیسی باپ کی عزت کو چونا لگایا ہے۔ یہ سب تمہاری ڈھیل کی وجہ سے ہوا ہے۔ باپ تھے ذرا رعب میں رکھتے۔'' ابا کو اماں کی بات پر شدید غصہ آیا۔ انہوں نے اُسے زور زور سے لاتیں مارتے ہوئے چیخ چیخ کر کہا۔ ''تو ماں تھی، تجھے پتا رکھنا چاہیے تھا کہ یہ کہاں گئی تھی، اس کا کس سے تعلق تھا، تجھے لیٹنے سے فرصت ہو تو تب بچوں پر نظر رکھتی۔''

قصور وار کون تھا؟ اس کا انہیں ذرا احساس نہیں تھا۔ اگر ایک لمحے کو میرے یہ ماں باپ اپنے آپ میں جھانک لیتے تو انہیں آرام سے جواب مل جاتا، اُس نے پلٹتے ہوئے سوچا۔

بہن بھائی بھی اس پر لعنتوں اور ملامتوں کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ایک شام ابا اپنی سے بڑی عمر کے آدمی کو گھر لائے۔ اس کے ساتھ نکاح پڑھوایا اور ہمیشہ کے لیے گھر سے یہ کہہ کر اسے رخصت کر دیا۔

''تیرے جیسی ناہنجار، بے شرم، بے حیا اولاد کا میرے گھر کوئی کام نہیں، تُو ہمارے لیے جیتے جی مر گئی۔ عمر بھر کے لیے دفع ہو جا۔'' وہ زار و قطار رو رہی تھی اور چیخ چیخ کر کہنا چاہتی تھی کہ میں بے گناہ ہوں، وہ باپ کی چوکھٹ پکڑے کھڑی تھی۔

وہ چیخ کر کہنا چاہتی تھی کہ میں بے گناہ ہوں، مگر الفاظ حلق ہی میں دم توڑ رہے تھے۔ اس کے آنسو کسی کو نہیں دکھائی دے رہے تھے۔

وہ گنہگار ہو کر بھی بے گناہ تھی۔ جنسی بے راہ روی کا شکار اُسے اس کے اپنے گھر کے ماحول نے کیا تھا۔ کاش اماں نے کسی ایک دن، کسی ایک لمحے مجھے اپنی آغوش میں لیا ہوتا، کسی ایک لمحے میرے ابا نے مجھے پیار کیا ہوتا، اپنے سینے سے لگایا ہوتا۔

اس کا وجود باپ کی چوکھٹ پر پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا، آنکھیں پتھرا رہی تھیں، بے حس ماحول میں اس کی بے گناہی پھر بھی کسی کو نظر نہیں آئی۔

☆.....☆

تیسرا شعلہ

آگہی کا عذاب

نصرت سرفراز

انتقام کے جذبے سے بھرپور ایک شعلہ ساماں تحریر

فروا کی ساس اچھی بھلی گھر سے نکلی تھی، بس یہ دو سڑکیں پار کر کے ہی تو اس کی نند کا گھر تھا، جہاں وہ اکثر ہی جایا کرتی تھیں۔ آج نہ جانے ایسا کیا ہو گیا تھا کہ قضا اُن کے انتظار میں کھڑی تھی۔ آج ہی ملک الموت کا ان سے ملنا اُن کا مقدر تھا۔ اس پھری دوپہر میں ہی فرشتۂ اجل نے ان کی روح قبض کرنا تھی۔

آج تو فروا نے دل و جان سے یہ سوچ رکھا تھا کہ وہ اُن کے پاؤں پکڑ کر، اُن سے معافی ضرور مانگے گی۔ اُس کی ساس کا دل تو اس کی سگی ماں سے بھی زیادہ وسیع تھا اور وہ ہوس زر کی ماری ان کے خلوص، پیار اور ان کے اخلاص کو سمجھ ہی نہ پائی تھی۔ وہ اچھا خاصا اپنے پاؤں پر چل کر گئیں اور چار پائی پر واپس آئی تھیں..... مگر..... فروا ساس کی میت پر ایسا دھاڑیں مار مار کر روئی اور اُن کے پاؤں پکڑ کر ایسی گریہ وزاری کی کہ سب کے لیے حیرت کا باعث بن گیا۔ میت پر آئی ہوئی عورتوں سے صحن بھرا ہوا تھا۔ برآمدے میں بھی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ گھر کے دونوں کمرے بھی عورتوں اور بچوں سے بھرے ہوئے تھے۔ فروا پر رہ رہ کر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ حادثہ بہت اندوہ ناک تھا اور بہت ہی اچانک بھی..... اور موت تو چیز ہی ایسی ہے، یہ چاہے کسی جوان کی ہو، بچے کی یا کسی بوڑھے کی، اپنے پہلو میں غم واندوہ ہی سمیٹ کر لاتی ہے لیکن فروا کی ساس تو اپنی طبعی عمر گزار چکی تھیں۔ وہ بیٹیاں، ایک بیٹا فروا کا شوہر، سب ہی شادی شدہ تھے۔ وہ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں والی تھیں۔ انہوں نے اپنی، مناسب اور متمول زندگی گزاری تھی۔ بارہ سال پہلے جب فروا کے سسر کا انتقال ہو گیا تھا، جب سے ہی وہ بیٹے کے زیر دست ہو گئی تھیں۔ فروا کے اپنے بچے تھے۔ میاں کی آمدن بھی کچھ ایسی خاص نہ تھی۔ وہ تو غنیمت تھا کہ وہ جس گھر میں رہ رہے تھے، وہ فروا کے سسر کے نام تھا اور مرتے وقت وہ یہ گھر اپنے اکلوتے بیٹے کے نام کر گئے تھے، جب کہ نندیں دونوں اپنے اپنے گھر میں خوش حال تھیں، انہوں نے بھی اپنا حصہ لینے کی کوشش نہ کی۔ گھر دو کمروں کا ہی صحیح مگر برآمدہ کافی کشادہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آج کل کے مہنگائی کے دور میں یہ سر چھپانے کا آسرا تو تھا۔ چاروں بچوں کے تعلیمی اخراجات، وین کی فیس، اسکول کی باریاں اور دیگر اخراجات اس کے علاوہ تھے۔

سسر کے انتقال کے بعد دھیرے دھیرے ساس صاحبہ فروا پر بوجھ بنتی چلی گئیں، بڑی بی کو شوگر کا مرض بھی لاحق تھا اور بلڈ پریشر بھی، ان کے دل کی دو شریانیں بھی جزوی طور پر بلاک تھیں، جن کا ڈاکٹروں نے انہیں اٹلی میڈم دے رکھا تھا کہ وہ جلد از جلد انجیو پلاسٹی کرالیں، مگر اخراجات کہاں سے آتے اور تو اور کچھ عرصے سے ان کی بینائی تو تھی ہی کمزور، اب لفظوں کو سنائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی قریب جا کر چلا کر بھی بولے، تو وہ یہی کہتیں کہ ”مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا۔“

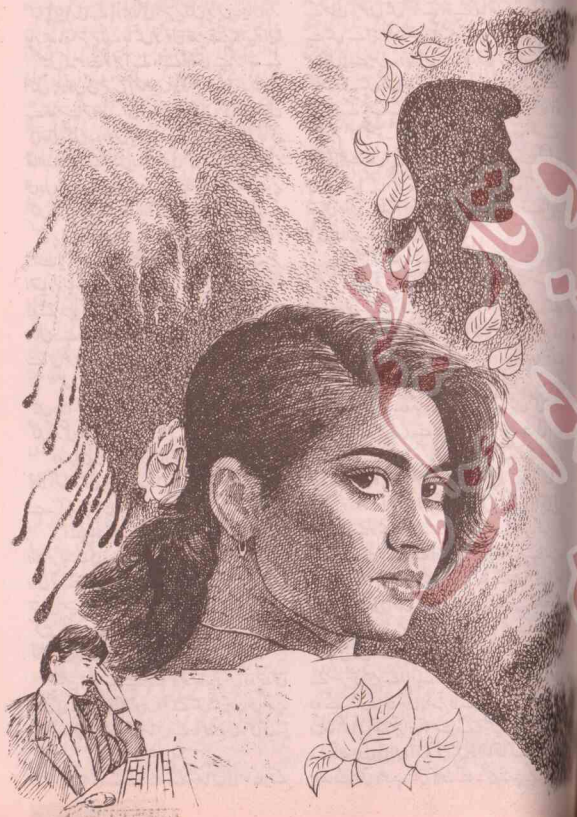

☆.....☆

حادثہ بہت بے رحم تھا، لیکن میت میں آئی بھی بڑی بوڑھیاں فروا کی ساس کو خوش قسمت قرار دے رہی تھیں کہ اپنی بیماری کے باوجود بھی بستر پر نہیں پڑیں۔ بیمار ہو کر چار چھ ماہ بستر پر لگ جاتیں تو کون خدمت کرتا۔ یوں ایسا سمجھیں کہ موت تو ہر آنے والے کو آتی ہے مگر اللہ نے انہیں پھولوں کی طرح اُٹھالیا، بہو کو تکلیف دی نہ بیٹیوں سے خدمت کروائی۔ ان کی دونوں بیٹیاں بھی اسی خیال کی حامل تھیں۔ دونوں کو ظاہر ہے ماں کی جدائی کا دُکھ تھی تھا اور وہ ماں کے غم میں روئی دھوئی بھی خوب تھیں، مگر دل ہی دل میں یہ بات بھی تھی کہ شکر ہے اماں، بستر علالت پر نہیں پڑیں نہ اسپتال میں داخل ہونے کی نوبت آئی۔ وہ کسی پر بوجھ تو نہیں بنیں بلکہ چلتے ہاتھ پاؤں سے کسی کو زحمت یا تکلیف دیے بغیر ہی ملکِ عدم کی جانب سفر اختیار کرلیا، لیکن ساس کی میت پر دھاڑیں مار مار کر فروا کو روتے دیکھ کر سب خواتین ساس سے اس کی محبت کی مثال دے رہی تھیں۔ گھر میں موجود تمام عورتوں نے فروا کے اس طرح رونے بلکنے کو اپنا موضوع بنایا ہوا تھا۔

''حد ہے بھئی! اتنا تو کوئی اپنی سگی ماں کے لیے بھی نہیں روتا..... ہائے بھئی فروا تو ہے بھی رحم دل، برداشت نہیں کرسکی۔''

دوسری بولی! ''ہاں واقعی دکھاوا تھوڑی کررہی ہوگی، بھلا دکھاوا کوئی اس قدر شدت کے ساتھ کیسے کرسکتا ہے۔'' ایک بڑھ کر بولی!

''آئے ہائے کوئی اٹھالے فروا کو میت کے پاس سے ورنہ مر جائے گی یہ چارپائی روروکر۔'' جب فروا تھک چیخ کر روتی تو رشتے دار خواتین اور محلے والی عورتیں اور اس کی دونوں نندوں سمیت فروا کو سینے سے لگا کر دلاسہ دلانے کی کوشش کرتیں، لیکن وہ تو لگتا تھا جیسے اپنے آپ میں ہی نہ تھی، یوں لگتا تھا کہ شدتِ غم سے اس کا سینہ پھٹ ہی جائے گا۔

لیکن اس کے سینے پر جو بوجھ تھا، تو بس وہ خود ہی جانتی تھی۔ فہیم (فروا کا شوہر) تو ہفتے میں تین دن ہی گھر پر رہتا تھا، باقی تو سارا وقت ساس کے ساتھ وہ ہی رہتی تھی۔

☆.....☆

اپنی شادی کے دن سے لے کر ساس کی موت کے دن تک ایک لمحہ کسی فلم کی طرح فروا کی آنکھوں کی اسکرین پر پلے ہو رہا تھا کہ کس طرح فراخ دلی سے شادی کی پہلی ہی رات اس کی ساس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ اس کے حنائی ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا تھا کہ ''بیٹا آج سے میں نے اپنا اکلوتا لختِ جگر فہیم تمہیں سونپ دیا۔ اب میرا دل اِسے صرف دعائیں دے گا، کوئی حق طلب نہیں کرے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ جو آبلہ پائی میرے حصے میں فہیم کے باپ کے انگلوتے ہونے کی وجہ سے آئی، وہ بھی تم بھی بھگتو۔'' اللہ بخشے میری ساس کو، وہ انگلوتے بیٹے کی محبت میں اپنی بہو یعنی مجھ کو بھی سچ دل سے قبول ہی نہیں کرپائیں، مگر میں اپنی بہو کے حق میں دستبردار ہو رہی ہوں۔ اللہ تم دونوں کو بے حد خوشیاں دے اور واقعی انہوں نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔

بے انتہا قناعت، بے پناہ پُرخلوص، حد سے زیادہ منکسر المزاج فروا کو کبھی محسوس ہی نہ ہوا کہ وہ سسرال میں رہ رہی ہے۔ شروع میں تمام کام فروا کی ساس نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ فروا کا کام صرف تیار ہونا، اچھے کپڑے پہننا اور شام میں فہیم کے آفس سے واپس آنے کے بعد اپنی امی کے گھر چلے جانا یا واک پر نکل جانا تھا۔ کچھ عرصے بعد چار بچوں کی پیدائش میں بھی فروا کی ساس نے سگی ماں سے بڑھ کر اس کی خدمت کی اور ذمے داری سے کچھ بڑھ کر ہی نبھایا۔ فروا کے بچے تو اس کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم کرائے بغیر ہی بڑے ہوگئے۔ راتوں کو روتا ہوا بچہ اماں کے پہلو میں لٹا کر فروا بی بی میاں کے پہلو میں مزے سے سوئیں۔ اب جب کہ فروا کے چاروں ہی بچے بڑے ہوگئے تھے، تو اماں اپنے چلتے پھرتے یہی دعا کرتیں کہ ''یا خدا مجھے جہاں سے اُٹھا لے۔ میری قبر کی پہلی مٹی ڈالنے والا ہاتھ میرے مجازی خدا کا ہو۔ یا اللہ میری آخری سانس فہیم کے اہا کی موجودگی میں آئے۔'' مگر ہوتی کو کون ٹال سکتا ہے۔ فروا کے سسر یعنی فہیم کے ابا ایک رات ایسا سوئے کہ سوتے ہی رہ گئے۔ اس رات پہلی دفعہ فروا نے اپنی ساس کو روتے دیکھا، مگر اس قدر صبر اور قناعت کے بوتے..... ''بس اللہ نے مجھے بیوگی کی اس آزمائش میں ڈالنا تھا کہ جو فہیم کے والد مجھے تین دھوپ میں چھوڑ گئے۔ فہیم تڑپ کر بولا۔

''اماں میں ہوں نا، آپ کے ساتھ'' اور اماں دھیرے سے مسکرادیں۔

ابا کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ وہ بنیادی کاموں سے کنارہ کش ہوتی چلی گئیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ جوڑوں کے درد، شوگر اور دل کے امراض میں بھی مبتلا ہوگئیں، مگر کبھی منہ سے کسی تکلیف کا اظہار نہ کیا، جو جمع پونجی اپنے پاس تھی، اُسی سے دوائیں منگاتیں، کبھی فہیم جو کوئی روپے دے دیتا تو وہ لے تو لیتیں، مگر اپنے منہ سے کبھی کوئی تقاضا نہیں کیا۔ جب سے دل کا عارضہ لاحق ہوا تو بہت پریشان رہتی تھیں کہ کوئی اُن کی وجہ سے زیرِ بارِ نہ ہو۔ اب تو ان کی ایک ہی دعا تھی کہ ''اے اللہ بیوگی کی آزمائش تو سہہ لی، بس بستر پر موت نہ آئے..... چلتے پھرتے ہاتھوں کے ساتھ بلالینا۔'' دل کی بیماری ابھی ابتدائی مراحل میں تھی، اخراجات بھی زیادہ نہ تھے، لیکن پھر بھی فروا کو ان کا وجود اب ایک ناکارہ پُرزے کی مانند لگتا تھا، جس کا کوئی مصرف نہ تھا۔ گو کہ ساس، بہو میں کفو کا سوال ہی نہ تھا کہ وہ حد سے زیادہ قناعت پسند اور صابر خاتون تھیں۔ کپڑے لتے، فیشن، میک اپ کی چیز سے ان کا لگاؤ نہ تھا، لیکن دو کمروں والے گھر کے ایک کمرے میں کار رہنا تھا اور یہ قبضہ بھی فروا کو بہت کھٹکتا تھا کہ بچے اب بڑے ہوگئے تھے، ان کو ایک علیحدہ کمرے کی ضرورت ہے۔ گو کہ دونوں بڑے بچے دادی کے ساتھ ہی رہتے تھے، مگر فروا کی چاہت یہ تھی کہ اماں کا پلنگ برآمدے میں ڈال دے اور بچوں کے لیے یہ کمرہ سیٹ کردے، آخر بڑی بی کو اس عمر میں کس پرائیویسی کی ضرورت ہے، جو انہوں نے ایک پورے کمرے پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ پہلے پہل تو وہ چپ رہتی تھی، مگر جب سے اُسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کی ساس کی سماعت متاثر ہوگئی ہے اور وہ نزدیک آکر بولنے اور اونچی آواز میں بات کرنے پر بھی کوئی بات سُن نہیں پاتیں، تو گویا جیسے اس کے دونوں ہاتھوں میں لڈو آگئے تھے۔ ہر دل جلانے والا نشتر اور زہر میں بجھے الفاظ اُن کے سامنے باآسانی کہہ جاتی کہ اماں کو اب کچھ سنائی تو دیتا ہی نہیں ہے۔

☆.....☆

اماں کا بہرہ پن روز بروز اور بھی زیادہ ہوتا جارہا تھا۔ اب تو ان کے سامنے چیخ چیخ کر باتیں کریں تب بھی پتھر کی پتھر ہی رہتیں۔ چوں کہ فروا کو بچوں کے لیے اماں والا کمرہ درکار تھا اور وہاں وہ بڑے مزے سے براجمان تھیں۔ کمرے میں آتے جاتے وہ خاصی بلند آواز میں کہتی۔ ''نہ جانے کب جان چھوڑیں گی اور کمرہ بچوں کو ملے گا۔'' حالاں کہ یہ کہتے ہوئے وہ یہ بھی بھول جاتی کہ پورا گھر ہی ان کے نام تھا، جو کہ بیٹے کے ساتھ ساتھ انہوں نے خود بخود بہو کے نام کردیا تھا۔ اُسے تو بس یہ یاد رہتا کہ یہ کون سا سن سکتی ہیں جو کہ ان کو دُکھ ہوگا کہ میں نے کیا کہا۔

فروا نے اپنے کمرے میں ایئر کنڈیشن لگوایا، تو فہیم نے کہا۔

''پہلے اماں کے کمرے میں لگے گا.....'' اس پر وہ بڑی بے لگامی سے بولی۔

''اب اس بڑھاپے میں ان کی بوڑھی ہڈیاں اے سی کی ٹھنڈک برداشت کرنے کی صلاحیت کہاں رکھتی ہیں۔'' فہیم نے کہا۔ ''فروا آہستہ بولو۔ اماں سن لیں گی۔'' تو اس نے جواب دیا۔ ''اُن کو کون سا سنائی دیتا ہے جو میرے بولنے نہ بولنے سے فرق پڑتا ہے۔''

فروا کی ساس تمام باتوں سے بے نیاز سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھی رہتیں۔ واقعی میں کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو سننے سے بہتر محسوس ہوتا ہے کہ انسان بہرہ ہی ہوتا اور فروا کی ساس تو اب، بہری ہی تھیں۔

کل شام جب اماں باہر نکلیں اپنی بیٹی کے گھر جانے کے لیے، جہاں وہ اکثر ہی جایا کرتی تھیں، تو جیسا کہ فروا نے پہلے سے ہی سوچا ہوا تھا کہ اماں تو باہر برآمدے میں بچھی ہو سکتی ہیں، تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ آج ہی اماں کی غیر موجودگی میں ہی ان کی مسہری اور میز نکال کر باہر برآمدے میں سمیٹ کردے اور یہ کمرہ بچوں کے حوالے کردے۔ چناں چہ اماں کے جاتے ہی اس نے دھڑا دھڑ ماسی کے ساتھ مل کر کمرہ صاف کرڈالا۔ اس نے اماں کی تمام چیزیں باہر برآمدے میں ایک کونے میں سجادیں۔ مسہری کے برابر میں ایک چھوٹی سی میز، جس پر ان کا چھوٹا موٹا سامان تھا اور وہ چھوٹی سی الماری

جس میں ان کے کپڑے اور دوائیں وغیرہ رکھی ہوتی تھیں، سب سمیٹ کر گھر کے صحن میں رکھ دیا..... اپنی سمجھ سے فرواُنے اماں کے آرام کا سارا انتظام کر دیا تھا۔

☆.....☆

اب خالی کمرے میں اُس نے اپنے کمرے سے اُٹھ کر بچوں کا بیڈ ڈالا۔ چھوٹا کارپٹ، بچوں کے کھلونے، ٹیڈی بیئر، بلی ماؤس، بڑا بھالو جو اس کی بہن نے گڈو کی سالگرہ پر دیا تھا۔ بچوں کے اسکول بیگز، جوتے، کتنا سامان تھا بچوں کا، جو میں نے اپنے بیڈ روم میں اماں کی وجہ سے رکھا ہوا تھا۔ ”اب کتنا کشادہ لگ رہا ہے میرا بیڈ روم..... بچوں کو اس کمرے میں سلا کر میں اور فہیم مزے سے اپنے بیڈ روم میں سویا کریں گے۔ بچوں کی کمرے میں موجودگی کی وجہ سے تو ایک ساتھ کمرے میں سونے کے باوجود محسوس ہوتا ہے کہ کوئی پرائیویسی نہیں..... ہائے کتنا مزہ آئے گا..... اب تو فہیم سے رات کو دور دور سے باتیں کرنے کے بجائے اُن کے شانوں پر سر رکھ کر دن بھر کی روداد سنایا کروں گی۔“ کس قدر خود غرض ہوئی تھی وہ اس وقت یہ سوچے بغیر کہ اماں نے تو ساری زندگی اسے صرف دیا ہی دیا ہے، اپنے کسی حقوق کا مطالبہ تو کبھی کیا ہی نہیں۔ اماں کی مسہری کمرے سے نکال کر برآمدے میں ڈالتے ہوئے لمحہ بھر کو بھی اس کا دل نہیں کانپا کہ وہ تو صرف حقوق طلب کرنے کی عادی تھی، حقوق دینا اور فرض پورا کرنا اس نے کب سیکھا تھا۔

اماں کا بستر برآمدے میں سمیٹ کر رکھنے کے بعد اُس نے سوچا کہ چلو آج اس کی چادر تبدیل کر کے نئی بیڈ شیٹ بچھا دیتی ہوں تو اماں نئی چادر دیکھ کر خوش ہو جائیں گی اور کمرے سے بے دخلی کو بھول جائیں گی۔ گزشتہ نہ جانے کتنے برسوں سے دھو دھو کر بھجائی جانے والی چادر نے تو اب اپنا اصلی رنگ بھی تبدیل کر دیا تھا۔ فروا نے نئی چادر بچھائی، ان کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے..... شاید یہ پہلا کام تھا جو فروا خود اپنی ساس کے لیے اپنے ہاتھوں سے کرنے والی تھی اور جہاں بے حد صابر و شاکر اماں کا سامان کمرے سے نکالتے ہوئے اس کا دل نہیں کانپا تھا۔ چادر بدلنے کی کوشش میں جو اس نے تکیہ اٹھایا تو اس کے نیچے سے ہری جلد والی ایک ڈائری نکل کر اس کے قدموں میں گر گئی۔ وہ فروا جس کا دل شاید پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو چکا تھا، یہ ڈائری پڑھ کر اس طرح کانپا اور سویا ہوا ضمیر اس طرح جاگا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اُس نے سوچا کہ آج اماں واپس آئیں گی تو وہ اُن سے اپنے تمام ناجائز رویوں کی رو رو کر معافی مانگے گی۔ اُسے وہ تمام باتیں یاد آ رہی تھیں جو وہ اماں کے سامنے بلند آواز میں کرتی رہی تھی کہ اماں کو کون سا تکلیف پہنچتی ہے، اُن کو کون سا سنائی دیتا ہے، وہ تو مکمل بہری تھیں۔ ڈائری کے اوراق کیا تھے، فروا کے لیے پچتاوے کی آگ تھے۔ ڈائری میں اماں کی داستانِ حیات درج تھی کہ کس طرح سے اُن کی ساس نے شادی کی پہلی رات سے ہی اُن کو اپنا دست نگر رکھا اور کس کس طریقوں سے اُن کو ستایا اور تنگ کیا، کیسے کیسے مظالم سہے انہوں نے اپنی ساس کی جانب سے۔ جب ہی انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بہو کے ساتھ ہرگز سب کچھ نہیں دہرائیں گی..... اور واقعی انہوں نے ایسا کر دکھا۔ ڈائری کا آخری جملہ پڑھ کر تو اس کا دل ایسا کانپا کہ آنکھوں سے آنسوؤں ابل پڑے..... لکھا تھا۔

”میں سُن سکتی ہوں، میری سماعت بالکل درست ہے، میں بہری نہیں ہوں، میں سب کچھ سن سکتی ہوں، مگر اب میں بہرہ ہونا چاہتی ہوں۔ چوں کہ میں خود تو بہری نہیں ہو سکتی، اپنا دل میں اب جان بوجھ کر بہری بن رہی ہوں۔ سب کچھ سنتے ہوئے بھی میری سماعتیں وہ آوازیں میرے دل تک نہیں پہنچا سکتیں۔“

”اے اللہ! اے میرے مالک..... تو مجھے چلنا پھرنا اُٹھانا اور کبھی بیمار ڈال کر کسی اور کے سر پے نہ پھوڑنا.....“

☆.....☆

فروا نے سوچا کہ آج جب اماں اس کی نظر کے سامنے سے واپس آئیں گی تو وہ اُن سے رو رو کر معافی مانگ لے گی اور اماں تو اس قدر وسیع القلب تھیں کہ ضرور وہ اسے معاف کر دیں گی اور اب فروا ان کی میت پر دیوانوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر بین کر رہی تھی۔ گزرا وقت اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا..... جرم کا احساس اور ندامت اسے رُلائے جا رہا تھا مگر گزرا وقت واپس نہیں آ سکتا تھا..... اب اُسے ساری عمر آگہی کے عذاب میں جلنا تھا۔

☆.....☆

کارِ جہاں دراز ہے

چراغ بالی

ہڈالی، ضلع خوشاب سے محمد علی اسد بھٹی کی گرم فرمائی

دو خاندانوں کی دشمنی سے وجود میں آنے والا وہ کردار جس نے پچیس برس تک جرم کی دنیا پر حکمرانی کی

پنجاب کے معروف لوک کردار اور تقریباً 25 سال تک جرائم کی دنیا کے بے تاج بادشاہ رہنے والے چراغ بالی کی زندگی پر متعدد فلمیں بن چکی ہیں، لیکن اصل کہانی فلمی کہانیوں سے بالکل ہی مختلف ہے۔ اصل کہانی کچھ یوں ہے کہ..... چراغ بالی 1928ء میں ضلع سرگودھا کی تحصیل شاہ پور (اب ضلع خوشاب) کے تاریخی اور قدیمی قصبہ ہڈالی کے ایک متوسط خاندان میں محمد حیات بالی کے گھر پیدا ہوا۔ اس خاندان کا آبائی پیشہ کاشت کاری ہے۔ اس خاندان کے افراد قد آور، خوب صورت، اسٹریل اور بہادر جوان ہیں۔ چراغ کی والدہ کا تعلق اعوان قبیلے سے تھا۔ دراصل بالی قوم بھی اعوان قوم کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ چراغ کے علاوہ اُس کے چار بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ چراغ کے بھائیوں میں سے اب صرف ایک بڑا بھائی حاجی میاں محمد زندہ ہے۔

چراغ بچپن ہی سے خود سر اور ضدی طبیعت کا مالک تھا، لیکن ذہین بھی تھا۔ اس کا اکثر اپنے ہم عمر لڑکوں سے لڑائی جھگڑا ہو جاتا۔ اسکول سے بھی اکثر شکایتیں گھر والوں کو آتیں۔ چراغ نے مڈل کلاس تک مقامی اسکول میں تعلیم حاصل کی اور اسی دوران قرآن پاک بھی پڑھ لیا۔ جب چراغ لڑکپن کی حدود پھلانگ چکا تو اُس کی شکایتوں کے پیشِ نظر اُس کا والد محمد حیات اُسے اپنے ساتھ فوج میں لے گیا، چوں کہ چراغ کا والد اور اُس کا بڑا بھائی میاں محمد فوج میں ملازم تھے جو اُس وقت وائسرائے ہند کے باڈی گارڈ رہتے میں شامل اور کلکتہ میں تعینات تھے۔ یہ تقسیم ہند سے قبل فرنگی کے دورِ حکومت کا زمانہ تھا اور فرنگی ایسے بہادر جوانوں کی قدر کیا کرتے تھے، یوں چراغ اپنے والد اور بھائی کے ساتھ وائس رائے ہند کے باڈی گارڈ دستے میں شامل ہو گیا۔

اسی دوران گاؤں میں اپنی ہی برادری کے مدد خان بالی جو کہ محمد حیات کا رشتے دار تھا، جن سے حیات وغیرہ کی رنجش چلی آ رہی تھی، شدت اختیار کر گئی اور مدد خان کے بیٹوں نے چراغ کی غیر موجودگی میں کل پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ چراغ کے گھر میں ہوتے ہوئے یہ لوگ اُس سے خوف زدہ اور سہمے رہتے تھے، کیوں کہ چراغ لڑائی جھگڑوں کا عادی نوجوان تھا اور اب اُس کے فوج میں چلے جانے کے بعد اُن کا راستہ صاف ہو گیا اور وہ اتنے منہ زور ہو گئے کہ انہوں نے مخالفین کے علاوہ شریف لوگوں کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیا۔

ایسے موقع پر جب دو گھرانوں میں رنجش یا مخالفت ہو جائے تو کچھ لوگ محض تماش بینی اور شرارت کے طور پر دونوں خاندانوں میں صلح صفائی کی بجائے مزید نفرت کے بیج بونا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں حیات بالی اور مدد بالی کے گھرانوں کے درمیان لگائی بجھائی والوں نے خوب زہر گھولنا شروع کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں گھرانوں میں دشمنی کی ایسی ابتدا ہوئی جو کہ ابھی تک چلی آ رہی ہے اور درجنوں آدمی اس دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔

دراصل کسی بھی دشمنی کی ابتدا میں زن اور زمین کا بنیادی عمل دخل ہوتا ہے۔ اسی طرح چراغ کی دشمنی کی ابتدا کا سبب بھی غیرت بنی۔ ہُوا یوں کہ قیام پاکستان سے تقریباً ایک سال قبل چراغ کے بھائی کی بیوی (چراغ کی بھابھی) مدد خان بالی کے ایک بیٹے نے زبردستی اغوا کر لی اور اُسے لے جا کر علاقہ غیر میں غائب کر دیا، جہاں اُس کی علاقہ غیر کے پٹھانوں سے دوستی تھی۔

جب معاملہ عزت اور غیرت کا ہو تو انسان انتقام کی آگ میں اندھا ہو جاتا ہے۔ اُس وقت چراغ کلکتہ میں تھا۔ جب اُس کو اِس بات کا علم ہوا تو وہ غضب ناک ہو کر عزت کا بدلہ لینے کے لیے فوج سے بھاگ آیا۔ اُس زمانے میں لڑائی جھگڑوں میں لاٹھی، کلہاڑی اور چھری، بھالے وغیرہ کا استعمال ہوتا تھا، کیوں کہ اُس وقت رائفل یا بندوق عام نہیں تھی۔ چراغ اور مخالف گروپ میں دشمنی کا باقاعدہ آغاز تقسیم ہند سے قبل 1946ء میں اُس وقت ہوا، جب دونوں گروپوں کا پہلا تصادم محلہ بالیاں والا ہڈالی میں ہوا۔ اس پہلی لڑائی میں مدد بالی گروپ کے سربراہ مدد خان، صادق اور صمد بالی تین افراد قتل ہوئے، جب کہ احمد خان شدید زخمی ہوا اور اس تنازع کا مرکزی کردار سرفراز بچ نکلا۔ اس لڑائی کے بعد چراغ بالی کا حوصلہ بڑھا اور اُس نے مدد بالی گروپ کے حمایتی ہمدرد اور اُن کی معاونت کرنے والے اور اپنے مخالفوں سے انتقام لینے کی منصوبہ بندی کی اور جرم کی دنیا میں باقاعدہ قدم رکھا۔ جب آدمی دریا میں چھلانگ لگا دے تو پھر چھینٹوں سے کیا ڈرنا کے مصداق اب چراغ بالی جرائم کی دلدل میں دھنستا چلا گیا اور پھر اس دلدل میں ایسا پھنسا کہ وہ اب اِس سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی اور پلان کے ذریعے دشمنوں کو قتل اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں کرنے لگا۔ متعدد وارداتوں کے بعد کچھ عرصے کے لیے جیل چلا گیا اور پھر ضمانت پر رہا ہو گیا۔ اس عرصے میں چراغ کی اپنی ہی برادری میں پہلی شادی ہوئی، لیکن بوجہ جرائم چراغ اُسے اپنے ساتھ نہ رکھ سکا اور وہ عورت ہمیشہ اپنے میکے میں رہی۔

ضمانت پر رہا ہونے کے بعد چراغ نے پھر سنگین جرائم کا ارتکاب شروع کر دیا اور اب مکمل طور پر ایک خطرناک ڈاکو کے روپ میں چراغ کا نام نہ صرف ضلع سرگودھا بلکہ پنجاب بھر میں خوف و دہشت کی علامت بن گیا۔ سنگین وارداتوں، لوٹ مار، قتل و غارت اور اسی طرح کے دیگر جرائم میں ملوث ہونے کی وجہ سے 1956ء میں پولیس نے اُس کی ہسٹری شیٹ کھول کر اُسے انتہائی خطرناک اشتہاری قرار دے دیا۔ 1956ء سے 1962ء تک چراغ کے عروج کا پہلا دور تھا۔ اِس عرصے میں چراغ نے مدد بالی گروپ کے قتل ہونے والے اُس کے ایک بیٹے کی بیوہ کو انتقاماً اغوا کر کے اُس سے باقاعدہ نکاح کر لیا۔ یہ چراغ کی دوسری شادی تھی۔ اِس عورت کو چراغ نے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا اور اس نے بھی تمام عمر چراغ سے وفاداری کا حق ادا کر دیا۔ اس سے چراغ کا ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔

1962ء تک چراغ اور پولیس کے درمیان آنکھ مچولی جاری رہی۔ اِس کے باوجود بھی چراغ کی وارداتوں میں فرق نہ آیا اور چراغ کے خلاف ضلع سرگودھا کے مختلف تھانوں میں سنگین جرائم کے لاتعداد مقدمات درج ہوئے، جن میں قتل، اغوا اور ڈکیتی کے درجنوں کیس شامل تھے، لیکن پولیس اپنی تمام تر کوشش کے باوجود بھی چراغ کو گرفتار نہ کر سکی اور جب اپنے تمام تر وسائل کے باوجود بھی پولیس کو ناکامی کا سامنا ہوا تو حکومت نے چراغ کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کے لیے دو مربع زرعی اراضی اور دو ہزار روپے نقد انعام مقرر کر دیا۔ اُس زمانے میں دو ہزار روپیہ آج کل کے زمانے کے

لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔

غرض چراغ پولیس کے لیے چھلاوہ بن چکا تھا۔ دراصل ایک تو چراغ کا اپنا مخبری کا نظام پولیس کے مخبری نظام سے زیادہ منظم تھا اور دوسرے پولیس بھی اپنی روایتی بُزدلی کی وجہ سے چراغ سے خوف زدہ رہتی، جیسا کہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ پولیس جرائم پیشہ لوگوں سے تو خوف زدہ اور چور ڈاکوؤں کے آگے بھیگی بلّی بنی رہتی ہے، جب کہ شریف شہریوں اور پُرامن لوگوں کے لیے شیر بن جاتی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب وادیٔ سُون میں ایک اور ڈاکو ملک محمد خان آف ڈھرنال کا راج تھا اور مغربی پاکستان میں ملک امیر محمد خان نواب آف کالا باغ گورنر تھے۔ اُن دنوں اِس علاقے میں دو مضبوط الشّان بڑی مشہور تھیں اور آج بھی بعض مواقع پر دی جاتی ہیں۔ اگر کسی کا رعب و دبدبہ اور ٹھاٹ باٹ یا شان و شوکت کا اظہار کرنا ہو تو لوگ کہتے ہیں ''وہ تو نواب آف کالا باغ ہے'' اسی طرح دوسری مثل تھی ''تو اں کوئی چراغ بالی ایں''

اب چراغ ایک خطرناک ڈاکو کے روپ میں علاقے پر راج کر رہا تھا، لیکن دوسری طرف اُس کا ایک کردار یہ بھی تھا کہ وہ غریبوں اور مظلوموں کا ہمدرد، غمگسار اور مددگار بھی تھا اور علاقے کے وہ غریب اور مظلوم لوگ جو کسی زیادتی کا شکار ہوتے تو وہ پولیس یا تھانے جانے کی بجائے چراغ سے مدد مانگتے اور چراغ ایسے لوگوں کی دادرسی کرتا، انہیں اُن کا حق دلواتا۔ وہ بڑے لوگوں کو لوٹتا اور غریبوں میں تقسیم کرتا۔ چراغ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اُس نے کبھی بھی کسی غریب، شریف یا عام آدمی کو تنگ نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالا، بلکہ وہ علاقے کی عزتوں اور غیرت کا رکھ والا تھا اور خواتین کا تو بے حد احترام کرتا۔ وہ دشمنوں کو تو قتل کرتا، بڑے لوگوں کو لوٹتا، لیکن علاقے کے لوگوں کی عزتوں کا محافظ بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ غریب اور عام طبقے کے لوگوں کی ہمدردیاں چراغ کے ساتھ تھیں۔ وہ دشمنوں کا تو دشمن لیکن دوستوں کا دوست تھا۔

چراغ نماز، روزے کا بھی پابند تھا اور ہر وقت اپنے ساتھ قرآن مجید رکھتا، اُس کی تلاوت کرتا، شاید یہی وجہ تھی کہ اکثر لوگ کہتے تھے کہ چراغ کے پاس کوئی ایسا تعویذ ہے جس کی وجہ سے اس پر کوئی اثر نہیں کرتی، حالاں کہ ایسی کوئی بات نہ تھی اور چراغ کے پاس ایسا کوئی تعویذ وغیرہ نہیں تھا۔

علاقے کے بعض بڑے اور بااثر لوگوں سے چراغ بالی کے مراسم اور دوستیاں بھی تھیں، جو اُس کی پُشت پناہی کرتے، جن میں بڑا ہی کے ایک نوابزادہ جو پولیس کے بہت بڑے افسر تھے، جو بعد میں جھوٹے دور حکومت میں ایف ایس ایف کے بانی ڈائریکٹر جنرل بنے، جیسے لوگ بھی شامل تھے اور ایسے بڑے لوگ مفرور، استہاریوں اور ڈاکوؤں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے اُن کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ نواب آف کالا باغ اور نوابزادہ ٹوانہ کی آپس میں پرانی رنجش چلی آ رہی تھی، جس کی وجہ یہ بھی کہ کسی زمانہ میں نوابزادہ ٹوانہ کے ایک بڑے بھائی، جو کہ پولیس کے بڑے دبنگ قسم کے افسر تھے، اپنی میانوالی میں تعیناتی کے دوران نواب آف کالا باغ کو دس نمبریوں میں شمار کر چکے تھے، جس کی وجہ سے نواب آف کالا باغ کی اِن لوگوں سے نہیں بنتی تھی۔ اب ایک طرف وادیٔ سُون کے ڈاکو محمد خان آف ڈھرنال نے نواب آف کالا باغ کی دوستی تھی تو دوسری جانب چراغ بالی سے نوابزادہ ٹوانہ کے مراسم تھے اور دونوں بڑے یعنی نواب آف کالا باغ، ڈاکو محمد خان کو نوابزادہ ٹوانہ کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا اور اُدھر نوابزادہ ٹوانہ، ڈاکو چراغ بالی کو نواب آف کالا باغ کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا، لیکن محمد خان اور چراغ اِن دونوں کے عزائم کو بھانپ گئے اور انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے نوابزادہ ٹوانہ اور چراغ بالی کے خلاف رنجش پیدا ہو گئی اور نواب زادہ ٹوانہ چراغ بالی کی گرفتاری میں دلچسپی لینے لگا۔ اُدھر چراغ کی کارروائیاں بھی حکومت کے لیے پریشانی کا باعث بننے لگیں تو چراغ کی گرفتاری کے لیے حکومتی سطح پر بڑی منظم اسکیم بنائی گئی اور پھر 1962ء میں شاہ پور کے

میلے کے موقع پر چراغ کو دھوکے سے اپنے ایک دوست نمبردار محمد خان مستیال کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا، یوں چراغ بالی اپنی پہلی مفروری کے بعد گرفتار ہو گیا۔

گرفتاری کے بعد چراغ کو مختلف مقدمات میں مجموعی طور پر 62 سال قید بامشقت، 48 ہزار روپے جرمانہ اور منقولہ جائیداد کی سزا ہوئی۔ 1962ء سے 1971ء تک کے عرصے میں وہ مختلف جیلوں میں رہا، چوں کہ چراغ ایک خطرناک مجرم تھا، اس لیے اسے زیادہ عرصہ ایک جیل میں نہیں رہنے دیا جاتا تھا۔

وہ کبھی مچھ جیل، کبھی میانوالی تو کبھی سرگودھا اور ساہیوال جیسی جیلوں کے چکر کاٹتا رہا۔ میانوالی، مچھ اور ساہیوال کی جیلیں خطرناک مجرموں کے لیے سخت ہیں۔ میانوالی جیل میں چراغ کو اس کوٹھری میں رکھا گیا جہاں انتہائی خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا ہے، جن سے حکومت بھی لرزاں ہوتی اور اکثر سیاسی قیدی اِس کوٹھری کے مہمان بنتے۔ میانوالی جیل کی اِس تاریخی کوٹھری میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا عبدالستار خان نیازیؒ، سردار عبدالقیوم خان، مولانا سید مودودیؒ، رسول بخش تالپور، غلام حیدر وائیں، احمد علی قصوری، نواب اکبر خان بگٹی، نواب غوث بخش بزنجو، شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو جیسی نامور شخصیات ایام اسیری گزار چکی ہیں۔ میانوالی جیل ہی میں چراغ بالی کی نواب اکبر بگٹی سے ملاقات ہوئی، جو بعد ازاں دوستی میں بدل گئی اور پھر تمام عمر چراغ بالی اور اکبر بگٹی کی لازوال دوستی کی مثال قائم ہوئی۔ چراغ کے دوبارہ جیل سے فرار ہونے کے بعد نواب اکبر بگٹی نے ہی چراغ کو اپنے ہاں پناہ دی اور اُس کی بیوی اور بیٹے کو اپنے گھر میں اپنے بچوں کی طرح رکھا اور چراغ کے بیٹے کی اپنے بیٹوں کی طرح پرورش کی جو اب ایک کامیاب انسان اور بزنس مین ہے۔

چراغ کی قید کے دوران 1965ء میں جب پاک بھارت جنگ چھڑی تو چراغ نے اپنے درجنوں ساتھیوں سمیت رضا کارانہ طور پر محاذِ جنگ پر جانے کے لیے حکومت سے اجازت مانگی، لیکن حکومت نے اس کی اجازت نہ دی۔ اِسی قید کے دوران چراغ نے پشتو زبان بھی سیکھ لی تھی۔ اِس تمام عرصے میں چراغ جس جیل میں بھی جاتا، وہاں کا بے تاج بادشاہ بن جاتا۔ جیل میں صرف چراغ کا راج ہوتا اور زیادہ تر اُسی کا حکم چلتا۔ جیل کا عملہ اُس کے سامنے بے بس اور بھیگی بلّی بنا رہتا۔ جیل سے چراغ کا اپنے خاص لوگوں اور گھر والوں اور علاقے کے لوگوں سے مسلسل رابطہ رہتا۔ وہ جیل ہی سے اپنے علاقے کے لوگوں کے کام آتا۔ لوگ اپنے کام کروانے کے لیے اُس کے پاس جیل میں ملاقات کے لیے پہنچ جاتے اور اپنا مسئلہ بتاتے تو چراغ جیل ہی سے پیغام بھجواتا اور متعلقہ شخص کا کام ہو جاتا۔

اسی دور میں پاکستان کی ایک پرانی فلم بغاوت بنی، جس کی شوٹنگ وادیٔ سون کے علاقوں جبی، ڈھوکری اور بڑالی کے شمالی مضافاتی ڈیروں وغیرہ میں ہوئی۔ اِس فلم کی شوٹنگ کے دوران فلم والوں کو گھوڑوں کی ضرورت پڑی تو انہوں نے چراغ کے بھائی گلزار سے رابطہ کیا۔ گلزار نے یہ بات چراغ کو بتائی تو چراغ نے اپنی ایک سفید رنگ کی گھوڑی اداکار کامل اور سُدھیر کو بطور تحفہ پیش کر دی۔ یہ سفید گھوڑی بعد میں بھی بہت عرصہ دوسری بہت سی فلموں میں کام کرتی رہی۔

اگست 1971ء میں جب چراغ کا بھائی گلزار قتل ہوا تو چراغ اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے سرگودھا جیل سے فرار ہو گیا۔ چراغ کے جیل سے فرار ہوتے ہی پنجاب بھر میں ایک بار پھر پبلک مچ گئی اور چراغ کے دشمنوں اور مخالفین کی نیندیں اُڑ گئیں، پھر چراغ نے اپنے مخالفوں کو پچن پچن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے وہ اکثر سوموار کے دن قتل کرتا اور جب بھی سوموار کا دن آتا تو ہڑالی کے لوگ دُعا کرتے کہ اللہ کرے یہ دِن خیریت سے گزر جائے۔ اگر سوموار کے دن کوئی بھی قتل ہو جاتا تو یہ چراغ کے کھاتے میں چلا جاتا۔

اِس عرصے میں یوں بھی ہوا کہ کچھ جرائم پیشہ لوگ چراغ کے نام پر کارروائیاں کرنے لگے۔ ایک دفعہ ایسے ہی کچھ لوگوں نے جب ایک گھر میں ڈاکہ ڈالا تو اُن کے سرغنہ نے کہا کہ میں چراغ بالی ہوں۔ لٹنے والے سہم گئے، وہ چراغ کو نہ پہچانتے تھے اور نہ ہی اُن میں سے

کسی نے پہلے کبھی چراغ کو دیکھا ہوا تھا، انہوں نے صرف چراغ کا نام سن رکھا تھا۔ ڈاکو لوٹ مار کر کے چلے جا رہے تھے کہ اتفاقاً اسی دوران چراغ کا بھی اس جگہ سے گزر ہوا جہاں لوگ اکٹھے تھے اور چراغ بالی کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ چراغ نے جب لوگوں سے اس کی وجہ معلوم کی تو لوگوں نے بتایا کہ ظالم ڈاکو چراغ بالی غریب لوگوں کو لوٹ کر جا رہا ہے۔ جب چراغ کو پتا چلا کہ میرے نام پر لوگ واردات کر رہے ہیں تو اُسے بہت غصہ آیا اور اُسی وقت اُس نے واردات کرنے والوں کا پیچھا کیا اور انہیں راستے ہی سے پکڑ کر واپس لٹنے والوں کے پاس لایا۔ لٹنے والوں کا سارا سامان واپس کروایا اور اُن لوگوں کو بتایا کہ میں چراغ بالی ہوں۔ یہ لوگ میرے نام پر واردات کرتے ہیں، حالاں کہ میں نے کبھی کسی غریب کو نہ تو لوٹا ہے اور نہ ہی کسی مظلوم سے کبھی زیادتی کی ہے، بلکہ میں تو ایسے لوگوں کی مدد کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر چراغ نے اُن چوروں کو اُن لوگوں کے سامنے خوب مارا اور اُن کے کان پکڑوائے، ناک سے لکیریں نکلوائیں اور اُن سے توبہ کروانے کے بعد اُن کا منہ کالا کر کے اُن سے آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ لے کر چھوڑا۔

چراغ مفرور تھا اور پولیس اُس کے تعاقب میں، لیکن چراغ پولیس کو دھوکا دے کر نکل جاتا۔ چراغ اور پولیس کے درمیان اکثر مڈھ بھیڑ بھی ہو جاتی، لیکن وہ ہر بار بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا۔

جولائی 1972 میں چراغ اپنے ایک حریف خادم حسین بالی کی تلاش میں بڈالی شہر آیا تو خادم حسین کو بھی چراغ کی آمد کا بروقت پتا چل گیا، لیکن خادم حسین کے ساتھ صرف دو آدمی تھے، جب کہ چراغ کے ساتھ درجنوں آدمی تھے۔ اب خادم حسین شہر میں آگے آگے اور چراغ اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ آخر جب چراغ خادم حسین کے سر پر آ پہنچا تو خادم حسین اپنے دونوں ساتھیوں سمیت ایک نزدیکی مسجد جو کہ پرانا لاری اڈہ کے نزدیک ہے، اس مسجد میں پناہ لے لی، لیکن اس کے باوجود بھی چراغ نے خادم حسین کو مارنے کے لیے مسجد کے احاطے میں گھس کر فائرنگ شروع کر دی، اندر سے خادم حسین بھی اِکا دُکا فائر کرنے لگا، کئی گھنٹے یہ مقابلہ جاری رہا، جس کی وجہ سے سرگودھا میانوالی روڈ بھی کئی گھنٹے بند رہی، باوجود کوشش کے نہ تو چراغ مسجد میں داخل ہو سکا اور نہ ہی خادم حسین مسجد سے باہر نکلا، بالآخر چراغ نے خادم حسین کی مسجد میں پناہ لینے کے باوجود بھی مسجد کو آگ لگا دی، جس سے مسجد کا کچھ حصہ بھی متاثر ہوا، لیکن مجموعی طور پر نہ تو خادم حسین کو نقصان پہنچا اور نہ ہی مسجد کا نقصان ہوا، حالاں کہ شہر کے کچھ لوگوں نے بڑی گولیوں میں موقع پر جا کر چراغ کو ایسا کرنے سے منع بھی کیا، لیکن چراغ نے اُن کی بات نہ مانی اور ضد میں آ کر خادم حسین کو مارنے کے لیے مسجد کے بے حرمتی کر ڈالی، لیکن ''جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے'' کے مصداق چراغ کوشش کے باوجود بھی خادم حسین کو نہ مار سکا اور اندر سے خادم حسین کے فائر کرنے سے چراغ کی ٹانگ میں کوئی لگ گئی، جس سے چراغ زخمی ہو گیا۔ زخمی ہونے کے بعد جب چراغ کو ناکامی نظر آئی تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا، پھر مسجد کی بے حرمتی کے بعد چراغ کبھی بھی سکون سے نہ بیٹھ سکا۔

اِس واقعہ کے ایک ماہ بعد چراغ نے خادم حسین کو دھوکے سے پولیس کے بھیس میں اپنے بندے بھیج کر بلوایا اور قتل کروایا۔ انہی دنوں میں گورنر پنجاب غلام مصطفیٰ کھر نے سرگودھا کا دورہ کیا، تو سرگودھا کے اشتہاری فتح محمد، جو کہ ایک عورت کے قتل کے علاوہ دیگر کئی قتلوں میں ملوث تھا اور چراغ بالی کا ساتھی بھی تھا، کی شکایت مقتولہ کے لواحقین نے گورنر پنجاب سے کی اور مطالبہ کیا کہ فتح محمد کے علاوہ چراغ بالی کو بھی گرفتار کیا جائے۔ گورنر پنجاب نے لوگوں کی شکایت پر ڈی ایس پی سید باقر حسین شاہ کو چراغ اور اُس کے ساتھیوں کو گرفتاری کے لیے خصوصی ہدایات دیں اور حکومتِ پنجاب کے مکمل تعاون کی یقین دہانی کروائی اور حکومت کی جانب سے چراغ کی گرفتاری کے لیے دو مربع زرعی اراضی اور پچیس ہزار روپے نقد رقم کا اعلان کیا۔

ڈی ایس پی باقر شاہ نے اپنی با اعتماد پولیس ٹیم

کے ساتھ چراغ کی گرفتاری کی منصوبہ بندی کی اور حکومت سے خصوصی اختیارات مانگے۔ آئی جی پنجاب اور گورنر پنجاب سے خصوصی اختیارات کی اجازت ملنے پر باقر شاہ نے مختلف پارٹیاں چراغ کی گرفتاری کے لیے ترتیب دیں۔ نومبر 1972ء میں ایک بُرد اعتماد نوجوان پولیس آفیسر اے ایس آئی محمد رفیق بٹ کی سرکردگی میں چراغ کے ڈیرے پر پولیس نے چھاپا مارا۔ اُس وقت چراغ اپنے ڈیرے پر اکیلا تھا۔ پولیس کی آمد کا چراغ کو پتا چل گیا اور وہ اکیلا ہی پولیس سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا۔ جب پولیس نے چراغ کے ڈیرے کے گرد گھیرا ڈالا تو چراغ نے پولیس سے مقابلہ شروع کر دیا۔ دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا، چوں کہ چراغ کے پاس جدید اسلحے کا ذخیرہ اچھا خاصا موجود تھا، اس لیے وہ مورچہ بند ہو کر فائرنگ کرتا رہا، تقریباً 6 گھنٹے کا تاریٰ مقابلہ جاری رہنے کے بعد شام ڈھلنے لگی تو چراغ مورچہ سے نکل کر نزدیکی کھاد کے کھیت میں چھپ گیا۔ اُس نے پولیس کی وارننگ کی پروا نہ کرتے ہوئے گرفتاری دینے سے انکار کر دیا۔ اے ایس آئی محمد رفیق بٹ جب چراغ کے پیچھے کھاد کے کھیت میں داخل ہونے لگا تو چراغ نے گن کا برسٹ مار کر رفیق بٹ کو ہلاک کر دیا۔ اے ایس آئی رفیق بٹ کے ہلاک ہوتے ہی پولیس تتر بتر ہو گئی اور چراغ موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ چراغ کے ہاتھوں پولیس افسر کی ہلاکت پولیس کے لیے بدنامی اور حکومت کی ناکامی کا باعث بننے لگی تو حکومتی دباؤ کے پیش نظر پولیس زیادہ سرگرم ہوئی اور ڈی ایس پی باقر شاہ نے چراغ کی گرفتاری کے لیے نہ صرف صوبہ پنجاب، بلکہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کی پولیس سے بھی رابطہ کر کے اُن سے مدد مانگی۔

مارچ 1973ء میں پولیس نے مخبری کی اطلاع پر چراغ کی گرفتاری کے لیے جب اُس کی خفیہ کمین گاہ کے ایک نزدیکی ڈیرے پر چھاپہ مارا تو وہاں سے چراغ تو فرار ہو گیا، لیکن پولیس نے اُس کے اسلحے کے ایک بہت بڑے ڈپو پر قبضہ کر لیا، جس میں بھاری مقدار میں جدید اسلحہ اور پولیس کی بے شمار وردیاں بھی شامل تھیں۔

اِس تمام عرصے میں چراغ کبھی سرحد، کبھی بلوچستان تو کبھی پنجاب کے مختلف علاقوں میں پھرتا رہا۔ وہ کبھی کبھار افغانستان بھی چلا جاتا۔ وہ اچانک علاقے میں واپس آتا اور ایک دو کل کر کے پولیس کی دوڑیں لگوا کر پھر روپوش ہو جاتا۔

مئی 1973ء میں چراغ کے ایک ساتھی اور مشہور اشتہاری فتح محمد کو سرگودھا سے گرفتار کر لیا گیا تو گرفتاری کے بعد فتح محمد نے بہت سے انکشافات کر دیے اور چراغ کے خفیہ ٹھکانے بھی پولیس کو بتا دیے۔ جون 1973ء میں جب کہ چراغ اپنی ایک بہن کے ساتھ، جو کہ ہر وقت اُس کے ساتھ رہتی تھی، پشاور سے افغانستان فرار ہونے والا تھا کہ ڈرامائی طور پر پشاور پولیس نے گرفتار کر لیا اور اس کی اطلاع فوراً پنجاب پولیس کو دے دی۔ سرگودھا سے ڈی ایس پی باقر شاہ اپنی زیرِ نگرانی چراغ کو سرگودھا لانے کے لیے روانہ ہوا۔ باقر شاہ کے پشاور پہنچنے پر پشاور پولیس نے چراغ کو باقر شاہ کے حوالے کر دیا اور سخت ترین سیکورٹی میں پولیس چراغ کو پشاور سے سرگودھا کے لیے روانہ ہوئی، ساتھ ہی گرفتاری کی اطلاع گورنر پنجاب کو دے دی۔ چراغ کی گرفتاری کے بعد کئی حکومتی اور پردہ نشینوں کے نام منظرِ عام پر آنے کے خطرے کے پیشِ نظر گورنر نے ڈی ایس پی کو براہِ راست چراغ کو فوری طور پر پولیس مقابلہ بنا کر گولی مارنے کا حکم دیا اور ڈی ایس پی باقر شاہ نے واپسی پر کُھٹہ کی پہاڑیوں میں، جب کہ چراغ کو ہتھکڑی اور بیڑیاں لگی ہوئی تھیں، گورنر کے حکم پر گولی مار کر ہلاک کر دیا اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سول ہسپتال جوہر آباد لایا گیا۔ جب چراغ کی لاش ہسپتال پہنچی تو مجمع بھرے ہوئے لوگوں کا جمِ غفیر چراغ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا۔

یوں تقریباً 25 سال تک جرائم کی دنیا کے بے تاج بادشاہ پنجاب بھر میں خوف و دہشت کی علامت بنے رہنے والے اور مجموعی طور پر 35 سے زائد افراد کے قاتل چراغ بالی کا دور ختم ہو گیا۔

☆.....☆

سچی کہانیوں کا نیا سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

المیہ

فریحہ اعظمی

دیارِ غیر سے ایک مرد کی ناامیدی کی داستان

اس نے لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی پندرہ سال کی بیٹی کھڑی تھی۔ بیٹی کو دیکھتے ہی وہ جذباتی ہوگیا۔ اس نے بڑھ کر اُسے پیار کرنا چاہا، مگر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور ساتھ ہی ایک کاغذ کا ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا۔

"آؤ، اندر آجاؤ۔"

"نہیں مجھے فوراً جانا ہے۔ فاؤسٹ اور میری ممی کار میں میرا انتظار کررہے ہیں۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ اُسے معلوم تھا کہ فاؤسٹ اس کی مطلقہ بیوی کے ساتھ رہتا ہے اور اُس کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہ فاؤسٹ کو اچھی طرح جانتا تھا، کیوں کہ دونوں پبلشنگ کے ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔

اُس نے کاغذ کو غور سے پڑھا۔ پورے مہینے کا حساب تھا۔ اُس کے دو بچوں کی تعلیم، گھر کا خرچ، جس کے کم یا زیادہ کرنے میں اُسے کوئی دخل نہیں تھا۔ اپارٹمنٹ کا کرایہ اور آخر میں بقایاجات کا ذکر تھا جو اس نے کئی ماہ سے ادا نہیں کیے تھے۔

اُس نے چیک بک نکالی۔ کاؤنٹر فوئل پر بیلنس دیکھا اور چیک لکھ کر باہر آیا۔ مسکرا کر اپنی بیٹی کو دیکھا اور چیک اُس کے حوالے کردیا۔ لڑکی نے چیک لے لیا اور بولی۔ ممی نے کہا تھا کہ اس بار تمام بقایاجات کلیئر ہوجانے چاہئیں ورنہ فاؤسٹ کورٹ سے نوٹس لے کر آجائیں گے۔ اُس نے پیار سے بیٹی کو دیکھا اور مسکرایا۔ بیٹی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ دیکھ کر اس کی مسکراہٹ افسردگی میں بدل گئی۔ لڑکی بے اعتنائی سے مڑی اور کار کی جانب چلی گئی جو کہ قریب ہی کھڑی تھی اور جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر اس کی ماں اور برابر کی سیٹ پر فاؤسٹ بیٹھے تھے۔

"اُس نے پورے پیسے نہیں دیے۔"

"کہاں سے دے گا؟"

"مگر عدالت نے فیصلہ دے دیا ہے۔"

"وہ اس لیے کہ ہم نے اُس کے اٹینٹیس کو بہت زیادہ بتایا۔"

"اُسے چیلنج کرنا چاہیے تھا۔ اُس نے کچل تک کو مقرر کرنا ضروری نہ سمجھا How Proud"

"یہ اُس کا پرابلم نہیں تھا۔ اُس کی شرافت تھی، اُس نے یہی کہا تھا کہ میرے اسٹیٹس کے بارے میں میری بیوی سے زیادہ دستاویز پیش کی وہ ٹھیک ہوگی، کیوں کہ اُس کے بارے میں وہ بہتر جانتی ہے۔ میں تو ایک رائٹر ہوں۔ مجھے ان سب معاملات میں دخل دینے کی فرصت کہاں تھی؟"

"اور بیوی کے معاملات میں دخل دینے کی فرصت تھی؟"

وہ بھی نہیں تھی۔ اُس نے تو ہم دونوں کو Compromising Position میں دیکھ لیا تھا۔ بس ضرورت سے زیادہ شریف تھا۔ "یعنی بے وقوف" اُس کی مطلقہ بیوی اور فاؤسٹ نے قہقہہ لگایا۔

اُس کی بیٹی نے فاؤسٹ کی طرف دیکھا اور مسکرائی، لیکن مسکراہٹ ان کے قہقہے میں شمولیت نہ تھی، بلکہ کسی اور خاموش گفتگو کا اشارہ یہ تھی اور وہ گھور رہا تھا۔

"مادری سماج کب تھا اور کب تک تھا۔ اس کا تعین مشکل ہے، لیکن انسانی تاریخ کے آغاز کے بعد اور زمین پر غلہ اُگا کر اور گھروندا بنا کر رہنے کے بعد بہت دن تک عورتوں کی حکمرانی تھی۔ بچے اس ماں کے ہوتے تھے جو انہیں جنم دیتی تھی۔ اس میں باپ کی شرکت نہیں تھی، کیوں کہ باپ ایک اوزار تھا جو ایک جگہ پہ نہیں رہتا تھا۔ اس کا کام بیج بونا تھا اور بس۔ اس کا وجود نہ پیدا ہوتا تھا اور نہ کوئی ذمے داری اس کے تھور کی۔ Vulvocentrism پر معاشرے کی بنیاد قائم تھی۔

کسی خیال کے تحت وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور شاپن ہاور کا مضمون پڑھنے لگا۔

"مرد ہی ایسا ہے جس کی عقل پر جنسی خواہش کا جذبہ ہوتا ہے کہ وہ خوب صورت جنس (Fair Sex) کا نام اس پستہ قد، چھوٹے کاندھوں، چوڑے کولہوں اور چھوٹی ٹانگوں والی نسل کو دیتا ہے۔ اس لیے کہ جنس کی ساری خوب صورتی خود اس کی خواہش کی گرفت میں ہوتی ہے۔ بجائے خوب صورت کہنے کے عورتوں کو "غیر جمالیاتی جنس" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

وہ زیرلب مسکرایا، پھر سامنے دیکھا۔ مینٹل پیس پر اس کی بیوی کی تصویر سفید ویڈنگ گاؤن میں اُس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اُس کی زبان سے بے اختیار نکلا

How Cynical

اور اُس نے ایک اور ورق اُلٹا۔

"ایشیائی اسے بہتر سمجھتے ہیں، اور بلاتکلف عورتوں کی کمتری کو تسلیم کرتے ہیں۔ جب قانون نے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیے تو انہیں عورتوں میں مردانہ دانشوری بھی پیدا کرنی چاہیے تھی۔ ازدواجی تعلقات کے کٹمن سے ایشیائی ہم سے بہتر وداعی داری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہاں ایک سے زیادہ ازدواجی ساتھیوں کی موجودگی کو قانوناً جائز سمجھا جاتا ہے۔ جو ہمارے ہاں کثرت سے عملی طور پر رائج ہے، مگر اسے لفظوں کے انجیر کے پتے میں لپیٹا جاتا ہے۔ حقیقت میں ایک پر اکتفا کرنے والے کہاں ہیں؟"

دور اندر تھی۔

"ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ ہم عورتوں سے کم سے کم واسطہ رکھیں۔ عورتیں ایسی برائی بھی نہیں جو ہماری ضرورت ہیں۔ اُن کے بغیر ہماری زندگی زیادہ محفوظ اور زیادہ آسان ہوتی ہے۔ مردوں کو چاہیے کہ وہ عورتوں کے حسن کے جال سے بچیں اور تخلیق مکرر کا سوانگ خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

جب سے عورتوں کی آزادی اور Phalocentrism کے خلاف نسوانی تحفیز نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی، اس نے اُس تحریک کے فروغ کے لیے بہت کچھ لکھا تھا، لیکن آج ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے تمام مفروضات اور تصورات کو ڈی کنسٹرکٹ کر رہا ہے۔ اُس نے اپنا پرانا مضمون نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔

"پدری سماج کے وجود میں آنے اور مرد اور عورت کے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کے بعد عورت ایک کمزور جنس بھی جانے لگی۔ اس کا کام گھر کو بستی اور بچوں کی نگہداشت ہو گیا اور مادری سماج کے زمانے میں جس طرح مرد اپنی پیداواری اوزار رکھتا، اسی طرح عورت ایک پیداواری اوزار بن گئی اور بچے باپ کے ہو گئے۔"

ایڈیٹر نے یہ جملہ پڑھا تو اسے ایک شرارت سوجھی۔

"تم کس سماج میں رہ رہے ہو۔ مادری یا پدری؟"

"آپ ایسا سوال پوچھ رہے ہیں جس کا جواب میرا مضمون پڑھ کر ایک بچہ بھی دے سکتا ہے۔"

"ہاں۔ یعنی ہم سب پدری سماج کے آدمی ہیں، لیکن تمہارے بچے تو تمہیں گھاس نہیں ڈالتے۔ وہ تو اپنی ماں کے بچے ہیں۔"

"میں آپ کی بات سمجھ گیا۔ ابھی مضمون نامکمل ہے۔"

اور اُس نے پھر لکھنا شروع کیا۔

"شاپن ہاور نے ٹھیک کہا تھا کہ Monogamy محض ایک غلط اصطلاح ہے۔ کوئی صرف ایک سے مستقل تعلقات رکھنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ مشرق نے اس مسئلے کو سمجھا اور اسی لیے وہاں ایک مرد کی کئی بیویاں ہو سکتی ہیں۔ پرانے ہندو سماج میں تو ایک عورت کے کبھی کئی شوہر ہوتے تھے۔ مہابھارت میں دروپدی پانچ بھائیوں کی بیوی تھی۔ اگر کوئی ایسا رواج رہا بھی ہوگا تو بہت جلد اس بنا پر دبا دیا گیا ہوگا کہ نسل باپ سے منسوب کیا جانے لگا جو پدری سماج کی صفت ہے اور باپ کی شناخت کے لیے شاید عورتوں کا کئی مردوں کی بیوی ہونا متروک ہو گیا، لیکن مرد کو اپنے پاس یہ حق رکھنا اور عورت کو اس سے محروم کرنا پدری سماج میں عورت کا استحصال تھا۔ مثلاً

میں مرد اور عورت دونوں کو بڑی حد تک برابری کا درجہ دیا گیا۔ اسی لیے دونوں کا Monogamous رہنا ضروری قرار پایا۔ بڑی حد تک لوگ....." اُس نے یہ جملہ بھی قلم زد کیا اور آگے کچھ نہ لکھ سکا، بلکہ سوچتا رہا۔

"لیکن میں نے تو اُس کی پابندی کی تھی اور شاپن ہاور غلط ثابت کر سکتا تھا، مگر..... جانے کب سے..... بچے تو اپنے ہی ہیں..... ہاں یاد آیا دوسرے بچے کے پیدا ہونے کے بعد..... نہیں نہیں پیٹ میں آنے کے بعد..... مگر وہ اجنبی تو نہیں تھا..... ہاں مگر اتنا فرق بھی نہیں ہوا تھا..... ویسے میں کیا کہتا۔ فاؤسٹ..... نہیں نہیں اس سے پہلے نہیں..... ثابت کیا کرنا چاہتے ہو..... یہ تو ممکن ہے..... اور اب کیا فائدہ..... اب تو کوئی کم کو باپ سمجھتا ہی نہیں..... اس میں ان معصوموں کا کیا قصور..... پھر بھی معاہدے کو توڑنے کے وقت کا تعین ممکن ہی نہیں..... مگر میں..... میں نے تو کبھی..... یا شاید وقت ہی نہ تھا..... یا شاید مجھے سب کچھ مل جاتا تھا..... اس سے نہیں زیادہ کی محبت نہ تھی..... کیا یہ میرا استحصال نہ تھا، کیسے لکھوں کہ پدری سماج میں عورتوں کا استحصال ہوتا ہے۔ استحصال تو میرا ہوا اور اور ہا رہے اور ہوتا رہے گا۔ عورت کے ہاتھوں LIB اور نسوانی تحفیز بے بنیاد ہے..... قانون؟ اس لیے کہ سماج کے لیے کسی باپ اور کسی کی اولاد ہونا ضروری ہے..... اور اسی لیے Adultery جرم ہے، مگر میں ثابت کیسے کرتا..... میری مشرقی سوچ غالب آ گئی۔ ایک عرصے سے مغرب میں رہتے ہوئے بھی میں زندہ مغلبی تنگنے کا عادی نہیں ہوا تھا۔ یہ میری وفاداری اور شرافت اور اچھا شہری ہونے کی صفات کا نتیجہ تھا..... اور یہ زیادتی کا سلسلہ شروع ہوا جسے نہیں معلوم..... اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور فاؤسٹ تو ہماری نسل کے بعد والی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ جب کاؤنٹی کے رجسٹر میں داخل ہوا تو میں دس سال سے ازدواجی رشتوں میں بندھا ہوا تھا..... شاید یہی وجہ ہے..... چالیسویں مائل سٹون پر مرد اور عورت دونوں بجلی اتارنا چاہتے ہیں..... پر میں تو..... معلوم نہیں کیوں؟ شاید میں بزدل تھا۔ شاید مجھ میں تجدید کا جذبہ تھا ہی نہیں۔ شاید میں دھوپ میں زیادہ رہا تھا..... شاید میں نے جلدی کی۔ لیکن نہیں..... میں اور میری سوچ..... Misfit..... اس لیے میں نے جلدی کی..... طلاق دے دی..... دفاع؟ کیا دفاع کرتا..... تجدید وہی تھا..... مگر اس عذاب سے تو بچ سکتا تھا..... اس یہاں بھی مشرق کی شرم و حیا غالب آئی..... اور میں اپنے بچوں کو اپنے سے جدا نہ کرنا چاہتا تھا..... مگر وہ گئے تو بس گئے..... مجھے پہچانتے نہیں..... صرف یہ جانتے ہیں کہ میں مقروض ہوں..... ان کی ماں کا..... جس کا میں نے ان کی نظر میں استحصال کیا..... شادی؟ اب کیا ضرورت ہے اُسے..... البتہ مل جاتی ہے اور وہ بھی مل جاتا ہے جس کے لیے شادی ہوتی ہے، لیکن شاید امید سے زیادہ..... مگر میری بیٹی..... کس کی بیٹی..... وہ تو..... خیر..... فاؤسٹ..... نہیں نہیں..... ہاں ہاں..... اس سماج میں سب کچھ ممکن ہے..... وہ تین سال ہی تو باقی ہیں..... کنسلٹنٹ کے اٹھارہ سال ہونا ضروری ہے..... اٹھارہ سال..... ہر چیز ڈکھاوا، منافقت، قانون کچھ، عمل کچھ، آزادی، آزادی..... پھر قانون کیوں؟

اور وہ ایک دم سے چونک پڑا۔ ریجنٹ پارک کی جھیل سے سُرخاب کا جوڑا ایک ساتھ اُڑا اور دور کنارے پر ایک ساتھ بیٹھ گیا اور اُسے یاد آیا۔ اس کی ماں کہا کرتی تھی یہ سرخاب کے جوڑے ہمیشہ ساتھ ہی رہتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک مر جاتا ہے تو دوسرا اس کے پاس ہی سر پٹک پٹک کر مر جاتا ہے۔ وہ مسکرایا، اور بہت ہی دھیمی آواز میں بولا..... جنٹلمن، نان سنس..... کس نے دیکھا کہ پارٹنر وہی تھے اور بدلے نہیں تھے، مگر یہ کوئی ریسرچ کا موضوع نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اگر یہ جنٹلمن تو سنطلمن تو بہت آگے کی بات ہے، انسان تو پارٹنرز کی زندگی میں سر پٹکتا ہے۔ ایک پارٹنر کی موت کے بعد تو دوسرے کو زندگی مل جاتی ہے شاید یہ اس زمانے کی بات ہے جب پارٹنرز نے ایک دوسرے پر قبضہ کرنا ضروری سمجھا اور معاشرے کا جبر جھٹی آزادی پر غالب آ گیا۔

اور پھر اُسے نیند آ گئی۔ وہ اس وقت جاگا جب دروازے پر دستک ہوئی۔

"رائی تم" اور پھر وہ مسکرایا۔ رائی کچھ کہے بغیر اندر آ گیا اور المینی کابل اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"اس بار کم ہے، بتایا ایڈجسٹ کر دیا گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"اب صرف تمی اور میں رہ گئے ہیں، بچی چل گئی۔"

"کہاں چلی گئی؟" اُس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"اُس نے شادی کر لی، فاؤسٹ کے ساتھ۔"

"فاؤسٹ کے ساتھ؟ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا، مگر اس کے بیٹے نے سوال پہلے کیا۔

"آپ چیک ابھی دے رہے ہیں یا میں پھر آؤں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش گم سُرا رہا، پھر اس نے اپنی میز کی دراز سے چیک بک نکالی اور چیک لکھ کر رائی کے حوالے کر دیا۔

اُس دن اُس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

"فاؤسٹ نے المینی ختم ہونے کی رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔"

☆.....☆

دوسری مرد کہانی

نادیدہ مہرباں

تسمیں غزالہ نہاں

غلط صحبت کے شکار ایک مرد کا قصہ خاص..... جسے ایک نادیدہ ہستی نے دلدل میں گرنے سے بچالیا تھا

ندیم نے وہسکی کی بوتل کی چھپانے کے لیے کپڑوں کی الماری کو منتخب کیا۔ ابھی وہ کپڑوں کی تہ میں بوتل کو چھپانے کی جگہ تلاش کررہا تھا کہ اچانک پتا نہیں کدھر سے آمنہ آگئی..... اس نے ندیم کے ہاتھ میں بوتل بھی دیکھ لی اور چھپانے کی جگہ بھی۔ ''یہ کیا کررہے ہیں آپ.....؟'' اس نے غصے سے پوچھا.....

''کچھ نہیں ذرا اس بوتل کو رکھنے کی جگہ دیکھ رہا ہوں.....'' ندیم نے ڈھٹائی سے جواب دیا..... ابھی تک تو تمام کارروائی آمنہ کی نظروں سے بچ کر ہوتی تھی..... مگر آمنہ کی آمد ڈرامائی طور پر کمرے میں ہوگئی اور ندیم کی تمام احتیاط، جو اس نے آمنہ سے چھپ کر کی تھی، سامنے آگئی..... اس لیے اس نے بھی ڈھیٹ بن کر سچ بول دیا..... اب جھوٹ بولنا بالکل بے کار تھا..... آمنہ نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا.....

''آپ کو کچھ احساس بھی ہے کہ آپ کیا کررہے ہیں..... اب آپ گھر میں بھی ناجائز، حرام اور اخلاقی برائی کا کام کریں گے.....؟ آپ کو بچوں کا بھی احساس نہیں..... اگر ان کو پتا چل گیا کہ ان کا باپ شرابی ہے تو ان پر کیا اثر پڑے گا.....؟''

''بچوں کو پتا چلے گا ہی کیوں اور اگر چلا بھی تو ان کو بتانے والی تم ہوگی۔''

ندیم نے آمنہ کو غصے سے دیکھ کر کہا.....

''ایسی باتیں نہیں سیکھتی ہیں..... خدا کے لیے اس لعنت کو چھوڑ دیجیے..... ایک گھر میں اگر حرام کا استعمال ہو تو وہ پولیس کو رلے ڈوبتا ہے..... گھر سے باہر شغل تو گھر کی بدنامی کا باعث نہیں تھا..... اب آپ نے گھر میں بھی شروع کردیا.....''

''چلو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں، آج کے بعد گھر میں یہ چیز بھی نہیں لاؤں گا.....'' ندیم نے آمنہ کو ٹالنے کے لیے کہا.....

''باہر بھی یہ سب نہیں ہونا چاہیے..... اس کی ذمہ داریوں کا آپ کو اندازہ ہے؟'' آمنہ پھر بولی۔

''جو کچھ تم کہہ رہی ہو..... یہ سب میں بھی جانتا ہوں..... مگر میں کہیں یہ بھی بتادوں کہ مجھے اس کی لت طالب علمی کے زمانے سے ہی لگی ہوئی ہے..... تم بتاؤ کیا میں اتنے عرصے میں کبھی بہکا یا تمہارے حقوق پورے کرنے میں کوئی کوتاہی کی؟ یا کبھی بچوں کے فرائض سے غافل ہوا؟ میں اتنا ہی پیتا ہوں کہ ہوش و حواس سے بیگانہ نہیں ہوتا۔''

''مگر اتنا بھی کیوں؟ جب کہ یہ حرام ہے اور حرام

چیز بربادی ہی کے لیے آتی ہے.....'' ندیم نے جو کچھ کہا تھا..... وہ صحیح تھا..... وہ بھی بہکا نہیں تھا، مگر پھر بھی اس کا یہ فعل بہت بُرا تھا، بہت ہی غلط تھا اس لیے آمنہ نے اسے ایک بار پھر سمجھاتے ہوئے جواب دیا تھا.....

''اچھا..... اچھا..... اب تم میری لتاں مت لو..... کہہ تو دیا میں اب خود چھوڑنے کی کوشش کررہا ہوں۔ بہت ہی کم پینے لگا ہوں۔''

''صرف کم کیوں، ختم کیوں نہیں کردیتے۔''

''کہا تو ہے بہت جلد چھوڑ دوں گا..... چلو اب سوجاؤ اور مجھے بھی سونے دو.....'' مگر آمنہ کی آنکھوں سے تو نیند جیسے اُڑ ہی گئی تھی..... ''اگر اس بات کا بچوں کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا.....؟ کل جب ان کی شادی کا موقع ہوگا تو لڑکی پریشان ہوگی..... اگر کسی کو پتا چل گیا کہ باپ شرابی ہے تو کون ان بچیوں کو بیاہنے آئے گا۔'' آمنہ بڑی فکرمندی سے کہہ رہی تھی۔

''میں نے کہا نا کہ میں کوشش کررہا ہوں اسے چھوڑنے کی۔''

''کوشش ہی کیوں، عمل کریں..... عمل۔''

''اچھا اچھا..... تمہاری بات پر عمل کرنا شروع..... ابھی اور اسی وقت.....''

''سچ.....؟''

''مچ مچھوں.....!'' یہ کہہ کر ندیم نے تکیے میں منہ چھپالیا۔

☆.....☆

رقیہ بانو کو جیسے ہی پتا چلا کہ ان کا لاڈلا بیٹا ندیم..... غلط صحبت اختیار کررہا ہے تو..... اس کی بے راہ روی کا یہ حل نکالا کہ اس کی شادی کردی جائے..... اماں بنیں پہلے تو لاڈ میں بیٹے کو بگاڑ دیتی ہیں..... پھر جب ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو اس کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا جاتا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ بیوی آکر سب سنبھال لے گی..... پھر بے چاری بیوی جو کم عمر بھی ہوتی ہے اور ناتجربہ کار بھی۔ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے..... کہ بگڑے نوجوان کو سنبھال لے گی اور پھر آنے والی ان کی غلطیوں کی سزا ساری زندگی بھگتتی رہتی ہے اور ناکردہ گناہوں کی سزاوار وہی آنے والی ٹھہرتی ہے۔

یہ ہی ایک ہستی ایسی ہے جو اپنی سب کشتیاں جلا کر شوہر کے گھر میں آتی ہے..... ہر لڑکی کے ماں باپ اس کو یہی تلقین کرکے بھیجتے ہیں کہ ''اب شوہر کا گھر ہمیشہ کے لیے تمہارا ہے..... تمہیں ہر حالت میں وہیں گزارنی ہے، بس یہ خیال رہے کہ ڈولی پر جارہی

ہو تو اب ڈولے پر ہی نکلنا ہے۔"

ادھر سسرال والے اس کو یہ کہہ کر بگڑا نواب حوالے کرتے ہیں کہ اب یہ گھر اور شوہر تمہارا ہے..... تم ہی سنبھالو..... گھر تو خیر سنبھل ہی جاتا ہے، مگر بگڑے شوہر کو سنبھالنا بہت مشکل کام ہے..... لیکن وہ صرف اپنا گھر بچانے کے لیے شوہر اور سسرال کے ہر دُکھ سہتی ہے، کبھی ناگزیر حالات میں عورت کو اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے تو بھی زمانے بھر کی تمام بدنامیاں اسی کے ہی کھاتے میں ڈال دی جاتی ہیں، بڑی بوڑھیوں کا کہنا ہے کہ..... "کنواری بیٹی پیاری..... بیاہی بیٹی بھاری۔" اور پیاری بیٹی اسی وقت بھاری ہو جاتی ہے، جب وہ اپنا گھر چھوڑ کے ماں باپ کی دہلیز پر آ کے بیٹھ جائے، چاہے طلاق کی صورت میں ہو یا بیوہ ہونے کی وجہ سے..... پھر چاہے وہ سارے گھر کی مفت کی نوکرانی بن کر دن رات خدمت کرے یا اگر بر سر روزگار ہے تو بھائی بھتیجوں پر اپنی تنخواہ لٹائے، دونوں صورتوں میں اس کو یہی طعنہ ملتا ہے کہ "ہم تمہیں رکھے ہوئے ہیں، ہم تمہیں کھلا رہے ہیں۔" ماں باپ بھی ایسی حالت میں بیٹے اور بہو کا ساتھ دیتے ہیں..... مطلقہ یا بیوہ عورت کی اپنے ماں باپ کے گھر میں بھی قدر کہیں ہوتی..... اس لیے ہمارے معاشرے کی ہر شادی شدہ عورت یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ جہاں رہ رہی ہے، چاہے جہنم ہی کیوں نہ ہو..... وہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہیں..... یہ ہی بے چاری آمنہ کے ساتھ صورت حال تھی۔

☆.....☆

جب تک رقیہ بانو نعیمی آمنہ کی ساس زندہ رہیں، اس وقت تک ندیم گو گھر پر کوئی غیر اخلاقی کام کرنے کی ہمت نہیں ہوئی..... وہ ایک ایسی جگہ نوکری کرتا تھا..... جہاں پر ایک شعبہ ایسا بھی تھا، جس میں کھلے عام رشوت چلتی تھی..... رقیہ بانو اس کی آمدنی کو مشکوک سمجھتی تھیں اور اس پر ہر وقت یہ زور ڈالتی رہتیں کہ وہ یہ نوکری چھوڑ کر کسی اور جگہ ملازمت کی کوشش کرے، جہاں پر حلال کی آمدنی ہو..... لیکن ندیم کا کہنا تھا کہ اس محکمے کی آمدنی بالکل حلال ہے، مگر کچھ لوگ کام کرنے کے لیے لوگوں سے کھلے عام رشوت طلب کرتے ہیں اور وہ رشوت کا پیسا ان کی اپنی جیب میں جاتا ہے..... تنخواہ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں..... ندیم ام الخبائث میں ملوث ہو چکا تھا..... لیکن جب تک ماں زندہ رہی، رشوت سے دور رہا.....

ماں کے مرنے کے بعد تو اسے کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ ویسے بھی برائی اور حرام ایسی دلدل ہے کہ ایک دفعہ انسان حرام استعمال کرے تو پھر اس میں اندر ہی اندر دھنستا چلا جاتا ہے..... ماں کے مرنے کے تین سے اسے اور نگی ٹاؤن کا چھوٹا سا گھر ملا تھا..... اب جب وہ رشوت بھی لینے لگا تو تھوڑے ہی عرصے میں اورنگی کا مکان بیچ کر..... ناظم آباد کراچی کے علاقے میں ایک لگژری فلیٹ خرید لیا..... اس نے کوشش کر کے اپنا ٹرانسفر لینڈ ڈیپارٹمنٹ میں کروا لیا تھا..... جہاں پر "وفضل ربی" کی بارش تھی..... اور پھر بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا کس کو برا لگتا ہے.....

☆.....☆

آمنہ کا تعلق نجیب الطرفین سید گھرانے اور گدی نشین پیر خاندان سے تھا..... اس کے والد بھی پیر ہوئے بزرگ تھے..... جب کہ دادا تو صاحب کرامت پیر تھے..... ان کا نسب برصغیر کے مشہور ولی سے ملتا تھا..... آمنہ کی رگوں میں نیک اور شریف خاندان کا خون تھا..... اس لیے وہ خود بھی ایک نیک سیرت لڑکی تھی۔ برائی سے دور رہنے والی اور حرام سے بچنے والی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس یا اس کے بچوں کو حرام کا ایک لقمہ بھی پیٹ میں جائے۔

ندیم بھی شریف اور سید خاندان سے تھا، مگر کہتے ہیں کہ "دل کے پیٹ میں شیطان" اسی محاورے کے تحت نیک آدمی کا بیٹا سیدھی راہ سے بھٹک گیا تھا..... آمنہ کے والدین کا بھی انتقال ہو گیا تھا..... اب ساس بھی داغ مفارقت دے گئیں..... ندیم کو سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا..... ماں کے مرنے کے بعد والد بھی اپنے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے کے گھر منتقل ہو گئے تھے..... بہنیں سب شادی شدہ تھیں۔

ندیم کی ساری ذمے داری اب آمنہ پر تھی، سیدھی راہ پر واپس لانا اب آمنہ کے لیے ایک چیلنج تھا..... وہ اسی کوشش میں مصروف تھی..... اس نے ندیم کی بے راہ روی کو اپنے اور اپنے بہن بھائیوں سے پوشیدہ رکھا تھا..... اس کو فکر تھی تو صرف یہ کہ اس کے بچوں پر کوئی برا اثر نہ پڑے..... شوہر کی بھی فکر تھی کہ نشے کا عادی انسان ایک نہ ایک دن عقل و شعور سب کھو دیتا ہے.....

ندیم پر بزرگوں کی دعائیں تھیں یا آمنہ کی عبادتوں اور صرف اللہ سے مدد مانگنے کا صلہ کہ ندیم بری عادتوں میں ملوث ہو کر بھی نماز روزے کا بھی پابند تھا۔ بیوی بچوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک رکھتا تھا..... رشتے داروں سے بھی اچھے تعلقات استوار کر رہے تھے۔ گھر والوں کے مسائل بھی حل کرنے میں پیش پیش رہتا تھا..... بزرگوں کی عزت اور بچوں سے بھی شفقت کرتا تھا..... کسی بزرگ خاتون کو سواری کی ضروری ہوتی، کسی کو اسپتال لے جانا ہوتا یا کسی بچے کو اسکول چھوڑنا ہوتا..... ندیم مع اپنی گاڑی کے اپنی خدمات فوراً پیش کر دیتا.....

اسی طرح وہ ہر وقت بزرگوں کی دعائیں وصول کرتا رہتا، شاید یہ ہی وجہ تھی کہ نشہ کرنے کے باوجود وہ اس کا عادی نہیں ہوا تھا کہ بہک جاتا، مگر نشہ چیز ایسی ہے کہ ایک دفعہ پڑ لت لگ جائے تو مشکل ہی سے پیچھا چھوٹتا ہے۔

☆.....☆

آج بھی دوستوں کے ساتھ ویسے ہی "شغل" کا پروگرام تھا..... آج ویک اینڈ بھی تھا..... اس لیے اس نے پہلی ہی سے اس کا انتظام کر لیا تھا..... اب پتا نہیں آمنہ کے کہنے کا اثر تھا..... یا محلے والوں کا خیال کہ اس نے سوچا۔ اس کے گھر سے رات گئے نشے میں ڈوبے ہوئے لوگ نکلیں گے اور کسی نے ان کو ایسی حالت میں دیکھ لیا تو اس کی اپنی عزت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس لیے یہ سوچ کر اس نے اپنے دوستوں کو پروگرام تبدیل کرنے کی فون پر اطلاع دی اور اپنے گھر بلانے پر معذرت کر لی، چنانچہ، ایک ایسے دوست کے گھر پروگرام طے ہوا جس کی فیملی باہر گئی ہوئی تھی۔

لیٹ نائٹ..... اس نے کپڑوں کی الماری میں سے بوتل نکالنے کے لیے جیسے ہی الماری کھولی..... اس کے کان میں بالکل صاف اور واضح آواز آئی.....

"ندیم بیٹا تم بہت اچھے ہو، نشہ کرنا چھوڑ دو..... یہ تمہیں برباد کر دے گا۔" وہ آواز پر اُچھل پڑا، اس نے بے اختیار پلٹ کر بیڈ پر سوئی ہوئی اپنی بیوی کو دیکھا..... اس کا خیال تھا کہ شاید آمنہ نے اس کو ڈرانے کے لیے آواز بدل کر اس کو یہ الفاظ کہے ہیں، مگر آمنہ واقعی بے خبر سو رہی تھی.....!

ندیم واقعی ڈر گیا، مگر دوستوں میں پروگرام طے تھا، اس لیے بوتل لے کر ان کی طرف چلا اور فلیٹ کا دروازہ لاک کر کے نکل گیا..... وہ اتنا ہی شغل کرتا تھا کہ ہوش و حواس قائم رہے۔ پینے کے دوران بھی اس کے کانوں میں وہ آواز گونجتی رہی..... اور واپس آ کر بھی اس کو اسی آواز کا خیال آتا رہا، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا..... پھر وہ اس کو اپنا وہم سمجھ کر سو گیا۔

ایک دن جب وہ آفس پہنچا تو اسے اپنے کولیگ میں کافی جوش و خروش محسوس ہوا۔ پتا یہ چلا کہ کوئی بہت اونچی پارٹی آ رہی ہے..... جس سے "لین دین" کا بہت بڑا معاملہ طے ہوا ہے..... واقعی وہ بہت بڑے لوگ تھے، جنہوں نے کسی کی قیمتی زمین پر ناجائز قبضہ کیا ہوا تھا۔ زمین کا مالک غریب تھا، وہ مقدمے بازی نہیں کر سکتا تھا اور قابضین بھاری رشوت دے کر اپنے نام کاغذات تیار کروانا چاہتے تھے اور پھر وہی ہوا جو دنیا میں ہوتا آ رہا ہے..... اصل مالک روتا رہ گیا..... جھوٹے مالکوں نے اپنے نام کروا لیا، سچ دب گیا جھوٹ کا بول بالا ہو گیا..... ندیم کے حصے میں بھی ایک بڑی رقم آئی۔

آمنہ کو پتا چلا تو اس نے پھر وہ ویدا مچایا کہ حرام کا ایک لقمہ بھی نہ میں استعمال کروں گی نہ اپنے بچوں کو کھلاؤں گی..... مجھے آپ صرف اپنی جائز اور حلال آمدنی دیں، بے شک میں وال روٹی پر گزارہ کروں گی.....

کہتے ہیں کہ "برائی کو طاقت سے روکو، اگر طاقت نہیں تو زبان سے روکو..... اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو دل

میں بُرا سمجھو۔"

آمنہ کی حیثیت اپنی تیسرے درجے کی تھی..... طاقت سے روک نہیں سکتی تھی..... زبان سے بہت کوشش کی، پھر تھک ہار کر دل میں بُرا سمجھ کے بیٹھ گئی۔

دوسرے دن ندیم نے اپنی بیوی بچوں اور خاندان والوں کے ساتھ پکنک کا پروگرام طے کیا، باکس بے جانے پر سب لوگ متفق ہوئے..... مقررہ وقت پر سب خوشی خوشی گاڑی میں بیٹھے یوں یہ قافلہ پکنک کی جگہ کی طرف رواں ہوا..... ابھی گاڑی فائیو اسٹار چورنگی پر پہنچی تھی کہ سامنے سے آنے والے ہیوی ٹرالر سے ندیم کی گاڑی کی ٹکر ہوگئی.....

ندیم آمنہ اور بچے بہت بری طرح زخمی ہوگئے..... مگر حیرت انگیز طور پر خاندان کے باقی افراد بالکل محفوظ رہے..... ان کو ایک خراش تک نہیں آئی، جبکہ پائی ایس وین، جس پر وہ لوگ سوار تھے، بری طرح تباہ ہوگئی۔ اس حادثے میں ندیم کا چھ ماہ کا بیٹا زخموں کی تاب نہ لاکر ختم ہوگیا..... جب ندیم کو ہوش آیا تو اس کے کان میں وہی آواز آئی۔ "ندیم تم پہلی وارننگ کے بعد بھی نہیں سنبھلے..... ہم نے تم سے کہا تھا، برائی کو چھوڑ دو، مگر تم نے دوسری برائی کو بھی اپنا لیا۔ تم جان بوجھ کر بھی حرام کاموں میں ملوث ہو رہے ہو، اب ہم پھر کہہ رہے ہیں، رشوت لینا اور نشہ کرنا چھوڑ دو۔"

☆.....☆

ندیم کی حالت ایسی تھی کہ وہ مڑ کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کے کانوں کے پاس کون بول رہا ہے..... مگر آج اسے یقین تھا کہ یہ کوئی انسان نہیں..... کوئی اور ہی مخلوق ہے جو اس کی ہمدرد ہے اور اس کو برائی کی کھائی میں پوری طرح گرنے سے بچانا چاہتی ہے۔

پھر جب اس کو پتا چلا کہ اس حادثے میں اس کا اکلوتا بیٹا اس سے بچھڑ گیا ہے، تو وہ صدمے سے گنگ ہوگیا..... تین بیٹیوں میں ایک ہی بیٹا تھا، جس کی پیدائش کے بعد آمنہ میں کچھ ایسی خرابی آگئی تھی کہ اب وہ مزید اولاد پیدا نہیں کر سکتی تھی..... پھر بھی ندیم خوش تھا کہ فیملی مکمل ہے، اولاد نرینہ ایک ہی سہی مگر ہے تو.....

آمنہ کا بھی یہ ہی خیال تھا کہ یہ ندیم کی بری عادتوں اور جان بوجھ کر گناہ کرنے کی سزا ہے..... ویسے بھی اس نے صابر وشاکر فطرت پائی تھی، اس لیے دُکھ پانے کے باوجود وہ اللہ کی رضا میں راضی تھی۔

دوسری طرف ندیم میں بھی کافی تبدیلی آگئی تھی..... اس نے نشے اور رشوت سے مکمل توبہ کرلی تھی..... نمازی تو تھا ہی اب ڈاڑھی بھی رکھ لی..... لیکن نشے کی لت جتنی آسانی سے لگتی ہے..... اتنی ہی مشکل سے چھوٹتی ہے، وہ کافی دنوں تک طلب محسوس کرتا رہا..... لیکن آمنہ کی دعاؤں کا اثر تھا..... یا اللہ کا خوف آگیا تھا..... یا نادیدہ ہستی کی نصیحتوں کا خیال کہ وہ طلب کے باوجود بھی پینے سے باز رہا.....

☆.....☆

مثل مشہور ہے "آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا" یہی حال ندیم کا ہوا..... شراب کے نشے کی طلب روکنے کے لیے اس نے تمباکو کا نشہ شروع کردیا۔ اب وہ گٹکا کھانے لگ گیا تھا۔

ہمارے اسلامی جمہوریہ ملک میں جب شراب آزادی سے مل جاتی ہے تو گٹکا..... مین پوری..... اور پتا نہیں کون کون سا نشہ ٹوٹ بچے کو دستیاب ہے.....

کہا یہ جاتا ہے کہ غیر مسلموں کے لیے نشہ بیچنے کی اجازت ہے..... مگر سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں کو مسلم ملک کیوں دستیاب کرے، جب کہ اسلام میں نشہ حرام ہے..... پڑوسی غیر مسلم ملک سے آیا ہوا چھالیہ اور گٹکے کا نشہ بھی ایک مسلمان ملک میں آسانی سے مل رہا ہے..... شاید آزاد ملک میں ہر "غیر اخلاقی" چیز کی آزادی ہے۔

شاید اسی لیے کچھ ہمدرد اور اچھی غیر انسانی قوتوں نے انسانوں کو سیدھی راہ سے بھٹکنے پر روکنے کے لیے ڈیوٹی سنبھالی ہوئی ہے۔

ندیم کے اچھے اوصاف اس کو بھٹکنے سے روکنے پر "کسی" کو مجبور کر رہے تھے۔ ایک دن جب وہ گٹکا منہ میں ڈال رہا تھا کہ پھر اس کو وہی آواز آئی۔

"ندیم بتایا یہ بھی غلط چیز ہے۔"

اور اس دن ندیم اپنی "اصلاح" پر کمر تیار ہوگیا۔

☆.....☆

بلڈنگ میں اس کے تعلقات سب فلور والوں سے بہترین تھے۔ اب تو اسے یونین کے صدر کا عہدہ بھی ملا ہوا تھا..... وہ اپنی بلڈنگ والوں کے مسائل کو حل کرنے کی کوششوں میں رہتا تھا۔

اس دن بھی یونین کی طرف سے میٹنگ رکھی گئی تھی۔ ٹاپ فلور پر میٹنگ کا انتظار کیا گیا تھا۔ جوانوں کے لیے چٹائی بچھا کر فرشی نشست کا انتظام تھا، جب کہ کچھ بزرگوں کے لیے چھت پر کرسیاں رکھوائی جارہی تھیں۔

رات کے کوئی بارہ بج رہے ہوں گے، جب ندیم بحیثیت یونین کے صدر میٹنگ اٹینڈ کرنے کے لیے اپنے فلیٹ سے نکلا ہی تھا کہ اس کے فلور کے ہی ایک لڑکے نے اس کو گنگنے کا پیک تھما دیا..... وہ اس کو منہ میں ڈال کر اوپر چلا گیا۔

منہ میں گٹکے کے ساتھ اس کو بات کرنے میں مشکل ہوئی تو اس نے اُٹھ کر چھت پر تھوڑا آگے جا کر گٹکا تھوک دیا..... بس اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں چلا۔ وہ منہ کے بل گرا..... بہت زبردست چوٹ لگی۔ کچھ شدید تکلیف اور کچھ نشے سے اس نے بلند چیخ سی کہا۔

"کون بدتمیز ہے....."

بس اتنا کہنا تھا کہ کہیں نے اس کو گردن سے پکڑ کر زور سے منہ کے بل فرش پر پٹخ دیا۔ عمل دوبارہ ہوا۔ ایسا لگا جیسے اس کے جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو..... اور بڑی کے تڑخنے کی آواز وہاں بیٹھے لوگوں نے بھی سنی..... "کیا ہوا..... کیا ہوا....."؟ لوگ پوچھتے ہی رہ گئے۔ اور ندیم ہوش سے بیگانہ ہوگیا۔

لوگوں کی مدد سے اسے اسپتال پہنچایا گیا..... کافی سیریس کنڈیشن تھی اس کی، آپریشن ہوا..... خون کی کئی بوتلیں چڑھائی گئیں۔ ڈاکٹر اور اسپتال کا عملہ کسی طرح یہ بات ماننے پر تیار نہیں تھے کہ یہ گرنے کی چوٹ ہے۔ ندیم کے اپنے بھائی اور بہنوئی وغیرہ بھی اس کو تشدد ہی سمجھے، مگر جب ہوش میں آکر ندیم نے بتایا کہ وہ واقعی گر گیا ہے، تب کچھ لوگوں کو یقین نہیں آیا.....

☆.....☆

یقین تو خود ندیم کو بھی نہیں آرہا تھا..... مگر اسی وقت اس کے کانوں میں وہی آواز آئی۔ "ندیم تمہاری زندگی تھی تو بچ گئے۔ ورنہ ہم سے جو بدتمیزی سے پیش آتے تو ہم اسی کو زندہ نہیں چھوڑتے..... تم میں کچھ اچھی عادتیں تھیں اور تمہارے خاندان میں بھی اچھے لوگ ہیں۔ سب سے بڑھ کر تمہاری بیوی آمنہ کے بزرگ کے مریدوں کی اولادوں سے ہمارا تعلق ہے، اس لیے ہم نے تمہارا بہت خیال کیا..... یہ آخری وارننگ ہے، اب اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو ہم تمہارا بالکل لحاظ نہیں کریں گے۔ اپنے انجام کے تم خود ذمے دار ہوں گے۔"

اور پھر سب نے دیکھا کہ ندیم ہاتھ جوڑ کر کسی نادیدہ ہستی سے معافی مانگ رہا تھا..... وہ کہہ رہا تھا۔

"بس آخری بار معاف کردیں اب ایسی غلطی نہیں ہوگی..... میں آپ کا شکر گزار رہوں گا کہ میری غلطیوں کے باوجود آپ نے میرا لحاظ کیا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب آئندہ برائی اور غلط کاموں سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے معاف کردیں، پلیز مجھے معاف کردیں۔" اور پھر اسے صاف محسوس ہوا جیسے کسی نے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ نادیدہ ہستی دامن اس پر مہربان تھی۔ ندیم نے شکر یہ ادا کیا اور آنکھیں موند لیں۔ آمنہ کچھ کہے بغیر سب سمجھ گئی تھی، جب کہ ندیم کے بھائی اور دوست وغیرہ کا خیال تھا..... کہ ندیم چوٹ لگنے کی وجہ سے اپنے حواس کھو رہا ہے..... اسی لیے بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔

☆.....☆

اب ندیم صحت یاب ہو کر گھر آچکا ہے۔ حیرت انگیز طور پر ندیم تمام بری لت میں برسوں سے مبتلا تھا..... سب چھوڑ چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی، بالکل نیا انسان بن گیا ہے۔ جو واقعی انسان ہے۔ دوسروں کا ہمدرد، رحم دل اور مخلوق کی خدمت کے لیے ہر دم تیار..... یعنی اب اس میں انسانیت پیدا ہوگئی ہے۔ ایک نادیدہ مگر مہربان ہستی نے اس کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔

یہ حقیقت ثابت ہوگئی کہ اچھے اور برے ہر مخلوق میں ہوتے ہیں، جو اللہ کی مخلوق کا درد دل میں رکھتے ہیں اور ان کو سیدھی راہ پہ چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ خود بھی ہدایت چاہتا ہو۔ اللہ اپنے ان بندوں کو جو ہدایت چاہتے ہیں، ضرور ہدایت بخشتا ہے کسی بھی ذریعے سے، آسانی عطا کر کے یا آزمائش میں مبتلا کر کے۔

☆.....☆

سُرخ گلاب

طاہر اقبال

اُس مرد کی مردانگی نے زندگی کے دھندلکوں میں

اُسے، وہاں پہنچا دیا جہاں وہ جانا نہ چاہتا تھا

یہ جنوری کا سرد مہینہ تھا، جس کی آج ستائیس تاریخ تھی۔ یہ عصر کا وقت تھا، وہ جاگ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ سپاٹ تھا، جس سے اُس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اُس نے رائل بلیو کلر کی سستی سی شرٹ پہنی ہوئی تھی، جس کی کہنیوں کے بعد کی آستینیں سفید تھیں۔ اِس کے علاوہ اس نے ایک بلیک ٹراؤزر اور ایک پتلا سا سوئیٹر پہنا ہوا تھا۔ یہ سوئیٹر اس نے دو سال پہلے تین سو کا خریدا تھا، سو اب کہاں گزر رہا تھا۔

ماحول میں کافی خنکی تھی، لیکن اُسے سردی بالکل بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ اُس کے ذہن میں بھنور کی طرح چلتی ہوئی سوچیں تھیں۔

پیزا ہٹ (Pizza Hut) سے کچھ قدم کے فاصلے پر ''جھوک'' تھا۔ جھوک کو اُس نے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ''میں ایک دن اتنا امیر ضرور ہو جاؤں گا کہ میں اور نرمین اِس ریسٹورنٹ سے کھانا کھا سکیں گے۔'' مہینوں پہلے رازی نے ایسا سوچا تھا، ایک تلخ سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آن ٹھہری۔

رازی ملتان میں گول باغ کے قریب ایک دڑبے نما فلیٹ میں اپنی بیوی نرمین کے ساتھ رہتا تھا۔ رادی اور نرمین کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، بس یہی کوئی پانچ مہینے..... اس سے پہلے رازی ایک ہاسٹل میں چار لڑکوں کے ساتھ کمرہ شیئر کرتا تھا، پانچ پانچ سو ہر لڑکا کرائے کا دیتا، لیکن شادی سے کچھ عرصہ پہلے اُس نے ایک فلیٹ دو ہزار کرائے پر لے لیا تھا۔ جہاں وہ اب اپنی پیاری سی بیوی نرمین کے ساتھ رہتا تھا۔

رازی کی عمر ابھی کوئی چھبیس سال تھی اور نرمین بیسویں سال میں تھی۔ رازی ایک ڈیفنس فنڈ اسٹور میں بطور سیلز مین کام کرتا تھا۔ صبح نو بجے جاتا اور رات گیارہ بجے واپسی ہوتی۔ وہ رات گیارہ بجے تک نرمین کو اکیلا گھر پر نہیں چھوڑ سکتا تھا، اسی لیے نرمین کی ماں زاہدہ اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ اگر نرمین کے اکیلے ہونے کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید وہ اپنے نشئی شوہر غلام عباس کے ساتھ اپنے اُسی ڈیڑھ مرلے کے مکان میں زندگی گزارنے کے لیے محنت کر رہی ہوتی، لیکن اب..... اب بھی زاہدہ کی شدید خواہش تھی کہ وہ یہیں کوئی دو چار قریب کے گھروں میں کام کرے، تاکہ وہ چار پیسے ہاتھ لگ جائیں، لیکن پھر وہی نرمین کے اکیلے ہونے کا مسئلہ.....

زاہدہ کے پاس اِس مسئلے کا حل موجود تھا۔ وہ نرمین کو اپنے ساتھ اُن گھروں میں لے جاتی، جہاں وہ کام کرتی۔ نرمین کی شادی سے پہلے وہ ایسا کرتی تھی، لیکن اب رازی اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا، بلکہ اُس کی خواہش پر نرمین نے شادی کے بعد چہرہ ڈھانپ کر باہر نکلنا شروع کر دیا تھا۔

نرمین اور رازی دونوں شکل کے اچھے تھے،

لیکن یہاں بھی ایک مسئلہ تھا، غربت نے ان کے چہروں کو کھلنے ہی نہ دیا تھا۔ رازی جس ڈیفنس فنڈ اسٹور میں کام کرتا تھا، وہاں اسے سیلری کے نام پر پینتالیس سو روپے ملتے تھے، جس میں سے اُس کی ہتھیلی پر پینتالیس سو رکھے جاتے۔ اصل میں جس فلیٹ میں وہ رہتے تھے، وہ اس ڈیفنس اسٹور کے مالک کا تھا، جو فلیٹ کا کرایہ پہلے ہی کاٹ لیتا۔ بجلی کا بل، گیس کے سلنڈر کی بھرائی، گھر کراشن پانی..... مہینہ جیسے تیسے گزر ہی جاتا۔ نرمین کڑھائی کا کام جانتی تھی اور وہ تھوڑا بہت کرتی بھی تھی، لیکن جب سے وہ امید سے ہوئی تھی، اُس نے وہ تھوڑی بہت کڑھائی کرنا بھی ترک کر دی تھی۔ اُس کی طبیعت اب کافی خراب رہتی تھی، گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی زاہدہ کرتی تھی۔ نرمین کے حاملہ ہونے کے ساتھ ہی گھر کے اخراجات کافی بڑھ گئے تھے۔ طاقت کی دوائیں (چوں کہ نرمین کافی کمزور تھی) اور دوسرے بہت سے اخراجات کے سبب تنخواہ بہت کم پڑ رہی تھی۔

رازی جس ڈیفنس فنڈ اسٹور میں کام کرتا تھا، وہاں وہ پچھلے آٹھ سال سے کام کر رہا تھا۔ جب وہ سولہ سال کا تھا، تب سے..... جہاں اس نے سولہ سال سے چوبیس سال کا سفر طے کیا تھا، وہاں اُس کی تنخواہ نے بھی دو ہزار سے پینسٹھ سو کا سفر کیا تھا۔

شادی کے اِن پانچ مہینوں میں رازی نے محبت سے عشق اور پھر عشق کی آخری حد تک کا سفر کیا تھا۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز نرمین کے قدموں میں نچھاور کر دے، لیکن صبح سے شام تک کام کرنے

کے باوجود وہ اُسے تین ٹائم کا کھانا بھی صحیح طرح سے نہیں کھلا سکتا تھا۔

موڑ پر پہنچ کر وہ تحصیل چوک کی طرف مڑ گیا۔ تحصیل چوک پر سڑک کے اُس پار ایک بل بورڈ پر ایک خوشبودار صابن کا اشتہار لگا ہوا تھا۔ رازی اس بل بورڈ کو دیکھتے ہوئے چل رہا تھا کہ اچانک بے دھیانی میں اس کی کسی سے ٹکر ہوگئی۔

''سوری'' اس نے ایک دم کہا تھا۔

''سوری کے بچے دیکھ کر نہیں چل سکتے۔''

رازی کا جس لڑکے کے ساتھ تصادم ہوا تھا، وہ رازی سے سات آٹھ سال چھوٹا دکھتا تھا، لیکن اُس نے رازی سے کافی سخت الفاظ میں باز پرس کی تھی۔ رازی نے نوٹس نہ لیا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں تو ایک سیلز مین کے معمول کی زندگی کا حصہ تھیں۔ وہ آگے چلتا رہا بلا کسی تنگر کے، سردی کافی بڑھ گئی تھی، لیکن اسے اس کی بھی پروا نہ تھی۔ اُس نے اب تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دیے، وہ جلد از جلد اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنا چاہتا تھا۔

سینٹرل کالج سے کچھ ہی آگے ''لاسال'' ہائر سیکنڈری اسکول تھا۔ اس اسکول میں اس کے مالک کا بیٹا پڑھتا تھا۔ وہ لڑکا او لیول کر رہا تھا اور دونوں ٹانگوں سے محروم تھا، لیکن وہ پڑھائی میں کافی اچھا تھا۔ اُس لڑکے کو اسکول سے گھر پہنچانا بھی رازی کی ذمے داریوں میں شامل تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے میں اس لڑکے کی مدد کرتا اور اُسے گھر چھوڑ کر واپس ڈپارٹمنٹل اسٹور آ جاتا۔

لاسال ہائر سیکنڈری اسکول سے مخالف سمت پر کچھ فاصلے پر ایک ایس این جی فلنگ اسٹیشن تھا۔ اس کے دائیں کنارے پر ایک پھول والا بیٹھا تھا۔ سرخ، پیلا، مالٹا اور گلابی۔ اس کے پاس چار رنگوں میں گلاب تھے، جن میں سرخ گلاب کی تعداد زیادہ تھی، اس لیے وہ زیادہ نمایاں ہو رہے تھے۔ زرمین کو سرخ گلاب بہت پسند تھے، جس کا اظہار اُس نے کئی بار کیا تھا، لیکن کبھی اُس نے رازی سے لانے کی فرمائش نہ کی تھی۔ رازی کو اس کی جیب نے کبھی بھی اجازت نہ دی تھی کہ وہ خود سے سرخ گلاب لے آئے۔

گلابوں کو دیکھ کر وہ تھوڑا سا مسکرایا، ساتھ ہی آنکھیں بھی تھوڑی نم ہوئی تھیں۔ بیک وقت مسکراہٹ اور آنسو بھی عجیب لگتے ہیں۔ تھوڑا سا مزید چلنے پر وہ نو نمبر چوک پہنچ گیا۔ یہ چوک ملتان کے مصروف ترین چوک میں سے ایک ہے۔ لاری اڈہ، ڈیرہ اڈہ، کلمہ چوک، چوک کہلہارا، گھنٹہ گھر، بی زیڈ یونیورسٹی کے تقریباً تمام بڑے علاقوں کو یہاں سے ویز جاتی ہیں۔

رازی اپنی مطلوبہ وین میں بیٹھ گیا، اسے جس مطلوبہ اسٹاپ پر جانا تھا، اس علاقے کی وین اُسے گول باغ سے بھی مل جاتی، لیکن اُس کے پاس سات روپے اضافی نہ تھے کہ وہ گول باغ سے مطلوبہ جگہ پہنچتا، اسی لیے اُسے گول باغ سے نو نمبر چوک تک ڈیڑھ کلو میٹر پیدل چلنا پڑا تھا۔

جب وہ اکیلا تھا تو اسے تنخواہ سے تھوڑا بہت بچ بھی جاتا تھا۔ پانچ سال اسی طرح رقم بچا بچا کر اس نے زمین کے لیے چاندی کے جھمکے بنوائے تھے، جو اس نے زمین کو بطورِ حق مہر دیے تھے اور شادی پر چھوٹے موٹے اخراجات بھی اسی نے کیے تھے، اپنے دوستوں کو کھانا کھلایا تھا۔ رازی کا آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں، اس لیے قلیل سی رقم میں شادی بیرو خوبی ہوگئی تھی، لیکن شادی کے بعد ہر گزرتے دن کے ساتھ حالات تنگ ہوتے جا رہے تھے۔ مہینے کے آخری دنوں میں تو ہاٹھی کے لیے بھی پیسے نہ بچتے تھے۔

وین آدھی سے زیادہ خالی تھی۔ کنڈیکٹر آوازیں لگا رہا تھا۔ وین بھری تو چل پڑی۔ پچیس منٹ میں اس نے رازی کو اس کے مطلوبہ اسٹاپ پر پہنچا دیا۔ مطلوبہ اسٹاپ پر بھی خوشبودار صابن کا اشتہار بل بورڈ پر لگا تھا۔ زرمین کو خوشبودار صابن خوب پسند تھا۔ شادی کے بعد زرمین نے رازی سے چند بار فرمائش کی تھی اور ہر بار اس کی فرمائش پوری کی۔

''ہو سکے تو نہانے والا خوشبودار صابن لے آنے گا۔'' وہ جھجک سے کہتی۔ اب زرمین کو صابن کا نام

ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا، لیکن رازی کے پاس سبزی لینے کے پیسے نہ تھے، کجا کہ وہ صابن لیتا۔

ستائیس، اٹھائیس، انتیس، تیس اور اکتیس..... اتنے سارے دنوں میں خرچ کرنے کے لیے اُس کے پاس صرف پندرہ روپے تھے، جس سے اب وہ یہاں آیا تھا۔

سڑک پار کرنے کے بعد وہ ایک گلی میں مُڑ گیا۔ مختلف گلیاں مڑنے کے بعد وہ ایک گلی میں ایک کالے گیٹ کے سامنے آ کر رُک گیا۔

ٹراؤزر کی جیب سے اس نے پرچی نکال کر مکان نمبر دیکھا۔ وہ مطلوبہ مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ گھنٹی بجانے سے پہلے اُس کے ہاتھ کانپے، لیکن اُس نے آنکھیں بند کر کے گھنٹی بجا دی۔

چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ ایک پینتالیس پچاس سالہ خاتون نے کھولا، وہ رازی کو دیکھ کر مسکرائی اور اسے لے کر اندر چلی گئی۔

رازی کی اس خاتون کے ساتھ چوتھی ملاقات تھی، اس سے پہلے اس خاتون سے اس کی تین ملاقاتیں اسی ڈپارٹمنٹل اسٹور پر ہوئی تھیں، جہاں وہ ملازم تھا۔

اس کالے گیٹ والے مکان میں صرف دو میاں بیوی رہتے تھے۔ شوہر پچھلے چار ماہوں سے کوما میں تھا، جب کہ بیوی مذکورہ خاتون تھیں، جو رازی کو لے کر گھر کے اندر گئی تھیں۔

رازی کی واپسی ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس خاتون نے رازی کو تین بار پیش کش کی تھی۔ آخری بار پیش کش اسے کل ڈپارٹمنٹل اسٹور پر کی تھی۔ ساتھ ہی اپنے گھر کا پتا بھی ایک پرچی پر لکھ کر رازی کے سامنے پھینک گئی تھی۔

اُس نے جس مقصد کے لیے رازی کو بلایا تھا، وہ ''مقصد'' رازی پورا کر چکا تھا۔ جب وہ اندر گیا تھا، تب اس کی جیب خالی تھی، لیکن اب پانچ پانچ سو والے چار نوٹ اس کی جیب میں تھے۔ جن سے اس نے زمین کے لیے اچھی خوراک لینی تھی، خوشبودار صابن لینا تھا اور..... اور..... اور سرخ گلاب بھی لینا تھا۔

☆.....☆

دبئی میں مقیم مفرد لب ولہجے کے معروف شاعر

سحر تاب رومانی

کا دوسرا مجموعہ کلام شائع ہو گیا ہے

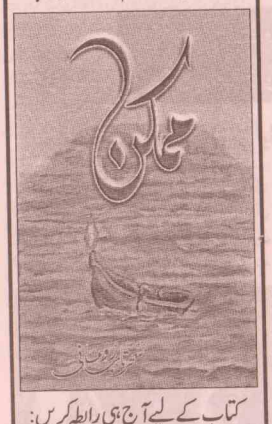

کتاب کے لیے آج ہی رابطہ کریں:

03008202093

علی زبیر پبلی کیشنز

435 خرم آباد لانڈھی نمبر ا کراچی

دوشیزہ ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے

50% رعایتی قیمت =/150

پلیٹ فارم

ڈیرے والی

ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی

اسٹیشن پر جنم لینے والی کہانیاں.....
جن میں جدائی اور ملن کی وسل بھی شامل ہے

حیرت و تجسّس میں ڈوبی ایک خانہ بربادِ دوشیزہ کی کہانی

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ ہر سُو ہُو کا عالم طاری تھا۔ سرد یخ بستہ ہواؤں نے تاریک شب کو اور بھی ہول ناک بنا دیا تھا۔ دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں شبِ تاریک کے گہرے سکوت کو توڑ کر ساعتوں سے وحشت پیدا کرنے والے ماحول میں اچانک ایک سایہ تیزی سے حرکت کرتا ہوا انتظار گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔

☆.....☆

یہ ماڑل کالونی ریلوے اسٹیشن کا ویٹنگ روم تھا، جہاں مسافر ٹکٹ لینے کے بعد گاڑی کی آمد کے منتظر ہوتے تھے۔ ماربل سے بنی سیٹیں قطار سے رکھی ہوئی تھیں اور سردی کے موسم میں ان ٹھنڈی ٹھنڈی سنگِ مرمر کی سلوں پر بیٹھنے کا مزہ ہی اور تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ریلوے ہی مسافروں کی آمد و رفت کا موثر، سستا اور محفوظ ذریعہ سفر جانا جاتا تھا، جو کہ آج بھی ہے۔ ریلوے کی افادیت کبھی کم نہیں ہوسکتی، لیکن اب محکمہ ریلوے بدعنوانیوں، اقربا پروری اور لوٹ مار میں سرفہرست ہونے کے سبب اپنی افادیت نہ صرف کھو چکا ہے، بلکہ علاقوں میں بنے ریلوے اسٹیشن اور پلیٹ فارم اب کھنڈر میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ اربوں روپے خرچ ہونے کے باوجود بھی ریلوے کو اپنی اصل شکل و صورت میں واپس لانا ممکن نظر نہیں آرہا ہے، کیوں کہ سنا رش یافتہ اور نااہل لوگ اس پر مسلط ہیں۔

☆.....☆

اب تو ماڈل کالونی ریلوے اسٹیشن بھی برسوں پہلے ویران و سنسان اور کھنڈر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ وہی اسٹیشن ہے، جہاں سے کبھی ہر آدھے گھنٹے بعد ریلوے کی سیٹی کی آواز گونجا کرتی تھی اور مسافر ایک فرلانگ دور سے اس کی آواز سن کر دوڑ لگا تا تھا اور گاڑی پکڑ لیتا تھا۔ اس کا وقت اس قدر رفتگیں اور پرٹیکٹ ہوتا تھا کہ یہ ماڈل سے ملیر ہالٹ اسٹیشن پہنچتی تو وہاں سے مسافر ٹرانزٹ ٹرین پکڑتے تھے، یعنی وہ لانڈھی جانے والی گاڑی پر سوار ہوکر پیری مارشلنگ یارڈ تک چلے جاتے تھے، پھر یہی ماڈل والی گاڑی انہیں ڈرگ روڈ، جنکشن اور چنسر ہالٹ ایسے مقررہ وقت پر پہنچاتی تھی کہ مسافر یہاں سے ناظم آباد، اورنگی، لیاری، بلدیہ اور وزیر آباد اسٹیشن کے لیے سرکلر ٹرین پکڑلیا کرتے تھے۔ اب یہ تمام باتیں عرصہ گزرا کہ خواب و خیال ہوئیں۔

☆.....☆

وہ بھی کیا وقت تھا کہ ادھر ماڈل اسٹیشن پر گاڑی ماٹا پان سے پہنچی نہیں کہ پلیٹ فارم پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی۔ لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کرتا تھا کہ گاڑی پلیٹ فارم سے لگتے ہی مسافروں سے کھچا کھچ بھر جایا کرتی تھی، لیکن آج.....

صبح چھ بجے سے رات بارہ بجے تک، تسلسل کے ساتھ ماڈل سے ماٹا پان، ملیر چھاؤنی تک ریلوے کا سفر کس قدر سرور انگیز ہوتا تھا، اس کا اندازہ کرنا تحریر سے نہیں، بلکہ سفر کرکے ہی ممکن ہے، پھر جب گاڑی ڈیری فارم ملیر سے گزرتی تھی، تو جون جولائی کی شدید گرمیوں میں بھی ٹھنڈک کا حسین احساس ہوتا تھا اور بڑی مدھری میٹھی میٹھی ہوا کے جھونکے نوزہ جسم کو فرحت بخشتے تھے۔ چوں کہ یہاں کی زمین "ہالومٹی" پر مشتمل تھی، جو کہ پانی اپنے اندر جذب کرکے ٹھنڈی ہوجایا کرتی تھی، تو اس پر ننگے پاؤں چلنے کا مزہ ہی اور تھا۔ جب ٹھنڈی ٹھنڈی ریتیلی زمین پاؤں کے تلوؤں کو چھوتی تو اس کی طراوت آنکھوں کو محسوس ہوتی تھی اور پھر ماٹا پان (MATAPAN) تک ہریالی ہی ہریالی دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں جیسے سبزہ اُگ آتا تھا۔ یہاں مسافر گاڑیوں کے ساتھ ساتھ مال گاڑیوں کی آمد و رفت بھی اسی تسلسل سے ہوا کرتی تھی، جس کے ذریعے پاک فوج کے لیے دفاعی ساز و سامان کی ترسیل ہوتی تھی اور پاک فوج کے جوان بھی اکثر انہی گاڑیوں کے ذریعے سفر کیا کرتے تھے۔

☆.....☆

ریلوے اسٹیشن کے طویل پلیٹ فارم (Platform) کے ایک طرف ریلوے کا ٹکٹ بکنگ آفس تھا، جہاں سے مسافر سفر کے لیے ٹکٹ خریدا کرتے تھے، اسی سے ملحق خواتین کی انتظار گاہ تھی اور اس کے سامنے مردوں کا ویٹنگ روم (Waiting Room) تھا۔ بکنگ آفس کے پیچھے لکڑی کا ایک دو منزلہ کیبن بنا ہوا تھا، جہاں سے ٹرین کو کنٹرول کیا جاتا تھا، اس کا زینہ اوپر جانے کے لیے باہر پلیٹ فارم سے ہی تھا۔ اس کے ساتھ ہی نیچے پانی سے بھرے چار مٹکے اسٹینڈ پر رکھے ہوتے تھے، جو مسافروں کو ٹھنڈا پانی مہیا کرتے تھے، کیوں کہ ٹھنڈا پانی مہیا کرنے والی خود کار سبیل عموماً

گرمیوں میں خراب ہی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بڑا سا چبوترہ بنا ہوا تھا، جس پر مسافر گرمیوں میں آرام کرتے تھے یا پھر اوقاتِ نماز میں نماز ادا کرتے۔

پلیٹ فارم کے ایک سرے پر ریلوے کا رسالہ تھی، جب گاڑی آتی تو ایک اہلکار کراسنگ پر کھڑا ہو جاتا اور دونوں طرف کے ٹریفک کو سرخ جھنڈی دکھا کر روک دیتا اور پھر ہری جھنڈی دکھا کر ٹرین کے لیے راستہ کلیئر کرتا، بعد ازاں یہاں ایک پھاٹک نصب کر دیا گیا، جس سے ٹرین کی آمد و رفت میں مزید سہولت ہو گئی۔ یہ پھاٹک آج بھی موجود ہے۔

ریلوے پلیٹ فارم کے ایک سرے پر ریلوے پھاٹک تھا اور دوسرے سرے پر پٹڑی کے دونوں جانب خانہ بدوشوں کی جھگیاں تھیں۔ انہیں عموماً ''ڈیرے والے'' یا ''سانڈے والے'' کے نام سے جانا جاتا تھا اور ان کی عورتیں ''ڈیرے والی'' کے نام سے مشہور تھیں۔

یہ عورتیں عموماً بھیک مانگ کر یا پھر جسم فروشی کے ذریعے اپنی ضروریات پوری کرتی تھیں اور ان کے مرد سارا دن تمبوں میں پڑے چارپائیاں توڑتے رہتے یا پھر ان کا کام چوری وچکاری کرنا یا منشیات فروشی تھا۔ یہ خود اور ان کی عورتیں بھی بلا کے منشیات نوش ہوتے ہیں۔ یہ ڈیرے والے تو آج بھی اپنی اسی شکل میں آباد ہیں۔ ان کی بڑی آبادیاں ماڈل بلیئر ہالٹ، کالونی گیٹ، چیسر ہالٹ اور ٹسی ریلوے اسٹیشنز پر ہیں، لیکن ماڈل اسٹیشن ریلوے کے بدعنوان اہلکاروں کی وجہ سے ویران و اجاڑ اور سنسان ہو چکا ہے اور اب یہاں ہُو کا عالم بولتے نظر آتے ہیں۔ ریلوے لائن پار کر کے ایک سینما ہال تھا جو اب اپنا بدی کا وجود کھو چکا ہے اور یہ ایک خوب صورت مسجد کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ری سائیکلنگ کمپنی کی فیکٹری تھی۔ جب سینما چھوٹا ٹرین پلیٹ فارم سے لگتی، تو یہ ڈیرے والیاں اپنے گاہکوں کی تلاش میں پلیٹ فارم پر آ جاتیں، ٹرین میں سوار ہو جاتیں، سینما کے گیٹ پر کھڑی ہو جاتیں یا پھر اپنے تمبوں کے باہر لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے مختلف طور طریقے استعمال کرتیں۔ اپنی پنڈلیاں، بازو، کمر حتیٰ کہ پیٹ کا نصف اور گردن سے چھاتی تک کا کچھ حصہ عریاں کر کے انہیں دادِ عیش دینے کی ترغیب دلاتیں، گویا وہ اپنے گاہکوں کو ہر طرح سے لبھانے اور لبھانے کی کوشش کرتیں۔

اس وقت زیادہ تر مزدور پیشہ طبقہ ہی فلم بینی کا شوق رکھتا تھا یا پھر پلیٹ فارم کی سیر کے لیے آتا تھا۔ شام سے رات گئے تک یہ لوگ پلیٹ فارم پر ہی اپنا وقت گزارتے اور ان چھیلیوں سے آنکھ مٹکا کرتے رہتے اور اگر اسی دوران کوئی چھوری پٹ جاتی، تو وہ چند سکوں کے عوض انہیں وہیں پلیٹ فارم کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر یا پھر اپنے کپڑوں اور چھتوں سے بنے خیمے میں لے جا کر بلا کا بھی کر دیتی۔ چوں کہ اس وقت نیٹ اور کیبل کا وجود نہیں تھا، لے دے کے بس یہی سینما ہی یا پھر خال خال ڈی وی ڈی آرکیڈ اجتماعی شکل میں مٹی سینما گھر کی شکل لے کر دل پشوری کر لیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت ان کا جسم فروشی کا دھندہ عروج پر تھا اور ان سے جھیلنے والے زیادہ تر مزدور پیشہ طبقے سے متعلق لوگ ہوتے تھے۔

☆.....☆

اس نے جیسے ہی پلیٹ فارم کے اوپر قدم رکھا تو کھلی فضاء میں یخ بستہ ہواؤں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ ٹھٹھرتا، کپکپاتا، سستاتا، اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں زور زور سے رگڑتا مسلتا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھتا ہوا اس نے زنانہ ویٹنگ روم کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر جیسے اسے تحفظ کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی جلدی قریب پڑے سگریٹ کے خالی پیکٹ، ٹکٹ کے بچے ہوئے اور کاغذ کے مڑے تڑے ٹکڑے، کچھ سوکھی جھاڑیوں کے تنکے اور سگریٹ کے بچے ہوئے ٹوٹے یکجا کیے، پھر انہیں انتظار گاہ کے ایک کونے میں جلا کر سردی سے یخ بستہ ہاتھ سیکنے لگا۔ آگ جلا کر اسے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا اور اس نے کوٹ، ڈنکنڈ، لگا، ٹوپی اور ایمبیسی مارکہ سگریٹ کے جوٹوں جمع کیے تھے، انہیں باری باری سلگا کر کش پر کش لگانے لگا۔ جلد ہی اسے اپنے جسم میں حرارت کا احساس ہونے لگا۔

جیسے ہی اسے سرد ہواؤں کے تھپیڑوں سے بچاؤ کے لیے اوٹ میسر آئی اور آگ کی حرارت نے اسے سکون مہیا کیا تو تھکن سے بوجھل جسم اور نیند سے بھاری آنکھوں نے اسے سونے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن ڈراؤ میلے کیے اور بوٹ کے تسموں کو لو ذکر کے سرے بند کی میلی کچیلی چادر کو اتار کر خ فرش پر بچھا دیا اور گلے سے لپٹے میلے مفلر کو کھول کر سر پر اس طرح لپیٹ لیا کہ اس کے دونوں کان بھی ڈھک گئے اور وہ سگریٹ کا ایک ٹکڑا جلا کر بچھی چادر پر ریم دراز ہو گیا۔ ماحول میں پراسراریت اسی طرح برقرار تھی اور رات کی تاریکی بھی ویسے ہی قائم تھی، جب کہ سرد ہواؤں کے جھکڑ بھی ابھی چل رہے تھے اور وہ نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب سحر ہوئی اور انتظار گاہ میں خواتین، جب کہ پلیٹ فارم پر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔

☆.....☆

سورج کی دو، پہلی کرنیں ابھی زمین پر پڑنا ہی شروع ہوئی تھیں کہ اچانک ایک تیز رفتار چیختی چنگھاڑتی سیٹی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور پلیٹ فارم پر اس قدر شدید ارتعاش پیدا ہوا کہ جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اس اچانک ناگہانی افتاد پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس وقت ٹرین پلیٹ فارم سے لگ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنے اطراف میں جو نظر دوڑائی تو اسے کچھ فاصلے پر چند گنے زبان باہر نکالے عصیلی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے نظر آئے، غالباً جو رات کو اسی کے ساتھ سوئے تھے، پھر بھی انہیں کیا یہ غصہ مافی پسند نہیں آیا تھا، جوان کی جگہ آ کر براجمان ہو گیا تھا۔ ان کی طرف دیکھ کر اس کو ایسا لگا کہ جیسے خون اس کی رگوں میں جمنے لگا ہے۔ کچھ فاصلے پر چند خواتین اور کچھ مرد آپس میں چہ می گوئیاں کرتے نظر آئے، جو غالباً اس کے ہی بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔

اس وقت صبح کے جھٹ رہے تھے اور یہ پہلی گاڑی تھی جو ماتا پان سے وایا ماڈل شہر جاتی تھی اور جس سے جانے والے مسافروں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی، اسی لیے لوگوں نے اس پر بھی توجہ کم ہی دی تھی، لیکن.....

اس کے لیے کسی مچھری پر اکندہ بال، لٹیں مٹی کے ڈھیر میں چیکٹ، میلا کچیلا لباس، سیاہ کوٹ پر مٹی کی چمکتی ہوئی سیاہ تہ، گھنی مگر میلی، اُلجھی ہوئی داڑھی نما زبردستی ہوئی شیو، حالت ایسی کہ جیسے برسوں سے نہایا نہ ہو، دانت پیلے، سگریٹ کے دھوئیں سے داغ دار، مونچھیں بڑی بڑی گھنی مگر میلی سیاہ، جس سے منڈھا ہوا، لب تو نظر ہی نہ آتے، گویا بے منہ کا بالوں والا آدمی، جوتے پرانے، جگہ جگہ سے اُدھڑے اور گھسے ہوئے۔ اس کے حلیے سے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یا تو یہ کوئی پاگل شخص ہے یا پھر کوئی نشہ کرنے والا.....

لوگوں کو اس طرح اپنی طرف متوجہ پا کر وہ جلدی سے اُٹھا، فرش پر بچھی ہوئی میلی کچیلی چادر اٹھائی، اسے کندھے پر رکھا اور جلدی جلدی بوٹ کے تسمے باندھے اور سر جھکائے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پلیٹ فارم کی سیڑھیوں سے اُتر کر ایک جانب کو چلا گیا۔ لوگ اس کو پاگل، یا نیم پاگل شخص سمجھتے ہوئے گاڑی میں سوار ہونے لگے، جو کہ اب پوری طرح سے پلیٹ فارم کے ساتھ لگی، رُکی ہوئی کھڑی تھی۔ چند منٹ بعد ہی وہ اپنی چنگھاڑتی آواز کے ساتھ شہر کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

☆.....☆

آج اسے انتظار گاہ میں رہتے ہوئے دوسرا دن تھا۔ وہ سارا دن نہ جانے کہاں غائب رہتا، لیکن رات کے آخری پہر آتا اور اسی طرح کاغذ کے ٹکڑے جمع کر کے آگ جلاتا، چادر بچھاتا، کوٹ کا بٹن کھولتا، جوتے کے تسمے ڈھیلے کرتا، ایک سگریٹ کا ٹوٹا سلگاتا اور پی کر سو جاتا، پھر وہ صبح پہلی گاڑی کی سیٹی کی آواز سن کر اٹھتا اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر، بلا کچھ کہے سنے سر جھکائے ایک طرف کو چل پڑتا، عموماً وہ پلیٹ فارم سے نیچے اُتر کر دور ڈیری فارم کے سبزے میں کھو جاتا۔

ڈیری فارم میں دُھن کے جاں نثاروں اور قوم کے محافظوں کے لیے گائے اور بھینسیں پلی ہوئی تھیں، جہاں سے ان کے لیے خالص دودھ، دہی، مکھن اور گھی سپلائی کیا جاتا تھا، جبکہ ڈیری فارم سے ان چوپایوں کے لیے چارہ کے طور پر استعمال ہونے والا سبزہ، جسے عام طور پر ''پٹھے'' کہا جاتا ہے، اُگایا جاتا تھا۔ وہ لمبائی میں اس قدر اونچے ہوتے تھے کہ انسانی قد اس میں گم ہو جاتے تھے۔ یہ وقت ضرورت انہیں کاٹ کر جانوروں کو کھلایا جاتا تھا۔ انہیں مشینوں کے ذریعے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بھی کاٹا جاتا تھا، جسے عام طور پر ''کُتی'' کہا جاتا ہے۔ سبزے کے طور پر دودھ دینے والے جانوروں کو خاص طور پر مٹھے کھلائے جاتے ہیں۔

☆.....☆

اب تو یہ روز کا معمول ہو گیا تھا، اس لیے لوگوں نے اس کی طرف توجہ دینا بھی کم کر دی تھی اور ٹکٹ گھر کا بابو بھی، جو عموماً اسے گھورا کرتا تھا، اب اسے کچھ نہ کہتا تھا، بلکہ جمعدار، جو صبح ہی صبح سورج نکلنے سے پہلے پلیٹ فارم کی صفائی کے لیے آجاتا تھا، وہ بھی اب زنان خانے کی انتظار گاہ میں جھاڑو اس وقت لگاتا، جب وہ وہاں سے چلا جاتا۔

پلیٹ فارم کے کتنے ہی اس اسی قدر رانوں ہو چکے تھے کہ وہ اسے دیکھ کر بھونکنے کے بجائے، جیسے ہی اسے آتا ہوا دیکھتے تو دُم ہلاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلے آتے تھے۔ وہ بھی انہیں اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چلنے کو کہتا اور انہیں چمکارتے اور پچکارتے ہوئے اپنے ساتھ زنان خانے تک لے آتا۔ وہ انتظار گاہ کے باہر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھتے رہتے، رات کو وہیں سو جاتے اور صبح ہی اس کے ساتھ چل پڑتے۔

☆.....☆

اسے یہاں رہتے ہوئے اب کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ گو کہ مسافروں نے اب اس میں دل چسپی لینا کم کر دی تھی، لیکن اب لوگوں نے یہ دیکھنا شروع کر دیا تھا کہ جب وہ صبح جاتا ہے تو اس کی بغل میں سیاہ رنگ کا ایک پرانا سا چرمی بیگ دبا ہوا ہوتا ہے۔ اب جمعدار کو بھی یہاں سے کچھ ایسے شواہد ملنے لگے تھے کہ جیسے یہاں پر کئی لوگ رہتے ہیں اور اب اسے یہاں سے کھانے پینے کی کچھ اشیاء بھی ملنے لگی تھیں۔ کبھی بچے ہوئے چاول، تو کبھی سالن اور روٹی کے ٹکڑے، تو کبھی شوربے میں ڈوبے ہوئے نان وغیرہ، یہ پلاسٹک کی تھیلی میں ہوتے یا کاغذ میں لپٹے ہوئے ملتے تھے، بعض مرتبہ چیڑی ہوئی ہڈیاں کتوں کے قریب سے ملیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہاں باقاعدہ شب بسری کا انتظام کیا جانے لگا ہے۔

چوکیدار نے کئی مرتبہ جمعدار کو اس شرط پر بتایا تھا کہ وہ اس کا تذکرہ کسی اور سے نہیں کرے گا۔ یعنی یہ کہ اس نے بارہا دیکھا ہے کہ سامنے پٹڑی کے کنارے، پلیٹ فارم کے سرے پر بڑے گھنے میں سے نکل کر رات کے آخر پہر میں ایک پُر شباب حسینہ اپنے شباب کا جوبن دکھاتی، اٹھلاتی، لہراتی، چھاتیاں ہلاتی، کولہے مٹکاتی یہاں آتی ہے اور صبح ہونے سے پہلے ہی وہ واپس اپنے خیمے میں چلی جاتی ہے۔

اس نے بتایا کہ شب بھر یہاں کیا چرچا ہوتا ہے، یہ تو اسے نہیں اور نہ ہی اس نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی، لیکن اسے یہ ضرور معلوم ہے کہ رات کو وہ حسینہ اپنے جسم کی بھرپور قیمت وصول کر کے اسے خوش کر کے چلی جاتی ہے۔ ہاں یہ ہے کہ کبھی یہ اکیلا، کبھی دو اور بعض دفعہ تین افراد ہوتے ہیں۔ ہلکی ہلکی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں تو آتی ہیں، لیکن ان کے مابین کیا باتیں ہوتی ہیں، یہ اب تک سمجھ نہیں آیا ہے۔ ہاں کبھی کبھی ریشہ ہوا کے شور کو چیرتی ہوئی عورت کی سسکارسنائی دے جاتی ہے۔

☆.....☆

آج تین روز ہو گئے تھے، لیکن وہ انتظار گاہ میں نہیں آیا تھا۔ کتنے ہی اس کی راہ کو تکتے تھک گئے تھے اور آ آ کر اس میں اک دوسرے پر ہو کے کر سردرات کی تاریکی کو چیر رہے تھے۔ ان کا بولنا سردی کی وجہ سے تھا یا احتجاج کے طور پر..... یہ تو پتا نہ چل سکا، البتہ چوکیدار، جمعدار اور پلیٹ فارم پر صبح صبح کی گاڑی سے جانے والے مسافر مرد وزن میں اس سے متعلق چہ میگوئیاں ضرور ہو رہی تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ ایک پاگل شخص تھا، جو اب دماغی علاج کے لیے گھر بند رہیں داخل ہو چکا ہے..... کسی نے کہا کہ وہ کسی مشن پر تھا، جس کی تکمیل پر وہ جشن منانے کے لیے کہیں گیا ہوا ہے۔ کوئی کہتا کہ وہ کسی ٹریفک حادثے میں مارا جا چکا ہے، اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ غرض یہ کہ جتنے منہ تھے، اتنی ہی باتیں تھیں.....

☆.....☆

خیمے میں موجود حسینہ آج اپنے حسن کا بھرپور جادو جگانے میں مصروف تھی، اس نے خود کو سجانے سنوارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ آج وہ اپنی جوانی کا بھرپور طور پر اظہار کرنا چاہتی تھی۔ آج وہ اپنے شباب کی بھرپور قیمت لگانے والی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آج اس کے جسم کا خریدار ضرور آئے گا اور اسے منہ مانگے دام دے کر اس کے بھرپور جسم سے پورا پورا خراج وصول کرے گا۔ خیمے سے پرفیوم کی خوشبو اُڑ کر سرد ہواؤں کے ساتھ پلیٹ فارم کی فضا کو معطر کر رہی تھی۔ ہوا کے دوش پر ہر سُو خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کجرے نے گہرائی لہر کھینچ دی تھی۔ کھلے چاک کی پُشت، مگر مختصر انگیا

کمر سے اوپر تک اس کے فربہ جسم کو نمایاں کر رہی تھی۔ اس کی پنڈلیوں سے اونچے لہنگے نے اس کے بھرے بھرے کولہوں کی گولائی کو خوب واضح کر دیا تھا۔ اس نے اپنی سیاہ زلفوں کو رنگ برنگے پراندوں سے گوندھ کر اور بھی طویل کر لیا تھا۔ اس کا مشکی رنگ رات کی تاریکی میں جو قیامت ڈھا رہا تھا، اس سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ بس..... بجلی اب گری کہ تب گری۔

☆.....☆

آج رات وہ نیم پاگل سا لگنے والا شخص پلیٹ فارم کے زنانہ انتظار گاہ میں موجود تھا۔ اس کے حلیے، شکل و صورت، لباس اور وضع قطع میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، البتہ آج اس کے چرمی بیگ کا سائز پہلے کی نسبت کچھ بڑا بڑا اور بھاری بھاری سا لگ رہا تھا۔ آج وہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی سنجیدہ، متفکر اور سوچوں میں گم نظر آ رہا تھا۔

چوکیدار اپنی شب دیکھی جمعدار کو بتا رہا تھا کہ کس طرح وہ حسینہ سنگتی، بل کھاتی، کمر ہلاتی، کولہے مٹکاتی رات کے آخری پہر نام نہاد بنی بچی، سنوری انتظار گاہ میں آئی اور پھر صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنے جسم کا بھاری خراج وصول کر کے واپس اپنے خیمے میں اسی طرح اپنے جسم کو ہوا کے دوش پر لہراتی واپس چلی گئی۔ اس نے بتایا کہ ”جب وہ نائن سیون واپس جا رہی تھی، تو اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کی کوئی تھیلی نما چیز تھی۔“ وہ کہہ رہا تھا ”ملگجے اندھیرے میں وہ صحیح طور سے یہ شناخت نہیں کر پایا کہ اصل میں وہ کیا چیز تھی.....“

☆.....☆

صبح چھ بجے والی ٹرین پلیٹ فارم سے لگ چکی ہے، لوگ جلدی جلدی گاڑی میں سوار ہونے کے لیے ادھر سے اُدھر آ جا رہے ہیں، زنانہ انتظار گاہ خالی پڑی ہے۔ وہ شخص کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔ ابھی لوگ اسی تجسس میں ہیں کہ شاید وہ شخص آج نہیں آیا، یا اس کی آنکھ کھلنے میں دیر ہو گئی..... ہو سکتا ہے کہ ابھی کچھ دیر بعد ہی وہ شخص کہیں سے آتا ہوا نظر آئے لیکن.....

گاڑی نے وسل دے دی ہے اور اب وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو چکی ہے۔ پلیٹ فارم مسافروں سے خالی ہو چکا ہے۔ ٹکٹ بابو بھی ٹکٹ گھر کی کھڑکی بند کر کے جا چکا ہے۔ اب وہ اس وقت آئے گا جب دوسری گاڑی آنے کا وقت ہوگا۔ ہر گاڑی کے آنے سے پندرہ منٹ پہلے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کھلتی ہے اور لوگ لائن بنا کر جلد از جلد ٹکٹ خرید لیتے ہیں۔ چوں کہ اکثر لوگ نوکری پیشہ والے ہیں اور ان کا شہر آنا جانا روز کا معمول ہے، اس لیے روزانہ ٹکٹ خریدنے کے جھنجٹ سے بچنے کے لیے مہینے بھر کا پاس بنوا لیتے ہیں، جس میں انہیں کچھ پیسوں کی رعایت بھی مل جاتی ہے اور لائن میں لگنے کے وبال سے ان کی جان بھی چھوٹ جاتی ہے۔ وہ ہر مہینے اپنے رعایتی ریلوے پاس کی تجدید کروا لیتے ہیں۔ عام طور پر بھی کبھار یا اشد ضرورت کے تحت یا محض سیر و تفریح کی غرض سے جانے والے لوگ بھی لائن میں لگ کر ٹکٹ خرید تے ہیں۔

☆.....☆

آج کا تازہ اخبار آ گیا..... بھارتی ایجنٹ گرفتار.....

”آغاز“ پڑھیے اور باخبر رہیے..... ایجنٹوں سے ہوشیار..... خبردار..... آج کا تازہ اخبار۔

ملگجے نے پلیٹ فارم پر اپنی پرانی کھچڑہ نما بلیلہ سائیکل کی رفتار کم کر کے آواز لگائی اور ایک اخبار لپیٹ کر ٹکٹ گھر کے کھلے دروازے سے ٹکٹ بابو کی گود میں پھینک دیا..... اس کے بعد آواز لگاتا ہوا یہ جا کہ وہ جا..... چند لوگوں نے بھی جو صبح دوڑ گزاری کے لیے کبھی کبھار اخبار خرید لیا کرتے تھے اور ٹرین میں کھڑے کھڑے چسکے دار خبریں مزے لے لے کر خود بھی پڑھتے اور ساتھ کھڑے اپنے دیگر پڑوسیوں کو بھی سناتے۔ اس طرح سفر سنتے سناتے، خبروں پر تبصرہ اور بحث و مباحثہ کرتے، وقت بلا کسی احساس کے کٹ جاتا۔ اس وقت ماٹا پان سے سٹی شہر کا سفر ایک گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔

”ارے یہ کیا.....“ اخبار کی شہ سرخی پڑھتے ہی مسافر چونک پڑے..... اخبار نے سرخی کچھ یوں جمائی تھی کہ.....

”ناول کا لوئی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کی زنانہ انتظار گاہ سے ایک شخص گرفتار.....“

”رپورٹ کی تفصیل کے مطابق شخص مذکورہ بھارتی خفیہ ایجنسی ”را“ (RAW) کا ایجنٹ تھا، جو نیم پاگل شخص کا حلیہ بنائے کئی ماہ سے لیڈیز ویٹنگ روم میں رہائش پذیر تھا۔ اس کی سرگرمیاں ملیر چھاؤنی، ڈیری

فارم، ماٹا پان اور ارد گرد کے علاقوں تک وسیع تھیں اور یہ مخص حساس علاقوں کی تصاویر، دفاعی تنصیبات کی تفصیل اور پاک فوج کی نقل و حمل سے متعلق رپورٹس بھارتی خفیہ ایجنسی (RAW) کے ہیڈ کوارٹر ارسال کیا کرتا تھا، جس کی روشنی میں بھارتی عسکری ذرائع اور حکومت اپنی پالیسی طے کرتی تھیں اور پاکستان کے خلاف حکمت عملی وضع کرتی تھیں۔ اس کا رابطہ اپنے مرکزی دفتر سے بھی تھا۔ اسے ملیر کنٹونمنٹ ایریا میں مشکوک سرگرمیوں کے سبب گرفتار کیا گیا تھا اور اس کے پاس سے خفیہ دستاویزات، حساس علاقوں کے نقشے، چھوٹا سا ٹرانسمٹر ریڈیو اور دیگر حساس آلات برآمد ہوئے تھے۔"

اس نے اپنی خفیہ سرگرمیوں کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ.....

"وہ کافی عرصے سے کراچی میں مقیم ہے اور اس کا ایک ساتھی ملیر چھاؤنی کے اندر مولوی کا روپ دھارے ایک مسجد میں پیش امام کے فرائض انجام دے رہا ہے، جب کہ اس کا دوسرا ساتھی ایئر پورٹ کے علاقے میں، اس جگہ سے کچھ فاصلے پر حساس علاقے میں ایک آستانہ بنائے پیر فقیر کا روپ دھارے تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کا کام کر رہا ہے۔ یہ لوگ مختلف روپ میں دفاعی اداروں اور وطن پاک کے جاں نثاروں کی سرگرمیوں کی اطلاع اپنے وطن بھیجا کرتے تھے اور انہیں ان کے مرکز، بھارت کی خفیہ ایجنسی "را" کے ہیڈ کوارٹر سے براہِ راست ہدایات جاری کی جاتی تھیں۔"

خبر کی تفصیل میں یہ بھی درج تھا کہ.....

"سی آئی ڈی پولیس نے ماڈل اسٹیشن کے چوکیدار اور جمعدار کو بھی اس کی اعانت کرنے کے جرم میں گرفتار کرلیا ہے، کیوں کہ چوکیدار نے بھی اس مشکوک شخص کے بارے میں جاننے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی اس کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی کوئی تفتیش کی، پھر یہ کہ کس طرح اس کی موجودگی میں کسی مشکوک شخص نے سرکاری لیڈیز ویٹنگ روم میں رہائش اختیار کرلی۔ جمعدار کو چوکیدار نے اپنا رازداں بنایا، لیکن اس نے بھی کبھی زبان نہ کھولی، کیوں کہ یہ دونوں باقاعدہ روزانہ کی بنیاد پر ایک معقول رقم بطور نذرانہ وصول کرتے تھے۔"

خبر کے آخر میں تفصیل کچھ یوں تھی.....

"سی آئی ڈی پولیس نے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ سے متصل ریلوے پٹری سے ملحق ایک خیمے سے "ڈیرے والی" ایک ناگن حسینہ کو بھی گرفتار کرلیا ہے، جس کے پاس سے ایک سیاہ رنگ کا چرمی بیگ برآمد ہوا ہے، جو بھارتی کرنسی سے بھرا ہوا تھا اور چوکیدار و جمعدار کو نذرانہ بھارتی کرنسی میں یہی حسینہ دیا کرتی تھی، ساتھ ہی وہ اس سے جسمانی خراج بھی وصول کرتے تھے۔"

یہ خبر پڑھ کر مسافروں کو تو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا اور وہ اس پر تبصرہ کرنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ انہیں تو اس بات پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے اتنا کچھ ہوتا رہا ہے اور انہیں خبر ہی نہ ہوئی.....

اب وہ خود کو بھی اس جرم میں برابر کا شریک سمجھ کر شرمندہ سے تھے کہ آخر انہوں نے کبھی کیوں نہ اس مشکوک شخص کی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ کی.....؟

☆.....☆

آج بھی صبح کے چھ بج چکے ہیں، ٹرین پلیٹ فارم سے لگ چکی ہے۔ مسافر مرد و زن سے پلیٹ فارم بھرا ہوا ہے۔ لوگ سر جھکائے ٹرین میں سوار ہو رہے ہیں، لیکن آج کسی کی نگاہ زنانہ انتظار گاہ کی طرف نہیں اٹھی اور نہ ہی کسی نے کوئی تبصرہ کیا تھا..... اخبار والا بھی آیا تھا..... لیکن وہ بھی خاموشی سے اخبار نکٹ بابو کی گود میں ڈال کر چلا گیا..... موسم بھی رفتہ رفتہ بدل رہا تھا اور ابھی گرمی کی آمد تو نہ ہوئی تھی، لیکن خنکی بھی ہوا سے رخصت ہو چکی تھی..... ڈیرہ بھی قریباً ویران ہو چکا تھا، کیوں کہ ان سب کو عدالت نے طویل سزائیں سنائی تھیں..... چوکیدار اور جمعدار بھی اب نئے آگئے تھے، جو اپنے فرائض بڑی تندہی سے انجام دے رہے تھے..... لوگوں نے بھی اب اس حوالے سے اپنے ذہن کو کافی تبدیل کرلیا تھا اور وہ ہر مشکوک شے پر بھرپور نظر رکھنے لگے تھے۔ اس قدر تبدیلی واقع ہونے کے باوجود آج بھی ماڈل سے ماٹا پان کا سفر ویسا ہی ہرا بھرا ہے اور آنکھوں کو طراوت بخشتا ہے۔ اس علاقے میں جا کر دل کو یک گونہ سکون سا حاصل ہوتا ہے، نہ جانے کیوں.....؟

شاید میرا دل بھی وطن کے جاں نثاروں کی محبت میں ان کے ہمراہ دھڑکتا ہے۔

☆.....☆

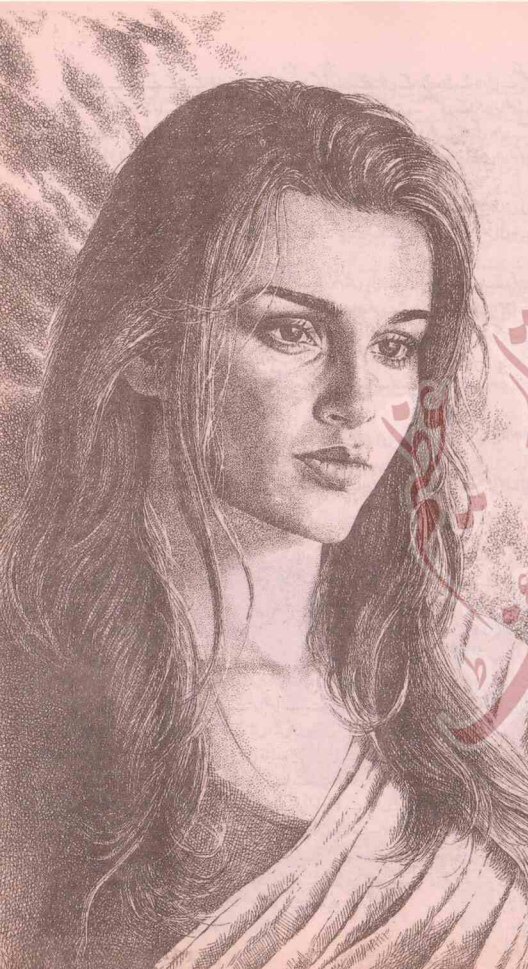

مکھی

ارشد علی ارشد

خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد ایک خوبصورت لڑکی کی داستان جب کی رسوئی کرتی

قسط وار کہانی پڑھئے

گزشتہ قسط کا خلاصہ

ایک روز نورالدین زنگی کو خواب میں رسول ﷺ کی زیارت ہوئی۔ جواب میں رسول ﷺ نے سلطان کو یہودیوں کی کھودی جانے والی سرنگ کے بارے میں بتایا۔ تین دن مسلسل دکھائی دینے والے خواب نے سلطان کو پریشان کردیا۔ وہ مدینہ منور جا پہنچے۔ آنحضرت ﷺ نے سلطان کو یہودیوں کی سرنگیں زمین نشین کرادیں۔ سلطان نورالدین زنگی مدینہ والوں کی دعوت کا اہتمام کرتا ہے، مگر دعوت میں شیطان صفت یہودی نہیں آتے۔ سلطان کو معلوم ہوتا ہے تو وہ خود ان کے حجرے میں پہنچتا ہے اور انہیں پہچان کر روضۂ اطہر ﷺ تک پہنچنے کی ناپاک سازش کرنے والے یہودیوں کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔

مکھی کا ذہن ایک اور کروٹ لیتا ہے تو وہ خود کو ایسی جگہ پاتی ہے جہاں سلور کی چار بڑی کڑاہیاں انگاروں سے بھری پڑی تھیں۔ تیس کے قریب موجود لوگ انگاروں سے پندرہ بیس میٹر دور کھڑے باتیں کررہے تھے۔ مکھی انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہے اور ان کی پریشانی کا سبب پوچھتی ہے۔ ایک بوڑھا شخص بتاتا ہے کہ ان کا تعلق چترال کے خوب صورت اور مذہبی گاؤں جلال آباد سے ہے۔ جلال آباد کے تمام لوگوں کا ذریعہ معاش ان کے چھوٹے بڑے پہاڑی کے باغات ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے سے پیداوار میں کمی ہوگئی ہے اور اس سال تو ان پر ایسا عذاب اترا کہ صرف ایک حصہ ملا، باقی تین حصے زہریلے کیڑوں کی نذر ہوگئے۔ پوری بستی میں ایک ہی خستہ حال مسجد ہے جس میں بہ مشکل چار پانچ آدمی نماز پڑھتے ہیں۔ بستی کے اکثر لوگ بے نمازی ہیں، بلکہ بہت سوں کو تو نماز پڑھنا بھی نہیں آتی۔ ان کی بات سن کر مکھی غصے میں آجاتی ہے، وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتی ہے اور انگاروں کی کڑاہی میں اتر جاتی ہے اور انگاروں کو کوٹ کر سرمہ بنادیتی ہے۔ تینوں کڑاہیوں کی آگ ٹھنڈی ہوجاتی ہے اور لوگ خوشی سے بغلگیر ہونے لگتے ہیں۔ تب وہ انہیں صبح کرنے اور ایمان مضبوط کرنے کی تلقین کرتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ لوگ اپنا مقصد حیات پہچانو، جب تم لوگ اپنا مقصد حیات پہچان لو گے تو پھر تمہیں کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔

ذہن کی اگلی جست میں وہ اپنے گھر کے نزدیک تھی، اس نے گھر کی طرف قدم بڑھائے پھر روک لیے، گھر والے

ڈنڈے اور لوہے کے سریے اٹھائے اس کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ دوڑتے بلادل نے مکھنی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا ”مکھنی بھاگ جاؤ یہ لوگ تمہارے قتل کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔“ مکھنی کے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ اس نے سوچا، مکھنی تیرے حق میں بھاگنا ہی بہتر ہے۔ میں انہیں کاٹنے کی طرح پیچھے لگی ہوں۔ مکھنی حیران تھی کہ اسی ابو میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ وہ تھک نہیں رہے۔ گاڑیوں، رکشا، موٹر سائیکلوں اور لوگوں کی بھیڑ سے بچتی بچاتی وہ بھاگی چلی جا رہی تھی۔

”میرے دشمنوں کا کیا حال ہے؟“ یہ سوچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک نیزہ اُڑتا ہوا آیا اور اس کی آنکھ میں کھب گیا۔ اس کی آنکھوں کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ شیشہ ٹوٹنے کے جھٹکے سے وہ لڑکھڑائی، اسے احساس ہوا کہ وہ پانی سے ٹکرائی تھی۔

جب مکھنی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو انتہائی آرام دہ بیڈ روم میں پاتی ہے۔ وہ سوچتی ہے نہ جانے یہ کون سی دنیا کا خوب صورت کمرا ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور کمرے میں ایک وجیہ نوجوان ادھیر عمر کی باوقار سی ایک خاتون اور جینز اور جیکٹ میں ملبوس ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کمرے میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ سب خلا میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ مکھنی خود سے سوال کرتی ہے، پھر وہ لوگ ایک ایک کر کے آگے بڑھتے ہیں اور مکھنی کے پاؤں چھوتے ہوئے کمرے سے نکلتے جاتے ہیں۔

(اور اب آگے پڑھیے)

وہ جس طرح آئے، اسی طرح باہر نکل گئے۔

”یہ سب کیا تھا، میں کہاں پہنچ گئی ہوں؟“ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ”میں کون ہوں؟“ سوالوں کی بوچھاڑ اور سوچ کے گھوڑے سرپٹ دوڑنے لگے۔

☆.....☆

شہرِ ذات کی پہچان ایک مشکل ترین کام ہے۔ اس شہر کے بے شمار دروازے ہیں، مگر ایک بھی نہیں۔ یہاں داخلے کے لیے جس طرف دل چاہے چلے جاؤ، واپسی کے لیے سارے راستے سارے دروازے بند ملتے ہیں، ایسی صورت میں دل پر ایک انوکھا عذاب اُترتا ہے۔ اس عذاب میں ساری خوشبوئیں، مسکراہٹیں، گلاب رُتوں کے سارے موسم، جاگتی اور بند آنکھوں کے خواب ناتمام! سب دل کی دہلیز پر آ کر دم توڑ دیتے ہیں۔ حیرت اور آگہی کا کوئی ایک لمحہ شہرِ ذات میں اُترتا ہے تو ایک طوفان مچا دیتا ہے۔ ذلت کے شہر کی ماری فصیلیں چیخ جاتی ہیں اور اپنی جستجو کی طلب بڑھ جاتی ہے، مگر اس طلب میں اپنے آپ کو گم کر دینے کے سوا کوئی دوسرا کنارہ ہاتھ نہیں آتا۔ جب اپنا آپ گم ہو جائے تو پھر سوال اور سوالوں کی سوچ در سوچ دماغ کی پتلی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کے اسے لہولہان کر دیتے ہیں۔ کبھی جواب پا لیتے ہیں اور کبھی یوں ہی پہنچتے پہنچتے جامِ زہر پی لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، میں کون ہوں..... کتنا انوکھا مگر بامعنی سوال ہے۔ اس کا جواب پانے کے لیے محبوب کی گلیوں کی نہیں، بلکہ جہانوں کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ ہمہ گیر جدوجہد کے ساتھ جسم و جاں سے ماورا ہو کر کھوجنا اور سوچنا پڑتا ہے، گویا ذات کے شہر کو پانے کے لیے دانتوں سینہ آ جاتا ہے، چہ کہ تکمیلِ ذات کا دعویٰ کیا جائے ورنہ ذات وہ چیز ہے جس کے ساتھ اسماء صفات کو نتھی کیا جاتا ہے۔ اس طرح ذات اور صفات کا فرق مٹ جاتا ہے۔ جب ذات اور صفات کا فرق مٹ جائے تو اندر طوفان مچل جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو، کیوں کہ بات وجودِ محض اور وجودِ مطلق پر چلی جاتی ہے۔ تکمیلِ ذات کی صرف کوشش ہو سکتی ہے، دعویٰ ہرگز نہیں۔ ہاں شہرِ ذات کی آگہی ممکن ہے۔

خوب صورت سجے ہوئے کمرے میں شہرِ ذات کے بارے میں سوچنا میرے لیے کسی اذیت سے کم نہیں۔ ذات کی صفر تک پہنچتے پہنچتے میرے پاؤں لہولہان اور جسم زخموں سے چور چور ہو گیا۔

میں دنیا کی کون سی مخلوق میں شمار ہوتی ہوں؟

☆.....☆

ٹھک، ٹھک، ٹھک۔ ذہن میں ایک ذیلی کھڑکی کھلتی ہے۔ ایک نامانوس، انجان اور ناآشنا مخلوق کھڑکی سے جھانک کر مجھ سے فنِ گویائی کو پوچھیں کر کہتی ہے۔

”تیری سوچ کس قدر بلند اڑان بھرتی ہے کہ وہ انتہائی وسعتوں میں پہنچ جاتی ہے، جہاں بلند یوں پر یہ رُکتی ہے، وہیں سے شہرِ ذات کی پہچان کا آغاز ہوتا ہے، مگر افسوس صد افسوس کے آغاز میں ہی تیرے پر پھڑ پھڑاتے ہیں اور تو دھڑام سے پستی میں آ گرتی ہے۔“

”پہلیلیاں نہ بجھا..... میرا دماغ اور سوچ پہلے ہی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مجھے میری پہچان کروا، تاکہ میں اس خوب صورت کمرے اور کمرے میں آئے ہوئے صاف ستھرے، خوب صورت چہروں کی پہچان کر سکوں۔ ان کے عمل کو جان سکوں۔ وہ سوٹ بوٹ میں ملبوس چمکدار لوگ کتنی زبان رکھتے تھے، جگر خاموش رہے، کچھ کہا نہ سنا۔ میں ان کی اس ناقابلِ فہم حرکتوں کو حتمی جامہ کیسے پہناؤں؟“

”تو کیا چاہتی ہے؟ شہرِ ذات کی آگہی، یا صفتی پہچان؟“

صفتی پہچان کے عقب میں شہرِ ذات کی آگہی چھپی رہتی ہے جب میں صفتی پہچان ہی نہیں رکھتی تو پھر شہرِ ذات میں کیسے جھانکوں؟ زمین میں چند لمحے پُراسرار خاموشی رہی۔ کھڑکی کے پٹ کھلے، پھر آواز گونجی۔

”تیرا حسی وجود چار ارتقائی مراحل کے بعد پروان چڑھا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اس ارتقائی عمل نے 98 لاکھ سال کا عرصہ لیا ہے۔“

”98 لاکھ سال.....“ حیرت سے میری زبان گنگ ہو گئی۔ اس لیے یہ الفاظ میں نے فقط دل کی گہرائیوں میں ادا کیے، مگر دماغ کی کھڑکی سے دل کے تاروں سے روابط ہے، اس لیے کھڑکی والے نے میرے الفاظ سن لیے اور بولا۔

”ہاں 98 سال“ چند لمحے کے لیے پھر سے پُراسرار خاموشی چھا گئی۔ سکوت کی یہ چند ساعتیں میرے دل پر گراں گزرنے لگیں۔ میں نے جسم سُرخ پر سے تپتی سے پہلو بدلا۔ اس وقت دماغ سے آواز آئی۔

ایک الہامی کتاب (قرآن مجید) میں بتایا گیا ہے۔

کیا انسان نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو ٹپکایا جاتا ہے، پھر وہ لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کردے۔

☆.....☆

میں خوشی سے جھوم اُٹھی۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی، مگر وہ 98 لاکھ سال والی بات سمجھ میں نہیں سمائی، جس کا میں نے فوراً اظہار کردیا۔ جواب ملا۔

اس دور میں یہ سمجھ سے بالاتر ہے، جب کہ جدید سائنس نے اس ارتقائی عمل کو ادوار میں تقسیم کردیا ہے۔

''آؤ..... جس آسمانی کتاب (قرآن مجید) کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، اس کے چار ارتقائی عمل بتاؤں؟''

''ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں.....'' میں نے عجلت میں کہا۔

وہ بشر ہے..... یہ پہلا عمل ہے، دوسرا اس کے بعد آتا ہے۔ ماخلقت الجن والانس..... الخ۔ اس حمل میں وہ انس بنا ہے، تیسرے عمل میں وہ انسان بنا۔ ولقد خلقنا الانسان..... من طین الخ۔ اب چوتھا مرحلہ بتاؤں۔

''جی..... جی، ضرور بتائیں.....''

''علم ۃ م الاسا کھلا۔ یعنی آدم ہے، کون؟ جانتی ہو۔''

''جان گئی ہوں، میں آدم ہوں۔'' میری بات پر کھڑکی سے جھانکنے والی مخلوق زور زور سے ہنسنے لگی۔

''کیا ہوا۔ اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے۔''

''تو آدم نہیں رہے پگلی..... بلکہ آدم کی اولاد میں سے ہے، جسے اوپر والے نے اعلیٰ وارفع پیدا کیا ہے۔''

''تو کیا میں اعلیٰ وارفع صنف میں سے ہوں۔''

''ہاں! تجھے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے، کیوں کہ تیرا دنیا میں ایک نصب العین ہے، تو خدا کا نائب ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، میں شعور آگہی سے تکمیل ذات تک پہنچ سکتی ہوں۔''

''صنف جان گئی ہو تو شعور ذات کی آگہی بھی پا ہی لو گی، مگر تکمیل ذات.....'' خاموشی پُراسرار اور گہری۔

''خاموش کیوں ہو..... آگے بولو نا۔''

''تکمیل ذات یعنی انسانِ کامل۔''

''ہاں! انسانِ کامل بھی کہہ سکتے ہو۔''

''اگر انسانِ کامل کی بات ہو تو، یہ جہاں ہو کہ وہ جہاں، صرف ایک ہی انسانِ کامل ہے۔ (حضرت محمد ﷺ)''

''کون۔'' میری بے چینی بڑھ گئی تھی، مگر ذہن میں گونجنے والی آواز نے خاموش ہو گئی۔ میں ہمہ تن گوش ہوں.....

ٹھک..... ٹھک..... ٹھک..... میں نے خود ہی دماغ کی کھڑکی پر دستک دی۔ آواز آئی۔

''اس بارے میں خود ہی سوچنا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' ایک سوال بار بار دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے کہ ''میں انسان ہوں، مان بھی لیا اور جان بھی لیا، مگر ہر انسان کا ایک خاندان، قوم اور مذہب ہوتا ہے، میرا خاندانِ قوم اور مذہب کیا ہے؟''

''مجھے نہیں پتا.....'' روکھا سا جواب میری سماعت میں تھپڑ مارنے لگا۔

''مجھے پتا تو چلے میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے والے یہ لوگ کون ہیں، کیا میں انہی میں سے ہوں؟''

''یہ سوال بھی اُنہی سے پوچھنا۔'' جواب ملتے ہی کھٹک سے کھڑکی بند ہو گئی اور میں مکمل اندھیرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر میں یونہی بے سدھ نرم و ملائم کمبل میں نیم دراز رہی۔ اس کے بعد دماغ کی ایک اور کھڑکی پر میں نے خود دستک دی۔

''ٹھک..... ٹھک..... ٹھک..... کون ہے۔'' اندر سے پوچھا گیا۔

''یہی جاننے کے لیے کہ میں کون ہوں، دستک دی ہے۔''

''یہ نہیں بتایا جا چکا ہے کہ تم انسان ہو۔''

''نہیں نہیں..... میں فولا بوبی، میرا نام، قوم اور مذہب کیا ہے۔''

''اتنا تیز مت بھاگو ورنہ منہ کے بل گر جاؤ گی۔''

''گر کر اُٹھنے کی سکت ہے مجھ میں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''تھوڑا صبر کرلو۔ جن لوگوں نے تمہیں زندگی کی سہولتیں دے رکھی ہیں، تیرے احترام میں باہم بات نہیں کرتے، تیری عزت میں تیرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں، وہ خود تمہیں بتائیں گے۔ تیرا نام کیا ہے، قوم اور مذہب کیا ہے، جو احترام میں بات نہیں کرتے، وہ بھلا کیسے بتا پائیں گے۔''

''اتنی جلدی کیا ہے تمہیں؟''

''اپنی صنف سے آگہی مل چکی ہے مجھے، اعلیٰ وارفع مخلوق ہوں میں۔ اس لیے اب مجھے زیب نہیں دیتا کہ اندھیرے میں رہوں۔''

''اب شعورِ ذات کا بھید پانا ضروری ہو گیا ہے۔ میں پہلے ہی اس تگ و دو میں بہت دور سے بھاگ کر آئی ہوں، اب تھک گئی ہوں۔''

''ایک بات پلّو سے باندھ لو، تھک جانے والے مسافر کبھی منزل تک نہیں پہنچتے۔ اس لیے مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ میں جانتی ہوں، مایوسی کفر ہے اور میں..... میرے لب خاموش ہو گئے۔ کفر کے لفظ پر اچانک میرے اندر تیز جھکڑ چلنے لگے تھے۔ تیز ہوائیں چلتی ہیں تو کھلی کھڑکیوں کے پٹ بری طرح آپس میں ٹکراتے ہیں، درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں اور گرد و غبار اُڑنے لگتا ہے، ایسا ہی کچھ میرے اندر بھی انتشار بپا ہو گیا۔'' اسی ٹھہراؤ میں آواز اُبھری۔

''یہ بتاؤ کفر کیا ہوتا ہے.....؟'' سوال پر میں چپ ہو گئی، پھر ایک اور کھڑکی کھلی اور اس میں سے ایک آواز سنائی دی۔

''ایمان کا معنی ہے، قبول کرنا، مان لینا یا تسلیم کرنا۔ کفر ایمان کے مقابلے میں کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہوا۔ نہ ماننا، رد کر دینا، انکار کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات واحد کے لیے کسی کو معصوم بنانا اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو رد کرنا، قرآن مجید کو نبی کریم ﷺ کی ذاتی تصنیف سمجھنا اور آخرت کا انکار کرنا، یہ کفر ہے۔''

☆.....☆

اس پر میں بُری طرح چونک پڑی۔ وجہ اس کی پہلی بات تھی۔ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔ تو کیا ایسے بھی انسان ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسری ذات کی عبادت کرتے ہیں، یا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں یا پھر غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ میری حیرت اس قدر شدید تھی کہ میں ایک ہی سانس میں کئی سوال کر بیٹھی۔

ذہن میں ایک اور کھڑکی کھلی، کھڑکی سے جھانکنے والی مخلوق سابقہ مخلوق کی طرح ناآشنا اور اجنبی تھی۔ مجھ سے کہا گیا۔

''ہم تمہیں ماضی بعید میں لے چلتے ہیں..... چلو گی؟''

''ماضی بعید..... مطلب زمانہ قدیم؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! بالکل زمانہ قدیم، جہاں مُردہ انسانوں کی پوجا کی جاتی تھی۔''

''میں چلوں گی..... کیوں کہ یہ بات میرے لیے نئی ہے کہ مردہ انسانوں کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔''

''ہم حیران ہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم تو ایسی نہ تھیں، مردہ انسانوں کی پوجا تو آج کے جدید دور میں بھی ہو رہی ہے۔''

میں نے کہا..... ''کیا تم مجھے جانتے ہو؟''

''تم موضوع سے ہٹنے لگی ہو۔ پہلے زمانہ قدیم کی سنو، جہاں انسان کے آگے سر جھکانا اور اسے رازق سمجھنا عام بات تھی۔'' قدیم انسانوں کا ایک اور جاہلانہ عقیدہ روح کو ہر چیز پر قادر سمجھنا تھا۔ روح جب چاہے جسم میں واپس آ سکتی ہے۔

اس خوف سے وہ مُردے کے ساتھ ضروریات زندگی بھی قبروں میں رکھ دیتے تھے، یہی نہیں بلکہ کوئی سربراہِ خاندان یا سردار فوت ہوجائے تو اس کی مادّی ضروریات کے پیشِ نظر اس کی بیوی اور غلاموں کو بھی موت کے گھاٹ اتار کر ان کے ساتھ ہی دفن کیا جاتا تھا۔ مُردے مافوق الفطرت مخلوق سمجھے جانے لگے۔ زمانے ایک نے ہلکی سی جست لی اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، مگر یہ احساس انہیں مُردوں سے زندوں کی طرف راغب کرے گا۔ زندہ انسانوں میں سب سے زیادہ طاقتور، بہادر، جنگجو اور سردار قسم کے لوگوں کو، فوق الفطرت قوتوں کا مالک سمجھا جانے لگا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی، بلکہ نوبت جادوگروں، اور کاہنوں کی پرستش جا پہنچی۔ یہ پرستش اور احترام اس حد تک ترقی کر چکا کہ ان کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھنا یا چلنا، ان کی طرف نظر بھر کے دیکھنا اور ان کی نشست پر بیٹھنا بے ادبی اور جرم کے زمرے میں آتا تھا۔

''رُک جاؤ، مجھے اعتراض ہے، تم بنا کسی ثبوت کے بات کو کہاں سے کہاں لے گئے ہو۔''

''میرا ذہن بہت چھوٹا ہے، اس میں فرضی گھوڑے نہیں دوڑائے جاسکتے، جو کہا جارہا ہے سچ اور حقیقت پر مبنی ہے، کبھی فرصت ملے تو انسان کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لینا۔ ٹھوس اور پراعتماد لہجے کا جواب مجھے چپ رہنے پر مجبور کردے گا۔''

''اچھا آگے بولو۔'' میں نے فوراً ہار مان لی۔

''انسان پرستی کا آغاز مصر سے ہوا۔ مردہ پرستی اور دیوتاؤں کو پوجتے پوجتے یہ زندہ انسان کی پرستش کی طرف آ نکلے۔ بادشاہ خود کو دیوتا سمجھنے لگتے اور عبادت انہیں دیوتا ماننے لگی۔ لوگوں کی جہالت اور بدعقیدگی کی یہ حالت تھی کہ بادشاہ کو خدا کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ خود کو خدا سمجھنے اور لوگوں سے اپنی پرستش کروانے میں مصر کا فراعنہ خائمن خاندان سب سے آگے تھا۔ اسی خاندان میں فرعون پیدا ہوا، جس نے خدائی دعویٰ کیا تھا۔ خود کو خدا سمجھنے کی ریت بابل کے بادشاہوں میں بھی بکثرت پائی جاتی تھی۔ انہی بادشاہوں میں نمرود بھی شامل تھا۔ کیا نمرود اور فرعون کے بعد انسانی پرستش کا باب بند ہوگیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''انتہائی احمقانہ سوال ہے'' جواب میں کہا گیا..... ''پوری بات سن لو گی تو سب کچھ جان لو گی۔''

''ٹھیک ہے بتاؤ۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''انسان پرستی میں یونان اور چاپان بھی بہت آگے ہیں، یونانیوں کا عقیدہ تو اس سطح پر پہنچ گیا تھا کہ وہ بادشاہ کی موت کے بعد اسے باقاعدہ دیوتا کا مقام دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ فانی نہیں، بلکہ لافانی ہوتے ہیں اور یہ موت کے بعد بھی جب چاہیں، دنیا میں واپس آسکتے ہیں۔ نہ معلوم یونانیوں کی انسان پرستی کہاں تک پہنچ جاتی کہ ان پر یونانی فلسفے نے ٹھیک ٹھیک ضربیں لگانا شروع کردیں اور انسانوں کو دیوتا کے مقام سے کھینچ لیا۔ بہت سے مشہور فلسفیوں نے انسان پرستی کے عقیدے میں کارآمد دراڑیں پیدا کیں۔''

''فلسفی.....'' میں نے زیرلب اس لفظ کو دہرایا..... ''یونانیوں کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔''

''ہاں..... ارسطو، افلاطون، سقراط اور فیثا غورث نے اپنے فلسفے میں انسان پرستی کے عقیدے کو رد کردیا تھا۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ قدیم یونان کے بعد اس عقیدے کا خاتمہ ہوگیا تھا۔'' میری اس بات پر ذہن کی چاروں کھڑکیاں کھل گئیں اور ان سے زور سے ہنسنے کی آوازیں باہر آنے لگیں۔ مجھے ایک بار پھر سبکی کا سامنا کرنا پڑا۔

''تم پھر بچوں جیسی باتیں کرنے لگی ہو..... ارے یہ عقیدہ تو آج تک قائم ہے۔''

''آج تک.....'' اس بار مجھے اپنی زبان پر جلتے ہوئے کوئلے دہکتے محسوس ہوئے۔

''آگے سننا ہوگی یا ہم جائیں۔ ویسے بھی اب میں آرام چاہیے ہوگا۔''

''نہیں بولو۔ میں سننا چاہتی ہوں۔'' میں نے ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے کہا۔

''یونانیوں سے یہ عقیدہ رومیوں کی طرف منتقل ہوا۔ روم میں سکندر اعظم کے باب فلپ مقدونی کی پرستش اس کی زندگی میں ہی شروع ہوچکی تھی۔ جس نے بادشاہ کی پوجا سے انکار کیا، وہیں اس کا سر قلم کردیا گیا۔ یہاں سے بادشاہوں کے مجسمے بنانے کا باقاعدہ رواج پروان چڑھا۔''

''اوہ.....'' میرے اندر کچھ باتیں، کچھ یادیں اُتار چڑھاؤ کا شکار ہونے لگیں، موجودہ زمانے میں بھی انسانوں کی مجسمہ سازی بھی زور شور سے جاری ہے۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر خاموش رہی، باتیں بڑی قیمتی تھیں جو مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ چاپانیوں نے انسان پرستی میں حد کردی ہے، چاپانی بادشاہ جو مینوٹو سے شروع ہونے والی پوجا اس نہج پر جا پہنچی کہ بادشاہ کو اللہ کا بیٹا قرار دیا گیا۔ یہ بات آج سے ڈھائی ہزار سال قبل شروع ہوئی تھی اور آج تک اسی عقیدے کے ساتھ قائم و دائم ہے، بدھ مت کے پجاری بھی عجیب لوگ ہیں۔

ممکن ہے آج ایسا نہ ہو، کیوں کہ آج کا دور سائنسی ہے۔ یہ ایجادات و اختراعات کا دور ہے۔ اب دنیا بہت آگے نکل چکی ہے، اس لیے آگہی کے اس دور میں انسان کو انسان نہیں پوج سکتا۔ انسانی پرستی گئے وقتوں کی بات لگتی ہے۔ میری اس بات پر ایک بلند قہقہہ گونجا۔

''ہاہاہا.....''

''لگتا ہے تم آج کے انسانوں سے ابھی تک ملی نہیں ہو۔''

''میں انسان ہوں اور انسانوں سے ملی بھی ہوں۔''

''تو پھر ہندوؤں سے نہیں ملی ہوگی، ہندوؤں کے ہاں بھگوان کے جو بھی اوتار ہوئے ہیں، وہ سب انسانی روپ میں ہوئے ہیں۔ وشنو، نرسنگھ کرشن اور رام وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ یہ سب انسان ہی تو تھے۔ ان کی مورتیوں کی آج بھی پرستش کی جاتی ہے، کروڑوں انسان انہیں اپنا خدا، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہیں۔ یہ ایسی مدلل اور ناقابل تردید حقیقت تھی کہ میری زبان کو چپ لگ گئی۔''

☆.....☆

ٹھک..... ٹھک..... ٹھک..... چوتھی کھڑکی پر دستک ہونے لگی، مجھے تو ایسی چپ لگی کہ بولنے کی ہمت نہ ہوئی، چند ساعتیں بالکل خاموش اور ساکت گزر گئیں..... پھر آواز آئی۔

''افسوس صد افسوس..... دنیا کے سب سے گھرے اور سچے مذہب اسلام میں بھی یہ رجحان بڑی شدومد کے ساتھ پروان چڑھ چکا ہے۔''

''اسلام تو اپنی بنیاد توحید پر کھڑا ہے۔''

''ہاں! مگر ایک انتہائی خطرناک بات مسلمانوں میں داخل ہوچکی ہے۔ برصغیر میں بہت سی رسم و رواج ہندوؤں سے مسلمانوں میں رائج ہوچکی ہیں۔ برصغیر میں عجیب و غریب رسمیں بنائی گئی تھی۔ یہ فرسودہ رسمیں دھیرے دھیرے باقاعدہ مذہب کا حصہ بن چکی ہیں۔ جوگیوں، سنیاسیوں اور ملنگوں کی پرستش کا رجحان اس قدر بڑھا کہ یہ آہستہ آہستہ مسلمانوں میں منتقل ہوتا گیا اور وجد یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بھنگیوں، ملنگوں، ہنگوں، چرسیوں، موالیوں کو بھی مشکل کشا سمجھا جانے لگا۔''

''اوہ.....'' میں بُری طرح چونک پڑی۔ ''تو کیا میں کوئی فقیر یا ملنگ ہوں، کچھ دیر پہلے بہت سے لوگ میرے سامنے تعظیم سے ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور میرے پاؤں بھی چھوئے تھے۔'' میری اس بات پر ذہن میں قہقہہ پھر سے بلند ہوا، ''تجھے تو ابھی شعورِ ذات کی ہی آگہی نہیں ملی، چہ جائے کہ تو اس مقام پر پہنچے۔''

''تو پھر وہ سب کیا تھا اور کیوں کیا گیا.....؟ مجھے کوئی جواب نہیں ملا، کیوں کہ کمرے کا دروازہ کھلنے سے میرا ارتکاز ٹوٹ چکا تھا۔

اس بار بھی کمرے میں داخل ہونے والا لمبے قد کا خوب صورت نوجوان تھا۔ میں مزید لوگوں کی توقع کررہی تھی، مگر وہ اکیلا ہی تھا۔ اس بار اس نے بادامی رنگ کا کلف لگا کاٹن کا سوٹ پہن رکھا تھا، باقی تراش خراش سچ مچ حسبِ سابق تھی۔ وہ آہستگی سے اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے انداز میں احترام کی جھلک بالکل واضح تھی۔ وہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا، شاید وہ بیٹھنا چاہتا تھا، مگر کوئی چیز مانع آرہی تھی۔

"بیٹھ جایئے۔" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ بیٹھ گیا، ہماری نظریں ملیں تو اس نے فوراً نگاہیں جھکالیں، مجھے اس کی خاموش گراں گزر رہی تھی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" میرے سوال پر اس نے بُری طرح چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کے چونکنے پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔

یہ کوئی ایسا اچنبھا سوال تو نہیں تھا، جس پر اس قدر حیران ہوتا، میں نے پوچھا۔

"آپ اس قدر حیران کیوں ہیں؟"

"میں حیران اس لیے ہوں کہ آج پورے تیرہ مہینے اور دس دنوں بعد آپ نے مکمل ہوش وحواس میں بات کی ہے۔" اس نے کہا۔

"تیرہ مہینے دس دن....." ذہن کی کھڑکی پر دستک ہوئی، مگر کھڑکی کھلی نہیں، کیوں کہ ایک اور اہم بات میرے علم میں آئی۔

"مہک....." میں نے پوچھا۔ "یہ مہک کون ہے؟"

"مہک آپ کا نام ہے۔"

"اوہ.....تو مجھے میرا نام پتا چل ہی گیا۔" میرے دل میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ اگر اندر مخلوق ہوتی تو بہت سارے خوشی کے گانے گائے جاتے۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میرا نام امن چند ولتانی ہے۔" اس نے برجستہ مجھے جواب دیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ میں انسانوں میں رہ رہی ہوں۔" میری بات پر امن ایک بار پھر چونک پڑا۔ اس بار میں نے اس کے چونکنے کا سبب پوچھا تو وہ بولا۔ "آپ کی اس بات پر میرے بابا کی بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"آپ کو سمجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ تو سمجھانے والی ہیں نہ کہ سمجھنے والی۔"

"یہ بات بھی میں سمجھ نہ پائی۔" مگر میرے کسی دوسرے سوال سے پیش تر وہ بولا۔

"میرے یہاں بیٹھنے یا آپ سے باتیں کرنے میں، آپ کو کوئی پریشانی یا تکلیف تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔"

"مجھے پریشانی نہیں بلکہ خوشی ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"میرے ذہن میں بہت سے سوالات اُٹھتے ہیں، جن کا مجھے جواب چاہیے۔"

"یہ میرے لیے حیرت کی بات ہے کہ جواب دینے والی اچانک سوال پوچھنے لگی ہے۔" میری اُلجھن واقعی بڑھ گئی تھی، یہ تیرہ مہینے دس دنوں کا کیا چکر ہے۔

"اگر آپ کو میری وجہ سے کوئی اُلجھن ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔" وہ کرسی سے اُٹھنے لگا تو میں نے فوراً اسے منع کیا۔

"نہیں.....نہیں.....آپ مت جائیں۔" آپ کی ذات سے مجھے کوئی اُلجھن نہیں۔ میں نے سُبل اُٹھا کر بیڈ سے اُترنے کی کوشش کی تاکہ اسے جانے سے روکوں، مگر وہ مجھ سے زیادہ عجلت میں بولا۔

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے میں نہیں جاتا۔ آپ پلیز نیچے مت اُتریں۔ آپ آرام سے بیٹھی رہیے۔" انتہائی مؤدبانہ لہجے میرے لیے باعثِ حیرت بنا ہوا تھا۔ میں نے پھر سے کمبل سینے تک اوڑھ کر تکیے سے ٹیک لگالیا۔ آپ مجھ سے انتہائی ادب سے کیوں بات کرتے ہیں، حالاں کہ قد اور عمر دونوں میں آپ مجھ سے بڑے ہیں۔"

"آپ کیسی عجیب باتیں کرنے لگی ہیں۔ آپ کا احترام مجھ سمیت میرے تمام گھر والوں پر لازم ٹھہرتا ہے۔"

"اچھا وہ تیرہ مہینے دس دنوں والی بات بتائیے نہ کہ میں رہ گئی ہے۔" مزید اُلجھنے سے بہتر تھا کہ میں اپنے مطلب کے جوابات پالوں۔

"آپ تیرہ مہینے دس دنوں بعد مکمل ہوش وحواس میں باتیں کر رہی ہیں۔"

نپولین بوناپارٹ

18 مئی 1804ء کو نپولین بوناپارٹ (1769-1821) فرانس اور اٹلی کا بادشاہ بن گیا وہ ایک اچھا فوجی ہی نہیں بلکہ انتظام حکومت میں بھی اپنی مثال نہیں رکھتا تھا۔ اس نے حکومت کی ابتری کو ختم کر کے امن وامان قائم کیا۔ مالیات کے نظام نیز عدالتوں کی اصلاح کی، تعلیم کو عام کرنے کا بندوبست کیا اور فرانسیسی قوانین کی باقاعدہ تدوین کروائی۔ نپولین کے فرانس کے بادشاہ بننے کے بعد برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ نپولین برطانیہ پر حملہ کرے، برطانیہ خود پہل کر کے نپولین کی طاقت کا غرور توڑے۔ نپولین کو علم تھا کہ وہ کسی بھی بحری جنگ میں برطانیہ کو شکست نہیں دے سکے گا اس لیے اس نے اپنے بحری بیڑے کو ویسٹ انڈیز کی طرف بھیج دیا۔ نپولین کو توقع تھی کہ برطانوی بحری بیڑا فرانس اور اسپین کے مشترکہ بحری بیڑے کو شکست دینے کی پوزیشن میں نہ ہوگا۔ مگر برطانیہ کے امیرالبحر، ہوریشیو نیلسن نے 21 اکتوبر 1804ء کو جنوبی مغربی اسپین میں آبنائے جبل الطارق کے دہانے پر فرانس اور اسپین کے بحری بیڑے کا محاصرہ کر لیا اور اسے شکست فاش دی۔ نپولین 1812ء میں اقتدار سے معزول کر کے جزیرہ ایلبا میں قید کر دیا گیا تھا۔ وہ مارچ 1815ء میں قید سے فرار ہو کر پیرس پہنچ گیا اور ایک مرتبہ پھر فرانس کا بادشاہ بن گیا۔ نپولین کا یہ اقتدار صرف سو دن جاری رہ سکا۔ 18 جون 1815ء کو برطانیہ اور روس نے متحد ہو کر بیلجیم میں واٹرلو کے میدان میں نپولین کو شکست دی۔ جنگ کے بعد نپولین کو گرفتار کر کے جزیرہ سینٹ ہیلینا میں قید کر دیا گیا جہاں وہ 5 مئی 1821ء کو انتقال کر گیا۔

"یہ بات تو آپ پہلے بھی بتا چکے ہیں۔" تیرہ مہینے دس دن میں کیسے بولتی تھی۔

"آپ نے جو بھی کہا اشاروں میں کہا۔ میرا مطلب ہے، آپ نے گفتگو میں ہمیشہ استعارات استعمال کیے ہیں۔ آپ کے بہت سے استعارے ہم سمجھ نہ پائے اور نا قابلِ تلافی نقصان اٹھایا ہے۔"

"استعارے.....؟" یہ ایک اور اُلجھن تھی، "میں جلد اشاروں میں بات کیوں کرنے لگی اور وہ استعارے تھے کون سے۔"

"اچھا یہ بتایئے ہم اس وقت کہاں ہیں؟"

"ہمارے گھر میں.....ہمارا گھر ضلع گھوٹکی کے نواحی گاؤں گوٹھ چندھن میں ہے۔"

"ضلع گھوٹکی.....گوٹھ چندھن....." میں نے زیرِ لب دہرایا۔ یہ نام میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ یہ علاقہ کہاں واقع ہے۔

صوبہ سندھ میں۔ گھوٹکی، سکھر ڈویژن کا ایک ضلع ہے۔ اس ڈویژن میں گھوٹکی کے علاوہ چار دیگر اضلاع سکھر، خیرپور، نواب شاہ اور نوشہرو فیروز بھی شامل ہیں۔

امن کی بات میں سرے سے سمجھ ہی نہیں پائی۔ یہ سارے کے سارے نام میرے لیے نئے اور اجنبی تھے۔ ایک دوسرا خیال میرے ذہن میں لپکا۔

"آپ کچھ دیر پہلے بہت سے لوگوں کے ساتھ یہاں آئے تھے، اتنے لوگوں کی بھیڑ کیسی تھی؟"

"چوبیس گھنٹوں میں دو بار تمام گھر والے لمل کر آپ کے پاس آتے ہیں، یہ بابا کا حکم ہے۔"

"تمام گھر والے۔" میں حیران رہ گئی۔ "تو کیا سب آپ کے گھر کے افراد ہیں۔"

"جی ہاں۔ ہمارا گھر بہت بڑا ہے، آپ گھوم تو چکی ہیں، تقریباً تین کنال پر بنا ہوا ہے۔ اس میں چار فیملیاں قیام پذیر ہیں۔"

"میرے تین چچا ہیں، ہم سب جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں۔"
میری حیرانگی بڑھ گئی تھی۔ "میں آپ لوگوں کے بیچ میں کب سے ہوں۔"
"یہی کوئی تیرہ مہینے دس دنوں سے۔"
"اس سے پہلے میں کہاں تھی۔" اگلے سوال پر امن خاموش ہو گیا۔ "آپ نے جواب نہیں دیا۔"
"جتنا میں آپ کو بتا چکا ہوں، اس کی بھی مجھے اجازت نہیں ہے۔" اس نے جتاتے ہوئے انداز میں کہا۔
"آپ کو کس نے منع کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"بابا اور تایا جان نے۔" اس نے جھٹ جواب دیا۔
"مگر کیوں....." میں یہ کہتی ہوئی بیٹھ گئی، میرا تیز لہجہ دیکھ کر وہ حیرت انگیز طور پر گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔
"کیا ہوا؟"
"کک۔ کچھ نہیں۔ میں چلتا ہوں۔" اس کی گھبراہٹ عجیب معنی رکھتی تھی۔ وہ چھ فٹ کا لمبا چوڑا نوجوان تھا۔ طلے سے کھاتے پیتے گھرانے کا مرد لگتا تھا، پھر مجھ سے اس قدر دب کیوں رہا تھا۔ میرے ذرا سے تیز لہجے پر اس کا سفید خوب صورت چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔
"آپ اتنے گھبرا کیوں جاتے ہیں۔" میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔
"آپ..... آپ ناراض تو نہیں ہیں۔" اس نے لجاجت سے کہا۔ "تو میرا جی چاہا کہ شدت سے میں اپنے بال نوچ لوں۔"
"میں بھلا کیوں ناراض ہونے لگی۔" میں نے کڑک کر کہا۔
"ٹھیک ہے میں چلتا ہوں، پلیز اگر بابا آ گئیں تو میری آمد کا ذکر ان سے مت کیجیے گا۔" امن یہ کہتے ہوئے فوراً باہر نکل گیا۔

☆.....☆

میرے دماغ کی کھڑکی پر پھر سے دستک ہونے لگی۔ ٹھک..... ٹھک..... ایک سوال پوری طاقت سے اُٹھا۔
"اگر میں یہاں تیرہ مہینے اور دس دنوں سے ہوں تو ان کا حال و احوال مجھے یاد کیوں نہیں، پھر یہ کہ ان تیرہ مہینے دس دنوں سے پہلے میں کہاں تھی؟" میں نے سَر بستر سے ٹکرا کر اپنا جائزہ لیا۔ "نہیں میں تیرہ مہینے پہلے دنیا میں نہیں آئی۔ میری عمر یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہے۔" پھر..... سوہنی الجھاؤ کا شکار رہنے لگیں۔ ایک سوال پھر میرے ذہن میں اُبھرا۔ "ان سے میرا کیا رشتہ ہے۔ تین کنال کے اس گھر میں بسنے والے لوگوں سے میرا کیا رشتہ ہے۔" سوالات کا در دروازے کی دستک سے بند ہو گیا۔
"آ جاؤ....." دستک کے جواب میں، میں نے بلند آواز میں کہا۔ دروازہ کھلا اور پچاس پچپن برس کا ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی شکل و صورت اور جسامت امن سے مشابہت رکھتی تھی۔ میرے خیال میں یہ امن کا بابا تھا۔ اس کے ہمراہ سارجنی میں ملبوس اس سے پانچ چھ سال چھوٹی عمر کی ایک عورت بھی داخل ہوئی۔ دونوں کے کپڑے اور نیچ اعلیٰ درجے کے تھے۔ دونوں انتہائی ادب سے اندر داخل ہوئے۔ شانے سے شانہ ملا کر میرے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ لیے۔ آنکھیں بند کر کے ایک منٹ دل ہی دل میں کچھ بڑبڑائے اور پھر میری جانب بڑھے۔ میں بھی کہ اب میرے پاؤں چھوئے جائیں گے، اس لیے میں نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے۔
مگر..... وہ میرے سرہانے چلے آئے۔
"آپ امن کے بابا ہیں۔" میں نے آپ سے پوچھا۔
"جی مہک جی۔ میں امن کا بابا ہوں۔ اور یہ اس کی مما ہیں۔"
"جی۔ جی۔" عورت نے انتہائی ادب سے جواب دیا۔
"آپ لوگوں کے نام کیا ہیں؟"

"مہک سب کچھ تو آپ جانتی ہیں۔" پتا نہیں میرے بارے میں ان کے دماغوں میں ایسا کیا گھسا ہوا تھا۔
"مجھے پتا ہے، مگر میں آپ کے منہ سے سننا چاہتی ہوں، میرا یہ تربہ کارآمد ثابت ہوا۔"
"میرا نام قدم چند دولتانی ہے۔"
"اور میرا نام چندھن دولتانی۔"
"کیا اس گاؤں کا نام، آپ کے نام پر رکھا گیا تھا۔"
"نہیں جی، بلکہ میرا نام گاؤں کے نام پر رکھا گیا تھا۔"
"مہک! ہمیں لان تک جانا ہوگا۔" امن کی ماں خوب صورت عورت تھی۔ ان کے لہجے میں شائستگی اور اپنا پن تھا۔ اس عمر میں بھی ہلکا۔ میک اپ کیے ہوئے تھی۔ کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں اور کانوں میں سونے کی بالیاں پہن رکھی تھیں۔
"مہک! آپ کو لان تک جانے میں کوئی دقت تو نہیں۔" امن کے بابا نے انتہائی نرم لہجے میں پوچھا۔
"نہیں مجھے کوئی دقت یا قباحت نہیں ہے۔ میں خود باہر کی تازہ ہوا لینا چاہتی تھی۔ کمرے میں ٹھنڈک کے باوجود مجھے حبس کا احساس ہونے لگا تھا۔" میں نے جیسے ہی ہامی بھری تو دونوں میاں بیوی میرے دائیں بائیں چلے آئے۔ مجھے کسی دہن کی طرح دائیں بائیں سے پکڑ کر وہ ہالے جانے لگے۔ مجھے یوں لگا جیسے آج میری مہندی ہے اور مجھے باہر مہندی کی رسم کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔
ان میں دو سارے لوگ موجود تھے، جو کمرے میں آئے تھے۔ وہاں ایک کرسی رکھی ہوئی تھی، جس پر مجھے بٹھا دیا گیا، باقی سب لوگ میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ وہ لوگ لائنوں میں بیٹھے تھے، بڑے آگے اور چھوٹے ان کے پیچھے تھے۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ یہ بہت بڑی حویلی تھی، لان بھی بہت بڑا تھا، ایک طرف پھلوں کے درخت اور دوسری طرف پھولوں کے پودے تھے، جس طرف پھولوں کے پودے تھے وہاں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔
میرے لیے ان کی ہتھ جوڑی حرکات و سکنات ایک معمہ بنتی جا رہی تھی۔ وہ چند منٹ آنکھیں بند کیے دل ہی دل میں کچھ پڑھتے رہے، پانچ دس منٹ بعد ان میں سے دو عورتیں اٹھیں اور تخت کو دھونا شروع کر دیا۔ دونوں نوجوان لڑکیاں بھی ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ تخت کو اچھی طرح دھونے کے بعد اسے خشک کیا گیا، پھر اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں، تخت پر خوب صورت دو دھیا رنگ کی چادر کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک طرف کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے، جن سے لذیذ کھانوں کی انتہائی انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ دو عورتوں نے مل کر دہاں کچھ چیز (عود یا لوبان) جلائی۔ اس کے بعد وہ مجھے تخت پر لے گئے۔ میرے عقب میں دونوں جوان لڑکیاں پنکھے لیے کھڑی ہو گئیں، پھر مجھ پر پھول نچھاور کیے گئے اور ساتھ ہی خوشبوؤں کا چھڑکاؤ بھی کیا گیا۔ ایک بڑے طاق میں رکھی گئی اگر بتیاں جلائی گئیں۔ میں کسی نئے ڈرامے کی توقع کر بیٹھی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ لوگ نہ تو مجھ سے کوئی بات کرتے تھے اور نہ ہی آپس میں زیادہ گفتگو کرتے تھے، جس سے میں اس ماجرے کی نوعیت سمجھ سکتی۔
تخت پر بیٹھے ہوئے بیرادم گھٹنے لگا تھا۔ عجیب و غریب تیز خوشبوؤں نے میرا گلہ دبا رکھا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر مزید چند منٹ اگر بتیوں کا طاق اٹھایا نہ گیا تو پھر دم اس کے دھوئیں سے ہی گھٹ جائے گا۔ میں نے انہیں طاق ہٹانے کا اشارہ کیا، جس پر فوراً عمل کیا گیا۔ اس دوران دو عورتیں ایک بوڑھی اور دوسری نوجوان..... دودھ کی بھری بالٹی تخت پر لے آئیں اور بالٹی میرے سامنے رکھی گئی۔ اب تخت پر چار عورتیں موجود تھیں، ان میں سے ایک امن کی مما تھی، باقی لوگ ایک بار پھر تخت کے سامنے زمین پر خاموش احترام کے ساتھ ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئے۔ میں تیزی سے کچھ سوچنے لگی اور اس کے منطقی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔
میرے ذہن کی ساری کھڑکیاں بند تھیں، میں ابھی تک بات کی تہ تک پہنچ نہیں پائی تھی اور جب تک میں کوئی نتیجہ اخذ کرتی، چاروں عورتوں نے مل کر مجھے دودھ سے نہلانا شروع کر دیا۔ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ یہ دودھ مجھے غسل دینے کے لیے رکھا گیا ہے، حیرت کے شدید ترین جھٹکے سے میں جب تک سنبھل پاتی، وہ اپنا کام کر چکی تھیں۔ مجھے دودھ سے

غسل دیا جا چکا تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا، میں خاموش رہی کہ دیکھا جائے ان کا مدعا کیا ہے۔ اب میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ غسل دینے کے بعد چاروں عورتیں نیچے اتر کر زمین پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں شامل ہو گئیں، مردوں میں سے بوڑھا مرد، جو امن کے بابا کے ساتھ مجھے تخت پر لایا تھا، کھڑا ہو گیا۔ ان کے ہاتھ میں اسٹیل کا ایک گول تھال تھا، جس میں مختلف اشیاء قلیل مقدار میں رکھی ہوئی تھیں۔ میرے بالوں سے دودھ کے قطرے اب تک گر رہے تھے کہ اور میرا چہرہ بھی گیلا تھا۔ کپڑے گیلے ہونے کی وجہ سے مجھے عجیب سی کوفت ہو رہی تھی، میں نے تھال پر غور کیا اور اس میں رکھی کئی اشیاء کو پہچاننے کی کوشش کی۔ بوڑھا شخص تھال کو بار بار حرکت دے رہا تھا، اس لیے اس پر نظر کا ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں چند چیزیں جو دیکھ پائی تھی، اس میں دہی، گڑ، پان کا پتا، ہلدی اور شاید کچھ چاول تھے۔ بوڑھا شخص بلند آواز میں نانوس زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں اس کا مفہوم سمجھ نہ پائی۔ پانچ چھ منٹ تک وہ کچھ پڑھتا رہا، پھر اس نے مجھ پر پھول نچھاور کیے، گھر والوں پر پھول کی پتیاں اور پانی کا چھڑکاؤ کیا، اس کے بعد ان کی ہتھیلیوں پر اس نے کچھ رکھا، جسے وہ اپنی زبان سے چاٹنے لگے۔

☆.....☆

میرے لیے یہ سب نیا، اچھوتا اور سنسنی خیز تھا۔ اب وہ برتنوں میں کھانا ڈالنے لگے تھے۔ ایک عورت میری طرف بڑھی، میں نے اسے ہاتھ سے روک دیا، میری حالت مگر گوں تھی۔ میں عجیب و غریب جنبوں میں روندی تھی اور اپنے نام کے سوا میں کچھ نہیں جانتی تھی، مگر ان لوگوں نے پتا نہیں مجھے کیا سمجھ رکھا تھا۔ جو کچھ بھی میرے ساتھ کیا گیا، یہ میری عقل سے ماورا تھا۔ مجھے اپنے جسم سے دودھ کی باس آنا شروع ہو گئی، جس سے مجھے متلی ہونے لگی۔ میں فوراً تخت سے نیچے اتر آئی، میرے اس طرح اچانک اٹھنے سے ان سب کے ہاتھوں کے طوطے چھوٹ گئے، وہ سب میری طرف یوں لپکے، جیسے کوئی معصوم بچہ کسی گہرے گڑھے میں گرنے والا ہے، میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکا، وہ حیرت انگیز طور پر اس طرح اپنی جگہ جم گئے جیسے انہیں زمین نے پکڑ لیا ہے۔

"امن....." میں نے ہولے سے امن کو پکارا، ساتھ ہی اسے اشارے سے قریب بلایا۔ "میرے کمرے تک رہنمائی کرو۔" میری ہدایت پر امن خاموشی سے میرے ساتھ ہو لیا۔

"مجھے غسل کرنا ہے۔" اندر داخل ہوتے ہی میں نے امن سے کہا۔

"جی بہتر۔ میں آپ کو ڈریسنگ روم میں لے چلتا ہوں۔"

"ڈریسنگ روم....." میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں آپ کا ڈریسنگ روم الگ ہے، اس طرف آیئے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس کے لہجے میں ادب اور فرماں برداری ہنوز قائم تھی۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ "آپ آرام سے غسل کیجیے، تب تک میں باہر انتظار کرتا ہوں۔" وہ جانے لگا تو مجھے کپڑوں کا خیال آیا۔

"ایک منٹ رکیے۔" میں نے اس سے کہا۔

"جی مہک فرمایئے۔"

"میرے کپڑے کہاں ہیں۔" میں نے تنک کر پوچھا۔

"یہ سب الماریاں آپ کے کپڑوں سے بھری پڑی ہیں، جو مرضی ہے پہن لیجیے، اس طرف سنگھار میز رکھا ہے، کیا آپ بھول گئی ہیں۔ آپ تو ہمیشہ اسی کمرے میں تیار ہوتی رہی ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے آپ جایئے۔" مجھے اپنے آپ سے الجھن آنے لگی تھی، میں اس لمحے فوراً غسل کرنا چاہتی تھی۔ باتھ روم میری توقع سے کہیں زیادہ بڑا اور خوب صورت تھا۔ میں نے نیم گرم پانی سے اچھی طرح غسل کیا، وارڈ روب میں میرے ناپ کے کپڑے تھے اور سلیکٹروں ایک سے بڑھ کر ایک جوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ سنگھار میز میک اپ کے ہر قسم کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ درازوں میں سونے چاندی اور آرٹی فیشل جیولری کے بے شمار سیٹ جڑے ہوئے تھے۔ میں مزید الجھ گئی۔

امن نے کہا تھا کہ آپ ہمیشہ اسی کمرے میں تیار ہوتی رہی ہیں، ہمیشہ سے ان کی مراد تیرہ مہینے دس دن ہے، جو میں نے یہاں بھگتائے ہیں، مگر اس سے پہلے میں کہاں تھی، پھر مجھے ان تیرہ مہینوں کا بھی حال احوال یاد کیوں نہیں۔ دماغ پر چھائی جانے والی عجیب و غریب کاٹی بدلی دھند کی تھی۔ اب میں سکون سے سوچ سکتی تھی۔ زمین کی بند کھڑکیاں کھول کر ان میں جھانک سکتی تھی۔ مجھے شہر ذات کی آگہی پر سبقت پانا تھی۔ جب تک میں خود کو پہچان نہ لوں، سکون سے نہیں رہ پاؤں گی۔ دروازے کی دستک نے میری محویت کو تہ و بالا کر دیا، بار بار کی دستک مجھے بے حد گراں گزرنے لگی۔

"آجاؤ، کون ہے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا تو دروازہ کھول کر سولہ سترہ برس کی خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس نے ٹی اسکرٹ پر ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال شانوں تک تراشے ہوئے تھے، چہرے پر میک اپ کی تہ جمی ہوئی تھی۔ وہ خاصی ہشاش بشاش لگ رہی تھی۔ آتے ہی ادب سے بولی۔ "مہک جی آپ کو ڈرائنگ روم تک جانا ہوگا۔ انکل نعیم آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"جاؤ بھاگ جاؤ..... میں نے کسی انکل وکل سے نہیں ملنا۔" میں نے انتہائی غصے سے کہا۔ "مجھے اب کسی ڈرامے کا کردار نہیں بننا..... دفع ہو جاؤ۔" میں نے غصیلی آواز میں اسے ڈانٹا تو وہ بے حد گھبرا گئی۔ اس کا ہشاش بشاش چہرہ مارے خوف کے زرد پڑ گیا۔ وہ اُلٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں کرسی پر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

چند لمحوں بعد امن کی آہستہ مگر زم آواز سنائی دی۔

"مہک۔" میں نے دیکھا۔ وہ اجنبیت سے بولا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"دیکھو امن، مجھے جب تک میرے بارے میں بتایا نہیں جاتا، میں نہ کسی سے ملوں گی نہ بات کروں گی۔" میرے لہجے میں تندی ہنوز برقرار تھی، جسے محسوس کر کے امن پریشان ہو گیا۔

"ٹھیک ہے مہک میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا، مگر فی الحال آپ انکل نعیم سے مل لیں پلیز۔" امن کے لہجے میں لجاجت اور چہرے پر بے بسی تھی، اس کی بے چارگی کی حالت دیکھ کر میرا دل موم ہو گیا۔

"مہک انکل نعیم کو آپ کے لاہور بھیجا تھا۔ وہ ایک مہینہ لاہور کی خاک چھان کر آئے ہیں، بے چارے بہت خجل خوار ہوئے ہیں۔" میرے دل میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔ "ہو سکتا ہے انکل نعیم کو میں پہچان لوں۔ وہ میرے رفیٹے میں کچھ لگتے ہوں۔ ہو سکتا ہے انہیں دیکھ کر شہر ذات کے اندر کوئی نئی کھڑکی کھل جائے، کوئی راستہ مل جائے، کوئی روشنی کی کرن، جو مجھے میری منزل کا پتا دے دے۔" میں ان سے ملنے کے لیے رضامند ہو گئی۔

ڈرائنگ روم میں امن کا بابا، بتایا اور گھر کے چند دیگر افراد بھی موجود تھے۔ انکل نعیم امن کے بابا کی عمر کا شخص ہے، مگر اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ کاٹن کی سفید شلوار قمیص اس پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ چہرے پر داڑھی اور سر پر ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سب لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ یہ تکلفات مجھے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ میں نے امن کی مماکے پاس بیٹھنے کی کوشش کی تو وہ فوراً گھبرا کر بولی۔

"مہک..... آپ کی نشست سامنے رکھی ہے۔" اس کا اشارہ ایک طرف الگ تھلگ رکھا ہوا صوفہ تھا۔ میں خاموشی سے وہاں بیٹھ گئی۔ اس نشست پر بیٹھنے کا مطلب تھا وہ سب میرے سامنے، میرے روبرو آ گئے تھے۔ میرا روئے سخن انکل نعیم کی طرف تھا۔ میں انہیں پہچاننے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ شخص میرے لیے مکمل اجنبی تھا، یہ سبھی کہا کہ وہاں پر جسے بھی میں نے دیکھا وہ میرے لیے اجنبی ظہیر اتھا۔ امن نے کہا تھا، انکل نعیم کو لاہور میں نے بھیجا تھا۔ کمرے میں گہری پر اسرار خاموشی چھا گئی تھی، ورنہ جب میں داخل ہوئی تو سب لوگ باتوں میں مگن تھے۔ پتا نہیں مجھے سامنے پا کر انہیں کیوں سانپ سونگھ جاتا ہے۔ یہ غیر فطری عمل میرے اندر کے غصے کو بڑھاوا دیتا تھا۔

☆.....☆

"آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔" میں نے براہ راست انکل نعیم سے پوچھا۔ میرے سوال پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر دوسرے لوگوں کو..... میں نے محسوس کیا کہ امن کے بابا نے سر ہلا کر اسے کوئی اشارہ کیا۔

"جی..... مہک جی! وہ آپ نے لاہور بھیجا تھا مجھے۔"

"کب..... یہی کوئی ایک ماہ پہلے۔"

"میں نے کیا کہا تھا۔" انکل فہیم چند لمحے خاموش رہے، پھر سوچ کر بولے۔

"مہک! آپ نے کہا تھا۔ "لاہور میں مٹی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں ہیں، ان میں ایک ڈھیری ویران ہے، اس پر برسوں سے خودرو جھاڑیاں اور گھاس پھوس اُگ آئی ہے۔ یہاں کسی نے صفائی ستھرائی نہیں کی۔ تُو جا، اسے غور سے دیکھ، پھر اس کی صفائی کرا اور جب صاف ہو جائے تو تم مینارِ پاکستان چلے آنا۔"

"ہاں تو پھر۔ آپ نے اس ویران ڈھیری کی صفائی کی۔"

"کیسے کرتا مہک! میں نے پورا لاہور چھان مارا۔ مجھے کہیں بھی مٹی کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں نہیں ملیں۔" انکل فہیم کے لہجے میں بے چارگی اور تھکاوٹ تھی۔ "میں مینارِ پاکستان بھی گیا، مگر کچھ حاصل نہ ہوا، تھک ہار کر مجبوراً واپس پلٹ آیا۔ خدا کے لیے میری رہنمائی آسان الفاظ میں کیجیے، میں پہلے ہی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہوں۔ میں نے محسوس کیا شاید وہ رینگم ہو گئے ہیں، مجھ میں اب اور ہمت نہیں ہے ٹوٹنے کی۔ اب تو میرے بکھرنے کا عمل شروع ہونے لگا ہے۔" ان کی آنکھوں سے آنسو باقاعدہ نکل پڑے تھے۔

میں نے ڈرائنگ روم میں ادھر اُدھر دیکھا، صرف دائیں طرف کی دیوار خالی تھی، ورنہ ساری دیواروں پر ڈیکوریشن، اشیاء اور خوب صورت فریمز لٹکے ہوئے تھے، میں نے خالی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انکل فہیم سے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

اس نے اُجھی ہوئی نظروں سے دیوار کو دیکھا، پھر مجھے دیکھ کر بولا۔

"دی..... دیوار ہے۔"

"دیوار میں کچھ نظر آ رہا ہے؟"

"نن۔ نہیں۔ کچھ نہیں....." انکل فہیم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"دی..... دیوار تو بالکل خالی ہے۔" میں نے دیکھا کہ گھر کے دوسرے افراد بھی اُلجھن کا شکار تھے۔ میں نے انکل فہیم کو متوجہ کر کے کہا۔

"دیوار کو غور سے دیکھیے۔" میں نے ہاتھ کو جھٹکا دے کر کہا، تو دیوار پردۂ اسکرین کی طرح دھندلا ہو گئی۔

"اوہ..... مم..... مہک....." سب کی آوازیں حیرت میں ڈوبی ہوئی میری سماعت سے ٹکرائیں، میں روشن اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اسکرین پر مینارِ پاکستان دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ مینارِ پاکستان ہے، جہاں پاکستان کی تاریخی قراردادیں منظور ہوئی تھیں۔ 23 مارچ 1940ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں آزادی کی قرارداد منظور ہوئی۔ مینارِ پاکستان ہمیں اسی اہم اور نئے موڑ کی یاد دلاتا ہے۔ مینارِ پاکستان کے مرکزی دروازے پر اللہ اکبر لکھا ہوا ہے، یعنی اللہ بہت بڑا ہے..... بے شک..... ایک دوسری سل پر مینارِ پاکستان لکھا ہوا ہے..... اور نیچے..... واللہ رب المشرق والمغرب تحریر ہے۔ اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب کا رب ہے..... بے شک۔"

"مینارِ پاکستان کا نقشہ مراد خان نے تیار کیا تھا۔ جو روسی نژاد مسلمان تھے، جب کہ اس کی تعمیر میاں عبدالخالق اینڈ کمپنی نے کی تھی۔ مارچ 1940ء اور 19 اپریل 1946ء کی دونوں قراردادِ مینارِ پاکستان پر درج ہیں۔ ان قراردادوں کو تین زبانوں اردو، انگریزی اور بنگالی میں رقم کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آزادی کی تحریکوں کا بھی مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ مینارِ پاکستان کی اونچائی آپ لوگ جانتے ہوں گی بلند ہے۔" یہ کہتے ہوئے اچانک میں نے حیرت میں گنگ افراد سے پوچھا، مگر وہاں کوئی بھی اپنے مکمل ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ میں نے خود ہی بات جاری رکھی۔

"اس کی اونچائی 96.5 فٹ ہے۔ مینارِ پاکستان کی تعمیر فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں بڑی تکنیکی مہارت کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بہت سے مقامات ہمیں بہت سے اشارے کرتے ہیں۔ اس کے مختلف چبوتروں کو مختلف (۱۰)

پہلی عالمی جنگ کا آغاز

4 اگست 1914ء کو جرمنی نے بیلجیم پر حملہ کر دیا اور یوں پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ 20 اگست 1914ء کو جرمنی نے برسلز پر قبضہ کر لیا۔ اب ان کا اگلا ہدف فرانس تھا۔ ادھر برطانیہ نے فرانس کی مدد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کا یہ اعلان دراصل جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ برطانوی فوج جو نوے ہزار پر مشتمل تھی فرانس پہنچی اور جرمنی کے خلاف کمر بستہ ہو گئی۔ اسی اثناء میں فرانس نے کئی محاذوں پر جرمنی میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر جرمنوں نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ 28 جون 1919ء کو معاہدہ ورسائی کے ذریعہ اس جنگ کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔

کی عکاسی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا ایک بڑا چبوترا بڑا کھردرا اور ناتراشیدہ ہے، مگر اس میں ایسا سامان استعمال کیا گیا ہے کہ یہ بُرا نہیں لگتا ہے۔ یہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ آزادی کے وقت ہمارے ملک کی حالت دگرگوں تھی۔ دوسرے چبوترے میں پتھروں میں تراش خراش کے ساتھ کھردرے پن کا امتزاج کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا غماز ہے کہ پاکستان اب دھیرے دھیرے سنور رہا ہے۔ تیسرے چبوترے پر کھردرا پن ختم کر دیا گیا ہے، یعنی اب اس کی حالت بالکل ٹھیک ہے۔ یہ چبوترہ ساڑھے تیرہ فٹ اونچے بنتے پر ہے اور اسی پر مینارِ پاکستان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ چوتھے چبوترے پر سنگ مرمر نہیں یہ یاد کرواتا ہے کہ اب پاکستانی عوام خوش حال اور خوش و خرم ہے۔ اندھیرے چھٹ گئے ہیں اور روشنیوں کا سفر شروع ہو چکا ہے۔" میں تھوڑی دیر کو چپ ہو گئی۔ ذہن میں عجیب اُتھل پتھل شروع ہونے لگی تھی، شاید آگے کے واقعات میں بیان کرنے سے قاصر تھی، مگر یہ حالت چند منٹ رہی، ذہن سے دھند چھٹ گئی اور واقعات خود بخود پُرمغز وارد ہونے لگے۔

"مینارِ پاکستان کی آخری چوٹی انتہائی اہمیت کی حامل ہے، اس میں اسٹین لیس اسٹیل استعمال کی گئی ہے، جس پر سورج کی شعاعیں پڑتے ہی منعکس ہو کر ارد گرد کے سارے ماحول کو منور کرتی ہیں۔ اس میں دنیا کا اہم پیغام دیا گیا ہے کہ پاکستان دنیا میں اسلام کی سربلندی کی علامت ہے۔ پاکستان کا اسلام کے ساتھ مضبوط رشتہ ثابت کرنے کے لیے اس میں سورۂ بقرہ، سورۂ آلِ عمران، سورۂ مائدہ، سورۂ الرعد کی قرآنی آیات اور مختلف اشعار درج کیے گئے ہیں، ان کی خطاطی خورشید عالم، محمد صدیق، محمد اقبال، خورشید رقم، الماس رقم، حافظ یوسف سدیدی اور ابن پروین رقم نے کی ہے۔"

اسکرین پر منظر بدلا تو ایک بہت بڑا قبرستان نظر آنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی بے شمار مٹی کی ڈھیریاں..... میں نے انکل فہیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ اتنی بڑی تعداد میں بھی آپ کو مٹی کی ڈھیریاں نظر نہیں آئیں، وہ ڈھیری بھی اسی میں ہے۔"

"اوہ..... اوہ..... میں سمجھ گیا۔ یہاں تو میری..... اوہ میرے خدا۔ مجھے سے کتنی بڑی بھول ہو گئی۔" انکل فہیم گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ اسکرین اوجھل ہو گئی تھی۔ انکل فہیم باہر کی طرف بھاگ گئے اور باقی لوگ میرے سامنے سجدہ ریز ہو گئے تھے۔ میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ کیا کر رہے ہو آپ لوگ..... اُٹھو..... فوراً اُٹھو....." میں نے حلق کے پھاڑ چیختے ہوئے کہا تو انہیں جیسے ہوش آیا۔

☆.....☆

دوسرے دن امن میرے پاس آیا تو بے حد پھٹ پڑی۔

''امن آپ نے کہا تھا، میں سب کچھ بتاؤں گا۔ مجھے پہلے انکل نعیم کے بارے میں بتاؤ۔ ان کا ماجرہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں نے انہیں لاہور کیوں بھیجا تھا، مجھے کچھ یاد نہیں۔'' میں نے اپنے بالوں میں انگلیاں پیوست کرتے ہوئے کہا، شاید اس بار میرے لہجے کا درد سوا تھا۔ امن پگھل گیا۔

''مہک۔ انکل نعیم بابا کے بچپن کے دوست ہیں۔ ہماری فیملی ان کی فیملی کے ساتھ بے حد کلوز ہے۔ انکل نعیم کی ایک بہت بڑی پرابلم یہ ہے کہ ان کی اولاد زندہ نہیں بچتی..... اولاد کے لیے وہ چار شادیاں کر چکے ہیں، مگر ہر چاروں بیویوں جو بھی اولاد پیدا ہوئی یا تو مردہ بچے کی ولادت ہوئی یا پھر وہ چند دن زندہ رہنے کے بعد ابدی نیند سو گیا۔ انکل نعیم سے چاہے اولاد کے لیے ترس گئے ہیں۔ ان کا وسیع و عریض بزنس بھی انہیں اولاد جیسی نعمت نہیں دے سکا۔ کروڑوں کے بزنس کا مالک اندر سے انتہائی دکھی ہے۔ بابا ایک دن انکل کو آپ کے سامنے لے آئے۔''

''میرے سامنے..... میرے سامنے ہی کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ نے آج تک جو کچھ بھی کیا، وہ کسی نہ کسی صورت سچ ثابت ہوا ہے۔''

امن کی بات میرے لیے حیران کن تھی، میں نے پہنچی سے پہلو بدلا۔ ذہن میں سوالات کی بارش ہونے لگی تھی، مگر جو تے بادل بھی برستے نہیں، اس لیے گونج گرج میں سوالات دب گئے۔ امن سابقہ موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

''نعیم انکل نے آپ کے سامنے اپنا دکھڑا بیان کیا، بھی آپ نے اسے لاہور بھیجا تھا، تب وہ بے جا رہے آپ کے قبرستان کا اشارہ سمجھ نہ پائے، بکل آپ نے اسکرین پر واضح کر دیا۔ اب وہ یقیناً سیدھا قبرستان جائیں گے۔ مگر ایک بات مجھے اب بھی سمجھ نہیں آئی۔ میں نے یہاں مقامی قبرستان دیکھا ہے، تمام قبریں ایک جیسی ہیں وہ بیگڑوں ہزاروں نہروں میں سے اپنی مطلوبہ قبر کیسے پہچان پائیں گے؟''

''آپ نے اس قدر احمقانہ سوال کی توقع نہیں تھی۔ آپ نے سنا اور دیکھا نہیں تھا۔ کل جب انہوں نے اس قبرستان کو دیکھا تو اُچھل کر کھڑے ہو گئے تھے اور بے اختیار کہہ اُٹھے تھے..... اوہ میں کچھ گیا..... یہاں تو میری..... امن وہاں ان کی کوئی عزیز ترین ہستی مدفن ہیں جسے وہ بھول کر پس پشت ڈال چکے ہیں، البتہ آپ کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی کہ قبرستان میں ساری قبریں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ امن یہ نظامِ قدرت ہے، موت سب کو برابر کر دیتی ہے، جب کوئی مرجائے تو یہ نہیں کہا جاتا کہ بادشاہ سلامت جلال الدین اکبر پڑے ہیں، چنگیز خان، ہلاکو خان یا نظر پڑے ہیں، بلکہ کہا جاتا ہے، میت پڑی ہوئی ہے۔ موت سب کے لیے ہے کہ پھر بھی ہم اسے بھول کیوں جاتے ہیں۔''

''ایک اور بات مہک۔''

''کیا؟''

''میں بچپن سے انکل نعیم کو یہیں دیکھ رہا ہوں، شاید وہ زندگی میں کبھی لاہور نہیں گئے، پھر وہاں انکل کی کوئی عزیز ہستی کیسے دفن ہو سکتی ہے اور جسے بھلا دیا جائے وہ عزیز ہستی کیسے ہو سکتی ہے۔''

''یہ بات انکل نعیم آئیں تو انہی سے پوچھ لینا۔ مجھے یہ بتاؤ۔ میں نے ایسا کیا کچھ کہا کہ وہ کسی نہ کسی صورت سچ ثابت ہوا۔'' میرے سوال پر امن متذبذب کا شکار نظر آیا۔

''دیکھو امن۔ میرے ذہن میں ہزاروں سوالات جنم لے رہے ہیں، ہر سوال میرے لیے نیا درد، نئی اذیت لے کر آیا ہے۔ آپ کو نہیں پتا میں کس اذیت ناک مرحلے سے گزر رہی ہوں، مجھے نہ اپنے آپ کا پتا ہے نہ خاندان کا، نہ گھر والوں کا، بلکہ میں تم لوگوں کے نت نئے ڈرامے کا کردار بنتی جا رہی ہوں۔ اس لیے خدا کے لیے میری حالت پر رحم کھاؤ۔'' میں نے اس کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔ ''میں آپ کی منت کرتی ہوں، مجھے میری پہچان کروا دو۔ مجھ پر گزرنے والا ہر پل درد اور درد کے نئے دروازے کھول رہا ہے۔ اگر میں آپ کے خاندان میں سے ہوں تو مجھے بتایا جائے کہ مجھے جنم دینے والی عورت کون سی ہے، جسے میں ماں کہہ کر پکار سکوں، جس کے سینے میں چھپ کر اپنا دُکھ درد بیان کر سکوں۔ خدا کے لیے امن

مجھے میری پہچان کروا دو۔'' اس بار میں خود پر ضبط نہ کر سکی اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بلک بلک کر رو پڑی۔ مجھے آنسوؤں کی برسات میں امن کا چہرہ پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''یہ..... یہ..... آپ کیا کر رہی ہیں۔ پلیز ایسا مت کیجیے، ورنہ میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ آپ میری منت کیوں کر رہی ہیں۔ پلیز ہاتھ کھول لیے اپنے۔'' امن گھبرا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

مزید کچھ کہنا میرے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ میرا دل و دماغ درد سے چیخ گئے تھے اور سینے میں درد کا گرم گرم دھواں بھر گیا۔

''آپ میرے ساتھ آیئے۔'' امن نے ایک طویل سانس خارج کرنے کے بعد کہا۔ مختلف راہداریاں عبور کر کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ دوسرے تمام کمروں کی طرح یہ کمرہ بھی سجاوٹ اور خوب صورتی میں یکتا تھا۔ کمرے میں ایک دیوار پر خوب صورت انتہائی نفیس فریم میں چودہ سالہ لڑکی کی تصویر آویزاں تھی۔ فریم پر پھولوں کا ہار چڑھایا گیا تھا۔ امن تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں امن کے عقب میں سر اُٹھا کر تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ فریم کے شیشے میں مجھے امن کی خوب صورت آنکھیں جو تصویر کو گھور رہی تھی، نظر آ رہی تھیں۔ امن نے تصویر کو پوری محویت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مہک آپ اسے جانتی ہیں؟''

میں نے تصویر کو بغور دیکھا۔ میں نے زندگی میں اتنی خوب صورت لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ میں حتی المقدور کوشش سے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے آنکھیں بند کر کے پوری یکسوئی کے ساتھ سوچا، مگر لڑکی کی شبیہ میرے ذہن کے کسی خانے میں واضح نہیں ہو رہی تھی۔ امن کہہ رہا تھا۔ ''مہک ذہن پر زور دیں، آپ اسے بہت اچھی طرح سے جانتی ہیں۔'' امن کے اصرار پر میں پوری سالگرہ کے ساتھ سوچنے لگی۔ آنکھیں کھول کر پھر سے بغور تصویر کو دیکھا، مگر اس بار بھی ناکامی میرے حصے میں آئی۔ میں شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''نہیں امن۔ میں اسے پہچان نہیں پائی۔'' میرے لہجے میں بے بسی و لاچارگی تھی۔

''مہک یہ میری چھوٹی بہن پارو ہے، سب کی لاڈلی اور چہیتی۔ یہی وہ کمرہ ہے جب سے نئے سال کی پارٹی میں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ یہاں.....'' امن کھوم کر ایک صوفے کے پاس کھڑا ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''اور آپ مہک مجھے آواز دینے کے بعد اس دروازے سے داخل ہوئی تھیں۔'' اس نے اشارے سے دروازے کی نشان دہی کی۔ میں اس کی کنٹری پورے ارتکاز کے ساتھ سن رہی تھی۔ میں آپ کے سامنے آ کر یہاں اس دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا تھا۔ آپ نے پارو سے پوچھا تھا۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

پارو نے ہمیشہ آپ کی بات ماننے میں جنت سے کام لیا تھا، وہ اس دن بھی رُکھائی سے بولی تھی۔ ''دیکھ نہیں رہی ہو، اندھی ہو گئی ہو؟''

''میں پارو کا جواب سن کر ناخوب اٹھا تھا، پھر آپ کی بات سن کر تو ڈر ہی گیا تھا۔ آپ نے کہا تھا۔''

''جتنی خوب صورت ہو اتنی ہی بدزبان بھی ہو۔ زبان سوچ سمجھ کر چلایا کرو۔'' امن کہے جا رہا تھا اور میرے ذہن میں جل تھل ایک ہونے لگی۔ ہوائیں چلنے لگیں، اور کچھ کچھ دھندلا پن میں واضح ہونے لگا۔ میں نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ میری آنکھوں کے پردے میں جنگل میں بھاگنے والی ایک انتہائی خوب صورت لڑکی گھومنے لگی۔ صراحی بدن، لمبی گردن، پتلی کمر، خمار بھری انگلیاں، پنڈلیوں سے ذرا اوپر تک جھولتی رسی سلکی زلفیں، عنابی آنکھیں، کمان دار پلکیں میں اُچھل پڑی تھی۔

''ہاں بالکل فریم میں سجی تصویر والی لڑکی بالکل وہی جنگل والی لڑکی ہے۔'' اوہ امن گھبرایا تھا۔ ''پارو نے آپ سے کہا تھا۔ آج سال نو کا فنکشن ہے۔ مجھے اس میں ہر صورت شمولیت کرنی ہے۔ تمہیں پتا بھی ہے، نئے سال کے موقع پر آتش بازی ہوتی ہے، برقی قمقمے جلتے ہیں، اور چراغاں کیا جاتا ہے۔''

میرے ذہن میں جنگل والی لڑکی کے الفاظ باقاعدہ دستک دے رہے تھے۔ جنگل میں آج کیا ناریل ٹوٹنے والا

ہے۔ جب ناریل ٹوٹتا ہے تو آسمان چمک اُٹھتا ہے، رنگ کے سات رنگ بکھر جاتے ہیں۔

امن کہہ رہا تھا۔ مہک آپ نے کہا تھا۔ ”بے وقوف لڑکی جب آتش بازی ہوتی ہے تو اس میں آگ بھڑکتی ہے اور آگ ہمیشہ جلد کو جلا دیتی ہے، تم بھی جل کر بھسم ہو جاؤ گی۔ میری بات مان جاؤ، وہاں مت جاؤ جہاں بھیڑیے رقص کرتے ہیں۔“ امن یہاں کی بتا رہا تھا اور میرے ذہن میں وہاں کا منظر گھوم رہا تھا۔

”بے وقوف لڑکی۔ جس درخت سے ناریل ٹوٹتا ہے، وہ اسے چبا جاتا ہے۔ تمہیں بھی چبا جائیں گے۔“ مجھے محسوس ہوا امن کچھ کہتے کہتے رو پڑا ہے۔ وہ باقاعدہ ہچکیوں میں رونے لگا تھا، جبکہ میرے سامنے جنگل کے اندر کا منظر تھا۔ لڑکی ریل کی پٹڑی میں پھنسی ہے اور میں اسے کسی مرد کے ساتھ مل کر باہر کھینچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مرد کا چہرہ دھندلا ہے، میں اسے پہچان نہ پائی۔ ہم جنگل میں لڑکی کو کھینچ رہے تھے اور یہاں امن کہہ رہا تھا۔

”پارو آپ کے منع کرنے کے باوجود چلی گئی اور آپ نے مجھے یہاں بازوؤں سے دبوچ لیا تھا اور سختی سے کہا تھا۔ اسے روکو، مت جانے دو اسے۔ آپ نے زور سے مجھے جھٹکا دیا تھا اور میری شرٹ دونوں بازوؤں سے پھٹ گئی تھی اور آپ لڑکھڑا گئی تھیں۔“ یہاں امن کی شرٹ پھٹی تھی، میں لڑکھڑائی تھی، مگر جنگل میں لڑکی کا جسم کٹا ہوا تھا اور میں ہی نہیں میرے ساتھ لڑکی کو کھینچنے والا مرد بھی لڑکھڑا کر نیچے گر گئے تھے۔

”کاش پارو آپ کی بات مان لیتی، کاش میں اسے روک لیتا۔ پارو نیا ایئر پارٹی میں چلی گئی تھی، مگر اس کے بعد ہمیں اس کی ریزہ ریزہ لاش ملی تھی۔ ڈانس پارٹی میں چند وائش نوجوان نشے میں بہک گئے تھے۔ اور..... اور..... وہ پارو کو اٹھا کر لے گئے۔“ امن اس کے آگے کچھ کہہ نہ سکا، کیوں کہ باقی کی داستان میرے ذہن میں خود بخود چل آئی تھی۔

امن نے میرے لیے سوچوں کے انبار لگا دیے تھے، سوالات کی بوچھاڑ میرے دماغ میں تڑتڑانی کیوں کی طرح برسنے لگی تھی۔ میں نے ماضی کے دریچے سے جھانکا۔ جنگل والی لڑکی پارو ہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد آ گیا، میں نے پارو کو جنگل میں جانے کے لیے روکا تھا، مگر پارو اس وقت یہاں اپنے گھر کے کمرے میں موجود تھی۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی انسان کے ساتھ دو مختلف واقعات پیش آئے تھے اور دونوں میں میری موجودگی بھی اس طرح تھی کہ مجھے اپنے ہونے کا احساس نہ یہاں تھا نہ وہاں۔ یہ قصہ میرے لیے ناقابلِ فہم معما بن گیا، میں جو شہ ذات کی آہی میں تگ و دو کر رہی تھی شاید ابھی تک کامل صنفی پہچان بھی پا سکی تھی۔

☆.....☆

میں نے دن اور رات کی تنہائی میں ذہن پر زور دے کر سوچا کہ ”جنگل میں پارو کو ریل کی پٹڑی سے کھینچتے وقت میرے ساتھ مرد کون تھا؟“ انتہائی کوشش کے باوجود میں اس سوال کا جواب نہ پا سکی۔ مرد کا چہرہ اتنا دھندلا تھا اور بجھا بجھا سا تھا کہ میں اسے پہچان نہ پائی۔ اس واقعے کو میں کئی بار ذہن کے پردۂ اسکرین پر چلا کر دیکھ چکی تھی، ہر بار پارو کا چہرہ بالکل واضح نظر آیا، مگر مرد کا چہرہ پوشیدہ رہا۔ میرے لیے مرد کا چہرہ پہچان لینا ضروری نہیں، وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟“ امن نے کہا تھا میں نے ہمیشہ استعاروں اور اشاروں میں بات کی ہے اور جو بھی کہا ہے وہ کسی نہ کسی صورت سچ ثابت ہوا ہے۔ دو اہم واقعات میرے سامنے آ چکے تھے۔ انکل نعیم اور پارو کے واقعات ہو سکتا ہے تیرہ مہینے دس دنوں میں، میں نے اس قسم کی کچھ اور حرکتیں بھی کی ہوں۔ یا کچھ اور بھی بولا ہو مجھے امن سے سب کچھ پوچھنا ہوگا۔ ابھی کسی واقعے میں میری پہچان کا دروازہ کھلے گا۔ یا شہ ذات کی طرف جانے کا کوئی راستہ کوئی کنارہ ملے گا اس گھر کے تمام افراد میں سے امن واحد شخص تھا جس پر میرا اعتبار کرنے کو دل کرتا تھا۔ گھر کے دوسرے افراد چھوٹے سے لے کر بڑے تک اور جوان سے لے کر بوڑھے تک مجھے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھتے تھے۔ میرے سامنے آتے تو ان کے سر احترام میں جھک جاتے اور لبوں پر خاموشی کا تالا لگ جاتا۔ وہ احترام کی ساری سرحدیں پار کر چکے تھے۔ امن بھی اس احترام میں کوتاہی نہیں کرتا تھا، مگر میرے کہنے پر وہ کچھ نہ کچھ بولنے لگا تھا۔ اس کا رویہ دھیرے دھیرے عام انسانوں کی راہ پر چل نکلا تھا۔

چند دنوں سے امن میرے کمرے میں نہیں آیا تو مجھے تشویش لاحق ہوئی، مبادا وہ بھی مجھ سے کترانے لگا ہے۔ یہ سوچ میرے لیے تکلیف دہ تھی، میری ضروریات زندگی کا دھیان رکھنے اور کھانا وغیرہ دینے کے لیے جو بھی عورت یا لڑکی آتی، ہمیشہ کی طرح انتہائی ادب و احترام سے چپ چاپ، میرے پوچھنے پر بھی بات کرنے سے کترا کر دامن بچا لیا۔ میں لان میں گھومنے لگتی یا بالائی منزل پر ڈرائنگ روم یا ٹی وی روم جہاں بھی گئی، کوشش کی کہ میں کسی نہ کسی کی نظر میں رہوں۔ میں نے وقفے وقفے سے سارا گھر چھان مارا۔ تمام افراد سے مل بھی چکی تھی مگر مجھے امن نظر نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گھر میں موجود نہیں ہے، شام کا کھانا دینے انیس میں سال کی خوب صورت لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس سے پہلے میں اسے مشترکہ لوگوں میں دیکھ چکی تھی۔ آج پہلی بار وہ تنہا آئی تھی۔ گھر کی دوسری نوجوان لڑکیوں کی طرح اس نے بھی بنل بوٹیوں والی بھڑکیلی چست پینٹ اور شارٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ اتنی چھوٹی تھی کہ وہ کھانا رکھنے کے لیے میز کی جانب جھکی تو کمر عریاں ہونے لگی، جس کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ توقع کے عین مطابق میرا سوال سن کر وہ بری طرح چونکی۔

”جی۔“ اس نے جی کو خاصہ لمبا کھینچ کر ادا کیا۔ خوب صورت چہرے اور بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے بھر گئیں۔

”آپ کا نام پوچھا ہے، اس میں اتنا حیران ہونے والی کون سی بات ہے۔“

”جی..... میرا..... میرا نام۔ امبر ہے۔“

”تم نے شارٹ شرٹ کیوں پہن رکھی ہے؟ تمہیں کچھ احساس ہے۔ حرکات و سکنات سے تمہاری کمر اور پیٹ کا ناف تک کا حصہ ننگا ہو رہا ہے۔“

”جی۔ مجھے پتا ہے۔“ اس کا جواب میری توقع سے ہٹ کر تھا۔

”اس کے باوجود تم ایسے کپڑے پہنتی ہو؟“ میرے سوال پر ویسے ہی حیرانی ہوئی جیسے مجھے اس کا جواب سن کر ہوئی تھی۔

فرزانہ آغا ماہنامہ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کی وہ مصنفہ جن کی کہانیوں اور افسانوں کے کردار ہی نہیں عنوان بھی بولتے ہیں.....

رقص طاؤس کے بعد ایک اور شاہکار مجموعہ

کہانی پوچھو تم

منظر عام پر آ گیا ہے

کتاب ملنے کا پتہ

علی میاں پبلیکیشنز

20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار۔ لاہور

فون 7247414

"جی۔ اس میں کیا برائی ہے۔"

"عجیب لڑکی ہو۔ گھر میں جوان مرد گھومتے ہیں۔"

"جوان مرد۔" امبر کی خیر انگی جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ "جوان مرد کون ہیں؟ سب میرے اپنے ہی تو ہیں، میرے ڈیڈ، تایا، چچا، بھائی۔"

"کیا تم امن کی بہن ہو۔"

"جی ہاں۔"

"مگر امن نے تو کہا تھا کہ اس کی تین بہنیں ہیں۔"

"میں امن کی چچازاد بہن ہوں، منجھلے چچا کی بیٹی۔"

"تو پھر امن تمہارا سگا بھائی تو نہ ہوا۔"

"امن میرے لیے بھائیوں جیسا ہی ہے۔"

"بھائیوں جیسا ہے، بھائی تو نہیں۔" میں نے اپنے الفاظ پر کافی زور دے کر کہا۔ میرے لہجے کی سختی محسوس کر کے امبر گھبرا گئی۔ میں نے لہجے میں ملائمت پیدا کی، تاکہ اس کا ڈر دور ہو اور میرے ساتھ بات جاری رکھے۔

"امن کہاں ہے؟ مجھے اِن دنوں نظر نہیں آ رہا۔"

"جی امن بھائی کراچی گئے ہوئے ہیں۔ کراچی میں آغا خان ہسپتال میں ڈاکٹروں کا ایک اہم سیمینار منعقد ہو رہا ہے۔"

"تو کیا امن بھی ڈاکٹر ہے۔"

"جی ہاں پاکستان کے چند مشہور ڈاکٹرز میں امن بھائی کا شمار ہوتا ہے، اپنے شعبے میں بڑے صحیحی ہیں، آپ کا علاج بھی تو امن نے ہی کیا تھا۔"

"میرا علاج، کیا میں بیمار تھی۔" میرے سوال پر امبر کو احساس ہوا کہ شاید وہ کچھ غلط بول گئی ہے، مجھے دھڑکا لگا کہ وہ بھاگ جائے گی۔

میں نے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔ "امبر میں یہاں پچھلے تیرہ چودہ مہینوں سے رہ رہی ہوں، اس دوران میرے گھر والوں نے آپ لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔"

"آپ کے گھر والے کہاں ہیں۔" امبر نے الٹا سوال کر دیا۔

"مجھے کیا پتا کہ کہاں ہیں، تمہیں پتا ہوگا۔"

"ہاں مجھے پتا ہے۔"

"اچھا ہے۔ میں خوشی سے اُچھل پڑی، کون ہیں اور کہاں ہیں۔" میں نے بے چینی سے پوچھا۔ میں بے اختیار مرکز کران کے قریب ہو گئی، مگر امبر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"مہک جی!" ہم ہی آپ کے گھر والے ہیں۔

"اچھا تو امن تمہارا بھائی ہے تو میں تمہاری کیا لگتی ہوں۔" اس بار امبر خاموش ہو گئی۔

"جواب دو نا میری بہن۔ کیا میں بھی تمہاری کزن ہوں۔" ذرا توقف سے میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "ہاں تم میری بہن ہو۔"

"نن..... نہیں۔ آپ میری بہن کیسے ہو سکتی ہیں۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی امبر؟ میں بھی تمہاری طرح کی ہی ایک عام سی لڑکی ہوں۔ عمر میں بھی اُنیس بیس کا فرق ہے، شاید تم ایک سال مجھ سے چھوٹی ہو۔"

"نہیں۔ نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ..... وہ کہتے کہتے رک گئی، آپ کھانا کھالیں، میں بعد میں آؤں گی۔" میرے کچھ کہنے سے قبل وہ پھرتی سے چست ہرنی کی طرح کلانچیں بھرتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے طویل سانس لے کر کھانے کے برتن کی طرف دیکھا۔ اعلیٰ اور لذیذ کھانا میرا منتظر تھا۔ گھر کے باقی افراد ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے تھے، مگر مجھے ہمیشہ کھانا کمرے میں پہنچایا گیا تھا۔

☆.....☆

میں نے امبر کی طرح گھر کے دوسرے تمام افراد کو وقتاً فوقتاً آزما کے دیکھ لیا۔ امن کے علاوہ مرد و زن میں ایک بھی فرد نہیں جسے میں سیڑھی بنا کر اوپر کی منزل تک پہنچ سکتی۔ وہ سب میرے سوال کے سامنے یوں متزلزل ہو جاتے ہیں جیسے ان کے اندر زلزلہ آ گیا ہو۔ میرے لیے ہر دن ایک نیا معمہ بن رہا تھا۔ میرے لیے عجیب بات یہ تھی کہ مجھے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا، مگر میں مکمل ہوش و حواس میں ہونے کے ساتھ ساتھ شعور میں بھی تھی۔ مجھے اس بات کا بہت اچھی طرح ادراک تھا کہ ڈاکٹر مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ وکیل عدالت میں کیس لڑتے ہیں اور پیش امام مسجدوں میں نمازیں پڑھاتے ہیں، مگر اپنے بارے میں سوائے نام کے کچھ نہیں جانتی ہوں۔ امن ایک ہفتے کے لیے کراچی گیا ہوا تھا۔ گھر کی فضا میں، میں حد درجہ بوریت کا شکار ہونے لگی تھی، اوپر سے ان کے عجیب و غریب ڈھکوسلوں نے مجھے چڑچڑا کر رکھا تھا۔ گھر کی فضا میرے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگی۔ یہاں میرا دم گھٹنے لگا، اس لیے اس بار جب سارے گھر والے میرے سامنے دو لانگوں میں جمع ہوئے اور دائرے کی شکل میں ہاتھ باندھ لیے، آنکھیں بند کر لیں تو میں نے امن کے بابا سے کہا۔

"مجھے باہر جانا ہے؟"

"باہر..... کہاں مہک جی۔" انہوں نے توجہ سے پوچھا پھر خود ہی بولے۔ "لان میں چلنا ہے۔"

"جی ہاں۔ یہ گھر اور اس کا لان باغ میں سب کچھ پچاس بار دیکھ چکی ہوں۔ میں اس تین کنال کے گھر سے باہر جانا چاہتی ہوں، تاکہ دیکھ سکوں باہر کی دنیا کیسی ہے، سفید یا سیاہ۔"

"جی....." وہ حیرانی سے بولے۔

"جی..... مجھے پتا چلے کہ باہر آپ جیسے لوگ موجود ہیں۔ جن سے کچھ پوچھا جائے تو خوف سے کانپنے لگتے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں باہر والے بھی میرے سامنے یوں لائنیں بناتے ہیں اور ہاتھ جوڑ کر دل ہی دل مجھے گالیاں دیتے ہیں۔"

"یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مہک جی..... گالیاں....." اس بار امن کے بابا حیرت سے بولے تھے۔

"جی ہاں گالیاں..... میں تو یہی سمجھوں گی نا۔ آپ ہر روز ایک ہی طرز عمل پیرا ہیں۔ جو کچھ بھی کہتے ہیں، دل ہی دل میں کہا جاتا ہے، تو میں کیا سمجھوں۔" کہتے ہوئے میرے لہجے میں تلخی در آئی تھی، جسے سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ ان کے چہروں پر غم و فکر کی ہوائیں اُڑنے لگیں۔

☆.....☆

"میں انسان ہوں، مجھے تم لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے۔ میرے سامنے یوں ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہو جیسے آپ لوگ مسلمان نہیں ہندو بیاہت پرست ہو۔ آپ لوگوں کے اس عمل سے مجھے بے انتہا کوفت ہوتی ہے۔" میرا جی چاہ رہا تھا، آج ان سب کو کھری کھری سناؤں۔ حیرت انگیز طور پر ذہن میں الفاظ کا نزول تسلسل سے ہونے لگا تھا۔

"آپ کو پتا ہے یہ بدھ مت کون ہیں؟ کیا ہیں؟" میں نے ذرا توقف سے بات جاری رکھی۔ "پتا نہیں۔"

"ٹھہرو میں بتاتی ہوں، کہ بدھ مت کون ہیں۔" میں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں، سامنے کی سفید دیوار خالی تھی۔

"وہاں دیکھو۔" میرے اشارے پر انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا تو حیرت اور خوف سے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے۔ بوڑھی عورتیں آہستہ آہستہ نیچے فرش پر بیٹھ گئیں۔ ان سب کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے، وہ انگشت بدنداں روشن دیوار کو دیکھ رہے تھے، جس پر ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔

(اس حیرت انگیز اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! "مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے مظاہرے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ "سچی کہانیاں" میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو از راہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات نوٹ کرلیں منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1).....مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جو لوگ خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2).....منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کریں۔

(3).....اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ "سچی کہانیاں" 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

□ راحیلہ۔ سکھر۔

○ محترم بابا جی! السلام وعلیکم۔ میرا نام راحیلہ ہے اور میری بچی کا نام نمرہ ہے، مسئلہ یہ ہے کہ میری بچی کا دماغ پڑھنے میں بہت کمزور ہے اور وہ شرارتیں بھی بہت ہی زیادہ کرتی ہے، چھوٹے بڑے کسی کا لحاظ نہیں کرتی اور نہ ہی میرا کہنا مانتی ہے، اتنا تنگ کرتی ہے کہ میں اکثر رو پڑتی ہوں، اس کی عمر اب سات سال ہونے کو ہے۔ اسکول، مدرسے جہاں بھی جاتی ہوں مجھے اس کی شکایتیں سننے کو ملتی ہیں اور اس کی نظر بھی بہت کمزور ہے، دور سے کسی چیز کو دیکھتی ہے تو آنکھیں بہت میچتی ہے اور دھوپ میں اس کی آنکھیں بند ہوجاتی ہیں۔ میں اپنی بیٹی کے بارے میں بہت فکرمند ہوں۔ برائے کرم مجھے اس مسئلے کا حل بتائیں۔ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔

☆ بیٹی راحیلہ! بچوں کو اگر بات بات پر مارا اور جھڑکا جائے تو وہ ڈھیٹ ہوجاتے ہیں۔ بچوں کی بھی عزتِ نفس ہوتی ہے اور اس کو مجروح کرنے کا والدین کو بھی حق نہیں۔ بہرحال بچی کو نرمی اور محبت سے سمجھاؤ۔ تم اپنے اندر برداشت پیدا کرو۔ ہر بچہ ایک سا نہیں ہوتا پھر اولاد کو اچھی طرح پالنے کے لیے بہت توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ تم نمازِ عصر کے بعد 11 بار سورۂ ناس پڑھ کر بچی پر دم کرو اور اللہ سے دعا کرو کہ اللہ اس کو فرمانبردار بنادے۔ حسبِ استطاعت صدقہ ضرور نکالا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ J.B۔ مقام نامعلوم۔

○ محترم بزرگ! میرے لیے مجبوری ہے کہ میں خط میں اپنا درست نام اور مقام نہیں لکھ سکتی۔ ایک مدت کے بعد دیارِ غیر میں اردو زبان کا رسالہ دیکھا تو آنکھیں بھر آئیں پھر آپ کا کالم پڑھ کر میں بہت دیر تک روتی رہی۔ میں اُن بدنصیب عورتوں میں سے ہوں جو جیسے کی چمک سے متاثر ہوجاتی ہیں۔ میرا تعلق پاکستان کے ایک درمیانے درجے کے خاندان سے ہے۔ ہمیشہ گھر میں روپے پیسے کی تنگی دیکھی پھر والدین نے شادی کردی۔ وہ لوگ بھی ہمارے جیسے ہی تھے۔ شوہر کے منع کرنے کے باوجود میں نے ایک ادارے میں نوکری کرلی۔ مالی آسودگی آئی تو شوہر بھی چپ ہوگئے۔ میں صبح سے گئی رات کو گھر میں تھکی۔ اللہ نے دو بیٹے بھی دیے جو دادی کے حوالے کرکے میں اپنی دنیا میں مگن رہی۔ پھر اپنے باس کے کہنے پر ایک میٹنگ میں ان کے ساتھ بیرونِ آئی اور اب یہاں ایسی جگہ ہوں جہاں شریف عورتیں تو کیا شریف مرد بھی بچ کر گزرتے ہیں۔ اپنی اولاد کو دیکھنے کو ترس رہی ہوں۔ شوہر کے گھر کا سکھ یاد آتا ہے۔ مگر جانتی ہوں واپسی کے سارے دروازے بند ہوگئے ہیں۔ 3 سال سے روزے ہوں۔ روز جیتی ہوں روز مرتی ہوں۔ مجھے سکون کا راستہ دکھایئے۔ میں حرام موت کو گلے لگانا نہیں چاہتی۔ آپ کو اللہ اور اس کے رسول کا واسطہ میرے لیے کچھ کیجیے۔

☆ بیٹی! تمہارے خط کا کچھ حصہ صرف اس لیے شائع کیا تاکہ پڑھنے والے عبرت حاصل کریں۔ بیٹی! بے شک تم نے بہت کچھ کھودیا ہے مگر ایک راستہ ابھی باقی ہے اور وہ ہے توبہ کا راستہ۔ یہ درِ زندگی کی آخری سانس تک کھلا رہتا ہے۔ بس بہت گڑگڑا کر اللہ سے دعا کرو۔ اپنی اولاد کو تو نہ پال سکیں لیکن اگر چاہو تو کسی ایک سفید پوش گھرانے کی کفالت کرسکتی ہو۔ اس سے تمہیں قلبی اور ذہنی بہت سکون میسر آئے گا۔ نماز پابندی سے ادا کرو اور چلتے پھرتے "یا مجیب" کا ورد کرو۔ اللہ سے دعا کرو کہ وہ کرم پر حرم فرمائے۔ مجھ سے رابطے میں رہو۔ میں تمہارے لیے خاص دعا بھی کروں گا۔

□ سیدہ زرق شاہ۔ لیڈز۔

○ بابا جی! میں پچھلے 18 سال سے لیڈز میں ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ زندگی آرام سے گزر رہی ہے۔ میرے دو بچے ہیں۔ بیٹی بڑی ہے میں اس کی پاکستان میں شادی کرنا چاہتا ہوں مگر میری بیوی بالکل تیار نہیں اصل میں وہ انگریز ہے مگر شادی سے قبل اس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس کے دماغ میں پتا نہیں کیسے یہ بات آگئی ہے کہ پاکستانی لڑکے بیویوں کو مارتے پیٹتے ہیں۔ بس اسی بات کو لے کر وہ بہت خوف زدہ ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ مفروضہ اس کے دماغ سے نکل جائے اور وہ خوشی سے پاکستان آنے پر تیار ہوجائے۔ میں بدمزگی کے بغیر یہ معاملہ طے کرنا چاہتا ہوں۔

☆ عزیزم زرق! اللہ تمہیں درست فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیا تمہارا اپنا رویہ بیوی سے اچھا نہیں رہا جو وہ ایسا سوچ رہی ہے؟ بہرحال اپنے رویے سے

ثابت کرو کہ اس کی سوچ غلط ہے۔ نماز پڑھو اور دعا کرو نماز عشاء کے بعد ایک بار سورۂ یونس پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ سجاول علی۔ اٹک۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم۔ میرا بھائی اٹلی میں مقیم ہے، میں اس کا مسئلہ من وعن اس ہی کی زبانی بیان کررہا ہوں۔ بابا جی! میں تقریباً گزشتہ دس سال سے اٹلی میں بسلسلہ روزگار مقیم ہوں لیکن تادم تحریر کوئی صورت بنتی نظر نہیں آتی کہ کوئی باعزت رزق حلال ملے۔ بابا جی! میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح فون پر آپ سے بات ہو لیکن یہ بھی اللہ کو منظور نہیں تھا۔ اب خط لکھ رہا ہوں کہ شاید آپ تک پہنچ جائے اور ممکن ہے اللہ کی ذات آپ کو میرے لیے کوئی ذریعہ بنادے۔ بابا جی! میں اگر اپنے بارے میں آپ کو سب کچھ لکھوں تو شاید پورا دن لگ جائے لیکن میں آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا، قصہ مختصر یہ ہے کہ مجھ پر ناجانے کس نے کوئی گندہ عمل کردیا ہے کہ نہ تو مجھے سکون ہے اور نہ روزگار مجھ پر (کمرے میں) خون سے چھینٹے بھی گرائے گئے ہیں۔ پانچ وقت کی نماز بھی پڑھتا ہوں اور تلاوت بھی کرتا ہوں، لیکن شاید میرا خدا مجھ سے ناراض ہے۔ ہر روز مایوس ہوتا جارہا ہوں اور یقین جانیے اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو اس وقت تک میں یہ بھی کر گزرتا۔ میرے لیے اب آپ ایسے ہیں جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ میرے والدین مجھ سے الگ ناراض لگ رہے ہیں ان کا خیال ہے کہ میں ان سے جھوٹ بول رہا ہوں اور انہیں پیسے نہیں بھیج رہا۔ یہ بھی ڈرے کہ کہیں وہ بددعا ہی نہ دے دیں۔ بیوی اور بچے بھی پاکستان میں الگ پریشان ہیں کیوں کہ میں ان کو بھی کچھ نہیں دے رہا۔ یہاں دن بدن قرض ہی بڑھتا جارہا ہے۔ بابا جی! میں آپ کو اس ذات کا واسطہ دیتا ہوں کہ جس کے قبضے میں ہماری جان ہے کہ مجھے خط کا جواب ضرور اور جلدی دیں اور اگر ہو سکے تو اپنا ذاتی فون نمبر بھی دے دیں۔ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے دعا ہے اور کچھ نہیں اور آپ دعا کریں کہ اللہ پاک میرا شمار بھی آپ کی طرح دینے والوں میں کردے۔ مجھے آپ کے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔

☆ بیٹے! تمہارا خط پڑھا تمہیں ضرورت ہے کہ نماز کی پابندی کرو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار سورۂ ناس اور 9-9 بار سورۂ فلق پڑھو اور اپنے اوپر دم کرلیا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ راشدہ سلیم۔ چکوال۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم۔ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ میرے ایک جاننے والے نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا اور آپ کا پتا بتایا کہ آپ بہت سے پیچیدہ مسائل کا حل بہت آسانی سے نکال لیتے ہیں۔ وظائف اور تعویذ بھی دیتے ہیں۔ خدارا میرے مسئلے کا بھی کوئی حل نکالیے کہ میں بہت پریشان اور اداس ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر کو فوت ہوئے تقریباً 4 سال ہو چکے ہیں، میرے 4 بچے ہیں۔ میرے سارے بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوش شکل و صورت کے اچھے، قد کاٹھ والے اور برسرروزگار ہیں۔ جب سے میرے شوہر فوت ہوئے ہیں میرا کوئی بھی کام آسانی سے پورا نہیں ہوتا۔ ہر کام میں ناجانے کیوں اتنی رکاوٹیں اور پریشانیاں آجاتی ہیں کہ وہ پورا نہیں ہو پاتا، بہت منتوں مرادوں کے بعد میری دو بیٹیوں کی شادی ہوئی ہے جب کہ سارے بچے شادی کے قابل ہیں۔ جہاں کہیں رشتے کی بات شروع ہوتی ہے بہت پُرامید طریقے سے ہوتی ہے مگر کچھ عرصے میں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ صرف رشتوں میں ہی نہیں بلکہ ہر کام میں ہوتا ہے۔

☆ بیٹی راشدہ! اللہ تمہاری مشکل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھو۔

۳۳ بار سُبْحَانَ اللّٰهِ
۳۳ بار اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ
۳۴ بار اَللّٰهُ اَكْبَرُ
پھر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

اول و آخر درود شریف 7-7 بار پھر حاجت بیان کرو مدت 2 ماہ ہے۔ مجھ سے فون پر ضرور رابطہ کرتا بیٹی۔

□ رحمت خان۔ ابوظہبی۔

○ بابا صاحب! میری عمر 38 سال ہے۔ عرصہ بارہ سال سے میں یہاں مقیم ہوں میں ایک بہت مشکل کا شکار ہوں۔ مجھے گلے میں شدید تکلیف رہتی ہے۔ ذرا سا کچھ بازار کا کھالوں، گلا خراب ہو جاتا ہے۔ آپ مجھے اپنی تیار کردہ دوا ارسال کردیجیے۔ میں بہت ممنون ہوں گا۔

☆ بیٹے رحمت! اللہ تمہیں شفا دے۔ نماز کی پابندی رکھو۔ دوا تیار کردوں گا۔ مگر اکثر دوائیں مطلوبہ پتے پرپل نہیں پاتیں۔ اس لیے آپ آفس سے دستی منگوا سکتے ہیں۔

□ انیس احمد۔ رحیم یار خان

○ بابا جی! میں یہاں ایک پرائیویٹ جاب کرتا ہوں۔ کام کے حساب سے تنخواہ نہیں ہے۔ گھر والوں سے بھی دور ہوں اور محنت کا صلہ بھی نہیں ملتا ہے۔ کوئی ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے میری مشکل حل ہو جائے۔

☆ بیٹے انیس! ہر نماز کے بعد 300 بار پڑھو اور دعا کرو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات بھی ضرور دو۔ مدت 2 ماہ دس دن ہے۔

○ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○

□ زینب سلیم۔ حویلیاں۔

○ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں میری شادی کو 3 سال ہوگئے ہیں اور میں اب تک اولاد سے محروم ہوں سسرال والے باتوں باتوں میں جتادیتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے میرے شوہر بہت اچھے ہیں مگر کب تک؟ میں نے اکثر خطوط کے جواب میں پڑھا ہے کہ آپ تعویذ دیتے ہیں۔ مجھے بھی تعویذ دے دیں تاکہ یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ بابا جی! بہت معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ میں وظیفہ نہیں کرسکتی ہمارے گھر کا کچھ ماحول ایسا ہے کہ بس صرف نماز ہی پابندی سے ادا ہو جائے تو بہت ہے۔ میرے والدین بھی آپ کو بہت دعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی زینب! اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس مت ہونا بے شک وہ نہایت مہربان آقا ہے۔ میں تمہیں تعویذ تیار کردوں گا مگر اس کے لیے مجھے تھوڑی سی تفصیل درکار ہے مجھے اپنا مکمل نام مع والدہ کے اور شوہر کا مکمل نام مع والدہ کے ارسال کرو۔ ہمراہ جوابی لفافہ تاکہ تعویذ ارسال کیا جاسکے۔

□ یاسر خان۔ بھور بن۔

○ بابا جی! اللہ آپ کو لمبی زندگی دے۔ میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور عزت کے ساتھ اپنے گھر لانا چاہتا ہوں۔ میرا اپنا ذاتی کاروبار ہے جس سے اللہ کا شکر ہے گزارہ بہت اچھا ہو جاتا ہے۔ گھر میں صرف میں اور میری والدہ ہیں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس کی جانب سے انکار نہ ہو جائے۔ وہ لڑکی کراچی کی رہنے والی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ایسا وظیفہ دیں جس کے کرنے کے بعد میں اپنی والدہ کو بھیجوں تو انکار نہ ہو۔

☆ بیٹے یاسر! اگر تم سمجھتے ہو کہ تم اس قابل ہو کہ اپنی بیوی کو بہت اچھی طرح رکھ سکتے ہو تو یہ تمہارا حق ہے کہ اچھی لڑکی اور اچھا گھر دیکھتے ہوئے رشتہ دو۔ اچھے رشتے کو ٹھکرانا کفران نعمت ہے اب یہ بات لڑکی والوں کو بھی سمجھنی چاہیے۔ بہرحال بیٹے! نماز عشاء کے بعد 9 بار سورۂ مرسلات پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 14 دن ہے۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ فیروزہ۔ مقام نامعلوم

○ بابا جی! السلام علیکم، میرا نام فیروزہ ہے میری عمر 36 سال ہے میرے والدین کا انتقال ہوگیا ہے اور تمام بہنیں شادی شدہ ہیں۔ میرا شادی کا مسئلہ ہے، رشتے آتے ہیں میری کہیں بات نہیں بنتی ہے میں چاہتی ہوں کہ میرا کہیں اچھی جگہ رشتہ ہو جائے شادی کا مسئلہ حل ہو جائے آپ کی دعاؤں کی طلب گار۔

☆بیٹی فیروزہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بعد نماز فجر 14 دن سورۃ احزاب ترجمہ کے ساتھ پڑھو اور دعا کرو پورے یقین سے جب بھی دعا کی جاتی ہے وہ بارگاہِ الٰہی میں ضرور شرف قبولیت پاتی ہے، کوشش کرو کہ ہر وقت باوضو رہو، اگر تعویز درکار ہو تو پھر مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھنا۔

□ فریدہ۔ مقام نامعلوم

o باباجی السلام علیکم! میرا بھانجا شاہ رخ نام ہے اس کے سر پر رسولی ہے آغا خان سے آپریشن بھی کروایا مگر وہ پھر ہوگئی ہے الحمد اللہ ویسے تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن وہ سر کی بیرونی جلد پر ہے تو بہت بڑی ہوگئی ہے ہر طرح کے علاج کروائے اب میری بہن کے حالات بھی اتنے اچھے نہیں کہ وہ مزید کچھ کر سکے۔ بھانجے کی عمر اب 17 سال ہے تو اس کے لیے کوئی وظیفہ بتادیں۔

☆بیٹی فریدہ! اللہ بچے کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو، نماز فجر اور عصر کے بعد ایک ایک بار بچے کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آیت الکرسی پڑھو اور مسلا کرو، ڈاکٹری علاج بالکل ترک مت کرنا۔ دوا اور دعا دونوں بہت ضروری ہیں۔

□ مہوش۔ مقام نامعلوم۔

o السلام وعلیکم باباجی! میرا نام مہوش محمد سلیم ہے اور میری عمر 26 سال ہے۔ میں تقریباً چھ، سات سال سے کافی بیمار رہتی ہوں۔ سب سے پہلے مجھے نیند نہ آنے کی شکایت ہوئی اور تھوڑے وقت میں میرے سر سے بال گرنا شروع ہوگئے جس سے سر کے سامنے کی طرف گنج پن ہوگیا اور وہ آج تک میرے بال صحیح نہیں ہوئے جب کہ میں نے ڈاکٹروں سے علاج کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی نہ بالوں کے لیے نہ بیماری کے لیے مگر کوئی فرق نہیں ہورہا۔ کچھ وقت پہلے سے میرے کپڑوں پر خون کے نشان اور جسم پر بھی عجیب سے نشانات آجاتے ہیں، جیسے کچھ لکھا گیا ہو یا ناخن اور انگلیوں کے نشانات۔ میرا کوئی کام نہیں ہو پاتا۔ میں نے 2003 میں میٹرک کیا، آگے پڑھنا چاہتی ہوں، کالج میں بھی داخلہ لیا اور پرائیویٹ بھی کرنا چاہا مگر میرا انٹر بھی نہیں ہو پارہا۔ Job کرنا چاہتی ہوں مگر اتنی کوششوں کے باوجود بھی صرف ناکامی ہی ہوتی ہے، عمر 26 سال ہے مگر رشتہ بھی نہیں ہوتا۔ میں ان تمام ناکامیوں اور بیماری سے بہت عاجز آچکی ہوں۔ اس مہینے میں میری طبیعت بہت زیادہ خراب رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دل پر کوئی بہت بھاری پتھر رکھ دیا ہو یا جیسے کوئی سانس روکنے کی کوشش کررہا ہو۔ ہم 12 سالوں سے جس گھر میں رہ رہے ہیں اب ہم وہ گھر چھوڑنا چاہتے ہیں۔ ہمارا گھر کرائے کا ہے، مگر کبھی ابو تو کبھی بھائی رضامند نہیں ہوتے اور جب ہو جائیں تو کسی نہ کسی وجہ سے ہم اس گھر سے جا نہیں پارہے۔ ابو اور بھائی کا کام ہوتے ہوئے بھی گھر میں برکت نہیں ہوتی اور اکثر و بیشتر تو حالات بہت ہی زیادہ بُرے ہوجاتے ہیں۔ ہم چار افراد ہیں گھر میں مگر ہمارے گھر میں کوئی نہ کوئی بیمار ہی رہتا ہے خاص کر میں اور میرے والد صاحب۔ 3 سال پہلے میری والدہ Hospitalize ہوئی تھیں تب سے اُن کی بھی طبیعت نرم گرم رہتی ہے۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا، آپ کی دعاؤں کی طلب گار۔

☆بیٹی مہوش! تمہارا ساتھ معاملہ سفلی عملیات کا ہے مزید تاخیر کیے بنا مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو تاکہ تفصیل سے جواب دیا جاسکے۔ فجر اور ظہر پر نماز فجر اور عشا کے بعد ایک ایک بار سورۂ توبہ پڑھو۔

□ س۔ف۔ حیدرآباد۔

o محترم باباجی! السلام وعلیکم! میں ایک ایسے مسئلے میں گرفتار ہوگئی ہوں کہ جس کے بارے میں میں کسی سے تو کیا خود سے بھی کوئی بات کرتے ڈرتی ہوں، میں نے اپنا نام اور شہر فرضی لکھا ہے۔ باباجی میں فائنل بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں اور اگلے ہی سال ڈاکٹر بننے والی ہوں، مگر مجھے لگتا ہے کہ اب یہ سب کچھ خواب ثابت ہوگا۔ باباجی! اندرونِ سندھ سے آنے والا میرا ایک کلاس فیلو جو کہ بے حد وجیہ و شکیل تھا۔ میں دوسری لڑکیوں کی طرح اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی اور باباجی ایک سال دھواں دھار عشق

کے بعد ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ باباجی! میں اُسے کسی بھی طرح، کسی بھی قیمت پر حاصل کرلینا چاہتی تھی۔ عشق کا بھوت اُس وقت اُترا جب اچانک محبت کی اس اندھی کو بند کمرے کے مناظر کسی دوسرے لڑکے نے موبائل کے ذریعے دکھا کر استعمال کیا۔ اللہ کے واسطے باباجی میں تنگ آگئی ہوں اپنی زندگی سے، یہ فیلڈ اتنی بھی بری نہیں مگر ہم محبت میں اندھی ہوجانے والیاں..... آپ کے ہاں کا کالم مسئلہ یہ ہے میں بچپن سے پڑھتی آرہی ہوں کیوں کہ میرے گھر کچی کہانیاں آتا تھا۔ میری امی پر کسی نے کالا جادو کروایا تھا تو آپ ہی کے پاس مسئلہ لکھ کر بھیجا تھا۔ خدا کا کرم ہوا اور آپ وسیلہ بن گئے۔ باباجی! اب میرا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ ایسا کردیں کہ از خود اُس ظالم کا دل نرم ہوجائے اور یہ میری زندگی کا کالا باب بند کرانے کے لیے وہ خود ایسا کرے کہ میں جس طرح کھلونا بن چکی ہوں، ایک نارمل لائف جینے لگوں۔

☆بیٹی! تم نے جو مسئلہ بتایا ہے وہ از خود تمہارا پیدا کردہ ہے، تمہارا حساب لگایا گیا ہے تم بہت بڑی آزمائش میں گھر چکی ہو۔ سب سے پہلے تو ہر وقت باوضو رہو، نماز کی پابندی کرو۔ اور تمہارے دوست نماز دشمن کے لیے بھی، بہت اہم تعویذات تیار کرالیے گئے ہیں۔ تم فوری طور پر سچی کہانیاں کے آفس فون کرکے طریقہ استعمال معلوم کرو۔ باقی کچھ چیزیں تمہارے جوابی لفافے میں ڈالی جارہی ہیں۔ امید ہے اس آزمائش سے تم جلد سرخرو ہوجاؤ گی۔ باقی ہو سکے تو روزانہ تین بار سونے سے پہلے سورۂ یٰسین کی تلاوت کو باقاعدہ بناؤ۔ اور اکتالیس دن تک روزانہ صبح فجر کے بعد سورۂ مریم کی تلاوت کرو۔ اس وقت تمہیں ہمت سے کام لینا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر چیز کو اُس کی جگہ پر اُتنا ہی اہمیت دو مگر شدت ہر چیز کی ہی بری ہوتی ہے، مجھ سے رابطے میں رہنا۔ خدا رحم کرے گا۔

□ محمد فیصل ڈوگر۔ مظفر گڑھ۔

o بہت اچھے باباجی! السلام علیکم! میرے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا ہے، ابھی حال ہی میں ہمارے کالج میں پنجاب حکومت کی جانب سے کیش پرائز اور لیپ ٹاپ تقسیم کیے گئے، میرا نام بھی اُس لسٹ میں شامل تھا مگر نا جانے کیسے اور کس طرح میری جگہ مجھ سے پانچ نمبر کم لڑکے کو میرا حق دے دیا گیا۔ میرا مسئلہ حل کیجیے، خدا کے بعد آپ کا ہی آسرا ہے۔ کسی طرح بھی ہو مجھے میرا حق مل جائے۔ آپ کا بہت بہت نام سنا ہے۔ امید ہے آپ کی دعائیں ضرور نتائج کا باعث بن جائیں۔

☆بیٹے فیصل! بیٹے تمہارا مستقبل ایک لیپ ٹاپ سے بہت آگے ہے۔ تم ہر روز نماز فجر کے بعد الحمد شریف کی تسبیح ایک سو ایک بار پڑھ کر پانی میں دم کرکے پیو اور پھر آیت الکرسی کا حصار قبلہ رُخ منہ کرکے باندھ لو۔ تمہارے لیے ایک تعویذ لکھا ہے۔ جو تمہیں روانہ کیا جارہا ہے، امید ہے تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ تعویذ گلے سے نا اتارنا۔

□ ن۔ س۔ کراچی۔

o محترم باباجی! السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ پاک آپ کو صحت و تندرستی عطا کرے آمین۔ باباجی میں نے B.Com کے بعد C.A میں داخلہ لیا۔ اس کا ٹیسٹ انتہائی مشکلوں سے پاس کرنے کے بعد میں نے C.A کے Module A کے دو پیپر دیے جس میں سے English میں پاس جب کہ QT یعنی Maths میں فیل ہوگئی پھر میں نے Module B کے 3 پیپر کے ساتھ QT کا پیپر دیا اور جب نتیجہ نکلا تو میں چاروں پیپروں میں فیل ہوگئی۔ باباجی میں بہت پریشان اور مایوس ہوں۔ والد بہت محنت کرکے مجھے پڑھا رہے ہیں، باباجی خدارا مجھے استخارہ کرکے بتادیں وجہ کیا ہے سب کچھ محنت کرنے یا میری دماغی کمزوری کی وجہ سے ہوا یا میں کسی جادو، ہنڈش یا نظر بندی کا شکار ہوں۔ میں کسی سے بھی بدگمان نہیں ہوں لیکن ہمارے ساتھ عرصہ دراز سے جادو ٹونے کے معاملات چل رہے ہیں۔ اور بہت سارے لوگ میری پڑھائی سے سخت ناخوش ہیں۔ باباجی! اللہ آپ کو جزائے خیر دے، اگر یہ سب میری اپنی دماغی کمزوری کی وجہ سے ہوا ہے تو آپ کوئی آسان سی دعا بتادیں جو میں نماز کے بعد پڑھ سکوں۔ میں الحمد اللہ نماز کی پابند ہوں اور اگر یہ کوئی

جادو ٹونے کا مسئلہ ہے تو اس کا بھی حل بتادیں۔ بابا جی مہربانی کر کے مجھے بچی کہانیاں کے January کے شمارے میں جواب عنایت فرمادیں کیوں کہ March کے شروع میں ہی میرے پیپرز ہیں۔

☆بیٹی! تمہیں کوئی دماغی کمزوری نہیں ہے سب سے پہلے تو یہ بات دماغ سے نکال دو، کوئی جادو بھی نہیں ہے۔ تمہاری پڑھائی بے انتہا مشکل ہے اور تمہیں اچھے استاد کی ضرورت ہے۔ تمہارے ساتھ جو بچے پڑھ رہے ہیں ان سے بھی مدد لو۔ کشمت سے (یا قادر) کا ورد کیا کرو انشاء اللہ ضرور کامیابی ملے گی۔ پوری توجہ سے پڑھو اور اس یقین کے ساتھ کہ اس بار ضرور کامیاب ہو جاؤ گی۔

□ سندھ/بلوچستان۔ مانچسٹر

o بابا جی! السلام علیکم! میں مانچسٹر میں گزشتہ تیس سال سے رہائش پذیر ہوں، میرے میاں کا اپنا اسٹور ہے۔ اللہ کا شکر ہے، مالی طور پر کوئی پریشانی نہیں۔ بابا جی خدا نے سب کچھ دیا مگر اولاد نرینہ سے محروم رکھا۔ مجھے اپنے رب سے کوئی گلہ نہیں جو اُس کی مرضی، اُسی پر ہم راضی بہ رضا۔ بابا جی میری تین بیٹیاں ہیں، میں نے ان کی تربیت میں کوئی کمی کوتاہی نہ برتی۔ میں ایک ہاؤس وائف ہوں اور ماں..... بس ساری زندگی ان ہی دو رشتوں کو نبھانے میں گزر گئی۔ میرے سر کے سائیں چار سال ہوئے ہارٹ اٹیک سے راہیٔ عدم ہو چکے۔ اب ہمارے ایک بہت اچھے فیملی فرینڈ فرینڈز ہیں جو کہ اسٹور سنبھالے ہوئے ہیں اور باقاعدگی سے ہماری کفالت کر رہے ہیں۔ بابا جی! جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو بھلا کہاں کسی کی سنتے ہیں یہ میں نے سنا ہی تھا مگر جب میری بیٹیاں اس ماحول میں پروان چڑھیں باہر کی دنیا کے رنگ دھنگ دیکھے تو آہستہ آہستہ یہ لندن اُن کے خون میں بھی گردش کرنے لگا۔ مجھے پہلا حیرت کا جھٹکا اُس وقت لگا تھا جب میری بڑی بیٹی ڈرنک کر کے گھر آئی تھی۔ اُس کی دیکھا دیکھی میری دونوں بیٹیاں بھی ڈرنک کرنے لگیں اور پھر میرا گھر جیسے ایک سرائے بن گیا۔ بابا جی! ایک دن میری بڑی بیٹی اپنے بوائے فرینڈ کو گھر لے آئی اور اُس کے بوائے فرینڈ نے زبردستی میرے ساتھ وہ سب کیا جو میں کسی کو بتا نہیں سکتی۔ بابا جی! بات یہیں ختم ہو جاتی تو اچھا تھا مگر میری بیٹی میری اِس طرح دشمن بن گئی ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں لندن چھوڑ دینا چاہتی ہوں مگر یہاں پاکستان میں بھی کوئی نہیں۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں کچھ ایسا کریں کہ میری بیٹیاں سدھر جائیں، شادیاں کر لیں، ورنہ بابا جی! خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ماں کی جگہ ایک طوائف بن گئی ہوں۔ اللہ کے واسطے میرے آنسوؤں کی لاج رکھ لیں۔ بابا جی! لندن کے لوگ اچھے ہیں مگر وہ جن چیزوں کو گناہ نہیں سمجھتے وہ میرے لیے کیا ہے؟ یہ میں جانتی ہوں، کچھ ایسا کریں کہ میری بیٹیاں راہِ راست پر آجائیں۔ میں بہت تنگ ہوں اس زندگی سے، میں اپنا یہ دُکھ کس سے بیان کروں، آپ ہی کا آسرا نظر آیا ہے، خدا کے لیے اس اندھیر نگری میں آپ ہی چراغ کی صورت نظر آئے ہیں مجھے، فوری جواب دیں اور ہاں میں آپ سے فوری طور پر رابطہ کرنا چاہتی ہوں، وہ طریقہ بتائیں۔

☆بیٹی! تم نے کہا کہ تمہارا مسئلہ شائع کیا جائے تاکہ اگر کوئی اور اس مسئلے سے دوچار ہو تو فلاح پا جائے۔ اس لیے مسئلہ شائع کیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ تم نماز کی پابندی کرو۔ اللہ کی ذات ہی ہے جو مسائل حل کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ بیٹیاں اُس ماحول کی عادی ہوئی ہی نہیں ہیں بلکہ مکمل طور پر حصّہ بن چکی ہیں۔ مادر پدر آزاد معاشرے کی تصویر اس معاملے میں فٹ آتی ہے۔ خدا اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اپنے آپ پر مکمل اختیار رکھو۔ نماز کی پابندی شرط ہے۔ روپے پیسے کی زیادتی بھی ایسے مسائل کو جنم دیتی ہے اور کیوں کہ تم ہاؤس وائف بنی رہیں اور لندن کو بھی پاکستان سمجھ کر بے خبر ہو گئیں تمہارا مسئلہ یہی ہے بابا۔ میاں کو ہارٹ اٹیک بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انہیں بھی جب بیٹیوں کا بے راہ روی کا علم ہوا ہوگا تو وہ یہ صدمہ سہار نہ سکے ہوں گے..... وقت گزرتے دیر نہیں لگتی پھر بیٹی! ہر مخلص کے لیے اچھا وقت بھی آتا ہے۔ خدا تمہیں بھی اچھا وقت دکھائے گا۔ نماز سے تمہارے دل کو سکون ملے گا۔ بیٹی نماز

عشا کے بعد روزانہ باقاعدگی سے 14 بار نیچے دی گئی دعا پڑھو اول و آخر درود شریف 7,7 بار پڑھ کر۔ ناغہ نا ہو۔

o قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۝ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

□ قادر/جتوعہ۔ اسلام آباد۔

o بابا جی! میرا بیٹا ایک طلاق یافتہ عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے، وہ اس کے ساتھ جاب کرتی ہے۔ بیٹے کی عمر 30 سال کے قریب ہے۔ ایک روز میں نے دونوں کو سڑک پر گزرتے دیکھا۔ عورت کم عمر ہے، دیکھنے میں لڑکی معلوم ہوتی ہے لیکن میری رائے اس کے بارے میں بالکل اچھی نہیں کیوں کہ اس نے میرے لائق بیٹے کو بہکایا ہے۔ میرے رشتے داروں کو پتا چلے گا تو سب ہی مجھ پر ہنسیں گے۔ بات بہت بڑھ گئی ہے۔ لڑکے نے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر ہم لوگ راضی نہ ہوئے تو وہ الگ گھر لے کر رہے گا اور ہمیں چھوڑ دے گا۔ میری بیوی کا بھی رو رو کر برا حال ہے۔ پلیز کوئی ایسا تعویذ دیں، ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرا بیٹا اُس لڑکی سے تائب ہو جائے۔

☆بیٹا! تم نے جو مسئلہ بتایا ہے۔ اگر تم خاندان والوں سے ڈرتے ہو تو بات اور ہے مگر دیکھو لوالدین کو بھی تھوڑا تحمل سے کام لینا چاہیے باقی سب سے پہلے تو تم سب نماز کی پابندی کرو اور آفس فون کر کے تعویذ منگوالو اور اُسے بیٹے کے کمرے میں رکھ دو۔ خدا بہتری کرے گا۔

□ شہروز۔ کراچی۔

o پیارے بابا جی! میں نے 3 مرتبہ میٹرک کا امتحان دیا اور تینوں بار فیل ہو گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہر بار کیمسٹری اور انگریزی کے مضامین رہ جاتے ہیں جبکہ میں پڑھنے میں اتنا برا نہیں ہوں۔ اب تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ضرور کوئی ہے جو میرا برا چاہتا ہے۔ خواہ مخواہ میرے ساتھ دشمنی کر لی ہے۔ ابو سخت ناراض ہیں مگر امی کہتی ہیں وہ دوبارہ میری فیس دے دیں گی۔ مگر وہ لوگ پھر فیل کر دیں گے۔ اس لیے اب تو فیس ضائع کرنے والی بات ہو گی۔ لوگوں کے سامنے احساسِ کمتری ہوتی ہے کہ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ بابا جی! مجھے ایسا وظیفہ دیں کہ اپنے امتحانات میں کامیابی حاصل کر کے اس احساسِ کمتری سے چھٹکارہ پا سکوں۔

☆بیٹے! تم انتہائی ڈپریشن کا شکار ہو پہلے اس ڈپریشن پر قابو پاؤ اور تمہارے لیے سب سے پہلے نماز کی پابندی ضروری ہے اور ہر نماز کے بعد ’یارحمٰن‘ کی تسبیح تین تین بار پڑھ لیا کرو۔ انشاء اللہ خدا تمہیں کامیاب کرے گا اور حافظہ بھی تیز ہو گا۔

□ الماس خاتون۔ صادق آباد۔

o بابا جی! گھر کے لڑائی جھگڑوں سے پریشان ہو کر میں اپنے دونوں بچوں کے ساتھ علیحدہ رہنے لگی ہوں۔ بیٹا کالج میں پڑھتا ہے اور بیٹی اسکول میں، بڑے بیٹے کی شادی کر دی ہے، اس کی بیوی انجینئر ہے۔ وہ اپنی بچی کو ہمارے پاس چھوڑ کر جاتی تھی۔ مسئلہ یہ ہے کہ علیحدہ ہونے کے بعد میرے شوہر نے میرا ساتھ نہ دیا بلکہ بڑے بیٹے کے ساتھ ہی رہنے لگے۔ ان کی محبت سے محروم ہو کر چھوٹے بیٹے نے نشہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ میں نشہ چھوڑ چکا ہوں لیکن مختلف طرح کے اخراجات کا ذکر کر کے کافی رقم لے لیتا ہے۔ اب یا تو میں اس پر اعتماد کروں یا پھر ڈرتی رہوں کیوں کہ میں گھر سے باہر تو اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ کچھ ایسا کردیں کہ میرا بیٹا

سدھر جائے۔

☆بیٹی! تم نے گھر چھوڑ کر سب سے بڑی غلطی کی اور دیکھ لو تم دونوں میاں بیوی بھی الگ ہو گئے۔ اور آگے جو پریشانیاں آئیں گی تمہارے سامنے ہے۔ خیر اب تم دیکھ کی پابندی کرو اور ہر نماز کے بعد ''یا مانع'' کی 3-3 بار تسبیح پڑھو اور ہاں ہر پیر اور جمعرات کے دن صدقہ خیرات لازمی دیا کرو۔ آفس میں رابطہ کرو اور ان حالات کی بہتری کے لیے تعویذ منگوالو۔

□ حور بانو۔ راولپنڈی۔

○ محترم بابا جی! ہمارے مالک مکان نفسیاتی مریض معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا بات کرنے کی آواز آتی ہے تو فوراً کہتے ہیں، پانی نہ پھینکو۔ حالاں کہ ہم جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے۔ غلطی سے کبھی نل کھلا رہ جاتا ہے۔ اس طرح دیوار پر کیل ٹھوکتے ہیں تو وہ پریشان ہو کر منع کرتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں دیوار توڑ رہے ہو، اس کے ساتھ ساتھ کانپنے لگتے ہیں۔ میں نے ان کی بیوی سے بات کی انہوں نے بتایا کہ وہ نفسیاتی مریض ہیں۔ بابا جی! ہم تو اس کل کل سے تنگ آ گئے ہیں۔ کرایہ پورا دیتے ہیں اور پھر بھی فقیروں کی طرح ان کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ کچھ ایسا عمل بتائیں کہ وہ بے جا بولنا چھوڑ دیں۔

☆بیٹی! تمہارا مسئلہ ایسا پیچیدہ نہیں ہے۔ جس نے گھر بنایا ہوتا ہے وہ ایک کیل کے ٹھونکنے پر اعتراض کرتا ہوا بھی جواب دے۔ بس برداشت سے کام لو۔ نماز کی پابندی کرو اور ہر نماز کے بعد 7-7 بار ''یا رحیم اور یا سمیع'' کی تسبیح پڑھو۔

□ عبید گل۔ اوکاڑہ۔

○ بابا جی! السلام علیکم۔ مجھے ہر وقت ڈر لگتا ہے۔ میں کسی کو دھوکہ تو نہیں دے رہا لیکن کچھ چھپا رہا ہوں۔ ایک لڑکی سے دوستی ہو گئی ہے۔ وہ میری بیوی کو جانتی ہے اور مجھے بے حد پسند کرتی ہے۔ وہ مجھے خود ملنے پر مجبور بھی کرتی ہے، اس کا کہنا ہے کہ اگر میں نے اس سے ملنے سے انکار کیا تو وہ میری بیوی کو سب کچھ بتا دے گی۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کہ میں ڈر رہا ہوں۔ دونوں سے خوف آ رہا ہے، پتا نہیں کیا ہو گا۔ میں دونوں کی نظروں میں اچھا بن کر رہنا چاہتا ہوں آج کل پریشانی اور الجھن نے دفتر میں بھی کام نہیں ہو رہا ہے۔ پلیز کچھ ایسا حل بتائیں کہ میں ایک طرف ہو جاؤں اور وہ لڑکی خود میرا ساتھ چھوڑ دے۔ بابا جی میں بالکل نفسیاتی ہوتا جا رہا ہوں۔

☆بیٹے! یاد رکھو، دو کشتیوں کا سوار کبھی منزل نہیں پا سکتا۔ تم اپنی بیوی کے وفادار ہو تو اس لڑکی سے فوراً کنارہ کش ہو جاؤ۔ وہ لاکھ تمہیں بہکائے۔ تم اُس کی باتوں میں نہ آؤ۔ اپنی بیوی کو سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ باقی سب اللہ پر چھوڑ دو۔ نماز کی پابندی کرو اور صدقہ دو۔ روزانہ نماز فجر کے بعد ''یا سمیع اور یا رحمٰن'' کی تسبیح 3-3 بار پڑھو۔ یہ عمل باقاعدگی سے 21 دن کرنا ہے۔

□ امیر زادہ۔ تبت۔

○ بابا جی! مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ جب گھر میں کوئی حکم دے کر بات کرے یا کام کروائے۔ خاص طور پر ابو تو اسی طرح بات کرتے ہیں امی بھی ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ اب بڑے بھائی کا رویہ بھی اسی طرح کا ہوتا جا رہا ہے۔ میں بھی جواب میں غصہ کرتا ہوں۔ اب اس طرح گھر میں شور مچ جاتا ہے ادھر ابو غصہ کرتے ہیں۔ ادھر میں چیخنا شروع کر دیتا ہوں۔ اب میرا دل چاہتا ہے گھر میں نہ رہوں۔ بس یونہی کسی طرف نکل جاؤں۔ اللہ کے واسطے مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں کہ میرا غصہ کنٹرول میں آ جائے۔ میں سخت الجھن کا شکار ہوں۔ باپ سے بدتمیزی بڑھتی جا رہی ہے۔ کیا کروں۔ بتا دیں پلیز۔

☆بیٹا! باپ، باپ ہوتا ہے۔ تم جتنے بھی بڑے ہو جاؤ اپنے باپ سے بڑے نہیں ہو سکتے۔ والدین کا احترام تم پر لازم ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے والد سے نرمی سے پیش آؤ۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے تمہاری عمر بھی کوئی خاص نہیں۔ تم نماز کی پابندی کرو۔ باوضو رہا کرو اور خود کو کسی ایسے تعمیری کام میں مصروف کر لو کہ دھیان بٹا رہے۔ نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد 7-7 تسبیح۔ ''یا رحمٰن، یا رحیم'' پابندی سے پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ راحت عالم۔ شیخوپورہ۔

○ بابا جی! السلام علیکم۔ میں نے اٹھارہ سال کی عمر میں گھر چھوڑ دیا تھا لیکن جس کی خاطر گھر چھوڑا وہ کوئی چھت نہ دے سکا۔ میں بھٹکتی رہی۔ آخر ایک اسپتال میں ملازمت کر لی اور وہیں رہائش بھی اختیار کر لی۔ آج کل ایک لڑکا جو شوگر کا مریض ہے اسپتال آتا ہے۔ وہ بہت اچھی عادت کا مالک ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کس طرح میری اس سے دوستی ہو گئی، میں نے اپنی ساری کہانی اُسے سنائی اور اس شخص کی بے حسی کے بارے میں بتایا جس نے مجھے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا، پھر دوسروں کے حوالے کرنے لگا، میں بیوقوف تھی، اس سے پہلے کہ زندگی تباہ ہو جاتی، مجھے اس اسپتال میں پناہ مل گئی۔ وہ میری کہانی سن کر رو پڑا۔ دوسرے دن اپنی امی کو ساتھ لایا، انہوں نے کہا کہ یہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے، اس کے پاس ملازمت بھی ہے ہمارا اپنا گھر ہے لیکن سوچ لو یہ بیمار ہے۔ بعد میں افسوس نہ کرنا۔ میری تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ کیسی خاتون ہیں جو مجھ جیسی لڑکی کو اپنا رہی ہیں۔ سوچتی ہوں انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں بھلا اس قابل کہاں ہوں۔ بابا جی! پلیز آپ مجھے استخارہ کر کے بتائیں کہ کیا میں یہ رشتہ قبول کر لوں اور کوئی ایسا وظیفہ بھی بتا دیجئے کہ میری زندگی میں آنے والے مسائل کا خاتمہ ہو سکے۔ پلیز بابا جی! میرے پاس آپ کی دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

☆بیٹی! حساب لگا لیا۔ استخارہ کر لیا۔ یہ رشتہ تمہارے لیے بہت مناسب ہے۔ بس تم نماز کی پابندی کرو اور ہاں سورہ کہف ہر جمعہ کے دن ضرور نماز عصر کے بعد پڑھو۔ ایک تعویذ آفس سے منگوا لو اور اُسے ہمیشہ ساتھ رکھنا۔

□ نصرت علی۔ صوابی۔

☆بیٹی تمہاری خواہش کے مطابق مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے..... بھائی کو سمجھاؤ جہاں وہ شادی کرنا چاہ رہا ہے وہ خاندان اس کے لیے مناسب نہیں معاملات بہت پیچیدہ ہو جائیں گے..... مجھ سے تعویذ منگوا کر اپنے بھائی کے کمرے میں رکھو انشاء اللہ 2 ماہ بعد اچھی خبر ملے گی مگر پہلے اس لڑکی سے تعلق ترک کرنا ہو گا بیٹی تمہیں بھی نصیحت کروں گا کہ مجھ سے تعویذ منگوا لو اب تمہاری مکمل ذمہ داری تمہارے شوہر کے سر پر ہے۔ اس کو اپنا فرض پورا کرنا چاہیے۔ بہر حال اطمینان رکھو سب اچھا ہو گا۔ تمہیں براہِ راست بھی جواب دے رہا ہوں۔

□ زرینہ گل۔ جھنگ۔

○ بابا جی! السلام علیکم۔ آپ سے رابطے میں ہوں مگر آج ایک نئے مسئلے کے ساتھ حاضر ہوں۔ میری شادی میری پسند سے ہوئی تھی شوہر نے بھی اپنے گھر والوں کی مخالفت مول لے کر مجھ سے شادی کی مگر اب جب کہ میرے دو بچے بھی ہیں ان کا رویہ بہت خراب ہو گیا ہے۔ انتہائی سرد انداز ہے۔ لگتا ہے جیسے مجھے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ بابا جی! ان کے اس رویے سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں چھوڑتی پھر بھی وہ مجھ سے خوش نہیں بتائیے میں کیا کروں؟

☆بیٹی! غیر فطری انداز زندگی بہت دیر تک نہیں چلتا۔ تمہارے شوہر تم سے بدظن نہیں بلکہ اس کو اس کا ضمیر کچوکے لگا رہا ہے۔ والدین کو ناراض کر کے کون خوش رہا ہے۔ تم اگر کامیاب زندگی چاہتی ہوں تو اپنے والدین اور شوہر کے والدین سے تعلقات بحال رکھو۔ تمہارے لیے بھی اچھا ہے اور بچوں کے لیے بہت بہترین ہے۔ بیٹی! رشتے ناطے سنبھال کر ساتھ لے کر چلے جاتے ہیں توڑے نہیں جاتے۔ شروع میں تمہیں مشکل ہو گی لیکن اگر چاہتی ہو کہ تمہاری اولاد سدا تمہاری فرمانبردار رہے تو بڑوں سے تم دونوں معافی مانگو بہت سکون ملے گا۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد ''یا حفیظ'' کا ورد کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

☆.....☆

کسک

ذات بھی ادھوری ہے
بات بھی ادھوری ہے
چاند بھی ہے ٹوٹا سا
رات بھی ادھوری ہے
جیت بھی نہیں پوری
مات بھی ادھوری ہے

شاعر: ظاہر اقبال۔ کوئٹہ والا

زلزلہ بلوچستان پر.....

دوپہر میں نیند میں، میں کھویا تھا
سنہرے خوابوں میں تجھ کو پرویا تھا
آئی اچانک آواز، اٹھو بھاگو، آیا ہے زلزلہ
اسی بھاگ دوڑ میں گونجیں کئی صدائیں
اَلٹ گیا منتظار بھی، دلدار بھی، افتخار بھی
اور تمہارا پیارا یار گلبہار بھی
دم توڑ گئے منگھ موڑ گئے
شیریں بھی اور گڑیا سے کھیلتی ہوئی
تمہاری پھول سی بیٹی ثوشین بھی
ارے ہاں وہ آگئی چھت کے نیچے
تمہاری بہن آشین بھی
ہوئی کیسی قیامت بپا؟
اک پل میں ہوئی جیسے مجھ سے کوئی خطا!!!

شاعرہ: زریہ جونیجو۔ بورڈی شریف

بھیگے بھیگے خط

اب کیوں خط لکھتے ہو
بھیگے بھیگے
اب کیوں لوٹ آنے کا
اصرار کرتے ہو
جب تمہیں میں کہتا تھا
تیرے بن جینا ہے مشکل
تب تم میرے جذبوں کا
مذاق اڑاتے تھے
مجھے پاگل دیوانہ کہتے تھے
اب تمہیں کیا کہ میں
کسی بھی ملک کسی بھی سرحد میں رہوں
تم نے ہی تو کہا تھا کہ میں
اپنی حد میں رہوں

شاعر: شاہد فراز؟

غزل

آرزو نہ کیا کرو بھائی
جو ملے لے لیا کرو بھائی
سانس لیتے ہو تو برائے کرم
زندگی بھی جیا کرو بھائی
لوگ لے لے کے توڑ دیتے ہیں
دل نہ ایسے دیا کرو بھائی
عشق کی واردات جو سَن لے
ایسی بھی عدلیہ کرو بھائی
درد جتنے ہیں سب مجھے دے دو
اشک نہ یوں پیا کرو بھائی
ہر جگہ پر اندھیر نگری ہے
تیرگی میں ضیاء کرو بھائی
کب سے مشغول ہو دعاؤں میں
کچھ دوا بھی کیا کرو بھائی
یہ نہیں دور زین غزلوں کا
اب کوئی مرثیہ کہو بھائی

شاعر: سید زین علی جعفری۔ کراچی

غزل

اب میسر نہیں خوشی کوئی
لے گیا چھین کر ہنسی کوئی
وہ تو تھا کہ ترا سایہ تھا
پاس تو تھا ابھی ابھی کوئی
کاش مجھ سے بھی کوئی بات کرے
توڑ ڈالے یہ خاموشی کوئی
بھید کھلتا نہیں کسی صورت
آشنا ہے کہ اجنبی کوئی
آج بھی کوئی یاد آتا ہے
یاد آتا ہے آج بھی کوئی
خود میں اپنی فنا جان کا دشمن
مجھ سے کرتا گیا دوستی کوئی
اس سے بہتر تو موت ہے عامر
زندگی ہے یہ زندگی کوئی

شاعر: عامر زمان عامر۔ بورے والا

کوئی راہ

تجھ سے تعلق کی کوئی راہ نکلتی نہ تھی
تجھ سے رشتہ کوئی کیسے بھلا جوڑ اکرتے
اپنے آغاز کی صورت سے ہی انجام کو ہم
یوں پہنچنے سے پہلے کیوں بھلا لوٹا کرتے
سپنوں کا کیا تھا؟ وہ تو ٹوٹ جاتے ہیں یوں ہی آنکھوں میں
ہم ہی پاگل تھے کہ حقیقت میں تجھے کھوجا کرتے
اپنے جذبات کی یوں دن رات پامالی پر
ہم بھلا کیوں نہ یوں چپ چپ کے روا کرتے
کٹ ہی جانی تھی تیری چاہ میں یہ زندگانی بھی
ہم بھلا کب تک یوں جینے کا دھوکا کرتے
آ ہی جاتے گر آخری دیدار کو تم رابی
مرتے دم ہی سہی ہم اظہار کا سودا کرتے

شاعرہ: رابیہ منصور رابی۔ واہ کینٹ

احتیاط

کچھ بھی ہو
بھولنے سے پہلے
یاد کر لینا
اُس کے وہ تمام اشک
جو تجھ سے پہلے
ساتھی تھے اُس کے

شاعر: ناصر سلیم۔ خانیوال

غزل

عجب کشمکش میں آکر ٹھہر گئی زندگی
میری ابتدا دیکھو یہی ہے انتہا میری
سمندر میں ڈوب کر بھی امید کا سہارا ہے
خوش فہمی کے جھولے میں پڑی ہے داستاں میری
کچھ نور ہوتے چہروں پر مایوسیوں کے سائے
بھی آکر ٹھہریں یہی ہے التجا میری
ٹھہر ٹھہرتی راتوں میں سنسانی گلیوں میں
وجود لاپتا میرا لاش گم شدہ میری
زیست میں چار سُو بس دکھوں کا بسیرا ہے
میرا مقدر دیکھو، قسمت آبلہ پا میری
میری حالت پہ کیوں مجید سب حیران ہوتے ہیں
میرا نقصان لاحدود، چاہت گم شدہ میری

شاعر: مجید احمد جائی۔ ملتان

نئے لہجے نئی آوازیں

قاتل جب بھی آن پڑے ہیں
سب رستے ویران پڑے ہیں
وقت نے جب بھی کروٹ بدلی
ہم بھی سر گردان پڑے ہیں

زعم تھا جن کو ان کے گھر پر
وہ بھی اب سنسان پڑے ہیں
خوشبو ہرجا بکھر چکی ہے
ٹوٹے ہوئے گل دان پڑے ہیں
بھاگ رہے ہیں سائے لیکن
جسم یہاں بے جان پڑے ہیں
بیات فرخی وہ جان گئے ہیں
میر کا جو دیوان پڑھے ہیں

شاعرہ: فریدہ جاوید فرخی۔ لاہور

غزل

تیری چاہتوں کا مجھ کو اگر اعتبار ہوتا
میری زندگی کا حاصل ترا انتظار ہوتا
تیرے لوٹ کے آنے کی امید تب میں رکھتی
تیرے دل کی دھڑکنوں میں بھی جو میرا پیار ہوتا
یہ محبتوں کی بازی میں کب کی جیت لیتی
میرے گلے میں تیری جو وفا کا ہار ہوتا
میں نے تو جان و دل سے چاہا تھا صرف تم کو
تو بھی تو اس طرح سے میرا طلبگار ہوتا
میری وفا کو ٹوٹا دل توڑا اپنی راہ لی
تیرا یقیں دوبارہ کیسے جانِ بہار ہوتا

شاعرہ: رضوانہ کوثر۔ لاہور

غزل

اس دھرتی سے سدھارے لوگ
کیسے کیسے پیارے لوگ
کس کے در پر جائیں یہ
رنج و الم کے مارے لوگ
روٹھ گئے ہیں جانے کیوں
میرے گھر کے سارے لوگ
دور زمیں سے ہیں ورنہ
توڑنے لگتے تارے لوگ
رکھ دیتے ہیں راہوں میں
زیرِ قدم انگارے لوگ
روٹی، کپڑا کے علاوہ
رکھتے کیا بے چارے لوگ
دہشت گردوں نے عامرؔ
کیسے کیسے مارے لوگ

شاعرہ: عامر ثانی۔ کراچی

گیت

میں رُوپ نگر کی شہزادی تُو اِک آوارہ بنجارا
میں چاند کی کشتی میں رہتی تو پھرتا پھرے مارا مارا
تُو میری خواہش رکھتا ہے، کیا سوچ کے تُو نے ایسا کہا
میں نیل گگن کی دوشیزہ ہوں، تو دھرتی زمیں کا نظارا
جب پانی نہیں سکتے مجھ کو، تو میری طرف کیوں بڑھتے ہو
اِک بدلی ہوں آکاش کی میں، تُو ساحل دریا بے چارہ
میں تو خوشبو ہوں پھولوں کی اور مستی مست بہاروں کی
تو داغ ہے کانٹوں سے لدا، تُو تو ہے خزاں کا گہوارہ
ترے پاس سوائے دل کے کیا کچھ اور بھی ہے پاگل عاشق
مرے طالب تو ہیں لاکھ یہاں، کیا جانوں تُو گر من ہارا
نہ جان کو اپنی روگ لگا، جا لوٹ کے اپنی بستی کو
میں تیری پیاری ہوں لیکن، تُو میرا نہیں ہے دلدارا

شاعرہ: فریدہ خانم۔ لاہور

تیرا انتظار

اپنی دہشتوں سے گھبرا کر
آج کمرے کی کھڑکی کھولی ہے
کھڑکی کی چوکھٹ پہ کچھ
تازہ پھول بھی رکھے ہیں
اور ہاں وہ سارے ورق جو
گزشتہ سالوں کی ڈائری میں
ادھورے چھوڑے ہیں
اب از سرِ نو ہر اک صفحے پر
تیرا انتظار لکھی لکھنا ہے

شاعرہ: عمارہ جاوید۔ کراچی

غزل

محبت میں شرارت کا ارادہ کرلیا جائے
تمہاری سوچ کو دل کا لبادہ کرلیا جائے
سنو اب جنوری کے دن پلٹ آئے ہیں آنگن میں
چلو آپس میں ملنے کا بھی وعدہ کرلیا جائے
شجر کا کاٹنا اب تو ضروری ہوگیا ہمدم
در و دیوار کو گھر کو کشادہ کرلیا جائے
چلو اس بار لوگوں سے ملیں باتیں کریں ہم بھی
دل پاگل کو سمجھا کر بھی سادہ کرلیا جائے
سنو اے فوزیہ احسان رانا جی محبت میں
یوں اپنے وصل کی شدت کو زیادہ کرلیا جائے

شاعرہ: فوزیہ احسان رانا۔ مظفر گڑھ

نظم

سنو!
تم لوٹ آؤ نا.....
اندھیری ویران راتوں میں
میں جب بھی ڈری جاتی ہوں
تمہاری یاد کے جگنو
میری نمناک آنکھوں میں
پھر آ کر ٹھہر جاتے ہیں
کہ!
تم دُور ہو کر بھی
میری آنکھوں میں بستے ہو
کسی فریاد کی صُورت
چمکتی یاد کی صُورت
تو آ نکھیں بھیگ کر میری
تمہیں آواز دیتی ہیں
دھیرے دھیرے رات کو بھی بہت جانا ہے
تمہاری یاد کے جگنو کو واپس لوٹ جانا ہے
تو مجھ کو پھر تمہاری کمی محسوس ہوگی نا.....؟
تو!
تم لوٹ آؤ نا.....

شاعرہ: نزہت جبیں ضیاء۔ کراچی

ایک نظم

جسم میرا روح تمہاری
دل میرا دھڑکن تمہاری
آنکھیں میری بینائی تمہاری
ہونٹ میرے مسکراہٹ تمہاری
خواب میرے تعبیر تمہاری
دن میرے راتیں تمہاری
زندگی میری لہو کی گردش تمہاری
گیت میرے لے تمہاری
نغمے میرے آواز تمہاری
سوچیں میری یادیں تمہاری
وجود میرا بانہیں تمہاری

شاعرہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

خالی کاغذ

لکھا ہے خود کو سالوں
خالی کاغذ پر
کہ
شاید میں کسی
اَن ہونے قصّے کی طرح
پڑھی جاؤں!

شاعرہ: فرحت جمال۔ کراچی

☆.....☆.....☆

وصیت نامہ

سید قاسم محمود

ایک مجبوں کا فسانہ خاص جو لیلائے وطن کی ایک

ایک مشکل ہر ہر پریشانی پر سو سو دفعہ مرتا اور جیتا تھا

حسب توقع فون پر اطلاع آئی کہ شیخ صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، فوراً گھر پہنچو۔ جنازہ تیار ہے۔

آج سے پہلے جب بھی فون آتا تھا، پھوپو کی آواز آتی تھی، لیکن آج جس شخص نے مجھے فون کیا، میں اُسے پہچان نہ سکا۔

شیخ صاحب دو ڈھائی سال سے بستر علالت پر اور دس بارہ روز سے بستر مرگ پر تھے۔ کل رات میں خاصی دیر تک اُن کے سرہانے بیٹھا رہا تھا اور گھر والوں سے صاف کہہ آیا تھا کہ یہ زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹے سانس لے سکیں گے۔ گھر والے بھی میری طرح ان کے حق میں دعائیں مانگتے تھے کہ اللہ اب ان کا پردہ اٹھالے۔ بہت عذاب میں جان انکی ہوئی ہے بے چاروں کی۔ مرتے ہیں نہ جیتے ہیں۔

فون آنے سے ذرا پہلے نعیم کمپیکٹر کا آدمی مجھ سے جھگڑ رہا تھا کہ دو ماہ ہو گئے ہیں، بل فوراً ادا کرو۔ میں نے اللہ توکل مرخانے کے لیے پرسوں شام کا وعدہ کر لیا، لیکن خوش قسمتی سے شیخ صاحب کی منادئی آ گئی۔ مرنا تو سب کو ہے۔ اللہ غریق رحمت کرے، بہت عظیم آدمی تھے، لیکن دنیا کے کاروبار مُردوں سے نہیں زندوں سے چلتے ہیں۔ عرصے سے ایک آس لگی ہوئی تھی کہ ان کے

"وصیت نامہ" والے سفید لفافے میں سے میرے نام کی نقدی نکلے گی تو کاروبار میں لگاؤں گا اور چھوٹا موٹا مرمت کا کام گھر میں بھی ہو سکتا تھا، وہ کر لوں گا۔ سوچا کہ پرسوں ادائیگی کا وعدہ میری زبان پر یونہی نہیں آ گیا۔ قدرت نے ایفا کا بندوبست پہلے ہی کر دیا۔

جی ہاں، شیخ صاحب کی وفات کی خبر میرے لیے جہاں بہت اندوہ ناک تھی، وہاں میری پرانی آس کو فتیلہ بھی دکھانے والی تھی۔ میں نے اپنے آدمی سے کہا، "دکان سنبھال، میں تو نہیں آ سکتا۔ کل آؤں گا۔ چابیاں قلعہ کچھن سنگھ پہنچا دینا۔" میں نے اسکوٹر کو کک ماری۔ چوک رنگ محل میں ٹریفک جمی کھڑی تھی، اس لیے بادل ناخواستہ اسکوٹر کو شاہ عالمی کی طرف ڈال دیا، حالاں کہ شیرانوالہ گیٹ اور مینارِ پاکستان کی طرف سے نکلنا تو جلدی پہنچ جاتا۔

شاہ عالمی کا چوک آنے سے پہلے شیخ صاحب مجھ پر سوار ہو گئے۔ پینتالیس برس قبل اُن سے پہلی ملاقات کی انتہائی دل چسپ اور ناقابلِ فراموش تھی۔ ہُوا یوں کہ رشتے کرانے والی نے میری بہن انیسہ بیگم کے لیے شیخ صاحب کے بڑے فرزند شیخ جمیل حسین کے لیے بات چیت شروع کرائی تھی۔ پہلے اُن کی زوجہ دو تین خواتین کے ہمراہ انیسہ کو دیکھنے ہمارے غریب خانے پر آئیں۔ اُنہوں نے کمال کیا کہ انیسہ کو چھوڑ، رئیسہ کو چھوڑ سب سے چھوٹی نفیسہ کو پسند کر لیا۔ اماجی نے صاف انکار کر دیا کہ ہمارے ہاں پہلے بڑیوں کی شادی کرتے ہیں، پھر چھوٹیوں کی باری آتی ہے۔ لیکن شیخ صاحب کی بیگم بھی ایسی آفت کی پرکالہ نکلیں کہ آئے دن ہمارے ہاں نازل ہو جاتیں۔ اپنے حربوں سے اماجی کو ایسا بھائی بنایا کہ ہم

سب اُنھیں خود بہ خود پھوپو کہنے لگے۔ پھوپو نے اپنی سدا بہار پھلجھڑیوں اور قہقہہ باز مٹھیوں سے بھائی کو جادوئی جال میں ایسا پھنسایا کہ آخر کار ایک لفظ 'ہاں' اُن کے حلق میں ہڈی کی طرح پھنس گیا۔ نہ اُگلا جائے، نہ نگلا جائے۔ میری والدہ، خالاؤں اور انیسہ اور رئیسہ کے واضح انکار کے باوجود نفیسہ جمیل حسین کے نام ہو گئی۔

منگنی کی رسم تو خیر بعد میں انجام پائی تھی، جب گجرات والی کے بیٹوں کو بھی بلایا جانا تھا۔ آج تو صرف "ہاں" ہو جانے کی خوشی میں ہماری پھوپو اور اُن کے شوہر جو گویا ہمارے پھوپا ہوئے اور اُن کا دوسرا بیٹا نوید حسین اُس کے دونوں ماموں شکور اور تیمور اُس کے اکلوتے خالو جمشید علی، خالہ دونوں ممانیاں اور تینوں چاروں کے ننھے منّے بچے نئے کپڑے پہن کر ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔

یہ ہمارے گھر کی، ایسی خوشی کی پہلی تقریب تھی جس کے ذریعے حضرت آدم علیہ السلام کی نسل چلتی ہے، اس لیے اس مبارک تقریب کے موقع پر تھی کہ میں نے بھی نیا جوڑا پہن رکھا تھا اور یہ بات مجھے خاص طور پر اس لیے یاد ہے کہ یہ میری زندگی کا پہلا نیا جوڑا تھا جس کا کپڑا میری پسند سے خریدا گیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ یہی جوڑا شیخ صاحب اور میری باہمی دوستی کا پل وسیلہ بن گیا۔ قصور اِن کا بھی نہیں تھا۔ میرا بھی نہیں تھا۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ چھوٹی سی بیٹھک تھی اور اُس میں شیخ صاحب کے مرد رشتے دار اور ظاہر ہے ہمارے بھی رشتے دار ٹھنس ٹھنس بھرے ہوئے تھے۔ میں نے چائے کی پیالی شیخ صاحب کو پیش کی۔ اُنہوں نے جوں ہی انگلی کنڈے میں ڈال کر کپ اٹھایا، کپ تو اُن کے ہاتھ میں رہ گیا اور

پیڈا پرچ سے چھک گیا، جو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ ساری گرم گرم چائے اُچھل کر اُن کی آن میں میرے کُرتے اور شلوار پر گری۔ میں ہراساں ہوگیا۔ بیشک میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ ایک شخص اُٹھ کر مجھے بچانے کے لیے میری طرف لپکا۔ سب سمجھے، قصور میرا ہے اس لیے دلاسا دینے لگے۔ شیخ صاحب الگ حیران و پریشان، خالی کپ کو دیکھتے اور کہتے جاتے تھے۔ ”یہ تو کوئی جادو کا کپ معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو ذرا! کپ میرے ہاتھ میں رہ گیا اور چائے حامد بیگ کے پاس چلی گئی۔ مجھے زیادہ خیال بیگ صاحب کے نئے جوڑے کا آتا ہے۔ میری غلطی سے خراب ہوگیا۔ مجھے کپ، پرچ سمیت پکڑنا چاہیے تھا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے زیادہ خیال کپ کا آتا ہے۔ یہ ٹی سیٹ کا حصّہ ہے جو ہم نے اپنے پڑوسی سے مانگا ہے۔“ اس پر اجتماعی قہقہہ پڑا جس کے دوران میں لاجی مجھے گھورتے رہے۔

اس سے بھی طویل اور زوردار قہقہہ اُس وقت پڑا جب رخصت کے وقت شیخ صاحب نے ہم بیٹی والوں کو یقین دہانی کے طور پر اپنی گونج دار مردانہ آواز میں، سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔ ”جب تک میں زندہ ہوں، آپ کی بیٹی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔“

میں نے پوچھا ”اور آپ کی وفات کے بعد کی کیا ضمانت؟“

تب لاجی نے صرف گھورا نہیں تھا، بلکہ بڑی درشتی سے کہا بھی تھا۔ ”چپ رہو بدتمیز، گستاخ۔“

مختصر یہ کہ شیخ صاحب سے پہلی ملاقات ہی رشتے داری سے ماورا، ایک ذاتی نوعیت کا تعلق بن گئی تھی، جو آنے والے دِنوں میں دوستی کی شکل اختیار کرگئی، حالاں کہ ہماری عمروں میں خاصا فرق تھا۔ ایک سال کے بعد جب نفیسہ کی شادی ہوئی تو میں نے میٹرک کا امتحان دے رکھا تھا پھر میں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ ایف اے کیا بی اے کیا۔ اس پورے عرصے میں گاہے گاہے میں قلعہ گجر سنگھ جاتا رہا۔ شیخ صاحب نے اپنے مکان کے سامنے ایک چھوٹا سا دو کمرے کا مکان کرایے پر لے رکھا تھا جس کے دروازے پر ایک چھوٹی سی تختی آویزاں تھی ”رائل سوپ، لدھیانہ والے۔“ ایک کمرے کو اسٹور بنا رکھا تھا اور دوسرے کمرے میں صابن کے سانچے تھے جن میں صابن کا گرم گرم روغن جما کر ٹکیاں بنائی جاتی تھیں۔ صحن میں بڑے بڑے کڑھاؤ میں کیمیکلز پکائے جاتے تھے۔ دو ملازم صابن سازی میں مصروف رہتے تھے اور شیخ صاحب اپنے دونوں پوتوں فرید اور وحید اور دونوں پوتیوں گڈو اور پپو کے ساتھ کھیلتے رہتے۔ کھلونوں سے اپنا دل بہلاتے اور مزے لے لے کر ضد گڈو کرواتے رہتے اور پھر یوں ہوتا کہ میں بھی ننھے منے بھانجوں اور بھانجیوں کے ساتھ بچہ بن جاتا۔

جب میں نے ایم اے جرنلزم میں داخلہ لیا تو فیلڈ مارشل ایوب خان کا زمانہ چاچتا تھا اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل آغا محمد یحییٰ خان کا دور شروع اور بھٹو صاحب کا ستارہ عروج پر تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب شیخ صاحب کے وجود پر ذوالفقار اسی انٹشن شروع ہوئی۔ وہ اپنی طرف سے مسئلے مسائل کو سمجھنے کی پوری کوشش کرتے تھے لیکن نہ تو شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات ان سے ہضم ہو سکے اور نہ بھٹو صاحب کی اسلامی سوشلزم ہی حلق سے نیچے سے اتر سکی۔ معاملات اُن کی سمجھ سے بہت اوپر نکل گئے تو اُن کی نظرت میں روپی ہوئی مفاس اُن جانے کیمیکلز میں گھل کر رفتہ رفتہ کڑواہٹ بننے لگی۔ دریں اثنا میں فائنل میں پہنچ گیا۔ جرنلزم میرا شوق بھی تھا اور چاہتا تھا کہ ایک کامیاب عالم انسانی بن جاؤں۔ میں نے صدر شعبۂ صحافت کی سفارش پر ایک مشہور روزنامے میں بہ طور اپرنٹس ”بلا معاوضہ رپورٹر“ کا کارڈ حاصل کرلیا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ میں اس وقت کی پیپلز پارٹی کی طرف ذہنی جھکاؤ رکھتا تھا۔ اپنی رپورٹوں میں دوسری سیاسی جماعتوں کے اتحاد کی غیر جانب دار رپورٹنگ کے باوجود کچھ اشارے اسلامی سوشلزم کی طرف زیادہ دے جاتا تھا جس کی شرح چوہدری مین بھنوے اچھی کی تھی۔ ”روٹی، کپڑا اور مکان۔“ اس وقت بھاری بھرکم جلسے جلوسوں کی رپورٹنگ میری ڈیوٹی میں شامل تھی۔ شیخ صاحب نے محض میری خاطر وہ اخبار ہاکر سے لگوالیا تھا۔ وہ میری رپورٹیں بڑی دِلچسپی سے پڑھتے اور تاکید اً کہا کرتے کہ میں روزانہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے سیاسی بصیرت حاصل کیا کروں کیوں کہ وہ یہ قول خود تحریک پاکستان کے سینئر رکن تھے اور پاکستان کیا تھا، کیوں بنا تھا، اِس کے بنانے والے کون تھے، اور یہ عظیم الشان ملک چھٹ بھیّے، کمینے، کریٹ لوگوں کے ہاتھوں میں کیوں کر آگیا ہے یہ سب تفصیل دلائل اور ٹھوس حقائق کی بنیاد پر بڑی عمدگی سے بیان کیا کرتے اور جوشِ خطابت میں کبھی کبھی اعلانیہ کہا کرتے۔ ”پاکستان میں نے بنایا ہے۔ میں پاکستان ہوں۔“

اُن کے سیاسی تبصرے اِس قدر واضح صاف اور مستحکم ہُوا کرتے کہ میں طالب علمانہ ذوق وشوق سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا۔ ہمارچوں بھانجیوں سے اک ذرا اکھیلنا سونے پر سہاگا تھا۔ شیخ صاحب بھی بڑی مٹھاس سے اپنی گونج دار، کھیلی آواز سے میرا استقبال کیا کرتے کہ پورا گھر متوجہ ہوجاتا۔ ”آؤ مرزا حامد بیگ آؤ! تشریف کا ٹوکرا یہاں رکھو۔ لاؤ بھئی نفیسہ! اپنے بھائی جان کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ اور ہٹ بھی تازہ ہوجائے تو سبحان اللہ۔“ پھر جب میری مفصل رپورٹیں اخبار میں چھپنے لگیں اور زمانہ بھی زیادہ سیاسی بصیرت کا تقاضا کرنے لگا تو شیخ صاحب کی زبان میں کچھ چیکے چیکے کڑواہٹ آتی گئی۔ اب استہزایہ لہجے میں بھی کچھ نہ کچھ کڑواہٹ آتی گئی۔ ”آؤ میاں، بڑے فارسی بیچ تیل۔ لاؤ جنی نفیسہ! اسلامی سوشلزم کے ڈھنڈورچی کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔ اب تو تمہارا بھائی عظیم صحافی ہوگیا ہے۔ عظیم فلسفی اور دانش ور۔ اور سناؤ بیگ صاحب! یہ آپ کے بھٹو صاحب کیا کر رہے ہیں؟ خود کدھر جا رہے ہیں؟ قوم کو کہاں لے جا رہے ہیں؟“

پختہ کار، مشاق صحافی، آزاد خیال اور ترقی پسند ہوتے ہوں گے۔ ہم بے چارے اپرنٹس، مبتدی قسم کے قلم کار تو چڑھتی لہر کے ساتھ ہی تیر سکتے ہیں۔ میں بھی دوسروں کی طرح اس وقت پکا سوشلسٹ تھا اور قسم خدا کی، مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ سوشلسٹ کون ہوتا ہے۔ سب تھے، اِس لیے میں بھی تھا۔ چڑھتی لہر کا نشا ہونے کے باعث اِس قدر اونچا اور بلند آہنگ ہوگیا تھا کہ شیخ صاحب جیسے معمولی صابن ساز کے سامنے گستاخ اور بدتمیز ہو جانے کو انقلابی تحریک خیال کرتا تھا۔ ایک روز میرا بھانجا فرید پلاسٹک کی رسّی گیند سے کھیلتا ہُوا ہمارے سامنے سے گزرا تو اُس کی ٹھوکر بجائے گیند کے شیخ سے ٹکرائی۔ تازہ تازہ چلم گرگئی اور سرخ کوئلے اور نیچے دبی ہوئی راکھ صحن میں بکھر گئے۔ شیخ صاحب نے بڑے طیش سے کہا ”سوشلسٹ ہوگیا ہے۔ حرام زادہ۔ ہر وقت توڑ پھوڑ، بھیڑا و جلاؤ۔“

تب پھوپو سے بھی نہ رہا گیا۔ وہ بھی پہلی تھیں۔ باورچی خانے ہی سے احتجاج بھری آواز آئی۔ ”کیوں بے چارے پر بہتان باندھ کر اپنی عاقبت خراب کر رہے ہو؟ پتا بھی ہے، قرآنِ مجید میں آیا ہے، تہمت لگانے والوں کا ٹھکانا جہنم ہے... جہنم!“

”جہنم میں جائے تُو اور تیرا بھتیجا، مرزا عبدالحامد بیگ۔ تم دونوں اور وہ سب جو کافروں کا ساتھ دیتے ہیں۔ سوشلزم کفر ہے۔ کفر ہے۔ ہزار بار لعنت۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے پاس تو جنت کا پروانہ ہے۔ منکر نکیر بھی مجھ سے پوچھ گچھ نہیں کریں گے۔ سیدھا جنت میں جاؤں گا تم دونوں اپنی خیر مناؤ۔“

پھوپو نے اب مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”حامد! انہوں نے پاکستان کی تحریک میں کیا ذرا سا حصّہ لے رکھا ہے کہ اپنے آپ کو جیتے جی بہتی سمجھ لیا ہے۔“

شیخ صاحب بھڑک اٹھے۔ ”دیکھ عائشہ! خدا کو جان دینی ہے۔ جھوٹ نہ بولا کر۔ خدا لگتی کہو، کیا میں نے ذرا سا حصّہ لیا تھا۔ اپنا سب کچھ پھونک دیا۔ پورے ہندوستان میں جہاں اور جب ضرورت پڑی، شیخ فیاض حسین پُر لگا کر پہنچا۔ شملہ کانفرنس ہوئی تیسٹن گارڈز کے پہلے دستے میں شامل۔ گڑھ مکتیسر میں ہندو مسلم فسادات ہوئے، شیخ فیاض حاضر۔ بہار اور نواکھلی میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہُوا، شیخ فیاض حاضر۔ سن چھیالیس کے الیکشن ہوئے، فیاض حاضر۔ ابھی تو ضلع لدھیانہ مسلم لیگ کے صدر چوہدری اسماعیل خان زندہ ہیں۔ اُن سے پوچھو شیخ فیاض نے کتنا ذرا سا حصّہ لیا ہے۔ پورے ہندوستان میں لدھیانہ والے شیخ فیاض حسین کا رائل سوپ چلتا تھا۔ سن لائٹ اور لائف بوائے والے جاسوسی کرتے پھرتے تھے کہ ان کے پاس کون سا فارمولا ہے۔ کلکتہ سے پشاور

تک، یوپی، سی پی، حیدرآباد دکن، بمبئی تک گھروں میں رائل سوپ چلتا تھا۔ ''رائل سوپ'' کا بائیکاٹ ہندوؤں نے کیا کہ یہ مسلمانوں کا صابن ہے۔ میرا بھٹہ بٹھا دیا۔ میں نے پروانہ کی۔ سن پینتالیس کے الیکشن کے موقع پر قائداعظم نے اپیل کی کہ چاندی کی گولیاں چاہئیں۔ میں نے لدھیانہ کے بڑے سے بڑے رئیس سے بڑھ کر چندہ دیا اور لدھیانہ تو تھا ہی ٹیکسٹائلز اور احراریوں کا گڑھ۔ ان کے سامنے مسلم لیگ کا چراغ جلائے رکھنا مجھ ایسے پاگلوں ہی کا کام تھا۔''

''ہاں اُن چاندی کی گولیوں ہی نے تو مجھے پھانسا تھا۔'' پھوپو نے قہقہے کو آہ الٰہی میں بدل لیا۔

''دیکھو عائشہ، خدا کو جان دینی ہے۔ جھوٹ نہ بول۔ میری طرف دیکھ کر بات کر۔ کس نے پھانسا تھا؟ صبح شام قرآن پڑھتی ہے۔ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتی ہے اور جھوٹ کتنا بولتی ہے۔ کس نے پھانسا تھا؟ تو نے کہ میں نے؟ دیکھو میاں حامد بیگ! تم ہی انصاف کرو۔ جب قائداعظم نے چاندی کی گولیوں کی اپیل کی تو ہم لڑکوں نے گھر گھر جا کر چندہ جمع کرنے کا پروگرام بنایا۔...''

پھوپو نے اب کے قہقہہ عمل کے لگایا۔ ''لڑکا! اور سنولڑکا۔ لڑکے ایسے ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ تین بیٹوں کے باپ تھے اور میں آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ ہمارے گھر آئے۔ ہمارے گھر کے دروازے پر پردہ پڑا رہتا تھا۔ میری ماں نے بوریاں ہی کر پردہ بنایا تھا۔ پردہ ڈھٹائی سے ہٹا کر لڑکے صاحب بولے ''چندہ دو۔'' گھر میں کوئی تھا نہیں۔ میں تھی اور میری ماں۔ ہانڈی چڑھا رکھی تھی۔ میں نے پردے دیکھا۔ یہ تھے اور اِن کے چند ساتھی، مسلم لیگ کی وردی میں۔ ماں نے وہیں سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

میں نے کہا۔ ''شیخ بھیجی ہے پھر چندہ مانگنے آ گیا ہے۔ میں انہیں جانتی تھی۔ مشہور بھی تھے اور بدنام بھی۔''

شیخ صاحب بولے ''بولتی رہ، بولتی رہ۔ میری باری بھی تو آئے گی۔''

پھوپو بولتی رہیں۔ لچھا چلو معاف کیا۔ بدنام بالکل نہیں تھے۔ بس مشہور ہی مشہور تھے۔ میری ماں نے کہا کہ ہم غریب آدمی ہیں، بیوہ ہوں، روز روز کہاں سے چندے دیتے جائیں۔ میریماں نے دو روپے دیے۔ کہنے لگے کہ جا کر ماں سے اور لاؤ۔ میں نے کہا کہ اور نہیں ہیں۔ آگے جاؤ، کل آنا۔ میں نے یہی کہہ دیا۔ بہت بھنائے۔ ''کیا ہم بھکاری ہیں؟ آگے جاؤ، کل آنا۔ ہم پانچ سے کم نہیں لیں گے۔'' اور پھر ہر روز آنے لگے۔ ہم کل کل کرتے رہے۔ ہر دفعہ مجھے ایسی بری نگاہ سے گھورتے تھے کہ توبہ بھلی۔ پانچ کے نوٹ کے ساتھ مجھ بھی تھپیٹ لائے...''

شیخ صاحب نے ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''اب عائشہ کا بیان سننے کے بعد تم خود ہی انصاف کرو کہ ایک حسین وجمیل لڑکی، آٹھویں جماعت کی طالبہ اور ایک تین بیٹوں کا باپ۔ کیں نے کس کی طرف کھینچا ہوگا۔ کشش اِس کی طرف سے تھی یا میری طرف سے تھی۔ میں تو سب کچھ کھائے پیے بیٹھا تھا۔ کم بخت نے ایسا ورغلایا کہ کہیں کا نہ چھوڑا۔ سن پچاس کے الیکشن کے موقع پر اس کی گلی میں اتنا جانا ہُوا کہ جب ہم ووٹ کے لیے گھر گھر جاتے تھے تو یہ اپنے کوٹھے پر چڑھ جاتی اور سلام کے لیے ہاتھ لہراتی تھی تو اس میں سلام کے بجائے اشارے ہوتے تھے۔ آخر کو میں مرد بچہ تھا۔ تیر نشانے پر لگا۔ خدا جانے اس نے اپنی بیوہ ماں پر کیا کالا جادو کیا، الیکشن سے اگلے دن یہ کپڑے دھلا کے سے بندھی میرے نکاح میں آ گئی۔ تقسیم کے بعد بھلے تو اپنے تین بیٹوں اور بیٹی کے ساتھ اپنے وکیل بھائی کے پاس گجرات میں جا کر آباد ہوئی۔ یہ میرے پلے پڑ گئی۔ ہر سال ایک بچہ، ہر سال ایک بچہ۔ دو لڑکے اور چار لڑکیاں۔ غضب خدا کا میرا خانہ خراب کر دیا۔ اِس سے گجرات والی لاکھ درجے بہتر ہے۔ وہاں اُس نے خواتین مسلم لیگ کو منظم کر رکھا ہے۔ یہ پیپلی بن کر رہ گئی ہے۔ کافرہ، سوشلسٹ۔ تم حامد بیگ! تم خود کافر، سوشلسٹ۔ جیسی پھوپو، ویسا بھتیجا۔ تم بھلا کیا انصاف کرو گے؟''

اور واقعی میں بھلا کیا انصاف کرتا۔ میں تو داتا دربار کے چوک میں جمی ہوئی ٹریفک میں رکا ہُوا تھا۔ میں نے سوچا کہ بلال گنج کے پیچھے سے نکل جاؤں تو شاید راستہ مل جائے لیکن ادھر جو رہے پر ٹریفک پولیس کھڑی ہوئی اور دن کے وقت میں پکڑا جاؤں گا۔ میں نے دس دس کے نوٹ سامنے والی جیب میں رکھے اور داتا دربار کے عقب میں بلال گنج کی طرف نکل گیا۔ ٹریفک کے سپاہی نے روک لیا۔ اسکوٹر کے کاغذات طلب کرنے لگا۔ میں نے بتایا کہ میرے پھوپا فوت ہوگئے ہیں۔ مجھے ان کے جنازے میں قلعہ پھلن سنگھ پہنچنا ہے۔ جلدی میں کاغذات دکان پر بھول آیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی پولیس بہت اچھی ہے۔ سچ بولو تو چھوڑ دیتی ہے جھوٹ بولو تو چپک جاتی ہے۔ چنانچہ سچ بولنے کے جرم میں مجھے چھوڑ دیا گیا اور میرے بیس روپے بھی بچ گئے۔

اسکوٹر پر بیٹھا تو شیخ فیاض حسین بھی اب تک میرے ہم سفر تھے۔ میں جلد از جلد قلعہ پھلن سنگھ پہنچنا چاہتا تھا۔ ایک روز انہوں نے اپنی وصیت سنانے کے انداز میں، میری موجودگی میں، پھوپو سے کہا تھا کہ میرا بندھا وصیت نامہ جو میں نے تجھے دے رکھا ہے، کھولے گا تو حامد بیگ کھولے گا۔ پھر مجھے مخاطب کر کے کہا تھا اکیلے نہ کھولنا۔ سب کے سامنے کھولنا۔ پھر جس کا جیسا نصیب۔ اس وقت تو میرے اعصاب پر شیخ فیاض حسین اور ان کی تجہیز و تکفین سے زیادہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ''وصیت نامہ'' سوار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک بار پھر میرا نصیب کھلنے والا ہے۔

ایک بار پہلے بھی میرا نصیب انہی کے احسانات کے باعث جاگا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سقوط ڈھاکا کے بعد شیخ فیاض حسین کا وجود ریزہ ریزہ ہونا شروع ہُوا تھا۔ بھٹو صاحب کے صدر اور پھر وزیراعظم بننے کے بعد اس روزنامے نے اپنی پوری پالیسی، سرے پاؤں تک، پی پی پی کے حق میں کر دی تھی جس کی وجہ سے نیوز پرنٹ کا کوٹا اور سرکاری اشتہارات اور دیگر مراعات اخبار کو ملنے لگے تھے۔ اقتصادی حالات بہتر ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہُوا کہ مجھے بھی بچا تقرر نامہ مل گیا۔ باقاعدہ تنخواہ لگ گئی اور ظاہر ہے کہ فرائض میں بھی اضافہ ہوگیا۔ مجھے فلمی صفحے کا انچارج بنا دیا گیا اور معروف سیاسی رہنماؤں سے انٹرویو کرنا بھی میرا معتد رکھ دیا گیا۔

چند ماہ کے بعد یوں ہُوا کہ میں شیخ صاحب کے پاس مایوسانہ بیٹھا تھا۔ اب تک وہ ملک وقوم سے اِس قدر مایوس ہو چکے تھے کہ میں جب بھی جاتا، وہ بستر پر

چین میں پہلی کمیونسٹ حکومت

21 جنوری 1949ء کو چین کے قوم پرست رہنما چیانگ کائی شیک کو حکومت کی صدارت سے مستعفی ہونا پڑا، اس کے گیارہ دن بعد ماؤزے تنگ کی قیادت میں کمیونسٹ فوجیں بیجنگ میں داخل ہوگئیں انہوں نے قوم پرستوں کے صدر مقام نانجنگ سمیت چین کے تمام اہم شہروں پر قبضہ کرلیا اور یوں چین کی طویل خانہ جنگی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ یکم اکتوبر 1949ء کو چین میں کمیونسٹوں کی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ماؤزے تنگ اس عظیم مملکت کے چیئرمین اور چواین لائی وزیراعظم مقرر ہوئے جبکہ مارشل چو تھے نے کمیونسٹ افواج کے کمانڈر اور وائس چیئرمین کا عہدہ سنبھالا۔

دراز ملتے۔ آج بھی وہ چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے اور لیٹے لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ اُنہوں نے سقوط کے بعد صابن کا کارخانہ بند کر دیا تھا۔ دونوں ملازموں کو چھٹی دے دی تھی اور ہر وقت اس گہری سوچ میں غلطاں رہتے تھے کہ پاکستان کا کیا بنے گا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جس رات اُنہوں نے یحییٰ خاں کو شراب کے نشے میں دھت ریڈیو پر تقریر کرتے سنا تھا کہ ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے اور مغربی محاذ پر جنگ لڑتے رہیں گے اسی رات انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ قائداعظم کی بنائی ہوئی اسلامی مملکت کا خاتمہ بالخیر ہُوا۔ جب اس کا سربراہ اعلان جنگ بھی شراب کے نشے میں کرے تو وہ مملکت اگر باقی بھی رہے گی تو "اسلامی" نہ رہے گی اور جب اسلامی ہی نہ رہے، تو پھر مسلمانانِ ہند کی تمام جانی و مالی قربانیوں کا گناہ کس کے سر ہوگا۔ اسی شب سے شیخ صاحب کا وجود وہ نہ رہا تھا جو قدرت نے بنایا تھا۔ مضبوط چٹان رفتہ رفتہ، ریزہ ریزہ ہونا شروع ہو گئی تھی۔ بستر پر دراز، ایک مایوس و پژمردہ وجود اور حقے کی گڑگڑاہٹ کی مسکن خاموشی۔

میں اُن کے سرہانے موڑھے پر بیٹھ گیا تو پوچھا۔ "کوئی اچھی خبر بھی لائے ہو؟ 92 ہزار قیدی کہاں گئے؟ کب آ رہا ہے وہ تمہارا جنرل نیازی۔ جسے تم کہتے تھے کہ شیروں کی طرح دہاڑتا ہے۔ اب بھارت کے کس پنجرے میں بھک رہا ہے؟ تمہارے قائدِ عوام نے کہا تھا، "اللہ کا شکر ہے پاکستان بچ گیا۔" کہاں بچ گیا پاکستان؟ کہاں رہ گیا پاکستان؟ اندرا گاندھی ساڑھی پھڑکاتی لال قلعے کے میدان میں بنگلہ رہی ہے۔ ہم نے دو قومی نظریے کے چیتھڑے اُڑا دیے۔ اب بولو۔ بتاؤ حامد میکر کیا کہتے ہیں مفتیانِ قوم، بیچ اس مسئلے کے؟"

میں نے کہا، "شیخ صاحب! کیا عرض کروں۔ میں تو خود مصیبت میں مبتلا ہوں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں تحریکِ پاکستان کے ایک عظیم رہنما اور سیاسی مدبّر سے انٹرویو کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کو اُس کا نام بھی بتایا تھا۔ یہ انٹرویو چودہ اگست کے آزادی کے ایڈیشن میں چھپے گا۔ میں نے دو نشستوں میں طویل انٹرویو کیا۔ ہمارے فوٹو گرافر نے تصویریں بھی لیں۔ پرسوں اُن کا باریش سیکرٹری میرے پاس آیا اور ایک سفید لفافہ تھمایا۔ میں نے کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک ہزار روپے تھے کہنے لگا کہ یہ آپ کے چائے پانی کے ہیں۔ یہ آپ کا حق ہے۔ آپ نے خاص طور پر وقت دیا ہے۔ بس ذرا انٹرویو زور دار طریقے سے اچھی جگہ پر لگوائیے۔ پہلے صفحے پر آجائے تو اور بھی اچھا ہے۔ میرے لیے یہ تجربہ انوکھا تو تھا ہی، پہلی دفعہ بھی تھا۔ میں نے بڑی معصومیت سے اپنے ایک سینئر دوست کو بتایا اور پوچھا کہ یہ چائے پانی کیا ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے؟ کیا جرنلزم میں بھی بڈھا من فضل ربی ہوتا ہے؟ بولا کہ لفافہ مجھے دو۔ میں نے لفافہ اُسے دے دیا۔ اُس نے اپنی جیب میں رکھا اور کہا کہ تمہیں نہیں چاہیے یار، تو مجھے دے دو۔ تو شیخ صاحب! بات یہ ہے کہ مجھے رزقِ حرام منظور نہیں۔ میں تو چونیّ گھنٹے کا استغفار سے آیا ہوں۔ جو ہو سو ہو لیکن پریشان بہت ہوں۔ اب کیا کروں۔"

شیخ صاحب نے کہا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ چلو میرے ساتھ۔ میں بتاتا ہوں، کیا کرنا چاہیے۔"

وہ بستر سے یوں اٹھے جیسے چٹان میں زلزلہ آنے والا ہو۔ مجھے باہر گلی میں لے گئے۔ کارخانے کا تالا کھولا۔ صحن میں پہنچے اور آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے "یہ کارخانہ تم سنبھال لو۔ میں تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ یہ سارا سامان، کڑاہیاں، کڑھاؤ، مسالے، تیل، سانچے، سب تمہارے حوالے۔ شاہ عالمی میں میرا لدھیانے کا دوست ہے۔ رائل سوپ کی اصل انجمنی شروع دن سے اُس کے پاس ہے۔ صابن بنانے کے طریقے میں سکھاؤں گا۔ بہت آسان فارمولا ہے۔ کپڑے دھونے کے صابن میں کاسٹک سوڈا اور نمبر ایک اور شیو کے صابنوں میں کاسٹک پوٹاش استعمال ہوتی ہے۔ ملائمت پیدا کرنی ہو تو گلیسرین استعمال کرتے ہیں۔ جیسی چاہو، خوش بو کا ایسنس ڈال لو۔ چیزیں عام مل جاتی ہیں۔ ناریل، بنولہ، مونگ پھلی، نیم اور سرسوں کے تیل۔ تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ جس طرح میں کہتا ہوں کرتے جاؤ۔ رزق دینے والی اللہ کی ذات ہے۔ کاروبار ملازمت سے لاکھ درجے بہتر ہوتا ہے۔ یہ ساری چیزیں مفت تمہارے سپرد... البتہ ایک ہزار روپے ماہوار تم مجھے دو گے۔ کسی اور کو جتنی کہ میرے بیٹوں، بیٹیوں اور اپنی بہن کو بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "پھوپو کو بھی نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ اُسے تو کانوں کان خبر نہ ہونی چاہیے۔ بڑی حرافہ ہے۔"

میرے لیے صابن سازی ایک عجیب و غریب پیشہ تھا۔ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا لیکن شیخ صاحب کی نگرانی اور رہنمائی میں کاروبار خوب چکا۔ ایک سال تک تو کارخانہ اسی مکان میں رہا۔ جب کاروبار پر میرا ہاتھ جم گیا تو میں نے راوی روڈ پر ایک پرانا مکان کرائے پر لے لیا۔ مزدوروں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ شیخ صاحب طرح طرح کی ترکیبیں اور مارکیٹنگ کے گُر کاغذ پر لکھ دیا کرتے اور میں ان پر حرف بہ حرف عمل کیا کرتا۔

جس دن جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء آیا، اس سے ایک روز پہلے "عوامی سوپ" کے پچاس ہزار اور "پیپلز سوپ" کے بھی پچاس ہزار لیبل چھپ کر آئے تھے۔ شیخ صاحب کا پیغام آیا کہ فوراً ملاقات کرو۔ ہدایت کی کہ "عوامی سوپ" کا نام "مسلم سوپ" اور "پیپلز سوپ" کا نام "حق سوپ" رکھ دو۔ میں نے کہا اور یہ ایک لاکھ چھپے چھپائے لیبل کیا رادی میں بہادوں۔ کہنے لگے۔ باگل ہو ایک طرف باندھ کے رکھ دو۔ داشت آید بکار۔ چنانچہ جب بے نظیر بھٹو کا پہلا دور آیا تو راتوں رات پرانے لیبل لگ کر "عوامی سوپ" اور "پیپلز سوپ" مارکیٹ میں آ گئے۔

جب میاں نواز شریف کا پہلا دور آیا تو بتوں اور کوہاٹ سے لے کر داؤد اور لازکانہ تک کے جنرل اسٹوروں میں "عوامی سوپ" کی جگہ "مسلم سوپ" اور "پیپلز سوپ" کی جگہ "شریف سوپ" نے لے لی تھی۔

بے شک میرا کاروبار خاصی جم گیا تھا۔ شیخ صاحب کے پرانے سول ایجنٹ کی مدد سے، مجھے شاہ عالمی میں ایک اچھی، کھلے کی دکان بھی کرائے پر مل گئی تھی جس پر ایک بڑا سائن بورڈ بھی نصب کرایا گیا تھا۔

"رائل سوپ لدھیانہ والوں کے مشہور و معروف بہترین صابن۔"

اس کاروبار کی آمدنی سے ایسے اور رئیسہ کی بھی شادیاں ہوگئی تھیں اور ماشاء اللہ میری بھی شادی شاہ عالمی کی ایک بڑی گارمنٹس فیکٹری کے مالک کی بیٹی سے ہوئی تھی اور یہ بھی درست ہے کہ جو ماہوار منافع یا وظیفہ میری جانب سے شیخ صاحب کو خفیہ طور پر دست بہ دست دیا جاتا تھا وہ سال بہ سال بڑھتے بڑھتے میاں نواز شریف کا دور آدور آتے آتے چھ ہزار تک پہنچ گیا تھا۔

لیکن میاں نواز شریف کے دوسرے دور کے آتے آتے ریزہ ریزہ ہوتی ہوئی چٹان میں دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ شیخ صاحب ہائی بلڈ پریشر کو پھلانگ کر ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو چکے تھے جسے لوگ "دماغی" کہا کرتے۔ کوئی کہتا، باؤلیا ہے۔ کوئی کہتا، بڑھاپا ہے۔ کوئی کہتا، پاگل پن ہے، دیوانگی ہے، جنون ہے۔ لباس وہی تھا جو وہ نوجوانی میں پہنتے آئے تھے۔ فینسی شلوار پر کوٹ، پاؤں میں صاف ستھری جرابیں اور ملیشن بھی براؤن، بھی کالے۔ سر پر ہمیشہ نفیس رنگ کی رومی ٹوپی، جس کا پھندنا ان کی اندرونی آوازوں کی ہاں ہاں میں ہاں ملاتا رہتا۔ وزیرِ اعظم ہو کر جانا پھر دوسرے کا آنا اور جانا۔ پھر تیسرے کا آنا اور جانا۔ آٹھوں ترمیم پھر الیکشن سپریم کورٹ، صدر کے آئینی اختیارات، کرپشن، لوٹ مار، امن و امان، قانون کی بالادستی، سریے محل، لندن کے فلیٹ، احتساب، پہلے احتساب پھر الیکشن۔ نہیں، پہلے الیکشن پھر احتساب۔ اخبار میں روزانہ، صبح شام ایسی ایسی خبریں پڑھ پڑھ کر مَیں من ہی من کہتا شیخ صاحب کی دماغی کیفیت اس بوڑھی ماں کی سی ہوتی جس کی آنکھوں کے سامنے جلاد اس کے نوجوان، اکلوتے جگر گوشے کو خنجر چھپو چھپو کر کھیل رہا ہو، قہقہے لگا رہا ہو۔

شیخ فیاض حسین کے خزانے میں اب کل سرمایہ جو رہ گیا تھا، وہ تھا اُن کا وجہِ بے وجہ چیخنا، چلانا، گالیاں اور مغلظات۔ صبح سے شام تک گالیاں، مزید گالیاں، بیٹوں کو، بہوؤں کو، پوتوں اور پوتیوں کو اور تمام مقتدر سیاست دانوں کو اور ان کے پٹھو صحافیوں اور کالم نویسوں کو۔ ایسی ایسی غلیظ، ناشائستہ اور فحش گالیاں جو شیخ صاحب جیسے مہذّب آدمی کی زبان پر آکر رحم کے قابل ہو جاتیں۔

بلکے اعصابی درد میں برتو ہماری پھوپو جانکیہ ہی اپنی ہلکی پھلکی مکھلیزیوں سے قابو پالیا کرتی تھیں۔ مثلاً جب وہ ایک دفعہ وزیرِ اعظم کو برا بھلا کہہ رہے تھے تو پھوپو نے

سل بٹے پر انار دانہ کوٹتے ہوئے، وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”خدا کے لیے، اب گالی نہ دینا۔ سڑی بسی گالیوں سے کیا فائدہ۔“

شیخ صاحب نے کہا۔ ”یولو بیگ صاحب! کیسی گالی چاہیے۔“ الف سے لے کر ی تک“ ہزار ہزار گالیاں ہیں میرے ترکش میں۔ ایک سے بڑھ کر ایک مزے دار اور چٹ پٹی۔ بولو، کس حرف کی گالی سننا پسند کرو گے۔ س سے ش، ب، ک، ج، گ سے۔“

پھوپو نے کہا ”چلو چلو، الف والی سناؤ۔“

شیخ صاحب بولے ”الف سے تو بہت بے ضرری گالی ہے۔ آج کل کے تو بچے، بلکہ عائشہ جیسی معزز خواتین بھی اٹھتے بیٹھتے یہ گالی سنتی سناتی رہتی ہیں۔ پی ٹی وی کے ہر ڈرامے میں یہ گالی فیشن بن گئی ہے۔ زبان زد عام وخاص ہے۔“

پھوپو نے کہا ”لیکن میں سناتی ہوں۔ تم اس ذرا سی گالی کو بھی کہیں کے کہیں پہنچا دیتے ہو۔“

شیخ صاحب چہکے۔ ”تم سناؤ گی! تو یہ کرو۔ گالی عورتوں کے لیے نہیں بنائی گئی۔ عورتیں گالی کے لیے بنائی گئی ہیں۔ گالی عورت کے ہونٹوں پر آ کر پریشان ہو جاتی ہے کہ کس عذاب میں پھنس گئی۔ لیکن میں سناتا ہوں۔ یہ جواہر جمیل حسین اور نوید حسین ہیں نا... لیکن حامد بیگ! پہلے یہ بتاؤ روح کی غذا کیا ہے؟“

میں نے جھٹ کہا ”موسیقی۔“

پھر پوچھا۔ ”روح کا فضلہ کیا ہے؟“

میں نے سوچا اور کہا۔ ”پتا نہیں۔“

”اچھے دانش ور ہو۔ پڑھے فارسی اور بیچے تیل۔ روح کا فضلہ ہوتی ہے گالی۔ میں تو روزانہ خوب گالیاں دیتا ہوں ٹکا ٹک۔ یہ جو ماں کے خم اور باپ کے اڈے ہیں۔ حرام زادے ولد الزنا، یہ سب سیاست کار، مکار، کمینے، انہیں خوب گالیاں دیتا ہوں اور اپنا کھاتا روز کے روز بے باق کر کے آرام کی نیند سوتا ہوں۔ جو روح کا فضلہ خارج نہیں کرتا، وہ ایلیشن اور ڈپریشن کا مریض بن جاتا ہے اور یہ مرض ہمارے قومی مرض بن چکے ہیں۔ ہماری قوم مہذب اور تعلیم یافتہ ہوتی ہے۔ مرد لوگ عورتوں کے احترام میں گالی دینا بھول گئے ہیں۔“

ہمارے ہاں گالی کا رواج ہی نہیں ہے۔ ہم تو بس ایک دوسرے کو ”ابے تبے“ کہتے ہیں۔ ہم تو بس ”ابے تبے“ کی گالی جان

بھی اُنہیں اکیلے میں یہی سمجھاتی تھی کہ تمہارے باپ نے پاکستان اور اور اہلِ پاکستان سے اِتنی محبت کی، اِتنی محبت کی کہ اپنے بیٹوں پر ذرا بھی توجہ نہ کی۔ تعلیم سے محروم رہ گئے۔ ڈنڈے بجاتے پھرتے ہیں۔ چھوٹا تو غلاظت کا ڈھیر اٹھاتا پھرتا ہے۔ بڑا کبھی کسی کمپنی کی نوکری کرتا ہے، کبھی کسی کمپنی کی۔ اپنی صابن فیکٹری میں گھسنے تک نہ دیا۔ یہی حال گجرات والی کے بچوں کا ہے۔

آخر ایک روز میں نے ہی کہا۔ ''شیخ صاحب، چلیے آپ کو اتفاق اسپتال لے چلتے ہیں۔ ہفتہ عشرہ وہاں کوئی پرائیویٹ کمرا لے کر علاج کرائیں گے تو صحت بحال ہو جائے گی انشاء اللہ۔''

''خرچ کیا تیرا باپ دے گا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''خرچا میں دوں گا۔ آخر آپ میرے باپ کی جگہ ہیں اور میرے محسن، سب کچھ آپ ہی کا دیا ہُوا ہے۔'' کہنے لگے۔ ''اچھا چلتے ہیں لیکن اتفاق اسپتال میں نہیں۔ گنگا رام اسپتال یا میو اسپتال چلتے ہیں۔ ہندو اور عیسائی ایسے مسلمانوں سے اچھے۔ خلوص اور ہوس کا فرق ظاہر ہے۔''

چنانچہ پچھلے سال شیخ صاحب کو گنگا رام اسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ دوسری تیسری رات میں نے کہا۔ ''پھوپو کے ساتھ میں بھی رہوں گا۔''

آدھی رات کے قریب جب شیخ صاحب کی آنکھ لگ گئی تو ہم دونوں باہر گھاس کے قطعے پر جا بیٹھے۔ موقع محل دیکھ کر میں نے پوچھ لیا۔ ''شیخ صاحب کا وصیت نامہ کیا ہے؟''

پھوپو نے کہا۔ ''خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں۔ ویسے رقم یا جائیداد کا معاملہ ہے۔ جب پاکستان بنا تو انہیں ایک اور مکان بھی الاٹ ہُوا تھا گوالمنڈی میں۔ بہت بڑا مکان تھا۔ اس کا پتا نہیں کیا بنا۔ پوچھتی ہوں تو بتاتے نہیں۔ ایک لفافہ سا ہے۔ اس میں کوئی تحریر ہے۔ شاید اس مکان کا ملکیت نامہ ہے یا بینک کا چیک وغیرہ ہے۔ خدا جانے کیا ہے۔ کبھی کبھی وہ کہا کرتے ہیں یہ وصیت نامہ حامد بیگ کے لیے ہے۔ حامد! ایک بات بتائے دیتی ہوں اگر یہ وصیت اس مکان کی ملکیت یا اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کے بارے میں ہوئی اور انہوں نے یہ سب کچھ تیرے نام کیا تو تجھے قسم اللہ کی اور اس کے رسول کی یہ سب کچھ مجھے دینا۔ میرے بچے بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ تجھے اُنہوں نے کارخانے کا مالک بنا دیا اور تیری زندگی سنوار دی۔ یہ حق میرے بچوں کا ہے۔''

میں جب قلعہ چھمن سنگھ شیخ صاحب کے گھر پہنچا تو اردگرد کی دونوں تینوں گلیاں لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ اہلِ محلہ، اہلِ خانہ، لدھیانہ والے، تمام سیاسی جماعتوں کے کارکن اس شخص کے جنازے کے انتظار میں تھے جو ہوش مندی سے لے کر جنون کی کیفیت تک ان کا چہیتا، مخلص اور مشفق رہا تھا۔ اہل خانہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ پھوپو نے بڑے بیٹے جمیل حسین کو بتا دیا کہ وصیت نامہ میں ہی کھولوں گا اور سب کے سامنے کھولوں گا۔ ہم میں سے کئی جو وصیت سے مادی و اقتصادی تعلق کی امید رکھتے تھے ایک دوسرے سے جڑے کھڑے تھے۔ صحن میں رکھی ہوئی نعش کے چاروں اطراف خواتین کی سسکیوں اور بین کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے سب کی موجودگی میں لفافہ چاک کیا۔ لفافے کے اندر ایک اور لفافہ تھا وہ بھی خالی تھا۔ دوسرے لفافے کے اندر پلاسٹک کا لفافہ تھا۔ اس کے اندر ایک اور لفافہ تھا جو بند تھا اور جس کے اوپر شیخ صاحب نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا ''جنت کا پروانہ'' جنت کے پروانے والے لفافے کے اندر ایک اور لفافہ تھا۔ میں نے اُسے کھولا۔ اس کے اندر سے شیخ صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر نکلی۔ ''منسلکہ جنت کا پروانہ میرے کفن میں، دل کے قریب رکھ کر میرے ساتھ قبر میں دفنایا جائے۔''

منسلکہ جنت کا پروانہ کیا تھا؟ پانچ سو روپے کے منی آرڈر کی ایک رسید تھی جس کے ایک طرف بھیجنے والے کا پتا لکھا ہوا تھا۔ ''شیخ فیاض حسین رائل سوپ فیکٹری 312۔ نیا محلہ لدھیانہ۔'' اور دوسری طرف رقم وصول کرنے والے کے صاف، روشن، مضبوط اور مستحکم دست خط تھے۔

''ایم اے جناح۔ 15 اکتوبر 1945۔''

☆.....☆